اثر نگارش

اہلِ قلم کی ایک جماعت

زیرِ نظر

استاد محقق آیت اللہ العظمیٰ ناصر مکارم شیرازی

تفسیر نمونہ

جلد 24

ترجمہ

حضرت مولانا سید صفدر حسین نجفی رحمۃ اللہ علیہ

زیرِ سرپرستی

حضرت آیت اللہ العظمیٰ الحاج سید علی رضا سیستانی مدظلہ

مصباح القرآن ٹرسٹ

فہرست مضامین

عنوان	صفحہ
سورۂ ممتحنہ	۲۵
سورۂ ممتحنہ کے مضامین	۲۷
سورۂ ممتحنہ کی تلاوت کی فضیلت	۲۷
آیت ۱ تا ۳	۲۹
شانِ نزول	۳۰
خدا سے دوستی کرنے کا انجام	۳۲
آیت ۴ تا ۶	۳۵
ابراہیمؑ تو سب کے لیے نمونہ ہیں	۳۶
چند نکات۔	
۱ : ابدی نمونے۔	۴۱
۲ : خدا سب سے بے نیاز ہے۔	۴۲
حب فی اللہ اور بغض فی اللہ بنیادی اصل ہے۔	۴۳
آیت ۷ تا ۹	۴۴
ان کفار سے دوستی جو برسرِ پیکار نہیں ہیں۔	۴۵
آیت ۱۰ تا ۱۱	۴۸
شانِ نزول	۴۹
مسلمانوں اور کفار کے نقصان کی تلافی	۵۰
آیت ۱۲	
دشمنوں کے لیے بھی عدالت	۵۴
آیت ۱۲	۵۵
عورتوں کی بیعت کی شرائط	۵۶
چند نکات	
۱ : عورتوں کی بیعت کا ان کی اسلامی شخصیت کے ساتھ ربط۔	۵۷
۲ : ابوسفیان کی بیوی ہندہ کا ماجرا	۵۸
۳ : معروف میں اطاعت	۵۹
آیت ۱۳	۶۰
اس مغضوب علیہ قوم سے دوستی نہ کرو۔	۶۶
سورۂ صف	۶۳
سورہ صف کے مضامین	۶۵
سورہ صف کی تلاوت کی فضیلت	۶۵
آیت ۱ تا ۴	۶۷
شانِ نزول	۶۸
فولادی دیوار کی طرح جم کر لڑنے والے	۶۸

عنوان	صفحہ
چند نکات	
۱ : صفوں میں وحدت کی ضرورت ۔	۷۲
۲ : گفتارِ بلاعمل	۷۲
آیت ۵، ۶	۷۵
میں احمد کے ظہور کی بشارت لے کر آیا ہوں	۷۶
چند نکات	
۱ : بشارت اور تکمیلِ دین کا ربط	۷۸
۲ : عہدین کی بشارتیں اور فارقلیطا کی تعبیر	۷۹
۳ : کیا پیغمبرِ اسلامؐ کا نام احمد ہے؟	۸۰
آیت ۷ تا ۹	۸۴
وہ نورِ خدا کو اپنی پھونکوں سے خاموش کرنا چاہتے ہیں۔	۸۴
آیت ۱۰ تا ۱۳	۸۹
سود مند اور بے نظیر تجارت	۸۹
چند نکات	
۱ : فتح قریب کون سی ہے ؟	۹۲
۲ : مساکنِ طیبہ کیا ہے ؟	۹۲
۳ : دنیا اولیاء خدا کا تجارت خانہ ہے۔	۹۳
آیت ۱۴	۹۴
حواریوں کی طرح ہو جاؤ	۹۴
ایک نکتہ	
حواریین کون ہیں ؟	۹۶
سورۂ جمعہ	۹۹
سورۂ جمعہ کے مضامین	۱۰۱
سورۂ جمعہ کی تلاوت کی فضیلت	۱۰۱

عنوان	صفحہ
آیت ۱ تا ۴	۱۰۳
پیغمبرؐ کی بعثت کا مقصد	۱۰۴
ایک نکتہ	
فضلِ خدا حساب سے ہوتا ہے	۱۰۹
آیت ۵ تا ۸	۱۱۰
ایسا چوپایہ جس پر کتابیں لدی ہوں۔	۱۱۱
چند نکات	
۱ : عالم بے عمل	۱۱۵
۲ : میں موت سے کیوں ڈروں ؟	۱۱۷
آیت ۹ تا ۱۱	۱۱۹
شانِ نزول	۱۲۰
ہفتہ کا عظیم ترین عبادی سیاسی اجتماع	۱۲۰
چند نکات	
۱ : اسلام میں پہلی نمازِ جمعہ	۱۲۴
۲ : نمازِ جمعہ کی اہمیت	۱۲۵
۳ : نمازِ عبادی سیاسی جمعہ کا فلسفہ	۱۲۶
۴ : نمازِ جمعہ کے آداب اور خطبوں کے مطالب و مضامین	۱۲۹
۵ : نمازِ جمعہ کے وجوب کی شرائط	۱۳۱
سورۂ منافقون	۱۳۳
سورۂ منافقون کے مطالب	۱۳۵
سورۂ منافقون کی تلاوت کی فضیلت	۱۳۵
آیت ۱ تا ۴	۱۳۷
سرچشمۂ نفاق اور منافقین کی نشانیاں	۱۳۸
آیت ۵ تا ۸	۱۴۵

عنوان	صفحہ
شانِ نزول	۱۴۶
منافقین کی دیگر نشانیاں	۱۴۷
چند نکات	
۱ : منافق کی دس نشانیاں	۱۵۲
۲ : منافقین کا خطرہ	۱۵۴
۳ : منافقین بے اخلاص اور ٹوٹنے والا ہے۔	۱۵۵
۴ : عزت خدا اور اس کے دوستوں کے لیے مخصوص ہے۔	۱۵۵
آیت ۹ تا ۱۱	۱۵۷
مال اور اولاد تمھیں خدا کی راہ سے غافل نہ کردیں۔	۱۵۸
چند نکات	
۱ : پریشانیوں پر غلبہ کی راہ	۱۶۰
۲ : نفاق ، اعتقادی و عملی	۱۶۱
سورۂ تغابن	۱۶۴
سورۂ تغابن کے مضامین و مطالب	۱۶۵
اس سورہ کی تلاوت کی فضیلت	۱۶۶
آیت ۱ تا ۶	۱۶۷
وہ دلوں میں چھپے ہوئے اسرار سے آگاہ ہے۔	۱۶۸
آیت ۷ تا ۱۰	۱۷۳
تغابن کا دن اور غبنوں کا آشکار ہونا	۱۷۴
آیت ۱۱ تا ۱۳	۱۷۹
تمام مصائب اسی کے فرمان سے ہیں	۱۷۹
آیت ۱۴ تا ۱۸	۱۸۳
شانِ نزول	۱۸۴
تمھارے اموال و اولاد تمھاری آزمائش کا ذریعہ ہیں	۱۸۵

عنوان	صفحہ
ایک نکتہ	
ایک پُرمعنی حدیث	۱۹۱
سورۂ طلاق	۱۹۳
سورۂ طلاق کے مضامین	۱۹۵
سورۂ طلاق کی تلاوت کی فضیلت	۱۹۵
آیت ۱	۱۹۷
طلاق اور علیحدگی کی شرائط	۱۹۸
چند نکات	
۱ : طلاق حلال چیزوں میں سب سے زیادہ قابلِ نفرت ہے۔	۲۰۱
عاطفی مشکلات	۲۰۲
اجتماعی مشکلات	۲۰۳
اولاد کی مشکلات	۲۰۳
۲ : اسبابِ طلاق	۲۰۴
۳ : عدت کا فلسفہ	۲۰۵
آیت ۲ ، ۳	۲۰۷
صلح یا پسندِ خدا علیحدگی	۲۰۸
چند نکات	
۱ : مشکلات سے نجات اور تقویٰ	۲۱۱
۲ : روحِ توکل	۲۱۳
آیت ۴ تا ۷	۲۱۵
مطلقہ عورتوں کے احکام اور ان کے حقوق	۲۱۷
چند نکات	
۱ : طلاقِ رجعی کے احکام	۲۲۲
۲ : خدا طاقت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتا۔	۲۲۳

عنوان	صفحہ
۳ : گھرانے کے نظام کی اہمیت	۲۲۳
آیت ۸ تا ۱۱	۲۲۵
سرکشوں کا دردناک انجام	۲۲۶
آیت ۱۲	۲۳۱
خلقتِ عالم کا مقصد معرفت ہے۔	۲۳۱
سورۂ تحریم	۲۳۵
سورۂ تحریم کے مضامین	۲۳۷
سورۂ تحریم کی تلاوت کی فضیلت	۲۳۷
آیت ۱ تا ۵	۲۳۹
شانِ نزول	۲۴۱
پیغمبرؐ کی بعض ازواج کی شدید سرزنش	۲۴۲
چند نکات	
۱ : اچھی بیوی کے اوصاف	۲۴۶
۲ : صالح مومنین سے کون مراد ہے ؟	۲۴۷
۳ : افشائے راز	۲۴۹
۴ : حلال خدا کو اپنے اوپر حرام نہیں کرنا چاہیے۔	۲۵۰
آیت ۶ تا ۸	۲۵۱
اپنے گھر والوں کو جہنم کی آگ سے بچاؤ	۲۵۲
چند نکات	
۱ : اہل خانہ کی تعلیم و تربیت	۲۵۷
۲ : توبہ رحمت کا ایک دروازہ ہے۔	۲۵۹
آیت ۹ تا ۱۲	۲۶۱
مومن اور کافر عورتوں کے نمونے	۲۶۲
سورۂ ملک	۲۶۹
سورۂ ملک کے مضامین	۲۷۱

عنوان	صفحہ
اس سورہ کی تلاوت کی فضیلت	۲۷۲
آیت ۱ تا ۵	۲۷۳
تم عالم ہستی میں کسی قسم کا نقص نہیں دیکھو گے	۲۷۴
ایک نکتہ	
عالم آفرینش کی عظمت	۲۸۰
آیت ۶ تا ۱۱	۲۸۲
اگر ہم سننے والے کان اور بیدار فکر رکھتے تو	
دوزخ میں نہ ہوتے۔	۲۸۳
ایک نکتہ	
عقل و خرد کی اونچی قدر و قیمت	۲۸۶
آیت ۱۲ تا ۱۴	۲۸۸
کیا جہاں کا خالق جہان کے اسرار سے آگاہ	
نہیں ہے؟	۲۸۸
آیت ۱۵ تا ۱۸	۲۹۱
کوئی مجرم اس کے عذاب و سزا سے امان	
میں نہیں ہے۔	۲۹۲
آیت ۱۹ تا ۲۱	۲۹۶
اپنے سر کے اوپر ان پرندوں کی طرف دیکھو	۲۹۷
ایک نکتہ	
انسان کی ناکامی کے چار عوامل	۳۰۰
آیت ۲۲ تا ۲۷	۳۰۱
شاہراہِ توحید کے راست قامت افراد	۳۰۲
آیت ۲۸ تا ۳۰	۳۰۷
جاری پانی تمھارے اختیار میں کون دیتا ہے؟	۳۰۸
ایک نکتہ	

عنوان	صفحہ
سورۂ قلم	۳۱۳
سورۂ قلم کے مضامین	۳۱۵
سورۂ قلم کی تلاوت کی فضیلت	۳۱۶
آیت ۱ تا ۷	۳۱۷
تیرے اخلاق کتنے عمدہ ہیں	۳۱۸
چند نکات	
۱: انسانی زندگی میں قلم کا نقش و اثر	۳۲۲
۲: پیغمبرؐ کے اخلاق کا ایک نمونہ	۳۲۶
آیت ۸ تا ۱۶	۳۳۰
ایسی صفات والوں کی پیروی نہ کرو	۳۳۱
چند نکات	
۱: اخلاقی رذائل	۳۳۵
۲: مداہنہ اور سازگاری	۳۳۶
آیت ۱۷ تا ۲۵	۳۳۸
باغ والوں کی عبرت انگیز داستان	۳۳۹
آیت ۲۶ تا ۳۳	۳۴۲
سرسبز باغ کے مالکوں کا دردناک انجام	۳۴۴
چند نکات	
۱: انحصار طلبی: ثروت مندوں کی بہت بڑی مصیبت	۳۴۸
۲: گناہ اور قطع رزق کے درمیان رابطہ	۳۴۹
آیت ۳۴ تا ۴۱	۳۵۰
مکمل بازپرس	۳۵۱
آیت ۴۲ تا ۴۵	۳۵۴
اس دن سجدہ کرنا چاہیں گے لیکن قادر نہ ہو سکیں گے۔	۳۵۵

عنوان	صفحہ
آیت ۴۶ تا ۵۰	۳۵۹
عذاب کا تقاضا کرنے میں جلدی نہ کرو	۳۶۰
آیت ۵۱ تا ۵۲	۳۶۴
وہ تجھے نابود کرنا چاہتے ہیں لیکن نہیں کر سکتے	۳۶۴
ایک نکتہ	
کیا نظرِ بد کی کوئی حقیقت ہے؟	۳۶۶
سورۂ حاقہ	۳۶۹
سورہ حاقہ کے مضامین	۳۷۱
اس سورہ کی تلاوت کی فضیلت	۳۷۱
آیت ۱ تا ۸	۳۷۳
سرکشی کرنے والی قوم کے لیے سرکش عذاب	۳۷۴
آیت ۹ تا ۱۲	۳۷۸
سننے والے کان کہاں ہیں؟	۳۷۸
چند نکات	
علیؑ کے فضائل میں سے ایک اور فضیلت	۳۸۱
گناہ اور سزا میں تناسب	۳۸۱
آیت ۱۳ تا ۱۷	۳۸۳
وہ دن جس میں وہ عظیم واقعہ رونما ہوگا	۳۸۴
آیت ۱۸ تا ۲۴	۳۸۸
اے اہلِ محشر میرا نامۂ اعمال پڑھو	۳۸۹
چند نکات	
۱: لفظِ عرش کی ایک اور تفسیر	۳۹۱
۲: علی اور ان کے شیعوں کا مقام	۳۹۲
۳: ایک سوال کا جواب	۳۹۲
آیت ۲۵ تا ۲۹	۳۹۴

عنوان	صفحہ
اے کاش مجھے موت آجاتی۔	۳۹۵
ایک نکتہ	
چند عبرت انگیز داستانیں	۳۹۶
آیت ۳۰ تا ۳۷	۳۹۹
اسے پکڑ کر زنجیروں میں جکڑ دو	۴۰۰
ایک نکتہ	
حروفِ قرآن پر اعراب لگانے کی ابتداء	۴۰۲
آیت ۳۸ تا ۴۲	۴۰۵
یہ قرآن یقیناً خدا کا کلام ہے۔	۴۰۶
آیت ۴۳ تا ۵۲	۴۱۰
اگر وہ ہم پر جھوٹ باندھتا تو ہم اسے مہلت نہ دیتے	۴۱۱
ایک نکتہ	۴۱۵

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

مقدمہ جلد ۲۴

دو متضاد چہرے

گذشتہ دنوں ہندوستان میں ایک کتاب، مذکورہ بالا عنوان (دو متضاد چہرے) کے تحت چھپی کہ جس کی ایک جلد ہمیں بھیجی گئی ہے۔ اس کتاب کے مؤلف (آقائے ابوالحسن ندوی) نے یہ کوشش کی ہے کہ اسلام کے دو مختلف چہرے دو گروہوں "اہل سنت" اور "شیعہ" کے عقاید میں دکھائیں۔ یعنی عقاید شیعہ کو عقاید اہل سنت کے مقابلہ میں اور عقاید اہل سنت کو عقاید شیعہ کے مقابلہ میں منعکس کریں تاکہ اس طرح سے ایک کو "اصل اسلام" اور دوسرے کو "انحرافی اسلام" ظاہر کر کے موجودہ زمانہ میں اختلاف کی آگ بھڑکائیں جبکہ ہمیں ہمیشہ سے زیادہ اتحاد کی ضرورت ہے۔

افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ — عادت کے مطابق — انھوں نے ہر جگہ شیعہ کے تعارف میں غلط پروپیگنڈے، شاذ و ضعیف روایات اور کمزور مدارک پر تکیہ کیا ہے۔

اس کتاب کا ایک باب کہ جو قرآن اور اس کی تفسیر کے ساتھ مربوط ہے، ذیل میں اس کا ترجمہ پیش کیا جاتا ہے:۔

مؤلف کہتے ہیں:۔

"شیعہ قرآن کے بارے میں بہت کم اعتنا کرتے ہیں! اور یہ ان کے قرآن کے بارے میں (اس کے اصل نہ ہونے) کے عقیدہ اور رائے کی وجہ سے ہے! وہ قرآن کو کوئی اہمیت نہیں دیتے اور عمل میں اس سے کوئی رابطہ نہیں رکھتے۔ یہی قرآن مجید جسے امت محمدیہ مشرق و مغرب اور شمال و جنوب میں پڑھتی ہے جس کے حفاظ کی تعداد لاکھوں سے زیادہ ہے ... اور وہ ماہ رمضان میں ایک یا دو مرتبہ ختم قرآن کرتے ہیں۔ اس کے مقابل یہ قول مشہور ہے کہ شیعوں میں کوئی حافظ قرآن نہیں ہوتا، اور یہ صورت ان کے قرآن کی صحت و اصالت میں شک کی بناء پر ہے۔ یہ وہ بات ہے کہ جسے میں نے سال ۱۹۷۳ء (۱۳۹۳ھ) میں اپنے سفر ایران کے موقع پر خود دیکھا ہے۔ اسی وجہ سے شیعہ کتب خانوں میں قرآن کی ندرت اور اس سے مربوط موضوعات کے بارے میں کچھ زیادہ آثار دکھائی نہیں دیتے، جبکہ دوسرے اسلامی ملکوں کے کتب خانے قرآن مجید سے مربوط تالیفات سے بھرے پڑے ہیں"۔

آپ نے یہ عجیب و غریب اتہامات سن لیے، اب ذیل کی توضیحات کی طرف توجہ فرمائیے:۔

یہاں چند نکات خاص توجہ کے لائق ہیں:۔

۱: یہی مؤلف (ہاں — یہی مؤلف) جب آج سے چودہ سال پیشتر ایک وفد کے ہمراہ ہمارے ملک ایران آئے تو انھوں نے اپنے اس سفر کے حالات اپنی ایک کتاب "ایمی یا ایران" (اے ایران سن!) میں نشر کیے تھے۔ اس میں انھوں نے قرآن اور جو کچھ قرآن مجید سے مربوط ہے" اس کے بارے میں ایران کے مسلمانوں کے درمیان اس کے احترام اور اہمیت کے متعلق ایک قابل ملاحظہ باب تحریر کیا تھا — یہاں اس کے ایک جزء کا ترجمہ پیش کیا جاتا ہے:۔

"ہمارے ایرانی بھائی بلاشک وشبہ قرآن کو دوست رکھتے ہیں، اس کا احترام کرتے ہیں اور اس کی طرف بہت توجہ دیتے ہیں اس کا اثر ان کے قرآن کریم کو بہترین خط اور نقش ونگار سے لکھنے میں قدیم ترین ایام سے نمایاں ہے۔ وہ قرآن کے ان نفیس اور خوبصورت نسخوں کو اپنے "کتابخانوں" اور عجائب گھروں میں محفوظ رکھتے اور اس پر فخر کرتے ہیں۔"

"خاص طور پر ایران میں ایک قرآن مجید اتنا عمدہ اور خوبصورتی کے ساتھ چھپا ہے، جو دوسرے ملکوں کے مطبوعہ قرآنی نسخوں سے کسی بھی طرح کم نہیں ہے۔ ایران کے بہت سے گذشتہ علماء اور محدثین نے قرآن کی تفسیر کی ہے۔ اور ان کی بہت سی اہم کتابیں یادگار کے طور پر باقی ہیں، ان میں سے تفسیر کی متعدد کتابیں ہندوستان اور دوسرے ممالک میں نظر سے گزری ہیں لیکن پھر بھی میرا خیال ہے کہ اس طرف کچھ زیادہ توجہ کی ضرورت ہے۔"

یہ شہادت تو چودہ سال پہلے کی ہے اور ان کی حالیہ کتاب "دو متضاد چہرے" اب سے دو سال پہلے لکھی گئی ہے۔ شاید یہ مؤلف اس بات کو بھول گئے کہ وہ اس موضوع پر پہلے بھی لکھ چکے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے اس قسم کے اختلاف کی طرف قدم بڑھایا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ ایک مدت تک مجھے یقین ہی نہیں آیا کہ کتاب "دو متضاد چہرے" اسی مؤلف کی ہوگی، تاہم میں بہت ہی غور وخوض اور وسواس کے ساتھ مؤلف کا نام دونوں کتابوں کی پشت پر دیکھا کرتا تھا۔ لیکن ظاہر تھا کہ دونوں کے مؤلف ایک ہی صاحب ہیں۔

کیا اس تھوڑی سی مدت میں ایران میں کوئی دگرگونی اور ایک سریع پسماندگی آگئی ہے؟ جبکہ سب لوگوں کو معلوم ہے کہ جمہوری اسلامی انقلاب کے بعد اور بھی زیادہ وسیع سطح پر قرآن کی نشر واشاعت ہوئی ہے۔ ایک مخصوص پروگرام "صدائے قرآن" کے نام سے چل رہا ہے نیز حفظِ قرآن یا تجوید قرآن کے کئی ایک مدارس شروع ہوگئے ہیں اور عام تعلیمی مدارس میں بھی قرآن پہلے سے زیادہ پڑھایا جانے لگا ہے۔ علاوہ ازیں تلاوت اور تجوید قرآن کے بہت سے مقابلے منعقد ہوئے اور ان میں سے بہت سے مقابلوں میں جو عالمی سطح پر ہوئے ایرانی قاری یا تو اول آئے ہیں یا اول آنے والوں کے ہمدوش رہے ہیں۔

تمام حکومتی اور غیر حکومتی جلسوں کی ابتداء آیاتِ قرآن کی تلاوت سے ہوتی ہے (یعنی وہ عمل جو کسی اسلامی ملک میں اتنی وسعت کے ساتھ نہیں ہو رہا ہے۔)

ان حالات میں جبکہ قرآن اس ملک کے لوگوں کی سراسر زندگی میں رسمی طور پر رچا بسا ہوا ہے، ان مؤلف صاحب کو کیسے جرأت ہوئی ہے کہ وہ اس ملک کے رہنے والے لوگوں کو قرآن سے بے اعتنا اور بیگانہ کہنے لگے۔

کیا ہمیں یہ حق نہیں ہے کہ ہم یہ خیال کریں کہ یہ سارے کے سارے اتہامات اور یہ ناروا حملے جو مکمل طور پر حقیقت سے دور ہیں، اسلام کے کے مشترک دشمنوں اور انقلابِ اسلامی کے مخالفین کی تحریک پر کیے گئے ہیں۔ جیسا کہ سب کو معلوم ہے ان کارگزاریوں کے اخراجات ان حکومتوں کی طرف سے مہیا ہوتے ہیں جو اسلام اور انقلابِ اسلامی کے دشمنوں کے ساتھ ہمکاری کرنے میں متہم ہیں۔

اگر یہ بات کسی عام آدمی سے صادر ہوئی ہوتی تو اسے بے اطلاعی اور ناآگاہی پر محمول کیا جا سکتا تھا، لیکن یہ بات وہ صاحب کہہ رہے ہیں جو بہت مشہور ومعروف ہیں اور ہزاروں طلبہ ان کے زیرِ تربیت ہیں۔ پھر وہ خود ایران آچکے ہیں، اور ان کے اپنے اعتراف کے مطابق انھوں نے قرآن کے بارے میں شیعان ایران کے اہتمام کو دیکھا اور محسوس کیا ہے۔ لہٰذا مؤلف موصوف کا یہ قول کسی طرح بھی قابلِ توجیہ اور لائقِ معافی نہیں ہے۔

اسی واقعہ سے ان تمام کتابوں کا جواب مل سکتا ہے جو شیعوں کے خلاف (خصوصاً قرآن کے بارے میں) لکھی گئی ہیں، نیز وہ تمام زہر سے بھری ہوئی کتابیں کہ جو آخری دنوں میں "انقلابِ اسلامی کے بعد" کثرت" و "سرعت" سے متحدہ اور پروہابیوں کے سرمایہ اور سامراجیوں کی تحریک سے ہر جگہ پھیلائی جارہی ہیں۔

۲ : ہم دُور نہیں جاتے، شیعوں میں اور خاص طور پر ایران کے شیعوں کے درمیان قرآن کی اہمیت، اُن کے کتب خانوں کے انواع واقسام کے نسخہ ہائے قرآن سے پُر ہونے، تمام جلسوں میں اس کی تلاوت، حفظ وتجوید کے مدارس اور فارسی وعربی اور دوسری زبانوں میں کئی قسم کی تفاسیر سے باخبر ہونے کے لیے اتنا ہی کافی ہے کہ یہ مؤلف یا جو شخص بھی حقیقت معلوم کرنا چاہے وہ ایران کا سفر کرے اور یہاں کے عجائب خانوں، کتب خانوں، دینی مدارس، مدارس عمومی، حوزہائے علمی اور مراکزِ حفظ وتجوید کی طرف رجوع کرے اور انھیں نزدیک سے دیکھے۔

مؤلف موصوف اکیلے ہی اکیلے قاضی کے پاس کیوں جاتے ہیں اور اپنے دل کو داستانوں اور افسانوں کے ذریعے کیوں خوش کرتے ہیں؟ نیز "علامہ امینی مرحوم" کے قول کے مطابق اگر شیعہ گذشتہ ادوار کی ایک جمعیت ہوتے اور آج سوائے کتب تاریخ کے ان کا کوئی نام ونشان معلوم نہ ہوتا تو پھر اس قسم کے اتہامات ممکن تھے۔ لیکن آنجا کہ عیاں است چہ حاجت بہ بیاں است؟ یہ بھائی دشمن کے ہاتھ کا آلہ کیوں بنے ہُوئے ہیں، اور ان عجیب اور نفاق ڈالنے والے اتہامات کے ساتھ دشمنانِ اسلام کی مدد کیوں کرتے ہیں؟

یہی تفسیرِ نمونہ' جو فارسی زبان کی تفاسیر میں سے ایک ہے ہمارے ملک میں اس کی نشر واشاعت ہُوئی ہے کہ اس کی بعض جلدیں بیس سے زیادہ مرتبہ اور ہر مرتبہ پہلے سے زیادہ تعداد میں چھپی اور نشر ہُوئی ہیں، اور اسی طرح دوسری تفاسیر اور قرآنی آثار بھی طبع ونشر ہوتے رہتے ہیں۔

۳ : ہم جانتے ہیں کہ قرآن کے الفاظ کی تلاوت اس پر عمل کرنے کے لیے ایک مقدمہ ہے۔ خدا کے لیے آپ خود ہی فیصلہ کریں کہ وہ ممالک جن پر ابوالحسن ندوی ناز کر رہے ہیں مثلاً مصر اور دوسرے بظاہر اسلامی ممالک میں احکام قرآن پر کس قدر عمل ہو رہا ہے؟ وہاں کے مراکز فساد، شراب وقمار، عورتوں کی برہنگی اور ان کا بے قید وبند ہونا، آلاتِ لہو ولعب اور سُود خوری کی وضع وکیفیت اور سب سے بدتر اجانب اور بیگانوں کا تسلط اور ان کے تمدن کے منفی پہلوؤں کو کس قدر اپنایا جاتا ہے اور کس قدر ان کی تقلید کی جاتی ہے۔

کیا ہی اچھا ہوتا کہ وہ کم از کم ان کے مطبوعات اور ریڈیو وٹیلیویژن کے پروگراموں کا ایران کے مطبوعات اور اجتماعی ذرائع ابلاغ کا مقابلہ کرلیتے تو انھیں معلوم ہو جاتا کہ قرآن اور اسکی حیات بخش آیات پر کہاں عمل ہو رہا ہے اور کہاں عمل نہیں ہو رہا؟

۴ : شیعہ عقیدہ پر "تحریفِ قرآن" کی تہمت ایک قدیمی انحرافی داستان ہے کہ جس کی محققین اور علماءِ شیعہ کی طرف سے سینکڑوں بار نفی کی گئی ہے پھر بلند آواز کے ساتھ ہر جگہ یہ مطلب بیان کیا گیا ہے کہ قرآن مجید جو اس وقت ہمارے درمیان ہے ایک ذرہ برابر کم وکاست کے بغیر بعینہٖ وہی ہے جو پیغمبرؐ کے زمانہ میں تھا۔

اگر انھوں نے بعض ایسی ضعیف روایات شیعہ کتب میں دیکھیں جو تحریف پر دلالت کرتی ہیں تو انھیں معلوم ہونا چاہیے کہ ان ہی روایات کے مانند، برادرانِ اہلِ سُنّت کی کتابوں، یہانتک کہ ان کی معتبر کتاب حدیث "صحیح بخاری" میں بھی بکثرت روایات موجود ہیں کہ جن کو علامہ بزرگوار شرف الدین نے کتاب "اجوبة مسائل جار الله" میں (ان کے حوالوں کے ساتھ) جمع کیا ہے۔

ہاں! نہ تو وہ نہ ہی ہم شاذ وضعیف روایات کو کوئی وقعت دیتے ہیں، پس اس تہمت پر یہ اتنا اصرار کہاں سے ہو رہا ہے؟ اور یہ کب تک جاری رہے گا؟ یقیناً اُس وقت تک کہ ہم خوابِ غفلت سے بیدار نہ ہو جائیں اور تفرقہ ڈالنے والے دشمن کے ہاتھ میں آلہ کار نہ بنیں۔

خداوند عالم ہمیں اور تمہیں اس راہ کی ہدایت کرے جس میں اسلام اور مسلمانوں کی صلاح وسعادت ہے ۔

ناصر مکارم شیرازی

حوزۂ علمیہ ـــــ قم (ایران)

۵ ۔ ۱ ۔ ۱۳۶۶

جلد ۲۴

تفسیرِ نمُونہ

- ممتحنہ
- صف
- جمعہ
- منافقون
- تغابن
- طلاق
- تحریم
- مُلک
- قلم
- حاقہ

سُورۂ مُمتَحِنَہ

یہ سورہ مدینہ میں نازل ہُوا اور اس کی ۱۳ آیات ہیں

آغاز
اول ماہ مبارک رمضان سنہ ۱۴۰۶ھ
بمطابق ۲۱، ۲، ۱۳۶۵ شمسی

سُورۂ مُمتحنہ کے مضامین

حقیقت میں اس سُورہ کے دو حصّے ہیں :۔

پہلے حصّے میں "حب فی اللہ" اور "بغض فی اللہ" کے مسئلہ اور مُشرکین سے دوستی کرنے سے ممانعت کا بیان ہے ، مسلمانوں کو خُدا کے عظیم پیغمبرؐ سے ہدایت حاصل کرنے کی دعوت دی گئی ہے اور اسی سلسلہ میں کچھ اور خصوصیات کا بیان ہے۔

یہ مضمون جس طرح سورۃ کی ابتداء میں آیا ہے اسی طرح سورۃ کے اختتام پر بھی اس کی تکرار اور تائید ہوئی ہے۔

دوسرے حصّے میں : مہاجر عورتوں، ان کی آزمائش اور امتحان اور اسی سے مربوط کچھ احکام سے بحث کی گئی ہے۔ اس سورہ کے لیئے "ممتحنہ" کے نام کا انتخاب بھی اسی امتحان کے مسئلہ کی وجہ سے ہے جو آیت ۱۰ میں آیا ہے[1]

اس سورہ کے لیے ایک اور نام بھی بیان کیا گیا ہے اور وہ سورہ مودّت ہے کہ جو اس سورۃ کی پہلی آیت میں مُشرکین سے مودّت کرنے سے منع کرنے کی وجہ سے ہے۔

سُورۂ ممتحنہ کی تلاوت کی فضیلت

رسولِ خُداؐ سے ایک حدیث میں آیا ہے :۔

من قرء سورة الممتحنة كان المؤمنون والمؤمنات له شفعاء يوم القيامة۔

"جو شخص سُورۃ ممتحنہ کی تلاوت کرے گا، تمام مومنین و مومنات قیامت کے دن اس کے شفیع ہوں گے۔"[2]

---

[1] بعض نے اس کو ممتحنہ (حاء کی فتح کے ساتھ) پڑھا ہے۔ مہاجر خواتین کے لحاظ سے جن کا امتحان لیا جاتا تھا اور بعض نے ممتحنہ (حاء کی زیر کے ساتھ) پڑھا ہے، کیونکہ یہ سورۃ خود امتحان کا ایک ذریعہ ہے۔

[2] مجمع البیان جلد ۹ ص ۲۶۷

ایک اور حدیث میں امام علی بن الحسینؑ سے آیا ہے :

من قرء سورة الممتحنة فی فرائضه ونوافله امتحن الله قلبه للایمان و نور له بصره ولا یصیبه فقر ابدًا ،ولا جنون فی بدنه ، ولا فی ولده

جو شخص سورۂ ممتحنہ کو واجب اور مستحب نمازوں میں پڑھے گا، خدا اس کے دل کو ایمان کے لیے خالص اور آمادہ کر دے گا۔ اور اُسے نورِ بصیرت عطا کرے گا اور ہرگز اُسے فقر و فاقہ دامن گیر نہ ہوگا اور وہ خود اور اس کی اولاد جنوں میں گرفتار نہ ہوگی۔

یہ بات کہے بغیر واضح ہے کہ یہ تمام فضیلتیں اور اعزاز اس شخص کے لیے ہیں جو اس سورہ کی آیات پر "حب فی اللہ" "بغض فی اللہ" اور راہِ خدا میں جہاد کرنے کے سلسلہ میں اس کے مضمون پر کاربند ہونے کے لیے توجہ دے گا اور صرف بے روح تلاوت اور علم و عمل کے بغیر پڑھنے پر اکتفا نہیں کرے گا۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

① یٰۤاَیُّهَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا لَا تَتَّخِذُوۡا عَدُوِّیۡ وَ
عَدُوَّكُمۡ اَوۡلِیَآءَ تُلۡقُوۡنَ اِلَیۡهِمۡ بِالۡمَوَدَّةِ وَقَدۡ
كَفَرُوۡا بِمَا جَآءَكُمۡ مِّنَ الۡحَقِّ ۚ یُخۡرِجُوۡنَ الرَّسُوۡلَ
وَ اِیَّاكُمۡ اَنۡ تُؤۡمِنُوۡا بِاللّٰهِ رَبِّكُمۡ ؕ اِنۡ كُنۡتُمۡ خَرَجۡتُمۡ
جِهَادًا فِیۡ سَبِیۡلِیۡ وَابۡتِغَآءَ مَرۡضَاتِیۡ ۚ تُسِرُّوۡنَ
اِلَیۡهِمۡ بِالۡمَوَدَّةِ ۚ وَ اَنَا اَعۡلَمُ بِمَاۤ اَخۡفَیۡتُمۡ وَمَاۤ
اَعۡلَنۡتُمۡ ؕ وَ مَنۡ یَّفۡعَلۡهُ مِنۡكُمۡ فَقَدۡ ضَلَّ سَوَآءَ السَّبِیۡلِ ۝

② اِنۡ یَّثۡقَفُوۡكُمۡ یَكُوۡنُوۡا لَكُمۡ اَعۡدَآءً وَّیَبۡسُطُوۡۤا اِلَیۡكُمۡ
اَیۡدِیَهُمۡ وَ اَلۡسِنَتَهُمۡ بِالسُّوۡٓءِ وَوَدُّوۡا لَوۡ تَكۡفُرُوۡنَ ۝

③ لَنۡ تَنۡفَعَكُمۡ اَرۡحَامُكُمۡ وَلَاۤ اَوۡلَادُكُمۡ ۚ یَوۡمَ
الۡقِیٰمَةِ ۚ یَفۡصِلُ بَیۡنَكُمۡ ؕ وَاللّٰهُ بِمَا تَعۡمَلُوۡنَ بَصِیۡرٌ ۝

ترجمہ

رحمٰن و رحیم خدا کے نام سے

① اے ایمان لانے والو! تم میرے دشمن اور اپنے دشمن کو اپنا دوست نہ بناؤ۔ تم ان کے لیے محبت کا اظہار کرتے ہو، حالانکہ جو حق تمھارے پاس آیا ہے وہ اس سے کافر ہو گئے ہیں۔ وہ

رسولِ خدا ؐ کو اور تمھیں اس وجہ سے تمھارے شہر سے نکالتے ہیں کہ تم اپنے پروردگار خدا پر ایمان لائے ہو۔ اگر تم نے میری راہ میں جہاد کرنے اور میری خوشنودی حاصل کرنے کے لیے ہجرت کی ہے تو تم اُن سے دوستی کا رشتہ قائم نہ کرو، تم مخفی طور پر ان سے دوستی کا رابطہ قائم کر رہے ہو حالانکہ جو کچھ تم پنہاں و آشکارا کرتے ہو میں اس سے اچھی طرح آگاہ ہوں، اور تم میں سے جو بھی یہ کام کرے وہ راہِ راست سے گمراہ ہو گیا ہے۔

② اگر وہ تم پر مُسلّط ہو جائیں تو وہ تم سے دشمنی ہی کریں گے اور تمھارے ساتھ اپنے ہاتھ اور زبان سے بدی ہی کریں گے اور تمھیں کفر کی طرف پلٹانے کی کوشش کریں گے۔

③ تمھارے عزیز و اقربا اور تمھاری اولاد تمھیں ہرگز کوئی نفع نہیں دیں گے۔ وہ قیامت کے دن تمھارے درمیان جُدائی ڈال دے گا اور جو کچھ تم کرتے ہو خُدا اُسے دیکھ رہا ہے۔

شانِ نزول

اکثر مفسرین نے تصریح کی ہے کہ یہ آیات (یا پہلی آیت) "حاطب بن ابی بلتعہ" کے بارے میں نازل ہوئی ہیں (البتہ مختصر سے فرق کے ساتھ) مرحوم طبرسی نے جو کچھ مجمع البیان میں ذکر کیا ہے ہم اُسے ذیل میں بیان کرتے ہیں:۔

واقعہ یہ ہوا کہ ایک عورت جس کا نام "سارہ" تھا اور وہ مکّہ کے کسی قبیلہ سے تعلق رکھتی تھی، مکّہ سے مدینہ میں پیغمبر ؐ کی خدمت میں حاضر ہوئی۔ پیغمبر ؐ نے اُس سے فرمایا:۔ کیا تو مُسلمان ہو کر آئی ہے؟ اُس نے عرض کیا:۔ نہیں! آپ نے فرمایا: کیا تو مہاجرت کے عنوان سے آئی ہے؟ اُس نے کہا: نہیں!

آپ نے فرمایا: پھر تو کیوں آئی ہے؟ اُس نے عرض کیا: آپ ہماری اصل اور عشیرہ و قبیلہ تھے۔ میرے سارے کے سارے سرپرست چل دیے ہیں اور میں سخت محتاج ہو گئی ہوں میں اِس لیے آپ کے پاس آئی ہوں تاکہ آپ مجھے کچھ عطا کریں اور لباس اور سواری سے نوازیں۔

آپ نے فرمایا: مکّہ کے جوان کہاں چلے گئے؟ (یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ وہ عورت گانے والی تھی اور جوانوں کے لیے گانے گایا کرتی تھی۔)

اُس نے کہا: جنگِ بدر کے بعد کسی نے مجھ سے گانے کی خواہش نہیں کی۔ (اس سے پتہ چلتا ہے کہ جنگِ بدر کی ضرب مُشرکینِ مکّہ پر کتنی سخت تھی۔)

آنحضرتؐ نے اولاد عبدالمطلب کو حکم دیا تو اُنھوں نے اُسے لباس، سواری اور زاد راہ دیا، یہ اس موقع کی بات ہے جب آپ فتح مکہ کے لیے تیاری کر رہے تھے۔

اس موقعہ پر "حاطب بن ابی بلتعہ" (ایک مشہور مسلمان جو جنگِ بدر و بیعت رضوان میں شریک تھا) "سارہ" کے پاس آیا اُس نے ایک خط لکھ کر اُسے دیا اور کہا: یہ اہل مکہ کو دے دینا۔ اُس نے دس دینار اور بقولے دس درہم اُسے دیے اور ایک یمنی کپڑا بھی اُسے دیا۔

"حاطب" نے اہلِ مکہ کو خط میں یہ لکھا تھا کہ رسولِ خدا تمھاری طرف آنے کی تیاری کر رہے ہیں، لہٰذا تم اپنے دفاع کے لیے تیار رہو۔" سارہ نے خط لیا اور مدینہ سے مکہ کی طرف چل پڑی۔

جبرئیل نے اس واقعہ کی اطلاع پیغمبرؐ کو پہنچائی۔ رسولِ خدا نے علی و عمار و عمرو زبیر و طلحہ و مقداد و ابو مرثد کو حکم دیا کہ وہ سوار ہو کر مکہ کی طرف جائیں۔ اُن سے یہ بھی فرمایا کہ تمھیں راستہ کے درمیان ایک منزل پر ایک عورت "سارہ" نامی ملے گی، جو مشرکین مکہ کے لیے "حاطب" کا ایک خط لے کر جا رہی ہے تم اُس سے وہ خط لے لو۔

وہ وہاں سے چل پڑے اور اسی جگہ اس تک جا پہنچے جہاں رسولِ خدا نے فرمایا تھا۔ اُس نے قسم کھائی کہ اُس کے پاس کوئی خط نہیں ہے۔ اُنھوں نے اُس کے سامانِ سفر کی تلاشی لی، لیکن انھیں کوئی چیز نہیں ملی، اور سب نے واپسی کا ارادہ کر لیا۔ لیکن علیؑ نے فرمایا: نہ تو ہمارے پیغمبرؐ نے جھوٹ کہا ہے، اور نہ ہم جھوٹ بول رہے ہیں، آپ نے تلوار سونت لی اور فرمایا: خط نکالو ورنہ خدا کی قسم! میں تمھاری گردن اُڑا دوں گا۔ "سارہ" نے جب مسئلہ کی حقیقت کو سمجھ لیا تو خط جو اُس نے اپنے گیسوؤں میں چھپایا ہوا تھا باہر نکالا اور وہ لوگ اس خط کو لے کر پیغمبرؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔

آنحضرتؐ نے کسی کو بھیج کر "حاطب" کو بُلوایا اور فرمایا: یہ خط پہچانتے ہو؟ اس نے عرض کیا: جی ہاں! آپ نے فرمایا: تم نے یہ کام کس لیے کیا ہے؟

اُس نے عرض کیا: یا رسول اللہؐ! خدا کی قسم۔ جس دن سے میں نے اسلام قبول کیا ہے، ایک لمحہ کے لیے کافر نہیں ہوا اور کبھی بھی آپ سے خیانت نہیں کی ہے۔ جب سے میں مشرکین سے جُدا ہوا ہوں کبھی ان کی دعوت قبول نہیں کی، لیکن مسئلہ یہ ہے کہ کبھی مہاجرین کے کچھ لوگ مکہ میں ہیں جو مشرکین کے مقابلے میں ان کے گھر والوں کی حمایت کرتے ہیں۔ مگر میں اُن کے درمیان اجنبی ہوں اور میرے گھر والے ان کے چنگل میں گرفتار ہیں۔ میں نے چاہا کہ اس طرح سے اپنا ایک حق اُن کی گردن پر رکھ دوں تاکہ وہ میرے گھر والوں کو کوئی تکلیف نہ پہنچائیں، حالانکہ میں جانتا ہوں کہ آخرکار خدا انھیں شکست دے گا اور میرا خط انھیں کوئی فائدہ نہیں پہنچائے گا۔

پیغمبرؐ نے اس کا عذر قبول کر لیا، لیکن عمر بن خطاب نے کھڑے ہو کر کہا: یا رسول اللہؐ! مجھے اجازت دیجئے کہ میں اس منافق کی گردن اُڑا دوں۔

پیغمبرؐ نے فرمایا: یہ بدر کے غازیوں میں سے ہے اور خدا ان پر ایک خاص نظرِ کرم رکھتا ہے۔ (اس موقعہ پر اوپر والی آیات نازل ہوئیں اور ان میں مسلمانوں کو مشرکین اور دشمنانِ خدا سے ہر قسم کی دوستی ترک کرنے کے سلسلے میں اہم

درس دیے گئے ہیں[1]

تفسیر

خدا سے دوستی کرنے کا انجام

جیسا کہ ہم شانِ نزول کے ذیل میں بیان کر چکے ہیں ایک مسلمان سے ایک حرکت صادر ہوئی جو اگرچہ جاسوسی کے ارادہ سے نہیں تھی لیکن دشمنانِ اسلام سے اظہارِ محبت شمار ہوتی تھی۔ لہٰذا اوپر والی آیات نازل ہوئیں اور مسلمانوں کو یہ تنبیہ کی گئی کہ آئندہ اس قسم کے کاموں سے پرہیز کریں[2]۔

پہلے فرماتا ہے: اے ایمان لانے والو! تم میرے اور اپنے دشمن کو دوست نہ بناؤ (یاایها الذین آمنوا لا تتخذوا عدوی و عدوکم اولیاء)۔

یعنی وہ صرف خدا ہی کے دشمن نہیں بلکہ وہ تم سے بھی دشمنی رکھتے ہیں۔ لہٰذا ان حالات میں تم ان کی طرف دوستی کا ہاتھ کس طرح بڑھاتے ہو؟

اس کے بعد مزید کہتا ہے: تم ان کے لیے محبت کا اظہار کرتے ہو، حالانکہ وہ اس حق (اسلام و قرآن) سے جو تمھارے لیے آیا ہے کافر ہو گئے ہیں۔ وہ رسولِ خدا کو اور تمھیں، تمھارے شہر و دیار سے اس وجہ سے باہر نکالتے ہیں کہ تم اپنے پروردگار خدا پر ایمان لائے ہو۔ (تلقون الیهم بالمودة وقد کفروا بما جاءکم من الحق یخرجون الرسول و ایاکم ان تؤمنوا بالله ربکم)[3]

وہ عقیدہ میں بھی تمھارے مخالف ہیں اور عملی طور پر جنگ کے لیے کھڑے ہیں۔ اس کام کو جو تمھارے لیے عظیم ترین اعزاز و افتخار ہے۔ یعنی پروردگار پر ایمان، اسے انھوں نے تمھارے لیے بہت ہی بڑا گناہ شمار کیا ہے اور اسی وجہ سے انھوں نے تمھیں تمھارے شہر و دیار سے نکالا ہے۔ ان حالات میں کیا اس بات کی گنجائش ہے کہ تم ان کے لیے محبت کا اظہار کرو اور سپاہِ اسلام کے قوی ہاتھوں سے ہونے والے عذابِ الٰہی کے خطرے سے ان کی نجات کے لیے کوشش کرو؟

اس کے بعد مزید وضاحت کے لیے اضافہ کرتا ہے: اگر تم نے راہِ جہاد میں جہاد کرنے اور میری خوشنودی کے حصول کے لیے ہجرت کی ہے تو تم ان سے دوستی کا رشتہ قائم نہ کرو (ان کنتم خرجتم جهادًا فی سبیلی وابتغاء مرضاتی)[4]

---

[1] "مجمع البیان" جلد ۹ ص ۲۶۹ (تھوڑی سی تلخیص کے ساتھ) اس شانِ نزول کو بخاری نے اپنی صحیح (جلد ۶ ص ۱۸۵، ۱۸۶) میں، فخر رازی نے اپنی تفسیر میں اور اسی طرح تفسیر "روح المعانی" و "روح البیان" و "فی ظلال" و "قرطبی" و "مراغی" وغیرہ نے تھوڑے تھوڑے فرق کے ساتھ نقل کیا ہے۔

[2] "تلقون الیهم بالمودة" کے جملہ کو "لا تتخذوا" کی ضمیر سے حال یا جملہ استینافیہ سمجھتے ہیں۔ (کشاف جلد ۴ ص ۵۱۲) اور "بالمودة" کی "باء" کو زائدہ اور تاکید کے لیے، جیسے (ولا تلقوا بایدکم الی التهلکة) ہے یا "سببیہ" ہے حذف مفعول کے ساتھ اور تقدیر میں اس طرح ہے۔ "تلقوا الیهم اخبار رسول الله بسبب المودة التی بینکم وبینهم" (وہی مدرک)

[3] مفسرین کی ایک جماعت یہ نظریہ رکھتی ہے کہ اس جملہ شرطیہ کی جزاء محذوف ہے کہ جس کا گذشتہ جملہ سے استفادہ ہوتا ہے۔ یہ تقدیر میں اس طرح ہے: (بقیہ اگلے صفحہ پر)

اگر واقعاً تم خدا کی دوستی کا دم بھرتے ہو، اسی کی خاطر تم نے اپنے شہر اور گھروں سے ہجرت کی ہے اور جہاد فی سبیل اللہ سے خدا کی رضا حاصل کرنا چاہتے ہو تو یہ بات دشمنانِ خدا کی دوستی کے ساتھ سازگار نہیں ہے۔

اس کے بعد مزید وضاحت کے لیے اضافہ کرتا ہے: "تم مخفی طور پر اُن سے دوستی کا رابطہ قائم کر رہے ہو۔ حالانکہ جو کچھ تم پنہاں و آشکارا کرتے ہو میں اس سے اچھی طرح آگاہ ہوں۔ (تسرّون الیھم بالمودۃ و انا اعلم بما اخفیتم وما اعلنتم)۔[1]

اس بناء پر خدا کے غیب و شہود کا عالم ہوتے ہوئے اخفاء کاری کا کیا فائدہ ہے۔

اس آیت کے آخر میں قاطع تہدید کے عنوان سے فرماتا ہے: "تم میں سے جو شخص بھی اس قسم کا کام کرے گا وہ سیدھے راستے سے منحرف اور گمراہ ہو جائے گا۔ (ومن یفعلہ منکم فقد ضلّ سواء السبیل)۔

وہ خدا کی معرفت کے راستہ سے بھی ہٹ گیا، کیونکہ اُس نے یہ گمان کر لیا کہ کوئی چیز خدا سے مخفی رہ جاتی ہے۔ وہ ایمان اخلاص اور تقویٰ کی راہ سے بھی ہٹ گیا۔ جبھی تو خدا کے دشمنوں سے دوستی کی بنیاد رکھی ہے۔ اس نے اپنی زندگی کی جڑوں پر بھی کلہاڑی ماری ہے کہ اپنے دشمن کو اپنے اسرار سے باخبر کر دیا ہے۔ یہ وہ بدترین انحراف ہے جو مومن آدمی کو سرچشمۂ ایمان تک پہنچنے کے بعد عارض ہو سکتا ہے۔

❊ ❊ ❊

بعد والی آیت میں مزید تاکید و توضیح کے لیے فرماتا ہے: "تم ان کے ساتھ دوستی کیوں کرتے ہو؟ حالانکہ اگر وہ تم پر مسلط ہو جائیں تو وہ تم سے دشمنی ہی کریں گے اور تمہارے ساتھ اپنے ہاتھ اور زبان سے بدی ہی کریں گے۔" (ان یثقفوکم یکونوا لکم اعداء ویبسطوا الیکم ایدیھم والسنتھم بالسوء)۔[2]

تم ان کے ساتھ ہمدردی کرتے ہو، حالانکہ وہ تمہارے اتنے پکے دشمن ہیں کہ اگر وہ تم پر مسلط ہو جائیں تو وہ کسی بھی کام میں کوئی فروگذاشت نہ کریں گے اور تمہیں اپنے ہاتھ اور زبان سے ہر قسم کا آزار اور تکلیف پہنچائیں گے۔ کیا ایسے لوگوں کے ساتھ ہمدردی کرنا مناسب ہے؟

سب سے بُری بات یہ ہے کہ "وہ یہ چاہتے ہیں کہ تمہیں اسلام سے کفر کی طرف پلٹا دیں" اور اپنے سب سے بڑے افتخار، یعنی گوہرِ ایمان کو کھو بیٹھو۔ (ودّوا لو تکفرون)۔

(بقیہ حاشیہ) "ان کنتم خرجتم جھادًا فی سبیلی و ابتغاء مرضاتی لا تتولوا اعدائی۔

[1] یہ ایک جملۂ استینافیہ ہے اور "ما اسررتم" کے بجائے "ما اخفیتم" کی تعبیر اس لحاظ سے ہے کہ اس سے زیادہ مبالغہ ظاہر ہوتا ہے۔ کیونکہ اخفاء پنہاں کاری سے زیادہ عمیق مرحلہ ہے۔ (تفسیر فخر رازی زیر بحث آیت کے ذیل میں)

[2] "یثقفوکم" "ثقف اور ثقافۃ" کے مادہ سے، کسی چیز کی تشخیص اور اس کے انجام دینے میں مہارت کے معنی میں ہے۔ اس لیے فرہنگ و تمدن یا کسی چیز پر ماہرانہ تسلط کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔

اور یہ واقعی ایک دردناک ترین ضرب ہے جو وہ تم پر لگانا چاہتے ہیں۔

آخری زیر بحث آیت میں "حاطب بن ابی بلتعہ" جیسے افراد کو جواب دیتا ہے۔ جب پیغمبرؐ نے اُس سے فرمایا تھا کہ تُو نے مسلمانوں کے اسرار مشرکین مکّہ کے پاس کیوں پہنچائے؟ تو اُس نے یہ جواب دیا تھا: میرے عزیز و اقارب مکّہ میں ہیں کہ جو کفّار کے ہاتھوں میں گرفتار ہیں۔ مجھے ڈر ہے کہ وہ انھیں آسیب پہنچائیں گے۔ اِس لیے میں نے چاہا کہ اِس طریقے سے اُن کی حفاظت کروں۔ خدا فرماتا ہے: تمھارے عزیز و اقرباء اور تمھاری اولاد ہرگز تمھیں کوئی فائدہ نہ پہنچائے گی۔ (لن تنفعکم ارحامکم ولا اولادکم)۔

کیونکہ اگر اولاد اور عزیز و اقارب بے ایمان ہوں تو وہ نہ اس دُنیا کے لیے عزّت و آبرُو اور سرمایہ ہوں گے، نہ ہی آخرت میں ذریعۂ نجات۔ پس مومن اُن کے لیے ایسے کام کیوں کریں جو خُدا کے غضب اور اُس کے اولیاء سے منقطع ہونے کا موجب ہوں۔

اس کے بعد مزید کہتا ہے: "خُدا قیامت کے دن تمھارے اور ان کے درمیان جُدائی ڈال دے گا۔" (یوم القیامۃ یفصل بینکم)۔ [1]

اہلِ ایمان جنّت کی طرف اور اہلِ کفر دوزخ کی طرف جائیں گے۔ یہ حقیقت میں اس بات کے لیے ایک دلیل ہے جو پہلے بیان کی گئی ہے۔ یعنی وہاں تم ایک دُوسرے سے جُدا ہو جاؤ گے اور تمام رشتے کُلّی طور پر منقطع ہو جائیں گے تو پھر وہ تمھیں کون سا نفع پہنچائیں گے؟

یہ آیت حقیقت میں اسی بات سے مُشابہ ہے جو سورۂ عبس کی آیہ ۳۴ تا ۳۶ میں بیان ہوئی کہ جس میں فرماتا ہے: یوم یفر المرء من اخیہ و امہ و ابیہ وصاحبتہ وبنیہ: "وہ دن دُور نہیں جس میں انسان اپنے بھائی، ماں، باپ، بیوی اور اولاد سے فرار کرے گا۔"

آیت کے آخر میں ایک دفعہ پھر سب کو خبردار کرتا ہے کہ "جو کچھ تم کرتے ہو خُدا اُسے دیکھ رہا ہے۔" (واللہ بما تعملون بصیر)۔

وہ تمھاری نیّتوں سے آگاہ ہے اور اُن اعمال سے بھی جو تم پوشیدہ طور پر انجام دیتے ہو۔ اگر کچھ موارد میں وہ تمھارے اسرار کو "حاطب بن ابی بلتعہ" کی طرح فاش نہیں کرتا تو وہ کچھ مصالح کی بناء پر ہے، نہ یہ کہ وہ واقف اور آگاہ نہیں ہے۔

حقیقت میں خُدا کا غیب و شہود اور ظاہر و پوشیدہ علم، انسان کی تربیت کے لیے ایک مؤثّر ذریعہ ہے کہ وہ ہر حالت میں خود کو اس کی بارگاہ کے سامنے سمجھے اور سارے جہان کو خُدا کے حضُور میں حاضر جانے۔ وہ اپنی گفتار و رفتار حتّٰی کہ اپنی نیّت کا بھی خیال رکھے۔ یہی چیز ہے جو ہم کہتے ہیں کہ خدا کی مکمّل معرفت تقویٰ کے ظہور کا سرچشمہ ہے۔

---

[1] بہت سے مفسّرین نے "یوم القیامۃ" کو یفصل کا متعلق سمجھا ہے۔ لیکن بعض اسے "لن تنفعکم" کے متعلق سمجھتے ہیں۔ تاہم دونوں کا نتیجہ قریب قریب ایک ہی ہے۔ اگرچہ پہلا معنی زیادہ مناسب نظر آتا ہے۔ یہ نکتہ بھی قابلِ توجہ ہے کہ بعض "یفصل" کی تفسیر جُدائی ڈالنے کے معنی میں نہیں کرتے بلکہ فصل کو قضاوت اور فیصلہ کرنے کے معنی میں جانتے ہیں۔ لیکن یہاں پہلا معنی زیادہ صحیح نظر آتا ہے۔

④ قَدْ كَانَتْ لَكُمْ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ فِي إِبْرَاهِيمَ وَالَّذِينَ مَعَهُ ۚ إِذْ قَالُوا لِقَوْمِهِمْ إِنَّا بُرَآءُ مِنْكُمْ وَمِمَّا تَعْبُدُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ كَفَرْنَا بِكُمْ وَبَدَا بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةُ وَالْبَغْضَاءُ أَبَدًا حَتَّىٰ تُؤْمِنُوا بِاللَّهِ وَحْدَهُ إِلَّا قَوْلَ إِبْرَاهِيمَ لِأَبِيهِ لَأَسْتَغْفِرَنَّ لَكَ وَمَا أَمْلِكُ لَكَ مِنَ اللَّهِ مِنْ شَيْءٍ ۖ رَبَّنَا عَلَيْكَ تَوَكَّلْنَا وَإِلَيْكَ أَنَبْنَا وَإِلَيْكَ الْمَصِيرُ ۝

⑤ رَبَّنَا لَا تَجْعَلْنَا فِتْنَةً لِلَّذِينَ كَفَرُوا وَاغْفِرْ لَنَا رَبَّنَا ۚ إِنَّكَ أَنْتَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ ۝

⑥ لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيهِمْ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِمَنْ كَانَ يَرْجُو اللَّهَ وَالْيَوْمَ الْآخِرَ ۚ وَمَنْ يَتَوَلَّ فَإِنَّ اللَّهَ هُوَ الْغَنِيُّ الْحَمِيدُ ۝

ترجمہ

④ تمھارے لیے ابراہیمؑ اور ان کے ساتھیوں کی زندگی ایک اچھا نمونہ ہے۔ جب انھوں نے اپنی مشرک قوم سے کہا: ہم تم سے اور جنکی تم اللہ کے سوا پرستش کرتے ہو، ان سے بھی بیزار ہیں۔ ہمارا تم سے کوئی واسطہ نہیں ہے۔ اور ہمارے تمھارے درمیان ہمیشہ ہمیشہ کی

دشمنی ہو چکی ہے اور یہ حالت اُس وقت تک جاری رہے گی حتّٰی کہ تم خُدائے یگانہ پر ایمان لاؤ سوائے اس بات کے جس کا ابراہیمؑ نے اپنے باپ (چچا) سے وعدہ کیا تھا کہ میں تیرے لیے طلبِ بخشش کروں گا، لیکن اس کے باوجود مَیں خُدا کے مُقابلہ میں تیرے لیے کسی چیز کا مالک نہیں ہُوں، پروردگارا! ہم نے تجھ پر ہی توکّل کیا ہے، تیری ہی طرف لَوٹے ہیں اور سب کی بازگشت تیری ہی طرف ہے۔

⑤ پروردگارا! ہمیں کافروں کے لیے گمراہی کا سبب قرار نہ دے اور ہمیں بخش دے، اے ہمارے پروردگار! بے شک تُو عزیز و حکیم ہے۔

⑥ ان کی زندگی میں تمھارے لیے ایک اچھا نمُونہ تھا، ان کے لیے جو خُدا اور روزِ قیامت پر ایمان رکھتے ہیں، اور جو شخص رُوگردانی کرے گا تو وہ خُود اپنے آپ کو ہی ضرر پہنچائے گا، کیونکہ خُدا تو بے نیاز ہے اور ہر قسم کی تعریف و ستائش کے قابل ہے۔

تفسیر

ابراھیم تم سب کے لیے نمونہ ھیں

چُونکہ قرآن مجید بہت سے موارد میں اپنی تعلیمات کی تکمیل کے لیے ایسے اہم نمونے جو جہانِ انسانیت میں موجُود ہیں، گواہ کے طور پر پیش کرتا ہے۔ اِس لیے زیرِ بحث آیات میں بھی دشمنانِ خُدا سے دوستی کرنے سے سختی کے ساتھ منع کرنے کے بعد، ابراہیمؑ اور اُن کے طریقۂ کار کے بارے میں ایک ایسے عظیم پیشوا کے عنوان سے جو تمام اقوام کے لیے اور خاص طور پر قومِ عرب کے لیے احترام کی نظروں سے دیکھے جاتے تھے، گفتگو کرتے ہُوئے فرماتا ہے: "تمھارے لیے ابراہیمؑ اور ان کے ساتھیوں کی زندگی میں اچھا نمُونہ ہے۔" (قد کانت لکم اسوة حسنة فی ابراھیم والذین معه)[1]

---

[1] مفسّرین نے اس جُملہ کی ترکیب میں کئی احتمال دیے ہیں، لیکن ظاہر یہ ہے کہ "اسوة حسنة" "کان" کا اسم اور "لکم" اس کی خبر ہے۔ اور "فی ابراھیم" "اسوة حسنة" کا متعلق ہے۔ ضمنی طور پر اس بات کی طرف توجّہ کرنا چاہیئے کہ "اسوة" تاسی اور پیروی کے معنی میں کبھی تو اچھے

(باقی اگلے صفحہ پر)

ابراہیمؑ پیغمبروں کے بزرگ تھے۔ ان کی زندگی سرتاسر خدا کی عبودیت، جہاد فی سبیل اللہ اور اس کی پاک ذات کے عشق کے لیے ایک سبق تھی۔ وہ ابراہیمؑ کہ اُمّتِ اسلامی ان کی بابرکت دُعا کا نتیجہ ہے اور ان کے رکھے ہوئے نام پر فخر کرتی ہے، وہ تمھارے لیے اس سلسلہ میں ایک اچھا نمونہ بن سکتے ہیں۔

"والذین معہ" (جو لوگ ابراہیمؑ کے ساتھ تھے) کی تعبیر سے مُراد وہ مؤمنین ہیں جو اس راہ میں ان کے پیرو اور ساتھی رہے۔ اگرچہ وہ قلیل تعداد میں تھے۔ باقی رہا یہ احتمال کہ اس سے مُراد وہ پیغمبر ہیں جو آپ کے ساتھ ہم آواز تھے یا اُن کے زمانے کے پیغمبر، جیسا کہ بعض نے احتمال دیا ہے۔ تاہم یہ بہت بعید نظر آتا ہے۔ خصوصاً جبکہ مُناسب یہ ہے کہ قرآن یہاں پیغمبر اسلامؐ کو ابراہیمؑ کے ساتھ اور مُسلمانوں کو اُن کے اصحاب و انصار سے تشبیہ دے۔ یہ تواریخ میں بھی آیا ہے کہ بابل میں ایک گروہ ایسا تھا جو ابراہیمؑ کے مُعجزات دیکھنے کے بعد ان پر ایمان لے آیا تھا اور شام کی طرف ہجرت میں وہ آپ کے ساتھ تھا، اِس سے پتہ چلتا ہے کہ ابراہیمؑ کے کچھ وفادار یار و انصار بھی تھے۔[1]

اس کے بعد اس معنی کی وضاحت کے لیے مزید کہتا ہے: "جب انھوں نے اپنی مُشرک اور بُت پرست قوم سے کہا: ہم تم سے اور جن غیر اللہ کی تم پرستش کرتے ہو، ان سے بھی بیزار ہیں"۔ (اذ قالوا لقومھم انا برٰؤا منکم ومما تعبدون من دون اللہ)۔

ہم نہ تو تمھیں اور نہ ہی تمھارے دین و مذہب کو قبول کرتے ہیں۔ ہم تم سے اور تمھارے بے قدر و قیمت بُتوں سے بھی نفرت کرتے ہیں۔

دوبارہ مزید تاکید کے لیے فرمایا: ہم نے تم سے کفر اختیار کر لیا۔ (کفرنا بکم)۔

البتہ یہ کفر وہی برأت و بیزاری ہے کہ جس کی طرف بعض روایات میں کُفر کی پانچ اقسام کے شمار میں اشارہ ہُوا ہے۔[2]

پھر تیسری مرتبہ مزید تاکید کے لیے اضافہ کرتا ہے: "ہمارے اور تمھارے درمیان ہمیشہ ہمیشہ کی دشمنی ہو چکی ہے"۔ (وبدا بیننا وبینکم العداوۃ والبغضاء ابدًا)۔

اور یہ وضع و کیفیت اسی طرح جاری رہے گی۔ یہاں تک کہ تم خُدائے یگانہ پر ایمان لاؤ۔ (حتّٰی تؤمنوا باللہ وحدہ)۔

اِس طرح سے انھوں نے کسی بھی طرح کی لگی لپٹی کے بغیر دو ٹوک طریقے سے دشمنانِ خُدا سے جُدائی اور بیزاری کا اعلان کر دیا اور صراحت کے ساتھ کہا کہ جُدائی کسی قیمت پر بھی واپسی اور تجدیدِ نظر کے قابل نہیں ہے۔ یہ ابد تک جاری رہے گی، مگر یہ کہ وہ اپنی راہ بدل لیں اور کُفر کو چھوڑ کر ایمان کی طرف آجائیں۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۶) کاموں کے لیے اور کبھی بُرے کاموں کے لیے آتا ہے۔ اسی لیے اوپر والی آیات میں "حسنۃ" کے ساتھ مُقید ہوا ہے

[1] کامل ابن اثیر جلد ۱ ص ۱۰۰

[2] "برأء" "بری" کی جمع ہے۔ جیسے "ظرفاء" و "ظریف"

لیکن چونکہ یہ کلّی اور عمومی قانون ابراہیمؑ کی زندگی میں ایک استثناء رکھتا تھا جو بعض مشرکین کی ہدایت کے لیے صورت پذیر ہوا تھا، لہٰذا اس کے بعد فرماتا ہے: اُنھوں نے کافروں سے ہر قسم کا رابطہ منقطع کر لیا اور ان سے کوئی بھی محبت آمیز بات نہیں کی: "سوائے اس بات کے جو ابراہیمؑ نے اپنے باپ (چچا آذر) سے کی تھی کہ میں خدا سے تمھارے لیے طلب مغفرت کروں گا، لیکن اس کے باوجود میں خدا کے مقابلے میں تیرے لیے کسی چیز کا مالک نہیں ہوں اور بخشش تو صرف اُسی کے ہاتھ میں ہے۔" (الا قول ابراهيم لابيه لاستغفرن لك وما املك لك من الله من شيء)۔ [1]

حقیقت میں یہ ابراہیمؑ اور ان کے ساتھیوں کا بُت پرستوں سے ہر قسم کے ارتباط کو منقطع کرنے کے مسئلہ سے ایک ایسا استثناء ہے جو ایک خاص مصلحت اور حالات کی وجہ سے تھا، کیونکہ قرائن بتلاتے ہیں کہ ابراہیمؑ نے احتمالاً اپنے چچا آذر میں ایمان کے لیے آمادگی مشاہدہ کی ہوئی تھی، لیکن آذر اس مسئلہ سے پریشان تھا کہ اگر اس نے توحید کی راہ اختیار تو اُس کی بُت پرستی کے دور کا کیا بنے گا؟ لہٰذا ابراہیمؑ نے اُس سے یہ وعدہ کر لیا تھا کہ میں بارگاہِ خدا میں تیرے لیے استغفار کروں گا اور اس وعدہ پر آپ نے عمل بھی کیا۔ لیکن آذر ایمان نہ لایا۔ جب ابراہیمؑ پر یہ واضح ہو گیا کہ وہ دشمنِ خدا ہے اور ہرگز ایمان نہیں لائے گا تو پھر اُس کے لیے استغفار نہیں کیا اور اس سے قطع تعلق کر لیا۔

چونکہ مسلمان ابراہیمؑ اور آذر کے اِس واقعہ سے اجمالی طور پر باخبر تھے، لہٰذا ممکن تھا کہ یہی مطلب "حاطب بن ابی بلتعہ" جیسے لوگوں کے لیے کفّار سے رازونیاز قائم رکھنے کا بہانہ بن جائے۔ اِس لیے قرآن کہتا ہے کہ یہ استثناء خاص حالات میں صورت پذیر ہوا۔ اور آذر کے ایمان لے آنے کا ایک ذریعہ تھا نہ کہ دُنیوی مقاصد کے لیے تھا۔ اسی لیے سورۂ توبہ کی آیہ ۱۱۴ میں فرماتا ہے: وما كان استغفار ابراهيم لابيه الا عن موعدة وعدها اياه فلما تبين له انه عدو لله تبرأ منه ان ابراهيم لاواه حليم: ابراہیمؑ کا اپنے باپ (چچا آذر) کے لیے استغفار صرف اِس وعدہ کی بناء پر تھا جو اُنھوں نے اُس سے کر لیا تھا (تاکہ اسے ایمان کی طرف کھینچ لائیں) لیکن جب اُن پر یہ واضح ہو گیا کہ وہ خدا کا دشمن ہے تو اُس سے بیزاری اختیار کر لی، بے شک ابراہیمؑ مہربان اور بُردبار تھے۔

لیکن مفسّرین کی ایک جماعت نے اسے "ابراہیمؑ" کے اُسوہ سے استثناء سمجھا اور کہا ہے کہ سوائے ان کے اپنے چچا آذر کے لیے استغفار کرنے کے ہر چیز میں اُن کی اقتداء اور پیروی کرنا چاہیے۔

یہ مطلب اگرچہ چند ایک مفسّرین کے کلام میں ہی آیا ہے، پھر بھی یہ بات بہت ہی بعید دکھائی دیتی ہے۔ کیونکہ اوّل تو وہ ہر چیز میں یہاں تک کہ اس عمل میں بھی اُسوہ تھے، کیونکہ اگر وہی "آذر" والے حالات بعض مشرکین میں پیدا ہو جاتے تو انھیں ایمان کی طرف کھینچ لانے کے لیے ان سے اظہارِ محبت کرنا اچھا کام ہوتا۔ دوسرے ابراہیمؑ ایک معصوم پیغمبر اور عظیم مجاہد انبیاء میں سے تھے۔ اور ان کے تمام کے تمام اعمال ہی نمونہ تھے، لہٰذا کوئی وجہ نہیں ہے کہ ہم اس مسئلہ کا

---

[1] "اصول کافی" بحوالہ "نورالثقلین" جلد ۵ ص ۳۰۲

استثناء کریں۔

خلاصہ یہ ہے کہ ابراہیمؑ اور اُن کے پیروکار پوری قوت کے ساتھ بُت پرستوں کے مخالف تھے، لہٰذا ہمیں اس سبق کو اپنا دستور العمل بنانا چاہیے۔ آذر کے واقعہ میں کچھ خاص حالات تھے اور اگر وہ ہمارے لیے بھی پیدا ہو جائیں تو وہ ہمارے لیے بھی پیروی کے لائق ہیں۔[1]

چونکہ دشمنانِ خدا کے ساتھ ایسی صراحت اور قاطعیت کے ساتھ مبارزہ، خصوصاً اُس زمانہ میں جبکہ وہ قدرتِ ظاہری رکھتے تھے، خدا کی ذات پر توکل کیے بغیر ممکن نہیں ہے، لہٰذا آیت کے آخر میں مزید کہتا ہے: پروردگارا! ہم نے تجھ پر توکل کیا ہے، تیری طرف رُخ کیا ہے اور انجام کار سب کا آخری اور اصلی رجوع تیری ہی طرف ہوتا ہے۔ (ربنا علیک توکلنا والیک انبنا والیک المصیر)۔

حقیقت میں اُنھوں نے اس عبارت میں تین مطالب خداوند تعالیٰ کی بارگاہ میں پیش کیے ہیں:

اوّل: اُس کی ذات پر توکل، دُوسرے اُس کی طرف توبہ و بازگشت اور تیسرے اس حقیقت کی طرف توجہ کہ تمام چیزوں کا آخری اور اصلی رجوع اُسی کی طرف ہوتا ہے، اور یہ ایک دُوسرے کے علت و معلول ہیں۔ معاد اور آخری بازگشت پر ایمان لانا توبہ کا سبب بنتا ہے، اور توبہ رُوحِ توکل کو انسان میں زندہ کرتی ہے۔[2]

بعد والی آیت میں ابراہیمؑ اور اُن کے ساتھیوں کی ایک اور درخواست کی طرف جو اس سلسلے میں حساس اور جاذب ہے اشارہ کرتے ہوئے کہتا ہے: "پروردگارا! ہمیں کافروں کی گمراہی کا سبب نہ بنا"۔ (ربنا لا تجعلنا فتنۃ للذین کفروا)۔

یہ تعبیر ممکن ہے ایسے اعمال کی طرف اشارہ ہو جو بعض بے خبر لوگوں سے سرزد ہو جاتے ہوں جیسا کہ "حاطب بن ابی بلتعہ" کا عمل تھا۔ یعنی وہ لوگ ایسا کام کر بیٹھتے ہیں جو گمراہوں کی تقویت کا سبب بن جاتا ہے حالانکہ ان کا گمان یہ ہوتا ہے کہ اُنھوں نے کوئی غلط کام نہیں کیا ہے۔

یا اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ ہمیں ان کے چنگل میں گرفتار نہ کرانا اور ان کے مقابلے میں مغلوب نہ کر دینا اور کہیں وہ یہ نہ کہنے لگ جائیں کہ اگر یہ حق پر ہوتے تو ہرگز شکست نہ کھاتے۔ اور یہی بات اُن کی گمراہی کا سبب بن جائے گی۔

---

[1] مذکورہ بیان سے واضح ہو جاتا ہے کہ یہاں "استثناء متصل" ہے اور "مستثنیٰ منہ" ایک محذوف جملہ ہے کہ جس پر آیت کا متن دلالت کرتا ہے۔ تقدیر میں اس طرح ہے: ان ابراھیم وقومہ تبرءوا منھم ولم یکن لھم قول یدل علی المحبۃ الا قول ابراھیم... لیکن دوسری تفسیر کے مطابق استثناء منقطع ہو جائے گا اور یہ خود اس پر دوسرا اعتراض ہے۔

[2] ہم نے جو کچھ بیان کیا ہے، اس سے واضح ہو گیا کہ یہ جملہ ابراہیمؑ اور ان کے ساتھیوں کا ہے۔ اگرچہ بعض مفسرین نے یہ احتمال بھی دیا ہے کہ یہ ایک مستقل جملہ ہے جو مسلمانوں کی تعلیم کے عنوان سے ان آیات کے وسط میں نازل ہوا ہے لیکن یہ احتمال بعید نظر آتا ہے۔

* * *

یعنی اگر وہ اپنی شکست اور کافروں کے تسلط سے ڈرتے ہیں تو خود اپنی وجہ سے نہیں بلکہ اس وجہ سے کہ دین حق پر کوئی اعتراض نہ ہو اور مشرکین کی ظاہری کامیابی ان کی حقانیت کی دلیل نہ سمجھی جائے۔ گویا ایک مومنِ واقعی کا طریقہ یہی ہے کہ وہ جو کچھ چاہتا ہے خدا کے لیے چاہتا ہے، وہ سب سے کٹ کر خدا کا ہو گیا ہے اور تمام کام اسی کی رضا کے لیے کرتا ہے۔

سوی تو کردیم روی و دل بہ تو بستیم
از ہمہ باز آمدیم با تو نشستیم !!
ہر چہ نہ پیوند یار بود بریدیم
ہر چہ نہ پیمان دوست بود گسستیم

ہم نے تیری طرف رخ کیا ہے اور تجھ سے ہی دل لگایا ہے۔
ہم سب کو چھوڑ کر تیرے ساتھ ہو بیٹھے ہیں۔
جس کا تعلق محبوب سے نہ ہو اس سے ہم کٹ گئے ہیں۔
جو دوست کا عہد و پیمان نہیں تھا ہم نے اس کو توڑ دیا ہے۔

آیت کے آخر میں مزید کہتا ہے: "پروردگارا! اگر ہم سے کوئی لغزش سرزد ہو جائے تو ہمیں بخش دینا" (واغفرلنا ربنا)۔ تو عزیز و حکیم ہے: (انک انت العزیز الحکیم)۔

تیری قدرت شکست ناپذیر ہے اور تیری حکمت ہر چیز میں نافذ ہے۔ ہو سکتا ہے یہ جملہ اس بات کی طرف اشارہ ہو کہ اگر ہماری زندگی میں تیرے دشمنوں کی طرف تمایل، محبت اور دوستی کی نشانی موجود ہو تو ہماری اس لغزش کو بخش دے۔ نیز یہ تمام مسلمانوں کے لیے ایک درس ہے کہ وہ بھی اس کو دستور العمل بنائیں اور اگر کوئی "حاطب" ان میں پیدا ہو جائے تو وہ استغفار کریں اور خدا کی طرف پلٹ آئیں۔

* * *

پھر آخری زیر بحث آیت میں دوبارہ اسی مطلب کو بیان کرتا ہے جو پہلی آیت میں بیان کیا گیا تھا۔ فرماتا ہے: ان کی زندگی میں تم مسلمانوں کے لیے ایک اچھا نمونہ تھے ان لوگوں کے لیے جو خدا اور قیامت کے دن پر ایمان رکھتے ہیں۔ (لقد کان لکم فیھم اسوۃ حسنۃ لمن کان یرجوا اللہ والیوم الآخر)۔[1]

نہ صرف بت پرستوں اور کفر کے طریقہ سے ان کی برأت اور بیزاری بلکہ بارگاہِ خدا میں ان کی دعائیں اور تقاضے بھی۔ جن کے کچھ نمونے گزشتہ آیات میں گزر چکے ہیں۔ تمام مسلمانوں کے لیے دستور العمل ہیں۔

یہ دستور العمل اور نمونہ وہی لوگ قبول کرتے ہیں جنہوں نے خدا کے ساتھ دل لگا لیا۔ مبدء و معاد پر ایمان نے ان کے

---

[1] بعض مفسرین نے یہ کہا ہے کہ اوپر والی آیت میں "لمن"، "لکم" کا بدل ہے۔ (تفسیر فخر رازی و روح المعانی زیر بحث آیات کے ذیل میں)

دل کو روشن کر دیا اور وہ طریقِ حق پر چل پڑے ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ اس تاسی اور پیروی کا نفع سب سے پہلے خود مسلمانوں کو ہی پہنچتا ہے۔ اسی لیے آخر میں مزید کہتا ہے: "جو شخص رُوگردانی کرے گا اور دشمنانِ خدا سے دوستی کی بنیاد ڈالے گا، وہ خود اپنے آپ کو ہی نقصان پہنچائے گا اور خدا کو اس کی کوئی حاجت نہیں ہے کیونکہ وہ سب سے بے نیاز اور ہر قسم کی حمد و ستائش کے لائق ہے" (ومن یتول فان اللہ ھوالغنی الحمید)۔

کیونکہ دُشمنانِ خدا کے ساتھ دوستی کرنا انھیں تقویت پہنچاتا ہے، اور ان کی قوت خود تمھاری شکست کا باعث ہے۔ اگر وہ تم پر مُسلّط ہو گئے تو پھر وہ کسی چھوٹے بڑے پر رحم نہیں کریں گے۔[1]

چند نکات

۱: ابدی نمونے

عملی نمونے ہمیشہ مُؤثر ترین نمونے ہوتے ہیں، چونکہ عمل ہی انسان کے قول پر اس کے ایمان کی گہرائی کا ترجمان ہوتا ہے، اور جو بات دل سے نکلتی ہے لازمی طور پر دل پر اثر کرتی ہے۔

ہمیشہ عظیم نمونے اور دستور العمل ہی انسانوں کی زندگی میں اُن کی تربیت کا مُؤثر ذریعہ رہے ہیں۔ اِسی بناء پر پیغمبرؐ اور آئمہ معصومینؑ ہدایت کی اہم ترین شاخ کی اپنے عمل سے نشان دہی کیا کرتے تھے۔ بناء بریں جب "سنّت" کے بارے میں گفتگو ہوتی ہے تو یہ کہا جاتا ہے کہ "سُنّت" معصوم کے "قول" و "فعل" و "تقریر" کو کہا جاتا ہے۔ یعنی معصوم پیشواؤں کا قول و فعل و سکوت سب حجت اور رہنما ہیں، یہی وجہ ہے کہ تمام پیغمبروں اور آئمہ میں عصمت شرط ہے تاکہ وہ تمام امور میں نمونہ بن سکیں۔

قرآن نے بھی اس اہم مسئلہ پر مُہرِ تصدیق ثبت کی اور تمام امور میں مومنین کے لیے نمونوں اور اُسوہ ہائے حسنہ کا تعارف کرایا ہے۔ ان میں سے زیرِ بحث آیات میں ابراہیمؑ اور اُن کے ساتھیوں کے بارے میں دو مرتبہ گفتگو کی ہے۔ نیز سُورۂ احزاب میں خود ذاتِ پیغمبرؐ کا مُسلمانوں کے لیے نمونہ اور اُسوہ کے عنوان سے تعارف کرایا ہے۔

(اس بات پر توجہ رکھنا چاہیئے کہ "اُسوۃ" مصدری معنی رکھتا ہے جو اتباع کرنے اور عملی پیروی کے معنی میں ہے۔ اگرچہ

---

[1] اس قول کی بناء پر جملہ "من یتول" جملۂ شرطیہ ہے اور اس کی جزاء محذوف ہے۔ وہ تقدیر میں اس طرح ہے: من یتول فقد اخطأ حظ نفسہ وذھب عما یعود نفعہ الیہ جو رُوگردانی کرے اُس نے اپنے حصہ سے خطا کی اور اُس چیز سے دُور ہو گیا ہے، جس کا نفع اس کی طرف لوٹتا ہے۔

(مجمع البیان جلد ۹ ص ۲۷۲)

فارسی کے روزمرہ کے استعمالات میں اُس شخص کے معنی میں ہے کہ جس کی اتباع اور پیروی کرنی چاہیئے۔)

خطروں سے بھری ہوئی جنگ احزاب میں جبکہ مسلمان سخت ترین آزمائش میں مبتلا تھے۔ اور ہمت توڑ دینے والے حوادث نے قوی ترین افراد کو بھی لرزہ براندام کر دیا تھا، خدائے تعالےٰ اس طوفان کے درمیان استقامت، پامردی، ایمان، اخلاص اور اطمینانِ قلب کے نمونہ کے طور پر اپنے پیغمبرؐ کا تعارف کراتا ہے۔ البتہ یہ امر صرف میدان احزاب میں ہی منحصر نہیں تھا بلکہ پیغمبرؐ ہر جگہ مسلمانوں کے لیے ایک عظیم نمونہ شمار ہوتے تھے۔

کونوا دعاة الناس باعمالکم ولا تکونوا دعاة بالسنتکم[1]

"لوگوں کو اپنے عمل سے خدا کی طرف دعوت کرو نہ کہ اپنی زبان سے۔"

یہ شعار اور نعرہ جو امام جعفر صادقؑ کی حدیث سے لیا گیا ہے اس بات کی دلیل ہے کہ تمام سچے مسلمانوں کو بھی اپنی جگہ پر دوسروں کے لیے نمونہ بننا چاہیئے، اگر یہ کام ہو جاتا تو اسلام عالمگیر ہو جاتا۔

۲: خدا سب سے بے نیاز ہے۔

قرآن مجید میں بارہا اس نکتے کا بیان ہوا ہے کہ اگر خدا تمھیں کچھ ایسے احکام دیتا ہے جو بعض اوقات مشکل اور شاق نظر آتے ہیں، تو اس بات کو نہ بھولیں کہ ان کے تمام منافع تمھاری طرف ہی لوٹتے ہیں۔ کیونکہ خدا کی ہستی کے بیکراں سمندر میں کوئی کمی نہیں ہے کہ وہ تم سے مدد لے، اس کے علاوہ تمھارے پاس کچھ ہے ہی نہیں کہ تم اُس کو مدد دو، بلکہ جو کچھ تمھارے پاس ہے وہ اُسی کا ہے۔

حدیثِ قدسی میں آیا ہے:

"میرے بندو! تم مجھے ہرگز کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتے اور نہ ہی کوئی نفع دے سکتے ہو۔ اے میرے بندو! اگر اوّلین و آخرین اور جن و انس پاکیزہ ترین دل رکھتے ہوں تو بھی میرے ملک میں ذرہ برابر اضافہ نہیں کر سکتے۔ اگر اوّلین و آخرین اور جن و انس ناپاک ترین دل رکھتے ہوں تو میرے ملک میں کوئی کمی نہیں کر سکتے۔"

"اے میرے بندو! اگر اوّلین و آخرین اور جن و انسان کسی میدان میں جمع ہو جائیں، جو کچھ وہ چاہیں مجھ سے طلب کریں اور میں وہ سب کچھ اُن کو دے دوں تو بھی میرے خزانوں میں کسی چیز کی کمی نہیں ہوگی، اور وہ سب کچھ اس رطوبت کے مانند ہوگا جو ایک رسّی سمندر سے حاصل کرتی ہے۔"

"اے میرے بندو! میں تمھارے اعمال کا ذخیرہ کرتا ہوں اور پھر میں اُنھیں تمھاری طرف لوٹا دوں گا، اب اگر کوئی اچھی چیز حاصل کرے تو وہ خدا کا شکر کرے اور جو اس کے سوا دیکھے تو وہ اپنے سوا کسی اور

---

[1] سفینۃ البحار جلد ۲ ص ۲۷۸ مادۂ عمل

کی ملامت نہ کرے۔ [1]

"حب فی اللہ و بغض فی اللہ" بنیادی اصل ہے۔

مذہب کا رشتہ وہ اہم ترین رشتہ ہے جو انسانوں کو ایک دُوسرے کے ساتھ مربُوط کرتا ہے اور دُوسرا ہر رشتہ اسی کے زیرِ اثر ہے۔

یہ وہ بات ہے جس پر قرآن نے بارہا تاکید کی ہے، اگر یہ رشتہ، دوستی، عزیزداری اور منافع شخصی روابط کے زیرِ اثر ہو جائے تو ارکانِ مذہب متزلزل ہو جائیں گے۔

اِس کے علاوہ اصل قدر وقیمت ایمان وتقویٰ کی ہے، لہٰذا یہ کیسے ممکن ہے کہ ہم ان لوگوں کے ساتھ رابطہ قائم کریں جن میں یہ دونوں چیزیں نہیں ہیں۔

امام جعفر صادق کی ایک حدیث میں آیا ہے:

"من احب للہ وابغض للہ، واعطی للہ جل وعز فھو ممن کمل ایمانہ"

"جو شخص خُدا کے لیے دوست رکھتا ہے، خُدا کے لیے دشمن رکھتا ہے اور خُدا کے لیے عطا وبخشش کرتا ہے تو وہ ان لوگوں میں سے ہے جن کا ایمان کامل ہو گیا ہے"

ایک اور حدیث میں انہی حضرت سے آیا ہے:

"من اوثق عری الایمان ان تحب فی اللہ، وتبغض فی اللہ وتعطی فی اللہ، وتمنع فی اللہ"

"ایمان کو محکم ترین کرنے والی چیزوں میں سے یہ ہے کہ تُو خدا کے لیے دوستی رکھے، خُدا کے لیے ہی دشمنی رکھے۔ خُدا کے لیے ہی دے اور خدا کے لیے ہی روکے" [2]

اس سلسلے میں احادیث بہت زیادہ ہیں، مزید آگاہی کے لیے اصُولِ کافی کی جلد دوم باب الحب فی اللہ کی طرف رُجوع کریں۔ مرحوم کلینی نے اس باب میں، اِس سلسلے کی سولہ احادیث نقل کی ہیں۔

علاوہ ازیں "حب فی اللہ اور بغض فی اللہ" کی مزید وضاحت کے لیے تفسیرِ نمونہ جلد ۲۳ سورۂ مجادلہ کی آیت ۲۲ کے ذیل میں ہمارے بیان سے رُجوع کریں۔

* * *

---

[1] روح البیان جلد ۹ ص ۴۷۹

[2] اصُولِ کافی جلد ۲ باب الحب فی اللہ حدیث ۱ و ۲

[3] اصُول کافی جلد ۲ باب الحب فی اللہ حدیث ۲۰۱

⑦ عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّجْعَلَ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَ الَّذِيْنَ عَادَيْتُمْ مِّنْهُمْ مَّوَدَّةً ؕ وَاللّٰهُ قَدِيْرٌ ؕ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝

⑧ لَا يَنْهٰكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِيْنَ لَمْ يُقَاتِلُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ وَلَمْ يُخْرِجُوْكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ اَنْ تَبَرُّوْهُمْ وَتُقْسِطُوْٓا اِلَيْهِمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ ۝

⑨ اِنَّمَا يَنْهٰكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِيْنَ قٰتَلُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ وَاَخْرَجُوْكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ وَظٰهَرُوْا عَلٰٓى اِخْرَاجِكُمْ اَنْ تَوَلَّوْهُمْ ۚ وَمَنْ يَّتَوَلَّهُمْ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ۝

ترجمہ

⑦ اُمید ہے کہ خدا تمھارے اور تمھارے دشمنوں کے درمیان (اسلام کے ذریعے) رشتۂ محبت قائم کرے گا، اور خدا قادر، بخشنے والا اور مہربان ہے۔

⑧ خدا نے تمھیں ان لوگوں سے جنھوں نے امرِ دین میں تم سے جنگ نہیں کی اور تمھیں تمھارے شہر اور دیار سے باہر نہیں نکالا، نیکی کرنے اور عدالت کی رعایت کرنے سے منع نہیں کیا، کیونکہ خدا عدالت کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔

⑨ خدا تو تمھیں صرف ان لوگوں سے دوستی کرنے سے منع کرتا ہے جنھوں نے امرِ دین میں تم سے جنگ کی اور تمھیں تمھارے گھروں سے باہر نکالا یا تمھارے باہر نکالنے میں مدد کی ہے اور جو شخص ان سے دوستی کرے گا وہی تو ظالم و ستمگر ہیں۔

تفسیر

اُن کفّار سے دوستی جو برسرِ پیکار نہیں ہیں

ان آیات میں ان مباحث کو جاری رکھا گیا ہے جو گزشتہ آیات میں "حبّ فی اللہ" اور "بغض فی اللہ" اور مشرکین سے قطع تعلق کرنے کے سلسلہ میں آئے تھے۔ چونکہ یہ قطع تعلق مسلمانوں کی ایک جماعت کے لیے قرابت داری میں ایک قسم کا خلا پیدا کرتا تھا، اس کے باوجود سچے مومنین اور صحابۂ رسول نے اس راہ میں ثابت قدمی دکھائی تھی، لہٰذا خدا ان کی جزاء کے لیے اور اس کمی کو دور کرنے کے لیے انھیں بشارت دیتا ہے کہ "تم غم نہ کھاؤ۔ یہ حالت ہمیشہ اسی طرح نہیں رہے گی"، فرماتا ہے:

"اُمید ہے کہ خدا تمھارے اور تمھارے دشمنوں کے درمیان (اسلام قبول کرنے کے ذریعے) دوستی کا رشتہ قائم کر دے گا۔" (عسی اللہ ان یجعل بینکم و بین الذین عادیتم منھم مودۃ)۔

انجامِ کار یہ وعدہ پورا ہوگیا، ہجرت کا آٹھواں سال آیا اور مکّہ فتح ہوگیا۔ اہلِ مکّہ یدخلون فی دین اللہ افواجًا کے مصداق گروہ در گروہ مسلمان ہوگئے، دشمنی و عناد کے سیاہ بادل ان کی زندگی کے آسمان سے چھٹ گئے اور آفتابِ ایمان، محبت و دوستی کی گرمجوشی کے ساتھ چمکنے لگا۔

بعض مفسّرین اس جملہ کو "اُمِّ حبیبہ" دخترِ ابوسفیان کے ساتھ پیغمبرؐ کے ازدواج کی طرف اشارہ سمجھتے ہیں کہ جو مسلمان ہوچکی تھی اور اپنے شوہر عبید اللہ بن جحش[1] کے ہمراہ مہاجرینِ حبشہ کے ساتھ حبشہ گئی تھی۔ اُس کا شوہر وہاں عیسائی ہوگیا تو پیغمبرِ اسلامؐ نے کسی کو نجاشی کے پاس بھیجا اور اُمِّ حبیبہ کو اپنی ازواج میں داخل کرلیا۔ چونکہ عربوں میں دامادی کا رشتہ عداوتوں اور دشمنیوں کی کمی کا باعث بنتا تھا۔ لہٰذا اس مسئلہ نے ابوسفیان اور اہلِ مکّہ پر اثر ڈالا۔

لیکن یہ احتمال بعید نظر آتا ہے۔ زیرِ بحث آیات فتح مکّہ کے قریب نازل ہوئیں، کیونکہ "حاطب بن ابی بلتعہ" کا مشرکین مکّہ کو خط لکھنے سے مقصد یہ تھا کہ وہ انھیں اس واقعہ کی اطلاع دے۔ جبکہ ہم جانتے ہیں کہ جعفر بن ابی طالب اور ان کے ساتھی اس واقعہ سے پہلے (فتح خیبر کے قریب) مدینہ کی طرف پلٹ آئے تھے۔[2]

بہرحال اگر وہ لوگ جو مسلمانوں کے عزیز و رشتہ دار ہیں، ان کے مذہب سے جدا ہو جائیں تو انھیں اُن کے اسلام کی طرف

---

[1] عبید اللہ بن جحش، عبداللہ بن جحش کا بھائی ہے۔ افسوس ہے کہ عبید اللہ اسلام پر باقی نہ رہا اور حبشہ میں اُس نے دینِ عیسائیت اختیار کرلیا۔ اسی بنا پر اُم حبیبہ اس سے الگ ہوگئی۔ لیکن عبید اللہ کا بھائی عبداللہ اسلام پر باقی رہا۔ وہ مجاہدینِ اُحد میں سے تھا۔ اور اسی میدان میں اُس نے شربتِ شہادت نوش کیا۔

[2] اس واقعہ کا خلاصہ شہرت سے مفسّرین نے نقل کیا ہے۔ تاہم اس واقعہ کی تفصیل "اسد الغابۃ فی معرفۃ الصحابۃ" جلد ۵ ص ۵۷۳ میں مطالعہ فرمائیے۔

لوٹنے سے مایوس نہیں ہونا چاہیئے۔ کیونکہ خدا ہر چیز پر قادر ہے، وُہی ہے جو دلوں کو متبدّل کرسکتا ہے اور وہی ہے جو اپنے بندوں کی خطاؤں اور گناہوں کو بخشتا ہے۔ لہٰذا آیت کے آخر میں مزید کہتا ہے: "خدا قادر و توانا اور غفور و رحیم ہے۔ (واللہ قدیر واللہ غفور رحیم)۔

لفظ "عسی" عربی زبان میں ان مواردمیں بولا جاتا ہے جہاں کسی چیز کے پُورا ہونے کی اُمید ہو، چُونکہ یہ معنی بعض اوقات جہالت یا عجز سے ملا ہُوا ہوتا ہے لہٰذا بہت سے مُفسّرین نے قرآنِ مجید میں اس کی تفسیر خُدا سے دُوسروں کے اُمید رکھنے کے معنی میں کی ہے۔ لیکن جیسا کہ ہم پہلے بھی بیان کرچکے ہیں، اِس میں کوئی حرج نہیں ہے کہ یہ لفظ خدا کے کلام میں اپنا وہی اصلی معنی رکھتا ہو۔ کیونکہ بعض اوقات کسی ہدف اور مقصد تک پہنچنے کے لیے کچھ شرائط اور حالات کی ضرورت ہوتی ہے۔ اگر ان میں سے بعض شرائط حاصل نہ ہوں تو یہی تعبیر استعمال ہوگی۔ (غور کیجیے)

بعد والی آیات میں مُشرکین سے دوستی کے رابطے ترک کرنے کے مسئلہ کی تشریح و توضیح ہے۔ فرماتا ہے: "خدا تمھیں ان لوگوں سے نیکی کرنے اور عدالت کی رعایت کرنے کے بارے میں، جنھوں نے تم سے جنگ نہیں کی اور نہ ہی تمھیں اپنے گھربار سے باہر نکالا ہے، منع نہیں کرتا"۔

(لاینھٰکم اللہ عن الذین لم یقاتلوکم فی الدین ولم یخرجوکم من دیارکم ان تبروھم وتقسطوا الیھم)۔

کیونکہ خدا عدالت اختیار کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔ (ان اللہ یحبّ المقسطین)۔

❖ ❖ ❖

خدا تو تمھیں صرف ان لوگوں کی دوستی سے منع کرتا ہے جنھوں نے دین کے مُعاملہ میں تم سے جنگ کی اور تمھیں تمھارے گھر اور شہر سے باہر نکالا، یا تمھیں باہر نکالنے میں مدد کی ہے۔ ہاں! خُدا تمھیں ان سے ہر قسم کے تعلّق اور دوستی سے منع کرتا ہے۔ (انما ینھٰکم اللہ عن الذین قاتلوکم فی الدین واخرجوکم من دیارکم وظاھروا علیٰ اخراجکم ان تولوھم)۔

"اور جو شخص انھیں دوست رکھے وہ ظالم و ستمگر ہے۔" (ومن یتولھم فاولئک ھم الظالمون)۔

اِس طرح سے غیر مسلم افراد دو گروہوں میں تقسیم ہو جاتے ہیں۔ ایک گروہ تو وہ ہے جو مُسلمانوں کے مُقابلہ میں کھڑا ہوگیا۔ ان کے سامنے تلوار کھینچ لی اور انھیں گھربار سے جبراً باہر نکال دیا۔ اِس طرح انھوں نے اپنی اسلام اور مسلمانوں سے دشمنی کو گفتار و عمل سے آشکارا کیا۔ اس صُورت میں مسلمانوں کی ذمّہ داری یہ ہے کہ اس گروہ کے ساتھ ہر قسم کے میل جول اور تعلّق کو ختم کر دیں اور ہر قسم کی دوستی اور محبت کا تعلّق چھوڑ دیں۔ اِس کا واضح مصداق مشرکینِ مکّہ خصُوصاً سردارانِ قریش تھے کہ جن میں سے ایک گروہ نے تو رسمی طور پر یہ کام کیا تھا اور دوسرے گروہ نے اس میں ان کی مدد کی تھی۔

لیکن ایک اور گروہ ایسا بھی تھا جو کُفر و شرک کے باوجُود مُسلمانوں کے ساتھ کوئی سروکار نہیں رکھتا تھا۔ نہ تو وہ عداوت و دشمنی رکھتے تھے، نہ ہی ان کے ساتھ جنگ کرتے تھے اور نہ اُن کو ان کے گھربار اور شہر و دیار سے باہر نکالنے کا اقدام کرتے

تھے۔ یہاں تک کہ اُن میں سے ایک گروہ نے تو مسلمانوں سے دشمنی نہ کرنے کا عہد کر رکھا تھا۔ پس اس گروہ سے نیکی کرنے اور اظہارِ محبت کرنے میں کوئی مانع نہیں تھا اور اگر اُن سے کوئی معاہدہ کیا ہُوا ہے تو اس کو وفا کرنا چاہیے اور ان سے عدالت کرنے کی کوشش کرنی چاہیئے۔

اِس گروہ کا مصداق قبیلۂ "خزاعہ" تھا، جنھوں نے مسلمانوں کے ساتھ ترکِ مخاصمت کا عہد و پیمان باندھا ہُوا تھا۔

اِس بناء پر بعض مُفسّرین کی اس توجیہ کی گنجائش نہیں کہ جنھوں نے اس حکم کو منسوخ سمجھا اور اس کا ناسخ سورہ توبہ کی آیۂ ۵ کو بیان کیا ہے کہ جس میں کہتا ہے: "فاذا انسلخ الاشهر الحرم فاقتلوا المشركين حيث وجدتموهم" جب محترم مہینے ختم ہو جائیں تو پھر بُت پرستوں کو جہاں پاؤ قتل کر دو۔" کیونکہ سورۃ توبہ کی یہ آیت صرف اُن مُشرکین کے بارے میں گفتگو کرتی ہے جنھوں نے عہد شکنی کی اور اسلام اور مسلمانوں کے خلاف علی الاعلان اُٹھ کھڑے ہُوئے۔ اِس بات کی گواہ اس کے بعد والی آیات ہیں۔[1]

بعض مفسّرین نے اس آیت کے بارے میں ایک روایت کی ہے کہ ابوبکر کی مُطلقہ بیوی اپنی بیٹی "اسماء" کے لیے مکّہ سے کچھ ہدیے لائی تو "اسماء" نے انھیں قبول کرنے سے انکار کر دیا، یہاں تک کہ اپنی ماں کو بھی گھر میں داخل ہونے کی اجازت نہیں دی۔ تب اوپر والی آیت نازل ہُوئی اور پیغمبرؐ نے اُسے حکم دیا کہ اپنی ماں کو گھر میں آنے دے، اس کا ہدیہ بھی قبول کرلے اور اس کا اکرام و احترام کرے۔[2]

یہ روایت بتاتی ہے کہ مکّہ کے سارے لوگ اِس آیت کے مشمول نہیں تھے، بلکہ مسلمانوں کے درمیان ایک ایسی اقلیت بھی موجود تھی جو مسلمانوں کے ساتھ کسی قسم کی کوئی دشمنی اور مخاصمت نہیں رکھتے تھے۔

بہرحال ان آیات سے مُسلمانوں کے غیر مسلموں کے ساتھ رابطے کی کیفیت کی "ایک بُنیادی اور کُلّی اصل" کا پتہ چلتا ہے جو نہ صرف اس زمانہ کے لیے بلکہ آج کے اور آئندہ زمانے کے لیے بھی ثابت ہے، وہ یہ ہے کہ مُسلمانوں کا فرض ہے کہ وہ ہر ایسا گروہ، جمعیت اور مُلک جو اُن سے دشمنی رکھتا ہو، اِسلام اور مسلمانوں کے مخالف ہو یا دشمنانِ اِسلام کی مدد کرتا ہو، اس کے خلاف سختی کے ساتھ مقابلے کے لیے کھڑے ہو جائیں اور ان سے ہر قسم کی دوستی کا رشتہ منقطع کرلیں۔

لیکن اگر وہ کافر ہونے کے باوجود اسلام اور مُسلمانوں کے بارے میں غیر جانبدار ہوں، یا ان کی طرف مائل ہوں تو پھر مُسلمان ان کے ساتھ دوستانہ روابط رکھ سکتے ہیں۔ البتّہ اس حد تک نہیں جو وہ مُسلمان بھائیوں کے ساتھ رکھتے ہیں اور نہ ہی اس حد تک کہ وہ مُسلمانوں میں نفوذ پیدا کرلیں۔

اگر کوئی گروہ یا کوئی حکومت گروہِ اوّل میں سے ہو اور وہ اپنی روش کو بدل دیں یا اس کے برعکس وہ دُوسرے گروہ میں ہوں اور وہ اپنا راستہ بدل لیں تو پھر ان کی موجودہ وضع و کیفیت کو معیار قرار دیا جائے گا اور ان کے ساتھ اوپر والی آیات کے مطابق طرزِ عمل اختیار کیا جائے گا۔

---

[1] بعض مفسّرین نے یہ احتمال دیا ہے کہ دوستی کی اجازت ان مومنین کے بارے میں ہے جو اسلام تو قبول کر چکے تھے، لیکن وہ مکّہ میں رہ گئے تھے اور انھوں نے ہجرت نہیں کی تھی۔ لیکن آیات کا لب و لہجہ بتلاتا ہے کہ یہ تمام باتیں غیر مسلموں کے بارے میں ہو رہی ہیں۔

[2] "روح البیان" جلد ۹ ص ۴۸۱ یہ روایت صحیح بخاری اور دوسری بہت سی کتب تفسیر میں بھی کچھ اختلاف کے ساتھ آئی ہے۔

⑩ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا جَآءَكُمُ الْمُؤْمِنٰتُ مُهٰجِرٰتٍ
فَامْتَحِنُوْهُنَّ ؕ اَللّٰهُ اَعْلَمُ بِاِيْمَانِهِنَّ ۚ فَاِنْ عَلِمْتُمُوْهُنَّ
مُؤْمِنٰتٍ فَلَا تَرْجِعُوْهُنَّ اِلَى الْكُفَّارِ ؕ لَا هُنَّ حِلٌّ
لَّهُمْ وَلَا هُمْ يَحِلُّوْنَ لَهُنَّ ؕ وَاٰتُوْهُمْ مَّآ اَنْفَقُوْا ؕ وَلَا
جُنَاحَ عَلَيْكُمْ اَنْ تَنْكِحُوْهُنَّ اِذَآ اٰتَيْتُمُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ ؕ
وَلَا تُمْسِكُوْا بِعِصَمِ الْكَوَافِرِ وَسْـَٔلُوْا مَآ اَنْفَقْتُمْ وَلْيَسْـَٔلُوْا مَآ
اَنْفَقُوْا ؕ ذٰلِكُمْ حُكْمُ اللّٰهِ ؕ يَحْكُمُ بَيْنَكُمْ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ۝
⑪ وَاِنْ فَاتَكُمْ شَيْءٌ مِّنْ اَزْوَاجِكُمْ اِلَى الْكُفَّارِ فَعَاقَبْتُمْ
فَاٰتُوا الَّذِيْنَ ذَهَبَتْ اَزْوَاجُهُمْ مِّثْلَ مَآ اَنْفَقُوْا ؕ وَاتَّقُوا اللّٰهَ
الَّذِيْٓ اَنْتُمْ بِهٖ مُؤْمِنُوْنَ ۝

ترجمہ

⑩ اے ایمان لانے والو! جب مومن عورتیں ہجرت کرکے تمھارے پاس آئیں تو تم اُن کی آزمائش کر لیا کرو۔ خُدا تو اُن کے ایمان سے اچھی طرح آگاہ ہے۔ پھر جب تم انھیں مومنہ پاؤ تو انھیں کُفّار کی طرف مت لوٹاؤ کہ نہ تو وہ کُفّار کے لیے حلال ہیں اور نہ ہی کفّار اُن کے لیے

حلال ہیں۔ اور جو کچھ اُن کے شوہروں نے (اُن سے ازدواج کرنے میں) خرچ کیا ہے وہ انھیں دے دو۔ اب تمھارے لیے ان سے نکاح کرنے میں کوئی گناہ نہیں ہے جبکہ تم ان کا مہر انھیں ادا کر دو، اور تم بھی کافرہ بیویوں کو ہرگز اپنی زوجیت میں نہ رکھو (اور اگر تمھاری عورتوں میں سے کوئی کافرہ ہو جائے اور وہ کافروں کے شہر کی طرف بھاگ جائے) تو تُم حق رکھتے ہو کہ جو حقِ مہر تم نے ادا کیا ہے اُس کا مُطالبہ کرو جس طرح وہ حق رکھتے ہیں کہ جن عورتوں سے وہ جُدا ہو گئے ہیں، ان کے حق مہر کا تم سے مُطالبہ کریں، یہ خدا کا حکم ہے جو تمھارے درمیان حکم کرتا ہے۔ اور خدا علیم و حکیم ہے۔

(۱۱) اگر تمھاری بیویوں میں سے بعض تمھارے ہاتھ سے نکل جائیں (اور کفّار کی طرف پلٹ جائیں) اور تم جنگ میں ان پر کامیابی حاصل کر لو اور مالِ غنیمت تمھارے ہاتھ آئے، تو جن کی بیویاں چلی گئی ہیں، ان کو اتنا مہر دے دو جتنا اُنھوں نے دیا ہے اور اس خُدا کی مخالفت سے پرہیز کرو جس پر تم سب ایمان رکھتے ہو۔

* * *

شانِ نزُول

مفسّرین کی ایک جماعت نے ان آیات کے شانِ نزول میں اِس طرح نقل کیا ہے کہ رسُولِ خداؐ نے صلح حدیبیہ میں مشرکین مکّہ سے ایک معاہدہ کیا تھا۔ اس معاہدے کی ایک شق یہ تھی کہ جو شخص اہلِ مکہ میں سے مسلمانوں کے ساتھ آملے وہ اسے واپس کر دیں گے۔ لیکن اگر مسلمانوں میں سے کوئی شخص اِسلام کو چھوڑ کر مکہ کی طرف پلٹ جائے تو وہ اُسے واپس نہیں کرینگے۔

اِسی دوران ایک عورت جس کا نام "سبیعہ" تھا، اُس نے اسلام قبول کر لیا اور اسی سرزمین حدیبیہ میں مسلمانوں سے آ ملی۔ تب اس کا شوہر پیغمبرؐ کی خدمت میں آیا اور کہا: یا محمدؐ! میری بیوی مجھے پلٹا دو، کیونکہ ہمارے معاہدہ کی ایک شق یہ بھی ہے اور ابھی اس کی سیاہی بھی خشک نہیں ہوئی ہے۔ اس پر اوپر والی آیت نازل ہوئی اور حکم دیا گیا کہ مہاجر عورتوں کا امتحان کر لیا کرو۔ (ابن عباس کہتے ہیں کہ ان کا امتحان یہ تھا کہ ان سے قسم لی جائے کہ ان کی ہجرت شوہر سے بُغض و کینہ یا نئی زمین سے لگاؤ یا کسی دُنیاوی مقصد کے لیے نہیں ہے بلکہ ان کی ہجرت صرف اِسلام کی وجہ سے ہے۔)

اس عورت نے قسم کھائی کہ ایسا ہی ہے تو اس موقع پر پیغمبرؐ نے وہ حق مہر جو اُس کے شوہر نے اس کو دیا تھا، اور تمام خرچہ جو اُس کے شوہر نے کیا تھا۔ اُس کے شوہر کو ادا کر کے فرمایا: "قرار دادِ معاہدہ کی اِس شق کے مطابق عورتوں کو نہیں صرف مردوں کو لوٹانا ہے"[1]

* * *

تفسیر

مُسلمانوں اور کُفّار کے نُقصان کی تلافی

گزشتہ آیات میں "بغض فی اللہ" اور دُشمنانِ خُدا سے قطع تعلق کے بارے میں گفتگو تھی، لیکن زیرِ بحث آیات میں "حبّ فی اللہ" اور ان لوگوں سے — جو کُفر سے جُدا ہو کر ایمان کے ساتھ تعلق قائم کریں رشتہ جوڑنے کے بارے میں گفتگو ہے۔

پہلی آیت میں مُہاجر عورتوں کے بارے میں گفتگو کرتا ہے اور اس آیت میں مجموعی طور پر سات احکام وارد ہُوئے ہیں جو زیادہ تر مہاجر عورتوں کے بارے میں ہیں اور ان کا ایک حصّہ کافر عورتوں کے بارے میں بھی ہے۔

۱: پہلا حکم: "مہاجر عورتوں" کی آزمائش کے بارے میں ہے۔ "رُوئے سُخن مُومنین کی طرف کرتے ہُوئے فرماتا ہے: "اے ایمان لانے والو! جب مُومنہ عورتیں ہجرت کر کے تمہارے پاس آئیں تو تم انھیں واپس نہ کیا کرو بلکہ ان کا امتحان کر لیا کرو" (یاایھا الذین اٰمنوا اذا جاءکم المؤمنات مھاجرات فامتحنوھُن)۔

انھیں مومنات کہنے کے باوجود امتحان کا حکم دینا اس بناء پر ہے کہ وہ ظاہری طور پر تو شہادتین کو زبان پر جاری کرتی تھیں اور اہلِ ایمان کے زُمرہ میں تھیں، لیکن یہ امتحان اس لیے تھا تاکہ اطمینان ہو جائے کہ — یہ ظاہر باطن کے ساتھ ہم آہنگ ہے —

باقی رہا امتحان کا طریقہ تو جیسا کہ ہم نے بیان کیا وہ اسی طرح سے تھا کہ انھیں قسم دلاتے تھے کہ ان کی مُہاجرت اسلام قبول کرنے کے علاوہ کسی اور مقصد کے لیے نہیں تھی۔ انھیں یہ قسم کھانی چاہیئے کہ اُنھوں نے شوہر سے دشمنی یا کسی دُوسرے مرد سے تعلق یا مدینہ کی سرزمین سے لگاؤ اور اسی طرح کی دُوسری باتوں کے لیے ہجرت نہیں کی ہے۔

یہ احتمال بھی ہے کہ اسی سورۃ کی بارھویں آیت مہاجر عورتوں کے امتحان کی کیفیت کی تفسیر ہو، (جس کے مُطابق انھیں چاہیے) کہ وہ پیغمبرؐ کی اس بات پر بیعت کریں کہ وہ راہِ شرک اختیار نہیں کریں گی، اور وہ چوری، منافیِ عفّت اعمال،

---

[1] اوپر والی شانِ نزول ثبت سی تفسیروں میں آئی ہے۔ ہم نے اسے مجمع البیان سے کچھ تلخیص کے ساتھ اوپر پیش کیا ہے۔ "طبرسی" نے اس حدیث کو "ابن عباس" سے نقل کیا ہے۔

اولاد کو قتل کرنے اور اس قسم کے اعمال کی مرتکب نہ ہوں گی اور رسول خداؐ کے فرمان کو کامل طور سے تسلیم کریں گی۔

البتہ ممکن ہے کہ کچھ افراد اس قسم اور بیعت میں بھی غلط بیانی سے کام لیں، لیکن اُس زمانہ میں بہت سے لوگوں حتّٰی کہ مشرکین کا مسئلۂ بیعت اور خدا کی قسم کے لیے مقید ہونا اس بات کا سبب بنا کہ بہت کم افراد جھوٹ بولیں۔ اِس طرح سے مذکورہ امتحان اگرچہ ہمیشہ اُن کے ایمانِ واقعی کی دلیل تو نہیں ہوتا تھا، لیکن عام طور پر اس واقعیت کو بیان کرنے والا ہو سکتا تھا۔

لہٰذا بعد کے جملہ میں مزید کہتا ہے: "خدا ان کے دل کی اندرونی کیفیت اور اُن کے ایمان کے متعلق سب سے زیادہ آگاہ ہے۔" (اللہ اعلم بایمانھن)۔

۲: اس کے بعد والے حکم میں فرماتا ہے: "جب وہ اس امتحان میں پوری اُتر جائیں اور تم نے واقعی انھیں مومنہ جان لیا تو پھر انھیں کفار کی طرف نہ پلٹاؤ۔" (فان علمتموھن مؤمنات فلا ترجعوھن الی الکفار)۔

یہ درست ہے کہ حدیبیہ میں زبردستی کے معاہدے کا ایک جزء یہ تھا کہ وہ افراد جو مسلمان ہو کر مکّہ سے مدینہ کی طرف ہجرت کریں گے، انھیں مکّہ کی طرف واپس لوٹا دیا جائے گا۔ لیکن اس جزء کا عورتوں پہ اطلاق نہیں ہوتا تھا، لہٰذا پیغمبرؐ نے انھیں ہرگز کفار کی طرف نہیں پلٹایا۔ یہ ایک ایسا کام تھا کہ اگر یہ انجام پا جاتا تو اس معاشرے میں عورتوں کے حد سے کمزور ہونے کی وجہ سے ان کے لیے سخت خطرناک ہوتا۔

۳: تیسرے مرحلہ میں جو حقیقت میں گزشتہ حکم کی ایک دلیل ہے۔ مزید کہتا ہے: "نہ تو یہ عورتیں کافروں پر حلال ہیں اور نہ ہی وہ کافر مرد ان ایماندار عورتوں پر حلال ہیں۔" (لاھن حل لھم ولا ھم یحلون لھن)۔

یہ اسی طرح ہونا چاہیئے، کیونکہ ایمان و کفر ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتے اور ازدواج کا مقدس پیمان مومن و کافر کے درمیان رابطہ قائم نہیں کر سکتا۔ اِس لیے کہ یہ دونوں دو متضاد نظریات رکھتے ہیں جبکہ پیمانِ ازدواج کو بیوی اور شوہر کے درمیان ایک قسم کی وحدت قائم کرنی چاہیے اور یہاں دونوں ایک دوسرے سے سازگار نہیں ہیں۔

البتہ ابتداءِ اسلام میں جبکہ ابھی اِسلامی معاشرہ مستحکم نہیں ہوا تھا ایسے شوہر اور بیویاں تھیں کہ جن میں سے ایک کافر اور دوسرا مسلمان ہوتا تھا۔ مگر پیغمبرؐ اس سے منع نہیں کرتے تھے، یہاں تک کہ اسلام کی بنیادیں مضبوط ہو گئیں۔ چنانچہ ظاہری طور پر صلح حدیبیہ کے بعد مکمل طور پر جُدائی کا حکم دیا گیا، اور زیرِ بحث آیت اِس موضوع کی ایک دلیل ہے۔

۴: چونکہ عربوں میں معمول یہ تھا کہ وہ اپنی عورتوں کا حق مہر پہلے دے دیتے تھے۔ لہٰذا چوتھے حکم میں مزید کہتا ہے: "ان کے کافر شوہروں نے جو کچھ اس ازدواج میں خرچ کیا ہے وہ ان کو دے دو۔" (و اٰتوھم ما انفقوا)۔

یہ ٹھیک ہے کہ ان کے شوہر کافر ہیں، لیکن چونکہ جُدائی اور علیحدگی کا اقدام ایمان لانے کی بناء پر عورت کی طرف سے شروع ہوا ہے۔ لہٰذا عدالت اِسلامی کا تقاضا یہ ہے کہ اس شوہر کے خسارے پورے کیے جائیں۔

کیا یہاں انفاق سے مُراد صرف حق مہر ہے یا اس میں وہ تمام اخراجات شامل ہیں جو اُس نے اس سلسلہ میں کیے ہیں؟ اکثر مفسرین نے پہلے معنیٰ کو اختیار کیا ہے اور آیت میں قدرِ مسلّم بھی یہی ہے۔ اگرچہ "ابوالفتوح رازیؒ" کے مانند بعض مفسرین نے

اپنی تفسیر میں دُوسرے مخارج بھی اس میں شامل کیے ہیں۔ [1]

البتہ یہ حق مہر کا ادا کرنا ایسے مُشرکین کے بارے میں تھا جنھوں نے مُسلمانوں کے ساتھ حدیبیہ یا دُوسرے مواقع پر ترکِ مخاصمت کا عہد کیا تھا۔

لیکن یہ مہر کس کو ادا کرنا چاہیے؟ ظاہر یہ ہے کہ یہ کام حکومتِ اسلامی اور بیت المال کے ذمّہ ہے، کیونکہ ایسے تمام امور جن کا اسلامی معاشرہ میں کوئی خاص شخص ذمّہ دار نہیں وہ حکومت ہی کے ذمّہ ہوتے ہیں اور زیرِ بحث آیت میں جمع مخاطب کا صیغہ اسی معنی کا گواہ ہے۔ (جیسا کہ چور کی حد اور زانی کی حد والی آیات میں نظر آتا ہے۔)

۵: ایک اور حکم جو اوپر والے احکام کے بعد آیا، وہ یہ ہے کہ فرماتا ہے: "اگر تم ان کے ساتھ نکاح کرلو تو تم پر کوئی گناہ نہیں ہے جبکہ تم ان کا حق مہر ادا کردو۔ (ولا جناح علیکم ان تنکحوھن اذا اٰتیتموھن اجورھن)۔

کہیں تم یہ تصوّر نہ کرلو۔ چونکہ وہ سابقہ شوہر سے حق مہر پہلے ہی لے چکی ہیں اور اس کے بدلے میں بیت المال سے اُس کے شوہر کو دے دیا گیا ہے اور تمھارا مفت میں کام ہو جائیگا۔ نہیں! ایسا نہیں ہے۔ عورت کی حرمت اور عزّت کا تقاضا یہی ہے کہ جدید ازدواج میں بھی مُناسب حق مہر اس کو دیا جائے۔

توجہ رکھنا چاہیے کہ یہاں عورت اپنے کافر شوہر سے طلاق کے بغیر الگ ہو جائے گی لیکن عدّت پوری کرنا پڑے گی۔

مشہور فقیہہ "صاحبِ جواہر" نے محقق کے کلام کی شرح کرتے ہُوئے کہ جو اُنھوں نے شرائع میں بیان کیا کہا ہے کہ: "اہلِ کتاب زوجہ وشوہر کے علاوہ، زوجہ وشوہر میں سے جو کوئی بھی اِسلام قبول کرلے۔ اگر یہ دُخول سے پہلے ہو تو عقد بلا فاصلہ فسخ ہو جائے گا۔ اگر دُخول کے بعد ہو تو پھر وہ عدّت کے ساتھ وابستہ ہے۔" فرماتے ہیں: "ان احکام میں کسی قسم کا کوئی اختلاف نہیں ہے، کیونکہ روایات اور فقہاء کے فتوے اس بارے میں ہم آہنگ ہیں۔" [2]

۶: لیکن اگر مُعاملہ اس کے برعکس ہو، یعنی شوہر اسلام قبول کرلے اور عورت کفر پر باقی رہے تو یہاں بھی زوجیت کا رابطہ ٹوٹ جائے گا اور نکاح فسخ ہو جائے گا۔ جیسا کہ اسی آیت کو جاری رکھتے ہُوئے فرماتا ہے: "کافر بیویوں کو اپنی زوجیت میں نہ روکے رکھو۔" (ولا تمسکوا بعصم الکوافر)۔

"عصم"، "عصمت" کی جمع ہے جو اصل میں منع کرنے کے معنی میں ہے، یہاں جیسا کہ مفسّرین نے کہا اور قرائن گواہی دیتے ہیں، نکاح اور زوجیت کے معنی میں ہے۔ (البتہ بعض نے یہ تصریح کی ہے کہ اس سے مُراد نکاح دائمی ہے اور عصمت کی تعبیر بھی اسی معنی کے ساتھ مُناسبت رکھتی ہے۔ کیونکہ نکاح دائمی عورت کو کسی بھی دُوسرے شخص سے ازدواج کرنے سے ہمیشہ کے لیے منع کرتا ہے۔

---

[1] تفسیر ابوالفتوح رازی جلد ۱۱ ص ۵۴

[2] جواہر الکلام جلد ۳۰ ص ۵۴

"کوافر"، "کافرۃ" کی جمع اور کافر عورتوں کے معنی میں ہے۔ کیا یہ حکم مشرک عورتوں کے ساتھ ہی مخصوص ہے یا اہلِ کتاب مثل عیسائی اور یہودی عورتوں کے لیے بھی ہے؟ اس بارے میں فقہاء کے درمیان اختلاف ہے۔ اس سلسلے میں روایات مختلف ہیں اور ان کی تشریح و تفصیل کا فقہ کی کتابوں میں مطالعہ کرنا چاہیئے۔ لیکن آیت کا ظاہر مطلق ہے اور تمام کافر عورتوں کے لیے ہے۔ نیز شانِ نزول اسے محدود نہیں کرتا۔ لیکن عدت کا مسئلہ یہاں بطریقِ اولیٰ برقرار ہے۔ کیونکہ اگر اُس عورت سے بچہ پیدا ہو تو وہ مسلمان بچہ ہوگا کہ اُس کا باپ مسلمان ہے۔

۷: آخری حکم جو آیت میں بیان ہوا ہے اس میں ان عورتوں کے حق مہر کے بارے میں گفتگو ہے جو اسلام سے علیحدگی اختیار کر کے اہلِ کفر سے جا ملیں، فرماتا ہے: "اگر تمہاری عورتوں میں سے کوئی اسلام سے الگ ہو جائے تو تم حق رکھتے ہو کہ جو حق مہر تم نے ادا کیا ہے اس کا مطالبہ کرو، جیسا کہ وہ حق رکھتے ہیں کہ اپنی ان عورتوں کے مہر کا مطالبہ کریں۔ جو اُن سے جُدا ہو کر اسلام سے وابستہ ہو گئی ہیں۔ (وسئلوا ما انفقتم ولیسئلوا ما انفقوا) اور یہ عدالت اور برابر حقوق کا تقاضا ہے۔

جو کچھ بیان ہو چکا، آیت کے آخر میں ان پر تاکید کرتے ہوئے فرماتا ہے: "یہ اللہ کے وہ احکام ہیں جن کا وہ تمہیں حکم دیتا ہے اور خدا علیم و حکیم ہے۔" (ذالکم حکم اللہ یحکم بینکم و اللہ علیم حکیم)۔

یہ ایسے احکام ہیں جن کا سرچشمہ علمِ الٰہی ہے۔ یہ حکمت کی آمیزش رکھتے ہیں، ان میں تمام افراد کے حقوق نظر میں رکھے گئے ہیں اور یہ اصل اسلامی عدالت و انصاف کے ساتھ کامل طور پر ہم آہنگ ہیں۔ ان احکام کے اجراء کیلئے عظیم ترین ضمانت شمار ہوتا ہے۔

دوسری اور آخری زیرِ بحث آیت میں اسی بات کو جاری رکھتے ہوئے فرماتا ہے: "اگر تمہاری بیویوں میں سے بعض تمہارے ہاتھ سے نکل گئی ہوں اور اسلام کو چھوڑ کر کفار سے جا ملی ہوں۔ اس کے بعد تمہیں جنگ میں ان پر کامیابی حاصل ہو جائے اور کچھ مالِ غنیمت تمہارے ہاتھ لگ جائے تو ان افراد کو جو اپنی بیویاں ہاتھ سے دے بیٹھے ہیں، جتنا مہر انھوں نے ادا کیا ہوا ہے اتنا غنائم میں سے انھیں دے دو۔ (وان فاتکم شیء من ازواجکم الی الکفار فعاقبتم فاتوا الذین ذھبت ازواجھم مثل ما انفقوا)۔

گزشتہ آیت کے مطابق مسلمان اس قسم کی عورتوں کا حق مہر کفار سے لے سکتے تھے، جیسا کہ وہ حق رکھتے تھے کہ اپنی ان بیویوں کا حق مہر مسلمانوں سے لے لیں جو اسلام سے وابستہ ہو کر مدینہ کی طرف ہجرت کر گئی ہیں۔ لیکن بعض روایات کے مطابق اس عادلانہ حکم پر مسلمانوں کے عمل کے باوجود مشرکین مکہ نے اُس سے روگردانی کی۔ لہٰذا ان افراد کے حق کو ضائع ہونے سے بچانے کے لیے یہ حکم دیا گیا کہ جب مالِ غنیمت ہاتھ آئے تو پہلے ان کا حق دیا جائے اور اس کے بعد باقی مالِ غنیمت کو تقسیم کیا جائے۔

یہ احتمال بھی ہے کہ اوپر والا حکم ایسی اقوام کے ساتھ مربوط ہو جن سے مسلمانوں کا کوئی عہد و پیمان نہیں تھا، لہٰذا طبعی طور پر وہ اس قسم کی عورتوں کا حق مہر مسلمانوں کو واپس دینے کے لیے تیار نہیں تھے۔ تاہم دونوں معانی کا جمع ہونا بھی ممکن ہے۔

"عاقبتم" "معاقبۃ" کے مادہ سے اصل میں "عقب" (بروزن کعب) "پاؤں کی ایڑی" کے معنی میں ہے، اسی مناسبت سے لفظ "عقبیٰ" کسی کام کی جزا کے معنی میں اور "عقوبت" کسی غلط کام کی سزا کے معنی میں استعمال ہوتا ہے اور بعض اوقات

یہ لفظ "مناقبہ" باری باری کام کرنے کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے، کیونکہ وہ لوگ جو کسی کام کو باری باری انجام دیتے ہیں، ان میں سے ہر ایک دوسرے کے بعد آپہنچتا ہے۔ اس لیے اوپر والی آیت میں "عاقبتم" مسلمانوں کے کفار پر غالب ہونے اور انھیں سزا دینے کے معنی میں ہے جو ضمنی طور پر غنائم لینے سے تفسیر ہوا ہے اور "تناوب" (باری باری) کے معنی میں بھی ہے، کیونکہ ایک دن کفار کی باری ہے تو دوسرے دن مسلمانوں کی باری آجاتی ہے اور یہ اُن پر غالب آجاتے ہیں۔

یہ احتمال بھی دیا گیا ہے کہ اس جملہ سے مُراد کام کا انتہا اور آخر کو پہنچنا ہے۔ یہاں کام کی انتہا سے مُراد جنگی غنائم حاصل کرنا ہے، ان معانی میں سے جو کوئی معنی بھی ہو نتیجہ ایک ہی ہے صرف اس نتیجے تک پہنچنے کے راستے مختلف بیان کیے گئے ہیں۔ (غور کیجیے)

آیت کے آخر میں تمام مُسلمانوں کو تقوٰی کی دعوت دیتے ہوئے فرماتا ہے: "جس خُدا پر تم سب ایمان لائے ہو اس سے ڈرو اور اس کی مخالفت نہ کرو" (واتقوا اللہ الذی انتم بہ مؤمنون)۔

ممکن ہے یہاں تقوٰے کا حکم اِس بناء پر ہو کہ عام طور پر حق مہر کی تشخیص میں بیوی اور شوہر کے قول پر ہی اعتماد کیا جاتا ہے۔ کیونکہ اس کے ثبوت کا طریقہ ان کے قول کے علاوہ اور کوئی نہیں ہے۔ لہٰذا اس بات کا امکان ہے کہ شیطانی وسوسے مقدارِ واقعی سے زیادہ کا دعوٰے کرنے کا سبب بن جائیں اسی لیے انھیں تقوٰی کی وصیت اور نصیحت کرتا ہے۔

تواریخ اور روایات میں آیا ہے کہ یہ اسلامی حکم صرف چھ عورتوں کو شامل ہوا جو اپنے مسلمانوں شوہروں سے جُدا ہو کر کفار سے جا ملیں اور پیغمبرؐ نے ان کا حق مہر جنگی غنائم سے اُن کے شوہروں کو دیا۔

ایک نکتہ

دشمنوں کے لیے بھی عدالت

اوپر والی آیت میں لطافت وظرافت اور خاص نکتہ کی بات جو مذکورہ احکام میں استعمال ہوئی ہے یہ بتلاتی ہے کہ احکامِ اسلامی کی تشریع میں اصل عدالت پر کس قدر توجہ دی گئی ہے۔ یہاں تک کہ طوفانی اور ہیجانی مواقع پر بھی اس بات کی کوشش کی جاتی ہے کہ کسی شخص حتٰی کہ کفار کو بھی نقصان نہ پہنچے۔

جبکہ دُنیا کا معمول یہ ہے کہ ہیجانی کیفیت میں سب یہی کہتے ہیں کہ حالات حد سے زیادہ سخت ہیں، لہٰذا ان کے لیے تیار رہنا چاہیے۔ اور حقدار کو حق دینے کی گنجائش نہیں ہے۔ لہٰذا ہر قسم کی بے سروسامانی کو برداشت کرنا چاہیے۔ لیکن قرآن کہتا ہے کہ سخت ترین حالات میں بھی یہ کوشش کرنی چاہیے کہ کسی کا حق ضائع نہ ہو، اور نہ صرف دوست بلکہ اگر دشمن بھی کوئی حق رکھتا ہو تو اس کی بھی رعایت کرنا چاہیے۔

اس قسم کے اسلامی احکام، اعجاز کی ایک قسم اور پیغمبرؐ کی دعوت کی حقانیت کی نشانی ہیں کہ جو اس قسم کے ماحول میں بھی جہاں نہ مال کا کوئی احترام تھا اور نہ ہی جان کی کوئی قدر وقیمت تھی، اسلام حقدار کو اس کا حق دینے میں اس حد تک کوشش کرتا ہے۔

(۱۲) يَاَيُّهَا النَّبِيُّ اِذَا جَآءَكَ الْمُؤْمِنٰتُ يُبَايِعْنَكَ عَلٰٓى اَنْ لَّا يُشْرِكْنَ بِاللّٰهِ شَيْـًٔا وَّلَا يَسْرِقْنَ وَلَا يَزْنِيْنَ وَلَا يَقْتُلْنَ اَوْلَادَهُنَّ وَلَا يَاْتِيْنَ بِبُهْتَانٍ يَّفْتَرِيْنَهٗ بَيْنَ اَيْدِيْهِنَّ وَاَرْجُلِهِنَّ وَلَا يَعْصِيْنَكَ فِيْ مَعْرُوْفٍ فَبَايِعْهُنَّ وَاسْتَغْفِرْ لَهُنَّ اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝

❖ ❖ ❖

ترجمہ

اے پیغمبرؐ! جب مومن عورتیں تیرے پاس آئیں اور تجھ سے ان شرائط پر بیعت کریں کہ وہ کسی چیز کو خدا کا شریک قرار نہیں دیں گی۔ چوری نہیں کریں گی۔ زنا سے آلودہ نہ ہوں گی۔ اپنی اولاد کو قتل نہیں کریں گی اور اپنے ہاتھوں اور پاؤں کے آگے کوئی افتراء اور بہتان نہیں باندھیں گی، اور کسی شائستہ کام میں تیرے حکم کی مخالفت نہیں کریں گی تو تم ان سے بیعت لے لو اور ان کے لیے بارگاہِ خدا میں طلبِ بخشش کرو۔ بیشک خدا بخشنے والا اور مہربان ہے۔

❖ ❖ ❖

تفسیر

عورتوں کی بیعت کے شرائط

گزشتہ آیات کے بعد کہ جن میں مہاجر عورتوں کے احکام کا بیان تھا۔ زیر بحث آیت میں پیغمبرؐ سے عورتوں کے بیعت کرنے کے حکم کی تشریح کرتا ہے۔

جیسا کہ مفسرین نے لکھا ہے کہ یہ آیت فتح مکہ کے دن نازل ہوئی جبکہ پیغمبرؐ نے کوہِ صفا پر قیام فرمایا اور مردوں سے بیعت لی۔ بعدہٗ مکہ کی وہ عورتیں جو ایمان لے آئی تھیں بیعت کرنے کے لیے آپ کی خدمت میں حاضر ہوئیں تو اُوپر والی آیت نازل ہوئی اور ان کی بیعت کی تفصیل بیان کی۔

روئے سخن پیغمبرؐ کی طرف کرتے ہوئے فرماتا ہے: "اے پیغمبرؐ! جب مومن عورتیں تیرے پاس آئیں اور ان شرائط پر تجھ سے بیعت کریں کہ وہ کسی چیز کو خُدا کا شریک قرار نہیں دیں گی، چوری نہیں کریں گی، زنا سے آلودہ نہیں ہوں گی، اپنی اولاد کو قتل نہیں کریں گی، اپنے ہاتھوں اور پاؤں کے آگے کوئی افتراء اور بُہتان نہیں باندھیں گی اور کسی شائستہ حکم میں تیری نافرمانی نہیں کریں گی تو تم اُن سے بیعت لے لو اور ان کے لیے بخشش طلب کرو۔ بے شک خُدا بخشنے والا اور مہربان ہے" (یاایها النبی اذا جاءک المؤمنات یبایعنک علی ان لا یشرکن بالله شیئًا ولایسرقن ولا یزنین ولا یقتلن اولادهن ولا یأتین ببهتان یفترینه بین ایدیهن و ارجلهن ولا یعصینک فی معروف فبایعهن واستغفرلهن الله ان الله غفورٌ رحیم)۔

اس کے بعد پیغمبرؐ نے اُن سے بیعت لی۔

بیعت کی کیفیت کے بارے میں بعض نے یہ لکھا ہے کہ پیغمبرؐ نے پانی کا ایک برتن لانے کا حکم دیا اور اپنا ہاتھ پانی کے اس برتن میں رکھ دیا۔ عورتیں اپنے ہاتھ برتن کے دُوسری طرف رکھ دیتی تھیں۔ بعض نے کہا ہے پیغمبرؐ لباس کے اُوپر سے بیعت لیتے تھے۔

قابل توجہ بات یہ ہے کہ اوپر والی آیت میں عورتوں کے بیعت کرنے کے لیے چھ شرطیں بیان کی گئی ہیں اور ان کے لیے ان سب کو قبول کرنا ضروری ہے۔

۱: ہر قسم کے شرک اور بُت پرستی کو ترک کرنا۔ یہ شرط اسلام و ایمان کی بُنیاد ہے۔

۲: چوری کو ترک کرنا اور شاید اس سے مُراد زیادہ تر شوہر کا مال ہو، کیونکہ اُس زمانہ کی مالی بدحالی، مردوں کی سخت گیری اور تہذیب و تمدن کی سطح کا پست ہونا اس بات کا سبب ہوتا تھا کہ عورتیں اپنے شوہروں کے مال میں سے چوری کریں اور احتمالاً اپنے رشتہ داروں کو دے دیں۔ "ہند" کی داستان جو بعد میں آئے گی، وہ بھی اسی معنی کی گواہ ہے۔ بہرحال آیت کا مفہوم وسیع اور عام ہے۔

۳ : زنا سے آلودہ نہ ہونا۔ کیونکہ تاریخ یہ بتلاتی ہے کہ زمانۂ جاہلیت میں عفت کی راہ سے بہت زیادہ انحراف تھا۔

۴ : اولاد کو قتل نہ کرنا۔ یہ فعل دو صورتوں میں یعنی بعض اوقات "اسقاطِ حمل" کی صورت میں اور کبھی "ؤٰاد" (لڑکیوں اور لڑکوں کو زندہ درگور کرنے) کی صورت میں انجام پاتا تھا۔

۵ : بہتان و افتراء کو ترک کرنا۔ بعض نے اس کی اس طرح تفسیر کی ہے کہ وہ مشکوک بچوں کو راستے سے اٹھالیتی تھیں، اور یہ دعوٰی کرتی تھیں کہ یہ بچہ اُن کے شوہر سے ہے۔ (یہ امر شوہر کی طویل غیبت کے زمانہ میں زیادہ امکان پذیر تھا)

بعض نے اسے شرم آور کام کی طرف اشارہ سمجھا ہے کہ وہ بھی زمانۂ جاہلیت کے باقیات میں سے تھا، وہ یہ تھا کہ ایک عورت اپنے آپ کو چند افراد کے اختیار میں دے دیتی اور جب اس سے کوئی بچہ پیدا ہوتا تو وہ ان میں سے جس کی طرف مائل ہوتی، بچے کو اُس کی طرف منسوب کر دیتی تھی۔

لیکن اس طرف توجہ کرتے ہوئے کہ مسئلہ زنا پہلے بیان ہو چکا ہے اور اس قسم کے کام کا اسلام میں جاری رہنا ممکن نہیں تھا یہ تفسیر بعید نظر آتی ہے اور پہلی ہی تفسیر زیادہ مناسب ہے۔ اگرچہ آیت کے مفہوم کی وسعت ہر قسم کے افتراء اور بہتان کو شامل ہے۔

"بین ایدیھن و ارجلھن" (ان کے ہاتھوں اور پاؤں کے آگے) کی تعبیر، ممکن ہے وہی سرراہ ملنے والے بچوں کی طرف اشارہ ہو جو دودھ پلانے کے وقت ذہن میں ہوتے تھے۔ لہٰذا طبعاً وہ ان کے پاؤں اور ہاتھوں کے سامنے ہوتے تھے۔

۶ : پیغمبرؐ کے اصلاحی احکام کی نافرمانی نہ کرنا۔ یہ حکم بھی وسعت رکھتا ہے اور پیغمبرؐ کے تمام فرامین کو شامل ہے اگرچہ بعض نے اسے زمانۂ جاہلیت کے بعض افعال مثلاً مُردوں پر بلند آواز میں نوحہ کرنا، گریبان چاک کرنا اور منہ کو نوچنا وغیرہ کی طرف اشارہ سمجھا ہے۔

یہاں یہ سوال سامنے آتا ہے کہ عورتوں کی بیعت کیوں ان شرائط کے ساتھ مشروط تھی؟ حالانکہ مردوں کی بیعت صرف اسلام اور جہاد پر تھی۔

اس کے جواب میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ مردوں کے بارے میں اس معاشرے اور ماحول میں جو چیز سب سے زیادہ اہم تھی وہ ایمان اور جہاد ہی تھا۔ چونکہ عورتوں کے لیے جہاد مشروع نہیں تھا لہٰذا ان کے لیے دوسرے شرائط ذکر کرتے ہوئے کہ جن میں توحید کے بعد سب سے زیادہ اہم امور وہی تھے جن سے اس معاشرے کی عورتیں انحراف میں مبتلا تھیں۔

چند نکات

۱ : عورتوں کی بیعت کا ان کی اسلامی شخصیت کے ساتھ ربط

ہم سورۂ فتح کی تفسیر کرتے ہوئے (آیۃ ۱۸ کے ذیل میں) بیعت، اس کے شرائط اور اسلام میں اس کی خصوصیات

کے بارے میں ایک تفصیلی بحث کر چکے ہیں کہ جس کے دُہرانے کی یہاں ضرورت نہیں ہے۔ [1]

یہاں جس بات کا بیان کرنا ضروری ہے، وہ عورتوں کے پیغمبرؐ کی بیعت کرنے کا مسئلہ ہے اور وہ بھی ایسی مفید اور اصلاحی شرائط کے ساتھ کہ جو اوپر والی آیت میں بیان ہوئے ہیں۔

بے خبر اور مفاد پرست لوگوں کے برخلاف جو یہ کہتے ہیں کہ اسلام انسانی معاشرے کے نصف حصے یعنی عورتوں کے لیے کسی قدر و قیمت کا قائل نہیں، اور اُس نے انھیں کسی حساب میں شمار نہیں کیا ہے، یہ مسئلہ اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ اسلام نے اسے خصوصیت کے ساتھ اہم ترین مسائل میں شمار کیا ہے۔ منجملہ ان کے مسئلۂ بیعت ہے جو ایک مرتبہ صلح حدیبیہ میں (ہجرت کے چھٹے سال) اور ایک مرتبہ فتح مکہ میں انجام پایا تو عورتیں بھی مردوں کے دوش بدوش اس خدائی عہد و پیمان میں داخل ہوئیں۔ یہاں تک کہ انھوں نے مردوں کی نسبت زیادہ شرائط کو قبول کیا۔ ایسی شرائط کہ جو عورت کی انسانی حیثیت کو زندہ کرتی تھیں۔ نیز اس کو بے قدر و قیمت متاع میں تبدیل ہونے یا بوالہوس مردوں کی لطف اندوزی کا ذریعہ بننے سے نجات دیتے تھے۔

* * *

۲ : ابوسفیان کی بیوی ہند کی بیعت کا ماجرا

فتح مکہ کے واقعہ میں جن عورتوں نے پیغمبرؐ کی خدمت میں حاضر ہو کر بیعت کی ان میں سے ایک ابوسفیان کی بیوی "ہند" بھی تھی۔ یعنی وہ عورت جس کی طرف سے تاریخ اسلام بہت سے دردناک واقعات محفوظ رکھے ہوئے ہے، ان میں سے ایک میدان اُحد میں حمزہ سید الشہداء کی شہادت کا واقعہ ہے کہ جس کی کیفیت بہت ہی غم انگیز ہے۔

اگرچہ آخرکار وہ مجبور ہو گئی کہ اسلام اور پیغمبر اسلامؐ کے سامنے گھٹنے ٹیک دے اور ظاہراً مسلمان ہو جائے لیکن اس کی بیعت کا ماجرا بتاتا ہے کہ وہ حقیقت میں اپنے سابقہ عقاید کی اسی طرح وفادار تھی، لہٰذا اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں ہے کہ بنی اُمیہ کا خاندان اور ہند کی اولاد نے پیغمبرؐ کے بعد اس قسم کے جرائم کا ارتکاب کیا کہ جن کی سابقہ زمانہ میں کوئی نظیر نہیں ملتی۔

بہرحال مفسرین نے اس طرح لکھا ہے کہ ہند نے اپنے چہرے پر نقاب ڈالا ہوا تھا وہ پیغمبرؐ کی خدمت میں اس وقت حاضر ہوئی جب آپ کوہِ صفا پر تشریف فرما تھے اور عورتوں کی ایک جماعت بھی ہند کے ساتھ تھی۔ جب پیغمبرؐ نے یہ فرمایا کہ میں تم عورتوں سے اس بات پر بیعت لیتا ہوں کہ تم کسی چیز کو خدا کا شریک قرار نہیں دو گی۔ تو ہند نے اعتراض کیا اور کہا: "آپ ہم سے ایسا عہد لے رہے ہیں جو آپ نے مردوں سے نہیں لیا، (کیونکہ اس دن مردوں سے صرف ایمان اور جہاد پر بیعت لی گئی تھی۔)

پیغمبرؐ نے اس کی بات کی پرواہ کیے بغیر اپنی گفتگو کو جاری رکھا اور فرمایا: "کہ تم چوری بھی نہیں کرو گی"۔

---

[1] تفسیر نمونہ جلد ۲۲ میں سورۂ فتح آیۃ ۱۸ کے ذیل میں دیکھیں۔

ہند نے کہا : ابوسفیان کنجوس اور بخیل آدمی ہے میں نے اس کے مال میں سے کچھ چیزیں لی ہیں۔ میں نہیں جانتی کہ وہ انھیں مجھ پر حلال کرے گا یا نہیں ! ابوسفیان موجود تھا، اس نے کہا: "جو کچھ تو نے گزشتہ زمانہ میں میرے مال میں سے لے لیا ہے وہ سب میں نے حلال کیا۔ (لیکن آئندہ کے لیے پابندی کرنا۔)

اس موقع پر پیغمبرؐ ہنسے اور ہند کو پہچان کر فرمایا: "کیا تو ہند ہے؟" اس نے کہا: "جی ہاں یا رسول اللہ! پچھلے امور کو بخش دیجئے خدا آپ کو بخشے۔"

پیغمبرؐ نے اپنی گفتگو کو جاری رکھا: "اور تم زنا سے آلودہ نہیں ہوگی۔"

ہند نے تعجب کرتے ہوئے کہا: "کیا آزاد عورت اس قسم کا عمل بھی انجام دیتی ہے؟" حاضرین میں سے بعض لوگ جو زمانۂ جاہلیت میں اس کی حالت سے واقف تھے اس کی اس بات پر ہنس پڑے۔ کیونکہ ہند کا سابقہ زمانہ کسی سے مخفی نہیں تھا۔

پھر پیغمبرؐ نے اپنی بات کو جاری رکھتے ہوئے فرمایا: "اور تم اپنی اولاد کو قتل نہیں کرو گی۔" ہند نے کہا: "ہم نے تو انھیں بچپن میں پالا پوسا تھا، مگر جب وہ بڑے ہوئے تو آپ نے انھیں قتل کر دیا۔ اب آپ اور وہ خود بہتر جانتے ہیں۔" (اس کی مراد اس کا بیٹا "حنظلہ" تھا جو بدر کے دن علیؑ کے ہاتھوں مارا گیا تھا)

پیغمبرؐ نے اس کی اس بات پر تبسم فرمایا۔ اور جب آپ اس بات پر پہنچے اور فرمایا: "تم بہتان اور تہمت کو روا نہیں رکھو گی"۔ تو ہند نے کہا: "بہتان قبیح ہے اور آپ ہمیں صلاح و درستی، نیکی اور مکارم اخلاق کے سوا اور کسی چیز دعوت نہیں دیتے۔"

جب آپ نے یہ فرمایا: "تم تمام اچھے کاموں میں میرے حکم کی اطاعت کرو گی"۔ تو ہند نے کہا: "ہم یہاں اس لیے نہیں بیٹھی ہیں کہ ہمارے دل میں آپ کی نافرمانی کا ارادہ ہو۔" (حالانکہ مسلّمہ طور پر معاملہ اس طرح نہیں تھا۔ لیکن تعلیماتِ اسلامی کے مطابق پیغمبرؐ اس بات کے پابند تھے کہ ان کے بیانات کو قبول کرلیں) [1]

۳ : معروف میں اطاعت

ان عمدہ نکات میں سے جو اوپر والی آیات سے معلوم ہوتے ہیں ایک یہ ہے کہ پیغمبرؐ کی اطاعت کو معروف کے ساتھ مقید کیا ہے۔ حالانکہ پیغمبرؐ معصوم تھے اور کبھی بھی منکر اور بری بات کا حکم نہیں دیتے تھے۔ لیکن ممکن ہے یہ تعبیر ان تمام احکام کے لیے ایک نمونہ کے عنوان سے ہو جو اسلامی سربراہوں سے صادر ہوتے ہیں۔ یعنی وہ احکام

---

[1] مجمع البیان جلد ۹ ص ۴۷۶

"قرطبی" نے بھی اس داستان کو تھوڑے سے فرق کے ساتھ نقل کیا ہے۔ اسی طرح سے "سیوطی" نے "در المنثور" میں اور "ابوالفتوح رازی" نے تفسیر "روح الجنان" میں زیر بحث آیات کے ذیل میں بیان کیا ہے۔

صرف اسی صورت میں محترم اور قابلِ اجراء ہیں جبکہ وہ تعلیمات قرآن اور اصولِ شریعتِ اسلام کے ساتھ سازگار ہوں اور "لا یعصینک فی معروف" کے مصداق ہوں۔

وہ لوگ (حقیقت سے) کتنے دُور ہیں جو برسرِ اقتدار لوگوں کو واجب الاطاعت سمجھتے ہیں، چاہے وہ کچھ بھی ہوں اور کسی بھی شخص کی طرف سے ہوں۔ حالانکہ یہ ایک ایسی چیز ہے جو نہ تو عقل کے ساتھ سازگار ہے اور نہ ہی شریعت اور قرآن کے حکم کے ساتھ مطابقت رکھتی ہے۔

امیرالمومنینؑ نے اپنے اس خط میں جو آپ نے مصر کے لوگوں کو "مالک اشتر" کی فرمانروائی (گورنری) کے بارے میں لکھا تھا ان تمام اوصافِ بلند کے باوجود جو آپ نے مالک کے بارے میں بیان فرمائے تھے آخر میں یہ لکھا تھا:

فاسمعوا له واطیعوا امره فیما طابق الحق
فانه سیف من سیوف الله [1]

"اُس کی بات کو سنو اور اس کے اس حکم کی جو حق کے مطابق ہو اطاعت کرو، کیونکہ وہ اللہ کی تلواروں میں سے ایک تلوار ہے۔

❖ ❖ ❖

---

[1] نہج البلاغہ خطبہ ۳۸، (یہ وہ مختصر خط ہے۔ جو امامؑ نے مصر کے لوگوں کے نام لکھا تھا اور مالک اشتر کے نام معروف فرمان کے علاوہ ہے۔)

(۱۳) يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَوَلَّوْا قَوْمًا غَضِبَ اللَّهُ عَلَيْهِمْ قَدْ يَئِسُوا مِنَ الْآخِرَةِ كَمَا يَئِسَ الْكُفَّارُ مِنْ أَصْحَابِ الْقُبُورِ

ترجمہ

(۱۳) "اے ایمان لانے والو! وہ قوم جس پر اللہ نے غضب کیا ہے اس سے دوستی نہ کرو۔ وہ آخرت سے اسی طرح مایوس ہو چکے ہیں جس طرح قبروں میں مدفون کفار مایوس ہیں۔"

تفسیر

اس مغضوب علیہ قوم سے دوستی نہ کرو

ہم دیکھ چکے ہیں کہ اس سورۃ کا آغاز، دشمنانِ خدا سے قطع تعلق کرنے کے مسئلہ سے ہوا ہے اور اب اسی چیز پر اس کا اختتام ہو رہا ہے۔ دوسرے لفظوں میں اس سورۃ کا اختتام اس کے آغاز کی طرف ایک بازگشت ہے۔ فرماتا ہے: "اے ایمان لانے والو! وہ قوم جس پر خدا نے غضب کیا ہے اس سے دوستی نہ کرو۔" (یاایھا الذین آمنوا لا تتولوا قومًا غضب اللہ علیھم)۔

تمہیں ان سے دوستی نہیں کرنی چاہیے اور اپنے اسرار اور بھیدوں کو ان تک نہیں پہنچانا چاہیے۔

اس بارے میں کہ "مغضوب علیہم قوم" کون لوگ ہیں، بعض تو صراحت اس کو یہودیوں سے متعلق سمجھتے ہیں، کیونکہ قرآن کی دوسری آیات میں انھیں اس عنوان کے ساتھ یاد کیا گیا ہے جیسا کہ سورۃ بقر کی آیت ۹۰ میں یہود کے بارے میں بیان ہوا ہے: "فباء و بغضب علیٰ غضب" پس وہ غضب بالائے غضب کے مستحق ہوئے۔

یہ تفسیر اس شانِ نزول سے بھی سازگار ہے جو مفسرین نے بیان کی ہے۔ کیونکہ انھوں نے کہا کہ فقراء مسلمین کی ایک جماعت مسلمانوں کی خبریں یہودیوں کے پاس لے جایا کرتی تھی اور یہودی اس کے بدلے میں انھیں اپنے درختوں کے پھل بطور ہدیہ کے دیا کرتے تھے۔ اس پر اوپر والی آیت نازل ہوئی اور انھیں اس کام سے منع کیا۔[1]

لیکن ان تمام باتوں کے باوجود اس آیت کی تعبیرات ایک وسیع مفہوم رکھتی ہیں جو تمام کفار و مشرکین کو شامل ہیں، کیونکہ قرآن مجید میں غضب کی تعبیر "یہود" میں منحصر نہیں ہے بلکہ یہی تعبیر منافقین کے بارے میں بھی آئی ہے۔ (سورۃ فتح ۔۶) اور

[1] "مجمع البیان" جلد ۹ ص ۲۰۶

شانِ نزول بھی آیت کے مفہوم کو محدود نہیں کرتا۔

بنا بریں اس آیت میں جو کچھ بیان ہُوا ہے، وہ اس وسیع مطلب کے ساتھ ہم آہنگ ہے جو اس سورۃ کی پہلی آیت میں دشمنانِ خدا سے دوستی نہ کرنے کے عنوان سے آیا ہے۔

اس کے بعد ایک اور مطلب کو بیان کرتا ہے جو اس نہی کی دلیل کے طور پر بیان ہُوا ہے۔ فرماتا ہے: "وہ آخرت میں نجات سے کلّی طور پر مایوس ہیں جیسا کہ قبروں میں مدفون کفار مایوس ہیں۔ (قد یئسوا من الاٰخرۃ کما یئس الکفار من اصحاب القبور)۔[1]

کیونکہ کفار میں سے جو مرچکے ہیں وہ عالم برزخ میں اپنے کاموں کے نتائج دیکھ رہے ہیں اور تلافی کے لیے واپسی کی کوئی راہ نہیں ہے، لہٰذا وہ کلّی طور پر مایوس ہیں۔ یہ زندوں کا گروہ بھی گناہ سے اس قدر آلودہ ہے کہ ہرگز اپنی نجات کی اُمید نہیں رکھتا، اور یہ ٹھیک کفار کے مُردوں کی طرح ہے۔

اِس قسم کے لوگ یقیناً خطرناک اور ناقابلِ اعتماد افراد ہیں۔ نہ تو ان کے قول پر کوئی اعتماد ہے اور نہ ہی ان کی صداقت اور ارادے پر کوئی اعتبار ہے وہ حق تعالےٰ کی رحمت سے مایوس ہیں، اسی بناء پر ہر جُرم و گناہ پر ہاتھ ڈالتے ہیں، ان حالات میں تم ان پر کس طرح اعتماد کرتے اور ان سے دوستی کرتے ہو؟

* * *

خداوندا! ہمیں اپنے بے پایاں لطف و کرم سے ہرگز محروم و مایوس نہ کرنا۔

پروردگارا! ہمیں ایسی توفیق مرحمت فرما کہ ہم ہمیشہ تیرے دوستوں کے دوست اور دشمنوں کے دشمن رہیں اور تیری دوستی کی راہ میں ثابت قدم رہیں۔

بارالٰہا! ہمیں اپنے اولیاء اور انبیاء کرام کی پیروی کرنے کی توفیق عطا فرما۔

آمین یا ربّ العالمین

۵ رمضان المبارک ۱۴۰۶ ھ

۲۵ ، ۲ ، ۱۳۶۵ ش

اختتام ترجمہ بروز جمعرات بوقت پونے چھ بجے صبح بتاریخ ۱۲ ذیقعد ۱۴۰۷ھ مطابق ۹ جولائی ۱۹۸۷ء بر مکان حقیر کوی جمشیدی محل سلطان محمد شریف۔ قم مقدس۔ ایران

---

[1] بعض نے اس آیت کی تفسیر میں اور احتمال بھی دیئے ہیں۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ وہ آخرت کے ثواب سے اسی طرح مایوس ہیں جس طرح مشرکین اصحاب قبور کے زندہ ہونے سے مایوس ہیں، لیکن جو تفسیر ہم نے اوپر بیان کی ہے وہ زیادہ مناسب ہے۔ (توجہ رہے کہ پہلی تفسیر کے مطابق "من اصحاب القبور" کفار کا وصف ہے اور آخری تفسیر کے مطابق "یئس" سے متعلق ہے۔)

سورۂ صفّ

یہ سورہ مدینہ میں نازل ہوا اور اس کی ۱۴ آیات ہیں

تاریخ اغاز
۵ رمضان المبارک ۱۴۰۶ھ

سُورۂ صفّ کے مضامین

یہ سُورہ درحقیقت دو بُنیادی محوروں کے گرد گھومتا ہے۔ اوّلاً اسلام کی تمام آسمانی ادیان پر برتری اور خدا کی طرف سے اس کی بقاء و دوام کی ضمانت اور ثانیاً اس دین کی حفاظت اور ترقّی کے لیے جہاد کا لازم ہونا۔

لیکن تفصیلی نظر سے اسے سات حصّوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے :۔

۱ : سورۃ کا آغاز جو خداوندِ عزیز و حکیم کی تسبیح سے ہُوا ہے اور بعد کے اُمور و حقائق کو قبول کرنے کے لیے دلوں میں آمادگی پیدا کرتا ہے۔

۲ : گفتار و کردار میں ہم آہنگی اور بلا عمل باتوں سے پرہیز کی دعوت۔

۳ : عزم راسخ اور اتحادِ کامل کے ساتھ جہاد کی دعوت۔

۴ : بنی اسرائیل کی پیمان شکنی کی یاد آوری اور ظہورِ اسلام کے بارے میں مسیح کی بشارت۔

۵ : دین اسلام کی تمام ادیان پر فتح مندی کی ضمانت۔

۶ : جہاد کی طرف مؤثر دعوت اور مجاہدین راہِ حق کی دنیاوی اور اُخروی جزاؤں کا بیان۔

۷ : حضرت عیسیٰؑ کے حواریین کی زندگی کے بارے میں ایک مختصر سا اشارہ اور ان سے ہدایت کا سبق حاصل کرنا۔

لیکن جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں اس سُورہ کا اصلی محور اسلام اور جہاد ہی ہے۔

سُورہ کے لیے "صفّ" کے نام کا انتخاب اس تعبیر کی بناء پر ہے جو اس سورہ کی چوتھی آیت میں آئی ہے، لیکن بعض اوقات یہ سُورہ "عیسیٰ" یا سُورہ حواریین کے نام سے بھی موسُوم ہوا ہے۔

مشہور قول ہے کہ یہ سارا سُورہ مدینہ میں نازل ہُوا ہے اور اس سورہ میں آیاتِ جہاد کا ہونا بھی اس معنی کی تائید کرتا ہے۔ کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ مکّہ میں جہاد کی تشریع قطعاً نہیں ہُوئی تھی۔

سُورۂ صفّ کی تلاوت کی فضیلت

پیغمبر گرامیؐ سے آیا ہے :

"من قرأ سورة عیسیٰ کان عیسیٰ مصلیا علیه مستغفرًا له ما دام فی الدنیا و هو یوم القیامة رفیقه"۔

"جو شخص سورۂ عیسیٰ (سُورۂ صفّ) کو پڑھے تو حضرت عیسیٰ اُس کے لیے دُعائے رحمت کریں گے جب تک وہ دُنیا میں زندہ ہے اس کے لیے استغفار کریں گے اور قیامت میں وہ ان کا رفیق اور ساتھی ہوگا۔[1] (حاشیہ اگلے صفحہ پر)

ایک اور حدیث میں امام محمد باقرؑ سے منقول ہے :

"من قرأ سورة الصف و اومن قرائتها فی فرائضه ونوافله صفه الله مع ملائکته و انبیائه المرسلین"

جو شخص سورۂ صف کو پڑھے یا واجب اور مستحب نمازوں میں اس کی مداومت کرے، خدا اُسے فرشتوں اور انبیاء مُرسلین کی صف میں قرار دے گا۔[1]

* * *

(حاشیہ صفحہ گزشتہ) [1] مجمع البیان جلد ۹ ص ۲۷۷ نور الثقلین جلد ۵ ص ۳۰۹

[1] مجمع البیان جلد ۹ ص ۲۷۷ نور الثقلین جلد ۵ ص ۳۰۹

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

① سَبَّحَ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۚ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ○

② يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَا لَا تَفْعَلُوْنَ ○

③ كَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللّٰهِ اَنْ تَقُوْلُوْا مَا لَا تَفْعَلُوْنَ ○

④ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِهٖ صَفًّا كَاَنَّهُمْ بُنْيَانٌ مَّرْصُوْصٌ ○

ترجمہ

رحمٰن و رحیم خُدا کے نام سے۔

① جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے، وہ سب خُدا کی تسبیح کرتے ہیں، اور وہ صاحبِ قدرت اور حکیم و دانا ہے۔

② اے ایمان لانے والو! تم ایسی بات کیوں کرتے ہو جس پر تم خُود عمل نہیں کرتے۔

③ خُدا کے ہاں یہ بات بہُت ہی غضب کا مُوجب ہے کہ تم ایسی بات کرو جس پر تم خود عمل نہیں کرتے۔

④ خدا اُن لوگوں کو دوست رکھتا ہے جو اس کی راہ میں اس طرح صف بستہ ہو کر قتال کرتے ہیں جیسے وہ سیسہ پلائی ہوئی دیوار ہیں۔

شانِ نزول

مفسرین نے آیۂ لم تقولون مالا تفعلون کی شانِ نزول میں بہت سی روایات بیان کی ہیں کہ جن میں کچھ زیادہ اختلاف نہیں ہے۔ ان میں کچھ یہ ہیں :

۱ : مومنین کی ایک جماعت یہ کہا کرتی تھی کہ (اس کے بعد) جب بھی ہم دشمن کے مقابل ہوں گے تو پشت نہیں پھیریں گے اور فرار نہیں کریں گے۔ لیکن انھوں نے اپنے قول کو پورا نہ کیا، اور جنگ اُحد کے دن بھاگ کھڑے ہوئے، یہاں تک کہ پیغمبر اکرمؐ کی پیشانی زخمی ہوگئی اور آپ کے دو دندانِ مبارک بھی شہید ہو گئے۔

۲ : جس وقت خدا نے شہدائے بدر کا ثواب بیان کیا تو صحابہ کی ایک جماعت نے کہا: "اب جبکہ معاملہ اس طرح ہے تو ہم آئندہ کی جنگوں میں اپنی تمام توانائیاں صرف کر دیں گے، پھر وہ جب اُحد میں بھاگ کھڑے ہوئے تو اوپر والی آیت نازل ہوئی اور انھیں سرزنش کی۔

۳ : مسلمانوں کی ایک جماعت حکمِ جہاد کے نزول سے پہلے یہ کہا کرتی تھی: "اے کاش! خدا ہمیں بہترین اعمال کی نشاندہی کرتا کہ ہم ان پر عمل کرتے"۔ زیادہ دیر نہ گزری تھی کہ خدا نے انھیں یہ خبر دی کہ "افضل اعمال، ایمانِ خالص اور جہاد ہے"۔ لیکن یہ خبر انھیں اچھی نہ لگی اور لیت ولعل کرنے لگے تو یہ آیت نازل ہوئی اور انھیں سرزنش کی۔[1]

❖ ❖ ❖

تفسیر

فولادی دیوار کی طرح جم کر لڑنے والے

اس سورۃ کی ابتداء بھی خدا کی تسبیح کے ساتھ ہے، اسی بناء پر مفسرین نے اس سورۃ کو بھی "مسبحات" (وہ سورتیں جو تسبیحِ خدا سے شروع ہوتی ہیں) میں شمار کیا ہے۔ فرماتا ہے: "جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے وہ سب خدا کی تسبیح کرتے ہیں"۔ (سبح للہ ما فی السماوات وما فی الارض)[2]

اس کی تسبیح کیوں نہ کریں اور اُسے ہر عیب و نقص سے منزّہ شمار کیوں نہ کریں، جبکہ "وہ شکست ناپذیر قادر ہے، اور ہر چیز سے آگاہ ہے"۔ (وھو العزیز الحکیم)۔

---

[1] مجمع البیان جلد ۹ ص ۲۷۸ باقی مفسرین نے بھی کچھ فرق کے ساتھ یہی روایات بیان کی ہیں۔

[2] عالم کے تمام موجودات کی تسبیح کی کیفیت کے سلسلہ میں ہم نے اس تفسیر میں بارہا گفتگو کی ہے ان میں سے سورہ بنی اسرائیل کی آیت ۴۴ کے ذیل میں (تفسیر نمونہ جلد ۱۱) اور سورہ نور کی آیت ۴۱ کے ذیل میں (جلد ۱۴) کو ملاحظہ فرمائیں۔

جیسا کہ ہم پہلے بھی بیان کر چکے ہیں یہ سورہ، سورۂ ایمان و توحید و معرفت ہے۔ موجودات کی عمومی تسبیح کے مسئلہ کی طرف توجہ کہ جو زبانِ حال و قال سے صورت پذیر ہوتی ہے اور اس میں موثر شگفت انگیز نظام جو عزیز و حکیم خالق کے وجود پر بہترین دلیل ہے۔ یہ چیزیں ایمان کی بنیادوں کو دلوں کے اندر مستحکم بناتی اور فرمانِ جہاد کے لیے راستہ استوار کرتی ہیں۔

٭ ٭ ٭

اس کے بعد ان افراد سے جو اپنی کہی ہوئی باتوں پر عمل نہیں کرتے، ملامت و سرزنش کے عنوان سے فرماتا ہے: "اے ایمان لانے والو! تم ایسی بات کیوں کہتے ہو، جس پر عمل نہیں کرتے"؟ (یاایھا الذین اٰمنوا لم تقولون ما لا تفعلون)[1]

اگرچہ شانِ نزول کے مطابق یہ آیات جہاد کی باتوں اور پھر جنگِ اُحد کے دن فرار کر جانے کے بارے میں نازل ہوئی ہیں لیکن ہم جانتے ہیں کہ شانِ نزول آیات کے وسیع مفاہیم کو ہرگز محدود نہیں کرتی۔ لہٰذا ہر قسم کی ایسی گفتگو جس پر عمل نہ ہو، ملامت کے لائق ہے چاہے وہ میدانِ جہاد میں پامردی کے لحاظ سے ہو یا کسی اور مثبت اور تربیتی عمل سے متعلق ہو۔

بعض مفسرین نے ان آیات میں مخاطب کو ظاہری مومن اور باطنی منافق سمجھا ہے، حالانکہ خطاب "یا یھا الذین اٰمنوا" اور بعد والی آیات کی تعبیریں یہ بتاتی ہیں کہ خطاب حقیقی مومنین ہی سے ہے، لیکن ایسے مومنین جو ابھی تک کمالِ ایمان کی سرحد تک نہیں پہنچے اور ان کی گفتار و کردار ہم آہنگ نہیں ہوئے ہیں۔

٭ ٭ ٭

اس کے بعد اسی گفتگو کو جاری رکھتے ہوئے مزید کہتا ہے: "یہ فعل خدا کے نزدیک عظیم غضب کا موجب ہے کہ تم ایسی باتیں کہو جن پر عمل نہیں کرتے (کبر مقتًا عند اللہ ان تقولوا ما لا تفعلون)[2]

مجالسِ عمومی میں بیٹھ کر دادِ سخن دیتے ہو لیکن جب میدانِ عمل کا وقت آتا ہے، تو پھر ہر شخص ایک طرف کو بھاگ کھڑا ہوتا ہے۔

سچے مومنین کی نشانیوں میں سے ایک یہ ہے کہ اُن کی گفتار و کردار سو فیصد ہم آہنگ ہو۔ ہاں جس قدر انسان اس اصل سے دُور ہوتا ہے، اتنا ہی حقیقت ایمان سے دُور ہوتا ہے۔

"مقت" اصل میں "اس شخص کے لیے بغض شدید کے معنی میں ہے جس نے کوئی قبیح کام انجام دیا ہو۔ لہٰذا عرب جاہلی میں جو شخص اپنے باپ کی بیوی کو اپنے نکاح میں لے آتا تھا، اسے "نکاح مقت" کہتے تھے۔ "کبر مقتًا" کے جملہ میں لفظ "مقت" "کبر" کے ساتھ ملا ہوا ہے جو اور بھی شدت و سنگینی اور عمل سے خالی گفتار کے بارے میں خدا کے عظیم

---

[1] "لم" اصل میں "لما" (لام جارہ اور ما استفہامیہ سے مرکب تھا) اس کے بعد اس کا الف کثرت استعمال سے یا "اخبار" و "استفہام" میں فرق رکھنے کے لیے گر گیا ہے۔

[2] بعض مفسرین نے "کبر" کو "افعال مدح و ذم" میں سے سمجھا ہے (تفسیر روح البیان زیر بحث آیات کے ذیل میں) اور بعض نے اسے تعجب کے معنی میں سمجھا ہے۔ (تفسیر کشاف)

غضب اور غصہ کی دلیل ہے۔[1]

"علامہ طباطبائی" "المیزان" میں فرماتے ہیں: "اس بات میں کہ انسان کوئی ایسی بات کہے جسے انجام نہیں دے گا، اور اس بات میں کہ کسی ایسے کام کو انجام نہ دے جو وہ کہتا ہے، فرق ہے۔ پہلا عمل نفاق کی دلیل ہے، اور دوسرا ضعفِ ارادہ کی دلیل ہے۔"

بہرحال اوپر والی آیت ہر قسم کے عہد و پیمان اور وعدہ سے تخلف، یہاں تک کہ بعض کے قول کے مطابق نذر کو بھی شامل ہے۔ اسی لیے مالک اشتر والے فرمان میں آیا ہے کہ امام علیؑ نے اُن سے فرمایا:

"ایاک .... ان تمدهم فتتبع موعدك بخلفك ... والخلف يوجب المقت عند الله والناس. قال الله تعالىٰ: كبر مقتاً عند الله ان تقولوا ما لا تفعلون"

"اور یہ کہ تم لوگوں سے کوئی وعدہ کرو اور پھر اس وعدے سے تخلف کرو۔ اس بات سے سختی کے ساتھ پرہیز کرنا، کیونکہ یہ بات خدا کے ہاں اور لوگوں کے نزدیک بھی خشمِ عظیم کا موجب ہو گی۔ جیسا کہ قرآن کہتا ہے: "كبر مقتاً عند الله ان تقولوا ما لا تفعلون۔"[2]

ایک اور حدیث امام صادق سے آئی ہے:

"عدة المؤمن اخاه نذر لا كفارة فيه فمن اخلف فيخلف الله بدًا ولمقته تعرض. و ذلك قوله: "يا ايها الذين امنوا لم تقولون ما لا تفعلون كبر مقتاً عند الله ان تقولوا ما لا تفعلون"

"مومن کا اپنے بھائی سے وعدہ کرنا ایک قسم کی نذر ہے، اگرچہ اس کا کوئی کفارہ نہیں ہے۔ جو شخص وعدہ کے خلاف کرے گا اُس نے خُدا کی مخالفت کی ہے اور خود کو اُس کے غضب کا مستحق بنا دیا ہے۔ یہ وہی چیز ہے جس کے بارے میں قرآن کہتا ہے: "يا ايها الذين امنوا لم تقولون ما لا تفعلون"[3]

* * *

بعد والی آیت میں اصل مسئلہ کہ جو جہاد ہے، اسے سامنے لاتے ہوئے فرماتا ہے: "خدا ان لوگوں کو دوست رکھتا ہے جو اس کی راہ میں اس طرح سے جہاد کرتے ہیں، جیسے کہ سیسہ پلائی ہوئی دیوار ہو۔" "(ان الله يحب الذين يقاتلون في سبيله صفًّا كانهم بنيان مرصوص)"[4]

---

[1] المیزان جلد ۱۹، ص ۲۸۷

[2] "نہج البلاغۃ" مکتوب ۵۳ (ص ۴۴۳ صبحی صالح)

[3] "اصول کافی" جلد ۲ باب خلف الوعد

[4] "صفًّا" یہاں حال کے معنی میں منصوب ہے۔

اِس بنا، پر محض جنگ کرنا اہم نہیں۔ اہم بات یہ ہے کہ وہ جنگ "فی سبیل اللہ" ہو اور وہ بھی مکمل اتحاد، نظم وضبط کے ساتھ ۔ جیسے کہ فولادی دیوار ہو۔

"صف" اصل میں مصدری معنی رکھتا ہے اور کسی چیز کو سیدھے خط میں قرار دینے کے معنی میں ہے۔ لیکن یہاں اسم فاعل کے طور پر آیا ہے۔

"مرصوص" "رصاص" کے مادہ سے سیسہ کے معنی میں ہے۔ چونکہ بعض عمارتوں کے استحکام اور مضبوطی کے لیے سیسہ پگھلا کر عمارت کے مختلف حصوں میں اِس طرح ڈالتے تھے کہ وہ حد سے زیادہ محکم اور یکجان ہو جاتی تھی۔ اِس لیے ہر محکم اور مضبوط عمارت پر "مرصوص" کا اطلاق ہوتا ہے۔

یہاں مُراد یہ ہے کہ مجاہدین راہِ خدا میں دشمن کے مُقابلے میں ایک دل، ایک جان، مستحکم اور استوار کھڑے ہوں۔ گویا کہ وہ سب آپس میں پیوستہ ہیں کہ جن کے درمیان کوئی شگاف و سوراخ نہیں ہے۔ اِسی لیے تفسیر علی بن ابراہیم میں اس آیت کی توضیح میں یہ کہا ہے: "یصطفون کالبنیان الذی لایزول": "مجاہدین راہِ خدا میں اس دیوار کی طرح صف بستہ ہوتے ہیں جو ہرگز نہیں ڈولتی"۔ [1]

ایک حدیث میں آیا ہے کہ امیرالمومنین علیؑ جب اپنے اصحاب کو جنگ کے لیے "میدانِ صفین" میں آمادہ کرنا چاہتے تھے تو آپ نے فرمایا:

"خدائے عزّوجلّ نے تمھیں اس فریضہ کی طرف رہنمائی کی اور فرمایا ہے: "ان اللہ یحب الذین یقاتلون فی سبیلہ صفًّا کانھم بنیان مرصوص": لہٰذا تم اپنی صفوں کو آہنی دیوار کی طرح مستحکم کرلو۔ جو زرہ پوش ہیں وہ آگے رہیں اور جن کے پاس زرہ نہیں ہے وہ اُن کے پیچھے رہیں۔ دانتوں کو مضبوطی کے ساتھ بھینچ کر رکھو اور نیزوں کے آگے پیچ وخم میں رہو کیونکہ یہ چیز دشمن کے نیزہ کو ردّ کرنے کے لیے زیادہ مؤثر ہے۔ دشمن کے انبوہ کی طرف تیز نگاہ سے دیکھو تاکہ تمھارا دل زیادہ قوی اور تمھاری رُوح زیادہ سکون و آرام میں رہے۔ باتیں کم کرو کہ یہ چیز سستی اور کمزوری کو دُور کرتی ہے اور تمھارے وقار کے لیے زیادہ مُناسب ہے۔ اپنے پرچم اور جھنڈوں کو خم نہ ہونے دو۔ اور انھیں ان کی جگہ سے نہ ہلاؤ۔ نیز دلیر اور بہادر افراد کے علاوہ خود کو کسی کے سپرد نہ کرو۔ [2]

* * *

---

[1] "نورالثقلین" جلد ۵ ص ۳۱۱

[2] "نورالثقلین" جلد ۵ ص ۳۰۱ اسی کے مشابہ نہج البلاغہ کے خطبہ ۱۲۴ میں بھی آیا ہے۔

چند نکات

۱: صفوں میں وحدت کی ضرورت

میدان جنگ میں نظم وضبط اور صفوں کا ملے ہوئے رہنا [illegible] سے مقابلے میں کامیابی کے اہم عوامل میں سے ہے۔ نہ صرف فوجوں کی جنگ میں بلکہ سیاسی اور اقتصادی جنگ میں بھی وحدت کے بغیر کوئی کام نہیں بن سکتا۔

حقیقت میں قرآن دشمنوں کو ایسے تباہ کن سیلاب سے تشبیہ دیتا ہے کہ جسے فولادی بند کے ساتھ ہی روکا جا سکتا ہے۔ "بنیان مرصوص" ایک عمدہ ترین تعبیر ہے جو اس سلسلے میں بیان کی گئی ہے۔ ایک دیوار یا عظیم بند میں سے ہر ایک کا ایک خاص اثر ہے۔ لیکن یہ نقش و اثر اسی صورت میں مؤثر ہوتا ہے جبکہ ان کے درمیان کسی قسم کا فاصلہ اور شگاف نہ ہو اور اس کے اجزاء اس طرح سے متحد ہوں کہ گویا وہ سب ایک ہی چیز ہیں۔ سب کے سب ایک ہاتھ اور ایک عظیم اور محکم مٹھی کی طرح ہوں جو دشمن کی سرکوبی کرکے اُسے ریزہ ریزہ کر دے۔

افسوس اسلام کی یہ عظیم تعلیم بھلا دی گئی ہے اور اتنا بڑا اسلامی معاشرہ نہ صرف یہ کہ "بنیان مرصوص" کی صورت نہیں رکھتا بلکہ پراگندہ صفوں میں تبدیل ہو چکا ہے کہ جو ایک دوسرے کے مقابلے میں کھڑی ہوئی ہیں جن میں سے ہر ایک کے سر میں ہوا اور دل میں ہوس بھری ہوئی ہے۔

اس بات کی طرف توجہ رکھنی چاہیئے کہ وحدتِ صفوف باتوں اور نعروں سے حاصل نہیں ہوتی بلکہ اس کے لیے "وحدتِ ہدف" اور "وحدتِ عقیدہ" کی ضرورت ہے۔ یہ ایک ایسی چیز ہے جو خلوصِ نیت، معرفت واقعی، صحیح اسلامی تربیت اور قرآنی تہذیب و تمدن کے احیاء کے بغیر ممکن نہیں ہے۔

اگر خدا ان مجاہدین کو دوست رکھتا ہے جو بنیان مرصوص کی طرح ہیں تو پھر وہ اُن پراگندہ اور منتشر صفوں کو دشمن رکھتا ہے۔ جیسا کہ اب ہم خدا کے اس غضب کے آثار اس کئی سو ملین معاشرے میں اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں کہ جس کا ایک نمونہ صیہونیوں کے ایک چھوٹے سے گروہ کا اسلامی سرزمین پر مسلط ہو جانا ہے۔ خدایا! ہمیں قرآن اور اس کی حیات بخش تعلیمات کی آگاہی، بیداری اور آشنائی مرحمت فرما۔

۲: گفتار بلا عمل

زبان دل کی ترجمان ہوتی ہے۔ اگر ان دونوں کا راستہ ایک دوسرے سے الگ ہو جائے تو یہ نفاق کی نشانی ہے، اور ہم جانتے ہیں کہ ایک منافق انسان کی فکر روح سلامت نہیں ہوتی۔

بدترین بلائیں جو کسی معاشرے پر مسلط ہو سکتی ہیں اُن میں سے ایک سلبِ اطمینان کی بلا ہے اور اس کا اصلی عامل گفتار کی کردار سے جدائی ہے۔ وہ لوگ باتیں تو کرتے ہیں لیکن ان پر عمل نہیں کرتے۔ وہ ہرگز ایک دوسرے پر اعتماد نہیں

کر سکتے اور مشکلات کے مقابلے میں ہم آہنگ نہیں ہو سکتے - ان کے درمیان اخوت، برادری اور خلوص ہرگز کارفرما نہیں ہو سکتا، ان کی کوئی قدر و قیمت نہیں ہوگی اور کوئی بھی دشمن ان سے مرعوب نہیں ہوگا۔

جب شام کے لشکر کے غارت گروں نے عراق کی سرحد کو تاخت و تاراج کیا اور یہ خبر امام علیؑ کے کانوں تک پہنچی تو آپ کو سخت دکھ پہنچا۔ آپ نے ایک خطبہ دیا اور اس میں فرمایا:

"ایھاالناس المجتمعة ابدانھم المختلفة اھواؤھم، کلامکم یوھی الصم الصلاب، وفعلکم یطمع فیکم الاعداء، تقولون فی المجالس کیت وکیت، فاذا جاء القتال قلتم حیدی حیاد!"

امام علیؑ اپنے خطبے میں، جو آپ کے سوزِ دل کی حکایت بیان کرتا ہے، عراق کے لوگوں سے کہتے ہیں:

"اے وہ لوگو! جن کے بدن تو اکٹھے ہیں لیکن افکار و خواہشات مختلف و پراگندہ ہیں، تمھاری گرما گرم باتیں تو سخت پتھروں کو بھی توڑ دیتی ہیں، لیکن تمھارے کمزور اعمال دشمنوں کو طمع دلاتے ہیں۔ مجالس و محافل میں تو تم اِس طرح اور اُس طرح کہتے ہو لیکن جنگ کے وقت ہائے وائے کرتے ہو کہ اے جنگ ہم سے دُور ہو جا۔"[1]

ایک حدیث میں امام صادقؑ سے مروی ہے کہ آپ نے فرمایا:

"یعنی بالعلماء من صدق فعله قوله، ومن لم یصدق فعله قوله فلیس بعالم"

"عالم وہ ہے، جس کا عمل اس کے قول کی تصدیق کرے۔ جس کا عمل اُس کے قول کی تصدیق نہیں کرتا، وہ عالم نہیں ہے۔"[2]

ایسی اقوام و ملل جو اہلِ قول تو ہیں لیکن اہلِ عمل نہیں ہیں، وہ اسی بناء پر ہمیشہ دشمنوں کے چنگل میں اسیر رہتے ہیں۔ ایک معاصر شاعر نے ان کی سرنوشت ایک خوبصورت داستان میں بلبل اور شکاری باز کی زبانی پیش کرتے ہوئے اس کی تصویر کشی کی ہے:

دوشش می گفت بلبلے با باز
کز چہ حال تو خوشتر است از من
تو کہ زشتی و بد عبوس و مہیب
تو کہ لالی و گنگ و بستہ دہن

---

[1] "نہج البلاغہ" خطبہ ۲۹

[2] "اصول کافی" جلد اوّل (باب صفۃ العلماء حدیث)

مست و آزاد روی دست شہاں
با دو صد ناز می کنی مسکن
من بدیں ناطقی و خوش خوانی
با خوش اندامی و ظریفی تن
قفسم مسکن است و روزم شب
بہرہ ام غصہ است و رنج و محن
باز گفتا کہ راست می گوئی!
لیک بسترش بود بسی روشن
داب تو گفتن است و ناکردن
خوئے من کردن است و ناگفتن

ترجمہ :

کل رات ایک بلبل باز سے کہہ رہی تھی
کہ تیری حالت مجھ سے کیوں بہتر ہے ؟
حالانکہ تو قبیح منظر، ترش رو اور نہیب شکل ہے۔
تو بے زبان گونگا ہے اور تیرا منہ بند ہے۔
تو پھر بھی مست اور آزادی کے ساتھ بادشاہوں کے ہاتھوں پر
سینکڑوں ناز اور نخرے کے ساتھ بیٹھتا ہے۔
لیکن میں اس نطق اور خوش خوانی کے باوجود
اور خوش اندام اور عمدہ بدن کے ساتھ
پنجرہ تو میرا مسکن ہے اور میرا روشن دن شب تاریک ہے۔
میرے نصیب میں غم اور رنج و محن برداشت کرنا ہے۔
باز نے کہا کہ تو سچ کہتی ہے
لیکن اس کا راز تو بہت ہی واضح ہے
تیرا طریقہ صرف باتیں بنانا ہے عمل کرنا نہیں
اور میری عادت عمل کرنا ہے باتیں بنانا نہیں

* * *

⑤ وَ اِذْ قَالَ مُوْسٰی لِقَوْمِهٖ یٰقَوْمِ لِمَ تُؤْذُوْنَنِیْ وَ قَدْ تَّعْلَمُوْنَ اَنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَیْكُمْ ؕ فَلَمَّا زَاغُوْۤا اَزَاغَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ ؕ وَ اللّٰهُ لَا یَهْدِی الْقَوْمَ الْفٰسِقِیْنَ ۝

⑥ وَ اِذْ قَالَ عِیْسَی ابْنُ مَرْیَمَ یٰبَنِیْۤ اِسْرَآءِیْلَ اِنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَیْكُمْ مُّصَدِّقًا لِّمَا بَیْنَ یَدَیَّ مِنَ التَّوْرٰىةِ وَ مُبَشِّرًۢا بِرَسُوْلٍ یَّاْتِیْ مِنْۢ بَعْدِی اسْمُهٗۤ اَحْمَدُ ؕ فَلَمَّا جَآءَهُمْ بِالْبَیِّنٰتِ قَالُوْا هٰذَا سِحْرٌ مُّبِیْنٌ ۝

* * *

ترجمہ

⑤ اس وقت کو یاد کرو جب موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا: "اے میری قوم تم مجھے تکلیف کیوں دیتے ہو، حالانکہ تم جانتے ہو کہ میں تمھاری طرف خُدا کا بھیجا ہُوا رسُول ہُوں۔ جب وہ حق سے مُنحرف ہو گئے تو خُدا نے ان کے دلوں کو ٹیڑھا کر دیا۔ اور خدا فاسقوں کو ہدایت نہیں کرتا۔

⑥ اور اس وقت کو یاد کرو جب عیسیٰ بن مریمؑ نے کہا: اے بنی اسرائیل! میں تمھاری طرف خدا کا بھیجا ہوا رسُول ہُوں۔ میں اس کتاب کی جو مجھ سے پہلے بھیجی گئی، یعنی تورات کی تصدیق کرنے والا ہُوں۔ اور ایک رسُول کی بشارت دینے والا ہوں جو میرے بعد آئے گا اور اس کا نام احمدؐ ہے۔ لیکن جب وہ (احمدؐ) معجزات اور واضح دلائل کے ساتھ اُن کی طرف آیا تو انھوں نے کہا کہ یہ تو ایک کُھلا جادُو ہے۔

تفسیر

میں احمدؐ کے ظہور کی بشارت لے کر آیا ہوں۔

ان دو احکام کے بعد جو گزشتہ آیات میں "گفتار و کردار کی ہم آہنگی" اور "وحدتِ صفوف" کے بارے میں آئے تھے، اس میں ان معنی کی تکمیل کے لیے دو پیغمبروں موسیٰؑ اور عیسیٰؑ کی زندگی کے ایک گوشہ کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ افسوس ہے "گفتار و عمل کی جُدائی" اور "صفوف کے عدمِ نظم" کے کئی واضح نمونے، ایسی منحوس سرنوشت کے ساتھ جو ان امور کے بعد ان میں پیدا ہوئی، ان دونوں کے پیروکاروں کی زندگی میں نظر آتے ہیں۔

پہلے فرماتا ہے: اس وقت کو یاد کرو جب موسیٰؑ نے اپنی قوم سے کہا: "اے میری قوم! تم مجھے کیوں تکلیف پہنچاتے ہو، حالانکہ تم جانتے ہو کہ میں تمہاری طرف خدا کا بھیجا ہوا رسول ہوں" (و اذ قال موسیٰ لقومه یا قوم لم تؤذونني وقد تعلمون انی رسول الله الیکم)۔

یہ آزار و اذیت ممکن ہے ان تمام مخالفتوں اور بہانہ جوئیوں کی طرف اشارہ ہو جو بنی اسرائیل نے موسیٰؑ کی زندگی میں اس عظیم پیغمبر کے ساتھ کی تھیں، یا بیت المقدس کی مانند کسی ماجرے کی طرف اشارہ ہو کہ جس میں انھوں نے موسیٰؑ سے کہا۔ ہم اس شہر میں داخل ہونے کے لیے تیار نہیں اور نہ ہی ہم "عمالقہ" کے ساتھ جنگ پر تیار ہیں جو ایک طاقتور اور جبار گروہ ہے۔ تم اور تمہارا پروردگار جاکر اس کو فتح کرو تو پھر ہم اس میں داخل ہوں گے۔" (مائدہ۔ ۲۴)

اسی سبب سے وہ سالہا سال تک وادیٔ "تیہ" میں گھومتے رہے اور جہاد کے حکم میں فضول، بیہودہ اور کمزور بہانے بنانے کا تلخ مزہ چکھتے رہے۔

لیکن اس چیز کی طرف توجہ کرتے ہوئے جو سورۂ احزاب کی آیت ۶۹ میں وارد ہوئی ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ اذیت و آزار ان ناروا نسبتوں کی طرف اشارہ ہے جو انھوں نے موسیٰؑ کی طرف دیں اور خدا نے موسیٰؑ کو ان سے مبرا قرار دیا تھا۔ اس آیت میں آیا ہے: "یاایها الذین امنوا لا تکونوا کالذین اذوا موسیٰ فبرأه الله مما قالوا و کان عند الله وجیهًا"۔

"اے ایمان لانے والو! تم ان لوگوں کی طرح نہ ہو جاؤ جنھوں نے موسیٰؑ کو اذیت پہنچائی اور خدا نے انھیں (بنی اسرائیل کی ناروا باتوں سے) بری قرار دیا۔

یہ نسبتیں تہمت سی تھیں۔ کبھی تو وہ انھیں اپنے بھائی ہارونؑ کو قتل کرنے کے ساتھ متہم کرتے۔ کبھی (نعوذ باللہ) ایک بدکار عورت کے ساتھ غیر شرعی روابط کی تہمت لگاتے۔ (وہ سازش جو حیلہ باز قارون نے تیار کی تاکہ وہ زکات سے مستثنیٰ رہے) کبھی ان پر جادو اور جنون کا اتہام لگاتے تھے، یا انھیں چند ایک جسمانی عیوب کے ساتھ متہم کرتے تھے کہ جن کی تفصیل سورہ احزاب کی مذکورہ آیت میں آچکی ہے۔[1]

(حاشیہ اگلے صفحہ پر)

یہ کیسے ممکن ہے کہ کوئی شخص کسی پیغمبر پہ ایمان لانے کا دعوے دار ہو اور پھر وہ اس کو ایسی ناروا نسبتیں دے؟ کیا یہ گفتار کے کردار سے جدا ہونے کا واضح ترین نمونہ نہیں ہے؟ اسی لیے تو موسیٰ کہتے ہیں: "باوجودیکہ تم اس بات کا یقین رکھتے ہو کہ میں خدا کا رسول ہوں، پھر یہ ناروا باتیں کیوں کرتے ہو"۔

لیکن یہ عمل سزا کے بغیر نہ رہا جیسا کہ زیر بحث آیت کے آخر میں آیا ہے: "جب وہ حق سے منحرف ہو گئے تو خدا نے بھی اُن کے دلوں کو منحرف کر دیا اور خدا فاسقوں کو ہدایت نہیں کرتا" (فلما زاغوا ازاغ اللہ قلوبھم واللہ لا یھدی القوم الفاسقین)۔

اس سے بڑی مصیبت اور کیا ہو گی کہ انسان خدائی ہدایت سے محروم اور اس کا دل حق سے منحرف ہو جائے؟ [1]

اس تعبیر سے معلوم ہوتا ہے کہ ہدایت وضلالت اگرچہ خدا کی طرف سے ہے، لیکن اس کے اسباب اور عوامل خود انسان کی طرف سے ہوتے ہیں، کیونکہ ایک طرف تو فرماتا ہے: "جس وقت وہ حق سے منحرف ہو گئے تو خدا نے بھی ان کے دلوں کو منحرف کر دیا"۔ یعنی پہلا قدم انھوں نے اُٹھایا ہے، دوسری طرف یہ کہتا ہے: "خدا فاسق قوم کو ہدایت نہیں کرتا"۔ پہلے فسق وگناہ سرزد ہوتا ہے کہ جس سے انسان توفیق وہدایت الٰہی کے سلب ہو جانے کا مستحق ہوتا ہے اور اس کے بعد اس عظیم محرومیت میں گرفتار ہو جاتا ہے۔ اس سلسلہ میں تفصیلی بحث سورۂ زمر کی آیت ۳۶ کے ذیل میں آ چکی ہے۔ (تفسیر نمونہ جلد ۱۹ کی طرف رجوع کریں)۔

بعد والی آیت میں حضرت عیسیٰؑ کی رسالت اور اس کے مقابلے میں بنی اسرائیل کی کارشکنی اور تکذیب کے مسئلہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مزید کہتا ہے: "اس وقت کو یاد کرو جب عیسیٰ ابن مریمؑ نے کہا: اے بنی اسرائیل! میں تمہاری طرف خدا کا بھیجا ہوا رسول ہوں، جبکہ میں اس کتاب کی جو مجھ سے پہلے بھیجی گئی (یعنی تورات) کی تصدیق کرنے والا ہوں"۔ (واذ قال عیسی ابن مریم یا بنی اسرائیل انی رسول اللہ الیکم مصدقا لما بین یدی من التوراۃ)۔

"اور میں اس رسول کی بشارت دینے والا بھی ہوں جو میرے بعد آئے گا۔ اس کا نام احمد ہے"۔ (ومبشرا برسول یأتی من بعدی اسمہ احمد)۔

اس بناء پر میں وہ حلقۂ اتصال ہوں جو اُمتِ موسیٰؑ اور ان کی کتاب کو آنے والے پیغمبر (پیغمبر اسلام) کی اُمت اور ان کی کتاب سے ملانے والا ہوں۔

اس طرح حضرت عیسیٰؑ کا رسالتِ خداوندی کے سوا اور کوئی دعویٰ نہیں تھا اور وہ بھی ایک خاص زمانہ کے لیے تھا۔ بعد میں ان کی طرف الوہیت یا خدا کا بیٹا ہونے کے بارے میں جو افتراء باندھا گیا وہ سب جھوٹ اور بہتان ہے۔

(حاشیہ سابقہ صفحہ) [1] تفسیر نمونہ جلد ۱۷ سورۃ احزاب آیت ۶۹ کے ذیل میں دیکھیں۔

[2] "زاغوا" مادہ "زیغ" سے، صراط مستقیم سے انحراف کے معنی میں ہے۔

اگرچہ بنی اسرائیل کا ایک گروہ اس موعود نبی پر ایمان لے آیا، لیکن ان کی ایک بہت بڑی جمعیت نہایت سختی کے ساتھ اس کے مقابلہ میں کھڑی ہوگئی۔ یہاں تک کہ انھوں نے اس کے واضح معجزات کا بھی انکار کر دیا۔ اس لیے آیت کے آخر میں مزید کہتا ہے: "جب وہ (احمدؐ) ان کے پاس معجزات اور واضح دلائل کے ساتھ آیا تو انھوں نے کہا: یہ تو کھلا ہوا جادو ہے۔" (فلما جاء هم بالبينات قالوا هٰذا سحر مبين)۔

تعجب کی بات یہ ہے کہ گروہ یہود، مشرکینِ عرب سے پہلے اس پیغمبر کو پہچانے ہوئے تھا۔ یہاں تک کہ انھوں نے اس کے شوقِ دیدار کے لیے ترکِ وطن کیا اور ان کے کئی قبائل سرزمینِ مدینہ میں آکر آباد ہو گئے۔ لیکن ان تمام باتوں کے باوجود بہت سے بت پرستوں نے تو اس پیغمبرِ موعود کو پہچان لیا اور اس پر ایمان لے آئے، لیکن اکثر یہودی ہٹ دھرمی، عناد اور انکار پر ڈٹے رہے۔

مفسرین کے ایک گروہ نے "فلما جاء هم" کی ضمیر کو، جیسا کہ ہم نے اوپر نقل کیا ہے، پیغمبر اسلام (احمدؐ) کی طرف لوٹایا ہے۔ لیکن بعض نے یہ نظریہ پیش کیا ہے کہ یہ ضمیر حضرت عیسیٰؑ کی طرف لوٹتی ہے۔ یعنی عیسیٰؑ جب بنی اسرائیل کے لیے واضح معجزات لے کر آئے تو انھوں نے اس کا انکار کیا اور جادو قرار دیا۔

لیکن بعد والی آیات بتلاتی ہیں کہ پہلی تفسیر زیادہ مناسب ہے۔ کیونکہ ان آیات میں اسلام اور پیغمبرِ اسلام کا تذکرہ ہوا ہے۔

* * *

چند نکات

۱: بشارت اور تکمیلِ دین کا ربط

ظہورِ اسلام کے بارے میں عیسیٰؑ کے خبر دینے میں "بشارت" کی تعبیر گزشتہ ادیان کی نسبت اس دین کی تکمیل کی طرف ایک لطیف اشارہ ہے۔ آیاتِ قرآنی کا مطالعہ اور اسلامی عقائد، احکام، قوانین اور مسائلِ اخلاقی و اجتماعی کے سلسلے میں قرآن کے معارف و تعلیمات کا اس کے ساتھ موازنہ کہ جو کتب عہدین (توریت و انجیل) میں آیا ہے، اس برتری کی واضح طور پر نشان دہی کرتا ہے۔

اگرچہ اوپر والی آیت میں اس کے بارے میں کوئی ذکر نہیں کہ یہ بشارت مسیحؑ کی آسمانی کتاب کے متن میں بھی ہے یا نہیں؟ لیکن قرآن کی دوسری آیات، خود انجیل میں اس کے ذکر کی گواہ ہیں۔ سورۃ اعراف آیۃ ۱۵۷ میں آیا ہے: "الذين يتبعون الرسول النبيّ الامي الذي يجدونه مكتوبًا عندهم في التوراة والانجيل"۔ وہ لوگ جو خدا کے بھیجے ہوئے پیغمبر امی کی پیروی کرتے ہیں، وہی پیغمبر جس کی صفات کو وہ اپنے پاس توراۃ و انجیل میں لکھا ہوا پاتے ہیں.... اور بعض دوسری آیات۔[1]

---

[1] "المیزان" جلد ۱۹ ص ۲۹۰

۲ : عہدین کی بشارتیں اور "فارقلیطا" کی تعبیر

اِس میں شک نہیں کہ موجودہ زمانہ میں یہود و نصاریٰ کے پاس جو کچھ تورات و انجیل کے نام سے موجود ہے، وہ خدا کے عظیم پیغمبروں یعنی موسیٰؑ و عیسیٰؑ پر نازل شدہ کتابیں نہیں ہیں۔ بلکہ یہ اُن کتابوں کا ایک ایسا مجموعہ ہے۔ جو اُن کے اصحاب یا ان کے بعد آنے والوں کے ذریعے تالیف ہوا ہے۔ ان کتابوں کا ایک اجمالی مطالعہ اس بات کا زندہ گواہ ہے اور خود عیسائیوں اور یہودیوں کا بھی اِس کے سوا اور کوئی دعویٰ نہیں ہے۔

لیکن اس کے باوجود اس میں بھی شک نہیں ہے کہ موسیٰؑ و عیسیٰؑ کی تعلیمات اور کتبِ آسمانی کے مضامین و مطالب کا کچھ حصہ ان کے پیروکاروں کے کلام کے ضمن میں منتقل ہو گیا ہے۔ اسی بناء پر جو کچھ عہد قدیم (توراۃ اور اس سے وابستہ کتابوں) اور عہدِ جدید (انجیل اور اس سے وابستہ کتابوں) میں آیا ہے، نہ تو اس سارے کو قبول ہی کیا جا سکتا ہے اور نہ ہی وہ سب کا سب قابلِ انکار ہے۔ بلکہ یہ دونوں کتابیں ان دو عظیم پیغمبروں کی تعلیمات اور دوسرے لوگوں کے افکار و تصورات سے وجود میں آئی ہیں۔

بہرحال موجودہ کتب میں بہت سی ایسی تعبیریں نظر آتی ہیں جو ایک عظیم ظہور کی بشارت دیتی ہیں کہ جس کی نشانیاں سوائے اسلام اور اس کے لانے والے کے اور کسی پر منطبق نہیں ہوتیں۔

قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ وہ پیشگوئیاں جو ان کتابوں میں نظر آتی اور پیغمبر اسلام کی ذات پر صادق آتی ہیں ان کے علاوہ انجیل 'یوحنا' کے تین مواردیں لفظ 'فارقلیط' آیا ہے۔[1] اِس کا فارسی نسخوں میں "تسلی دینے والا" کے ساتھ ترجمہ ہوا ہے۔ اب آپ انجیل یوحنا کی طرف رجوع کریں:

"میں باپ سے درخواست کروں گا تو وہ تمھیں دوسرا "تسلی دینے والا" دے گا جو ابد تک تمھارے ساتھ رہے گا۔" [2]

بعد والے باب میں آیا ہے:

"اور جب وہ "تسلی دینے والا" آئے گا جسے میں باپ کی طرف سے تمھاری طرف بھیجوں گا، یعنی سچائی کی روح جو باپ کی طرف سے آئے گی وہ میرے بارے میں شہادت دے گی۔" [3]

پھر اس کے بعد والے باب میں آیا ہے:

لیکن میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ میرا جانا تمھارے لیے مفید ہے، کیونکہ اگر میں نہ جاؤں گا تو وہ "تسلی دینے

---

[1] یہ تفسیر عربی انجیل چاپ لندن مطبع ولیم وٹس سال ۱۸۵۷ء میں آئی ہے۔

[2] انجیل یوحنا باب ۱۵ جملہ ۲۶

[3] انجیل یوحنا باب ۱۶ جملہ ۷

والا" تمہارے پاس نہیں آئے گا۔ لیکن اگر میں چلا جاؤں تو اُسے تمہارے پاس بھیج دوں گا۔[1]

اہم بات یہ ہے کہ سریانی اناجیل کے متن میں جو اصل یونانی سے لی گئی ہیں "تسلی دینے والے" کے بجائے "پارقلیطا" آیا ہے۔ اور یونانی متن میں "پیرکلتوس" آیا ہے کہ جو یونانی لغت کے لحاظ سے "لائق تعریف شخص" کے معنی میں ہے جو "محمدؐ" و "احمدؐ" کا معادل ہے۔

لیکن جب اربابِ کلیسا (عیسائی پادریوں) نے یہ دیکھا کہ اس قسم کے ترجمہ کی نشر و اشاعت اُن کے گھڑے ہوئے نظریات پر ضربِ شدید لگائے گی تو "پیرکلتوس" کی بجائے "پاراکلتوس" لکھ دیا کہ جو "تسلی دینے والے" کے معنی میں ہے۔ اس واضح تحریف کے ذریعے انھوں نے اس زندہ سند کو بدل کر رکھ دیا۔ اگرچہ اس تحریف کے باوجود بھی مستقبل کے عظیم ظہور کی ایک واضح بشارت موجود ہے۔[2]

ایک مشہور عیسائی پادری جو بعد میں مسلمان ہو گیا تھا، (فخر الاسلام مؤلف کتاب معروف انیس الاعلام) کی ناطق گواہی "فارقلیطا" کی تفسیر میں اُس کے عظیم اُستاد کے حوالے سے ہم تفسیر نمونہ کی جلد اوّل میں نقل کر چکے ہیں۔ وہ اس بات کو واضح کرتی ہے کہ یہ بشارتیں "احمدؐ" اور "محمدؐ" نامی شخص کے بارے میں تھیں۔[3]

یہاں ہم آپ کو اس لفظ کے اس ترجمہ کی طرف متوجہ کرتے ہیں جو اس سلسلہ میں دائرۃ المعارف کے بزرگ نے فرانسہ میں کیا ہے۔

محمدؐ موسس دینِ اسلام، خدا کا بھیجا ہوا اور خاتم انبیاء ہے۔ لفظ محمد بہت زیادہ تعریف کیے گئے کے معنی میں ہے۔ اور مادہ حمد سے مشتق ہوا ہے جو تجلیل و تمجید کے معنی میں ہے۔ عجب اتفاق کے زیرِ اثر ایک اور نام ذکر ہوا کہ اس کا مادہ بھی حمد ہی ہے۔ اور لفظ محمدؐ کا مترادف اور ہم معنی ہے، یعنی احمد۔ یہاں احتمال قوی یہ ہے کہ عرب کے عیسائی اس لفظ کو "فارقلیط" کے بجائے استعمال کرتے تھے۔ احمد یعنی زیادہ تعریف کیا ہوا اور لفظ پیرکلتوس کا بہت عمدہ ترجمہ ہے کہ جس کی بجائے غلطی سے لفظ "پارہ کلتوس" رکھ دیا گیا ہے۔ مسلمان مذہبی مولفین نے یہ بارہا گوشزد کیا ہے کہ اس لفظ سے مراد پیغمبر اسلام کے ظہور کی بشارت ہے۔ اور قرآن مجید بھی سورۃ صف کی حیرت انگیز آیت میں اس موضوع کی طرف واضح طور پر اشارہ کرتا ہے۔[4]

خلاصہ یہ ہے کہ "فارقلیطا" کا معنی رُوح القدس یا تسلی دینے والا نہیں ہے، بلکہ یہ "احمدؐ" کے معادل مفہوم رکھتا ہے۔ (غور کیجئے)

۳: کیا پیغمبرِ اسلام کا نام احمدؐ ہے؟

یہاں ایک اہم سوال سامنے آتا ہے کہ پیغمبرِ اسلامؐ کا مشہور نام محمدؐ ہے جبکہ زیرِ بحث آیت میں 'احمدؐ' کے عنوان سے

---

[1] انجیل یوحنا باب ۱۶ جملہ ۷۔ [2] "الفرقان فی تفسیر القرآن" جلد ۲۷، ۲۸ ص ۳۰۶، زیرِ بحث آیت کے ذیل میں وہاں اوپر والے جملوں کے متن کے ساتھ واضح طور پر سریانی متن بھی آیا ہے۔

[3] تفسیر نمونہ جلد اوّل سورۂ بقرۃ آیت ۸۹ کے ذیل میں۔

[4] دائرۃ المعارف بزرگ فرانسہ جلد ۲۳ ص ۴۱۷۶

سے ذکر ہوا ہے۔ یہ دونوں باتیں ایک دوسرے سے کس طرح سازگار ہیں۔

اس سوال کے جواب میں ضروری ہے کہ ذیل کے نکات کی طرف توجہ کی جائے۔:

الف تواریخ میں آیا ہے کہ پیغمبر اسلامؐ بچپن سے ہی دو نام رکھتے تھے۔ یہاں تک کہ لوگ بھی آپ کو دونوں ہی ناموں سے خطاب کیا کرتے تھے۔ آپ کا ایک نام "محمدؐ" اور دوسرا "احمد" تھا۔ پہلا نام آپ کے جد امجد عبدالمطلب نے اور دوسرا نام آپ کی والدہ محترمہ جناب آمنہ نے انتخاب کیا تھا۔

یہ مضمون سیرۃ حلبیہ میں تفصیل کے ساتھ ذکر ہوا ہے:

ب جن لوگوں نے پیغمبر اسلامؐ کو بارہا اس نام کے ساتھ یاد کیا ہے ان میں سے ایک آپ کے چچا ابوطالب تھے۔ آج بھی وہ کتاب جو دیوان ابوطالب کے نام سے ہمارے ہاتھوں میں موجود ہے اس میں بہت سے ایسے اشعار نظر آتے ہیں کہ جن میں پیغمبر گرامیؐ کو 'احمدؐ' کے نام سے یاد کیا گیا ہے مثلاً:

ارادوا قتل احمد ظالموهم

ولیس بقتلهم فیهم زعیم

ان کے اوپر ظلم کرنے والے احمدؐ کے قتل کا ارادہ رکھتے تھے۔
لیکن اس کام کے لیے کوئی رہبر انھیں نہیں مل سکا۔

وان کان احمد قد جائهم

بحق ولم یأتهم بالکذب

احمدؐ قطعی طور پر ایک دینِ حق لے کر ان کے پاس آیا ہے اور،
وہ ہرگز جھوٹا دین لے کر نہیں آیا۔ [1]

دیوانِ ابوطالب کے علاوہ بھی جناب ابوطالب کے کچھ اشعار اس سلسلے میں نقل ہوئے ہیں:

لقد اکرم الله النبی محمدًا

فاکرم خلق الله فی الناس احمد

خدا نے اپنے پیغمبرؐ محمدؐ کو مکرم و محترم قرار دیا ہے۔ اسی لیے لوگوں
کے نزدیک مخلوقِ خدا میں سب سے زیادہ گرامی احمدؐ ہے۔ [2]

ج پیغمبرؐ کے ہمعصر مشہور شاعر "حسان بن ثابت" کے اشعار میں بھی یہ تعبیر نظر آتی ہے:

مفجعة قد شفها فقد احمد

فظلت لالاء الرسول تعدد

---

[1] دیوان ابوطالب ص ۲۵، ۲۹ [2] تاریخ ابن عساکر جلد ۱ ص ۲۷۵

وہ مصیبت زدہ جسے احمدؐ کے فقدان نے کمزور کر دیا تھا۔ وہ ہمیشہ
رسول خدا کے عطایا و مواہب کو شمار کیا کرتا تھا۔[1]

ابوطالب یا ان کے علاوہ دوسرے افراد کے وہ اشعار جن میں (محمدؐ کے بجائے) احمدؐ کا نام آیا ہے اس قدر زیادہ ہیں کہ ان کو یہاں نقل کرنے کی گنجائش نہیں ہے۔ ہم اس بحث کو دو اور عمدہ اشعار کے ساتھ ختم کرتے ہیں جو ابوطالب کے فرزند علیؑ نے کہے ہیں:۔

اتامرنی بالصبر فی نصر احمد
و واللہ ما قلت الذی قلت جازعًا
ساسعی لوجہ اللہ فی نصر احمد
نبی الھدی المحمود طفلا و یافعًا

کیا تو مجھ سے یہ کہتا ہے کہ میں احمدؐ کی مدد اور نصرت میں صبر سے کام لوں۔
خدا کی قسم! میں نے جو کچھ کہا ہے وہ جزع و فزع اور بے صبری کی بناء پر نہیں کہا۔
میں تو خدا کے لیے احمدؐ کی نصرت میں کوشش کرتا ہوں۔
وہی پیغمبر ہدایت جو بچپن اور جوانی میں ہمیشہ محمود اور قابلِ تعریف تھا۔[2]

د جو روایات مسئلہ معراج کے سلسلہ میں وارد ہوئی ہیں ان میں یہ کثرت سے آیا ہے کہ خدا نے پیغمبر اسلام کو شب معراج بارہا "احمدؐ" کے نام سے خطاب کیا۔ شاید اسی وجہ سے یہ مشہور ہو گیا ہے کہ آنحضرتؐ کا نام آسمانوں میں احمدؐ اور زمین میں محمدؐ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ہے۔
ایک حدیث میں امام محمد باقرؑ سے بھی آیا ہے کہ پیغمبر اسلامؐ کے دس نام تھے۔ ان میں سے پانچ نام قرآن میں آئے ہیں۔ "محمدؐ" و "احمدؐ" و "عبداللہ" و "یٰس" و "ن"[3]

ھ جب پیغمبرؐ نے (سورۂ صف) کی اوپر والی آیات کو مدینہ اور مکہ کے لوگوں کے سامنے پڑھا تو یقینی طور پر یہ اہلِ کتاب کے کانوں تک بھی پہنچیں۔ مگر مشرکین اور اہلِ کتاب میں سے کسی نے یہ اعتراض نہیں کیا کہ انجیل تو احمدؐ

---

[1] دیوان حسان بن ثابت ص ۵۹ تحقیق محمد عزت نصراللہ
[2] الغدیر جلد ۷ ص ۳۵۸
[3] نور الثقلین جلد ۵ ص ۳۱۳۔ تفسیر در المنثور جلد ۶ ص ۱۴ میں بھی اس سلسلے میں کئی روایات آئی ہیں کہ جن کے نقل کرنے سے طول ہو جائے گا۔

کے آنے کی بشارت دیتی ہے اور تمہارا نام محمدؐ ہے۔ یہ سکوت خود اس ماحول میں اس نام کی شہرت کی دلیل ہے۔ اگر کوئی اعتراض ہوا ہوتا تو وہ ہمارے لیے بھی نقل ہوتا، کیونکہ دشمنوں کے اعتراضات تاریخ میں ثبت ہیں یہاں تک کہ ایسے مواد میں بھی جو بہت چبھنے والے ہیں۔

اس تمام بحث سے ہم یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ "احمدؐ" پیغمبر اسلامؐ کے مشہور ناموں میں سے تھا۔[1]

---

[1] اس بحث اور گزشتہ بحث میں کتاب "احمد موعود انجیل" اور "تفسیر فرقان" سے بھی استفادہ کیا گیا ہے۔

⑦ وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰی عَلَی اللّٰهِ الْكَذِبَ وَهُوَ يُدْعٰٓى اِلَى الْاِسْلَامِ ۭ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ۝

⑧ يُرِيْدُوْنَ لِيُطْفِـُٔوْا نُوْرَ اللّٰهِ بِاَفْوَاهِهِمْ وَاللّٰهُ مُتِمُّ نُوْرِهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْكٰفِرُوْنَ ۝

⑨ هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ ۙ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ ۝

ترجمہ

⑦ اُس شخص سے بڑھ کر اور کون ظالم ہو گا جو خدا پر جھوٹ باندھے (اور تکذیب کرے) حالانکہ اُسے اِسلام کی دعوت دی جا رہی ہے، اور خُدا ظالم قوم کو ہدایت نہیں کرتا۔

⑧ وہ تو یہ چاہتے ہیں کہ خُدا کے نور کو اپنی پھُونکوں سے بجھا دیں لیکن خدا اپنے نُور کو مکمل کرکے رہے گا، چاہے کافروں کو پسند نہ آئے۔

⑨ وہی تو ہے کہ جس نے اپنے رسُول کو ہدایت اور دینِ حق کے ساتھ بھیجا ہے تاکہ اسے تمام دینوں پر غالب کر دے چاہے مشرکوں کو بُرا ہی لگے۔

تفسیر

وہ نورِ خدا کو اپنی پھونکوں سے خاموش کرنا چاہتے ہیں

گزشتہ آیات میں بیان ہُوا تھا کہ مخالف اور ہٹ دھرم گروہ، پیغمبر اسلامؐ کے بارے میں گزشتہ پیغمبر حضرت عیسیٰؑ

وہ چشمۂ نور کے مقابلہ میں کھڑی ہو سکتی ہیں۔

تاریخ اسلام قرآن کی اس عظیم پیشین گوئی کے پورا ہونے کی ایک زندہ سند ہے، کیونکہ ظہورِ اسلام کے پہلے دن سے ہی اس کی نابودی کے لیے سازشیں اور منصوبے بنائے جاتے رہے ہیں:

کبھی دشمنوں کے تمسخر اور ایذار و آزار کے ذریعے۔

کبھی اقتصادی و اجتماعی مقاطعہ کے ذریعے۔

کبھی اُحد و احزاب و حُنین وغیرہ کے میدانوں میں مختلف جنگوں میں اُلجھانے کے ذریعے۔

کبھی منافقوں کی اندرونی سازشوں کے ذریعے۔

کبھی مسلمانوں کی صفوں میں اختلاف پیدا کرنے کے ذریعے۔

کبھی صلیبی جنگوں کے ذریعے۔

کبھی عظیم اسلامی سلطنت کو چالیس سے زیادہ ملکوں میں تقسیم کرنے کے ذریعے۔

کبھی مذہبی قوانین کو بدل کر اور مسلمان جوانوں کو اُن کی پُرانی تہذیب و تمدن سے دُور کرنے کے ذریعے۔

کبھی جوانوں میں فحشاء و منکر، فساد اخلاق اور انحرافِ عقیدہ کے وسائل کی نشر و اشاعت کے ذریعے۔

کبھی فوجی، سیاسی اور اقتصادی تسلط کے ذریعے۔

اور کبھی دُوسرے طریقوں سے اسلام کو نابُود کرنے کی کوششیں کی گئی ہیں۔

لیکن جس طرح خدا نے ارادہ کیا تھا، یہ نورِ الٰہی روز بروز پھیل رہا ہے اور ہر زمانے میں اسلام کا دامن پہلے سے وسیع ہوتا چلا جا رہا ہے۔ اعداد و شمار بتلاتے ہیں کہ مسلمانوں کی جمعیت، صیہونیوں، صلیبیوں اور مشرق کے مادّیین کی مشترکہ کوششوں کے باوجود بڑھتی ہی جا رہی ہے۔ ہاں! وہ ہمیشہ سے چاہتے تو یہی ہیں کہ خدا کے اس نور کو بجھا دیں، لیکن خدا کا ارادہ کچھ اور ہے۔ اور یہ قرآن کا ایک ابدی اور جاودانی معجزہ ہے۔

قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ یہ مضمون قرآن مجید کی آیات میں دو مرتبہ آیا ہے، اس فرق کے ساتھ کہ ایک مقام پر تو "یریدون ان یطفئوا" آیا ہے۔ (توبہ - ۳۲) لیکن یہاں "یریدون لیطفئوا" ہے۔

راغب "مفردات" میں اس اختلاف اور فرق کی وضاحت کرتے ہوئے کہتا ہے کہ پہلی آیت میں تو مقدمہ کے بغیر خاموش کرنے کی طرف اشارہ ہے، لیکن دوسری آیت میں مقدمات کے ذریعے سمجھانے کی طرف اشارہ ہے۔

یعنی چاہے وہ مقدمات فراہم کریں یا نہ کریں نورِ خدا کو خاموش کرنے کی قدرت نہیں رکھتے۔

* * *

آخری زیرِ بحث آیت میں مزید تاکید کے لیے صراحت کرتے ہوئے کہتا ہے: "وہی ہے کہ جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور دینِ حق کے ساتھ بھیجا، تاکہ وہ اسے تمام دینوں پر غالب کر دے۔ چاہے مشرکین کو بُرا ہی لگے۔" (هو الذی ارسل رسوله بالهدٰی و دین الحق لیظهره علی الدین کله ولو کره المشرکون)۔



"ارسل رسولہ بالھدٰی و دین الحق" کی تعبیر اسلام کی کامیابی اور غلبہ کی رمز کے بیان کے طور پر ہے کیونکہ یہ غلبہ اور کامیابی 'ہدایت' اور 'دینِ حق' کی طبیعت میں رکھی ہوئی ہے۔ اسلام اور قرآن نورِ الٰہی ہیں، اور جہاں کہیں بھی نور ہو وہ اپنے آثار اور نشانیاں دکھا کر رہتا ہے اور یہ کامیابی کا سبب ہے۔ کافروں اور مشرکوں کی ناپسندیدگی اس کی راہ میں کوئی رکاوٹ پیدا نہیں کر سکتی۔

ایک خاص بات ہے کہ یہ آیت بھی تھوڑے سے فرق کے ساتھ قرآن مجید میں تین مرتبہ آئی ہے۔ یعنی سورۂ توبہ (آیت ۳۳) سورۂ فتح (آیت ۳۸) اور اسی سورۂ صف میں بھی ہے۔

لیکن اس بات کو نہیں بھولنا چاہیے کہ یہ تکرار اور تاکید اس زمانہ میں تھی جب اسلام دنیا کے دیگر خطوں میں تو کیا ابھی جزیرہ عرب میں بھی اچھی طرح نہیں پھیلا تھا۔ لیکن قرآن نے اسی وقت تاکید کے ساتھ اس مسئلہ کو پیش کیا اور آئندہ کے واقعات نے اس عظیم پیشین گوئی کی صداقت کو سچ کر دکھایا اور انجام کار اسلام عقل و منطق اور عملی پیش رفت کے لحاظ سے بھی دوسرے ادیان و مذاہب پر غالب آگیا۔ اس نے دشمنوں کو دنیا کے وسیع حصوں سے پیچھے دھکیل کر ان کی جگہ لے لی اور اس وقت بھی بڑھتا ہی جا رہا ہے۔

لیکن اس پیش رفت کا اصلی مرحلہ ہمارے عقیدہ کے مطابق حضرت امام مہدیؑ ارواحنا فداہ کے ظہور کے ساتھ پورا ہوگا اور یہ آیات بھی خود اس عظیم ظہور کی ایک دلیل ہیں۔

اس آیت کے مضمون کے بارے میں کہ اس سے مراد منطقی غلبہ ہے یا غلبۂ قدرت اور اس کا ربط حضرت امام مہدیؑ کے ظہور کے ساتھ کس طرح ہے ہم نے سورۃ توبہ کی آیت ۳۳ کے ذیل میں ضروری بحث کی ہے۔[1]

٭ ٭ ٭

---

[1] تفسیر نمونہ جلد ۷ سورۃ توبہ آیت ۳۳ کی طرف رجوع کریں۔

(۱۰) يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا هَلْ اَدُلُّكُمْ عَلٰى تِجَارَةٍ تُنْجِيْكُمْ مِّنْ عَذَابٍ اَلِيْمٍ ○

(۱۱) تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ وَتُجَاهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِكُمْ وَ اَنْفُسِكُمْ ؕ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ○

(۱۲) يَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ وَ يُدْخِلْكُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ وَ مَسٰكِنَ طَيِّبَةً فِيْ جَنّٰتِ عَدْنٍ ؕ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ○

(۱۳) وَ اُخْرٰى تُحِبُّوْنَهَا ؕ نَصْرٌ مِّنَ اللّٰهِ وَ فَتْحٌ قَرِيْبٌ ؕ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ ○

ترجمہ

(۱۰) اے ایمان لانے والو! کیا میں تمھیں ایسی تجارت کی طرف رہبری نہ کروں جو تمھیں دردناک عذاب سے رہائی بخشے۔

(۱۱) خدا اور اس کے رسولؐ پر ایمان لے آؤ اور خدا کی راہ میں اپنے مالوں اور جانوں کے ساتھ جہاد کرو۔ یہ تمھارے لیے ہر چیز سے بہتر ہے اگر تم جانو۔

(۱۲) اگر تم یہ کام کرو گے تو خدا تمھارے گناہوں کو بخش دے گا اور تمھیں اس جنّت کے باغوں

میں داخل کرے گا جس کے درختوں کے نیچے نہریں جاری ہیں اور بہشتِ جاوداں کے مساکن میں تمھیں جگہ دے گا، اور یہ ایک عظیم کامیابی ہے۔

(۱۳) اور ایک دوسری نعمت تمھیں بخشے گا جسے تم دوست رکھتے ہو۔ اور خدا کی نصرت اور فتح قریب ہے اور مومنین کو بشارت دے دے۔

* * *

تفسیر

سود مند اور بے نظیر تجارت

جیسا کہ ہم اس سورۃ کے آغاز میں بیان کر چکے ہیں اِس آیت کے اہم مقاصد میں سے ایک ایمان اور جہاد کی دعوت ہے۔ زیرِ بحث آیات میں بھی انہی دونوں باتوں کی تاکید ایک ایسی لطیف مثال سے کی گئی ہے جو انسان کے دل و جان میں حرکتِ الٰہی کے جذبے کو وجود میں لاتی ہے۔ وہ جذبہ جو تمام دینوں پر دینِ اسلام کے غلبے کی شرط ہے۔ اِس کی طرف گزشتہ آیات میں بھی اشارہ ہوا ہے۔

پہلے فرماتا ہے: "اے ایمان لانے والو! کیا میں تمھیں ایسی تجارت کی طرف رہبری نہ کروں جو تمھیں دردناک عذاب سے نجات دے؟" (یاایھا الذین اٰمنوا ھل ادلکم علی تجارۃ تنجیکم من عذاب الیم)۔

اس کے باوجود کہ "ایمان" اور "جہاد" یقینی اور قطعی واجبات میں سے ہیں مگر یہاں انھیں حکم کی صورت میں نہیں بلکہ تجارت کی پیش کش کی صورت میں بیان کرتا ہے، وہ بھی ایسی تعبیروں کے ساتھ جو خدا کے بے پایاں لطف و کرم کی حکایت بیان کرتی ہیں۔

اِس میں شک نہیں کہ "عذابِ الیم سے نجات" انسان کی اہم ترین خواہشات میں سے ایک ہے۔ اِس لیے یہ سوال کہ کیا تم چاہتے ہو کہ تمھیں ایسی تجارت کی طرف رہنمائی کروں جو تمھیں عذابِ الیم سے رہائی بخشے، سب کے لیے جالبِ توجہ ہے۔

جب اس سوال کے ساتھ دلوں کو اپنی طرف جذب کر لیا تو ان کے جواب کا انتظار کیے بغیر اس سود مند تجارت کی تشریح کرتے ہوئے فرماتا ہے: "اور وہ یہ ہے کہ تم خدا اور اُس کے رسول پر ایمان لے آؤ اور خدا کی راہ

میں اپنے مالوں اور جانوں سے جہاد کرو۔" (تؤمنون باللہ و رسولہ و تجاھدون فی سبیل اللہ باموالکم و انفسکم)۔ [1]

اس میں شک نہیں کہ خدا کو اس سود مند تجارت کی کوئی ضرورت نہیں ہے بلکہ اس کے نفع کا کلی تعلق صرف مومنین کے ساتھ ہے، اسی لیے آیت کے آخر میں فرماتا ہے: "یہ تمھارے لیے ہر چیز سے بہتر ہے، اگر تم جانو" (ذالکم خیر لکم ان کنتم تعلمون)۔

قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ یاایھا الذین اٰمنوا کے قرینہ سے مخاطب مومنین ہیں اور عین اس حالت میں انھیں "ایمان" اور "جہاد" کی دعوت دیتا ہے۔ ممکن ہے یہ تعبیر اس بات کی طرف اشارہ ہو کہ سطحی اور نام کا ایمان کافی نہیں، گہرے اور خالص ایمان کی ضرورت ہے کہ جو ایثار، فداکاری اور جہاد کا سرچشمہ بن سکے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ خدا اور رسولؐ پر ایمان کا ذکر یہاں اس ایمان کی تشریح ہو جو گزشتہ آیت میں اجمالی طور پر آیا ہے۔

بہرحال پیغمبرؐ پر ایمان خدا پر ایمان سے الگ نہیں ہے جیسا کہ جان کے ساتھ جہاد، مال کے ساتھ جہاد سے جدا نہیں ہو سکتا، کیونکہ تمام جنگیں وسائل و امکانات کی محتاج ہوتی ہیں جنھیں مالی امدادوں کے ذریعے پورا کیا جانا چاہیے۔ بعض لوگ دونوں طرح کے جہادوں پر قادر ہوتے ہیں اور بعض صرف میدانِ جنگ سے پیچھے رہ کر مالی جہاد پر ہی قدرت رکھتے ہیں۔ اسی طرح بعض لوگ صرف جان ہی پیش کر سکتے ہیں اور اسے قربان کرنے پر آمادہ ہوتے ہیں۔

بہرحال دونوں قسم کے جہادوں کو ہر صورت میں ایک دوسرے سے توام ہونا چاہیے تاکہ کامیابی حاصل ہو۔ اگر ہم یہ دیکھتے ہیں کہ مالی جہاد کو مقدم رکھا گیا ہے تو اس کی وجہ یہ نہیں کہ وہ جانی جہاد سے زیادہ اہم ہے۔ بلکہ یہ اس وجہ سے ہے کہ وہ اس کا مقدمہ شمار ہوتا ہے، کیونکہ جہاد کے آلات و اسلحہ مالی امدادوں کے ذریعے ہی فراہم ہوتے ہیں۔

یہانتک اس عظیم اور بے نظیر تجارت کے تین ارکان مشخص ہوئے ہیں: "خریدار" خدا ہے۔ "بیچنے والے" صاحبِ ایمان لوگ ہیں، اور "متاع" ان کی جانیں اور مال ہیں۔ اب چوتھے رکن کی نوبت آتی ہے جو اس بڑے سودے کی قیمت ہے۔

فرماتا ہے: "جب تم ایسا کرو گے تو خدا تمھارے گناہ بخش دے گا اور تمھیں جنت کے باغوں میں جس کے درختوں کے نیچے نہریں جاری ہیں اور بہشت جاودانی کے پاکیزہ مسکنوں میں جگہ دے گا۔ اور یہ ایک عظیم کامیابی ہے۔" (یغفر لکم ذنوبکم و یدخلکم جنّٰت تجری من تحتھا الانھار و مساکن طیبۃ فی جنّٰت عدن ذالک الفوز العظیم)۔ [2]

---

[1] تؤمنون باللہ کا جملہ "جملہ استینافیہ" ہے جو تجارت کی تفسیر کرتا ہے اور بعض نے اسے عطفِ بیان سمجھا ہے۔ یہاں یہ "جملہ خبریہ" بمعنی "امر" کی صورت میں ہے۔

[2] یغفر لکم کا جملہ ایک محذوف "شرط" کی "جزا" کے طور پر آیا ہے کہ جس کا سابقہ جملہ سے استفادہ ہوتا ہے۔ تقدیر میں اس طرح ہے۔ ان تؤمنوا باللہ و

(باقی اگلے صفحہ پر)

اُخروی اجر کے مرحلہ میں پہلے گناہوں کی بخشش کی بات کرتا ہے۔ کیونکہ انسان کو زیادہ تر فکر و پریشانی اپنے گناہوں سے ہوتی ہے۔ جب مغفرت اور بخشش یقینی ہو جائے تو پھر فکر کی کوئی بات نہیں ہے۔ یہ تعبیر بتلاتی ہے کہ اس کی راہ میں شہید ہونے والوں کے لیے پہلا ہدیۂ خداوندی یہ ہے کہ وہ اُن کے گناہوں کو بخش دیتا ہے۔

اب رہی یہ بات کہ کیا یہ صرف "حق خدا" کے بارے میں ہے یا "حق الناس" کو بھی شامل ہے؟ تو آیت کا مُطلق ہونا عمومیت کی دلیل ہے۔ لیکن اس بات کی طرف توجہ کرتے ہوئے کہ خدا نے حق الناس خود انھیں کے سپرد کیے ہُوئے ہیں، لہٰذا بعض نے اس کی عمومیت میں شک کیا ہے۔

اِس طرح سے اوپر والی آیات میں دو شانیں تو ایمان کی ہیں، (خدا اور رسولؐ پر ایمان) اور دو شانیں جہاد کی ہیں (مال اور جان کے ساتھ جہاد) اور دو شانیں اُخروی جزاؤں کی ہیں، (گناہوں کی بخشش اور بہشت جاودان میں دخول) اور جیسا کہ ہم دیکھیں گے جو والی آیت میں دنیا میں مواہب الٰہی کی بھی دو شانیں آئی ہیں۔

❖ ❖ ❖

جہاں فرماتا ہے: "اور دوسری وہ نعمت تمھیں عنایت کرے گا جسے تم دوست رکھتے ہو اور تمھیں جس سے بہت لگاؤ ہے اور وہ خدا کی مدد و نصرت اور نزدیک کی فتح ہے۔" (و اخرٰی تحبونها نصر من الله وفتح قریب)۔[1]

کتنی سُود مند اور برکت والی تجارت ہے جو سراسر فتح و کامیابی اور نعمت و رحمت ہے اور اسی وجہ سے اس کو فوز عظیم اور بہت بڑی کامیابی قرار دیا ہے۔

اِسی وجہ سے بعد میں مومنین کو اس عظیم تجارت کے بارے میں مُبارکباد کے ساتھ بشارت دیتا اور مزید کہتا ہے: "اور مومنین کو بشارت دے دو۔" (وبشر المؤمنین)۔

ایک حدیث میں آیا ہے کہ جب لیلۃ عقبۃ (جس رات پیغمبرؐ نے مکہ کے قریب مدینہ کے کچھ لوگوں سے مخفی طور پر مُلاقات کی اور ان سے بیعت لی) رسول اللہؐ اور مدینہ کے مسلمانوں کے درمیان عہد و پیمان ہُوا تو عبداللہ بن رواحہ نے عرض کیا: "اس پیمان کے ضمن میں آپ اپنے لیے اور اپنے پروردگار کے لیے جو شرط چاہیں رکھ لیں۔"

پیغمبرؐ نے فرمایا: "میرے پروردگار کے لیے تو یہ شرط ہے کہ کسی طرح بھی کسی چیز کو اس کا شریک قرار نہیں دو گے اور میرے لیے، یہ شرط ہے کہ جس طرح تم اپنی جان و مال کا دفاع کرتے ہو اسی طرح میرا بھی دفاع کرو گے۔"

عبداللہ نے کہا: "اس کے مقابلے میں ہمیں کیا دیا جائے گا؟"

پیغمبرؐ نے فرمایا: بہشت!

(بقیہ حاشیہ صفحہ سابقہ) (رسولہ و تجاھدوا فی سبیلہ ... یغفر لکم ذنوبکم)۔ یہ احتمال بھی دیا گیا ہے کہ یہ "امر" کا جواب ہو کہ جو تؤمنون اور تجاھدون کے جملہ خبریہ سے معلوم ہوتا ہے۔

[1] "اخرٰی" ایک محذوف موصوف کی صفت ہے۔ مثلاً نعمت یا خصلت۔ بعض نے یہ بھی کہا ہے کہ موصوف "تجارت" ہے لیکن یہ بعید نظر آتا ہے۔

جداللہ نے کہا: ربح البیع لا نقبل ولا نستقبل۔ "کتنا سودمند اور نفع بخش معاملہ ہے؟ نہ تو ہم اس معاملہ سے خود پھریں گے اور نہ ہم اس معاملہ سے پھر جانے کو قبول کریں گے (نہ تو فسخ کریں گے اور نہ ہی فسخ کو قبول کریں گے)"[1]

چند نکات

۱: فتح قریب کون سی ہے؟

ان آیات میں جس فتح کا وعدہ کیا گیا ہے وہ مسلمانوں کو منطقی پہلوؤں میں اور جنگ کے میدانوں میں بھی بارہا حاصل ہوئی ہے۔

لیکن اس بارے میں کہ "فتح قریب" سے مراد کون سی فتح ہے؟ مفسرین نے کئی احتمال دیئے ہیں، اور بہت سے مفسرین نے تو اس کی "فتح مکہ" کے ساتھ تفسیر کی ہے۔ بعض نے ایران و روم کے شہروں کی فتح اور بعض نے تمام اسلامی فتوحات سے تفسیر کیا ہے جو مسلمانوں کے ایمان و جہاد کے بعد تھوڑے سے عرصے میں ہی حاصل ہوگئیں۔

چونکہ مخاطب صرف پیغمبرؐ کے اصحاب و انصار ہی نہیں، بلکہ طول تاریخ کے تمام مومنین اس خطاب کے مخاطب ہیں، لہٰذا "نصر من اللہ و فتح قریب" کا جملہ، ایک وسیع و عریض معنی رکھتا ہے اور یہ ان سب کے لیے ایک بشارت ہے، اگرچہ پیغمبرؐ کے زمانے میں اور ان آیات کے نزول کے وقت، اس کا واضح مصداق فتح مکہ ہی تھا۔

* * *

۲: مساکن طیّبہ کیا ہیں؟

جنّت کی نعمتوں میں سے یہاں خصوصیت کے ساتھ پاکیزہ اور شاندار مساکن کا ذکر ہوا ہے۔ جو جنّت کے ابدی اور جاودانی باغات میں ہوں گے۔ یہ اس وجہ سے ہے کہ انسان کے آسائش و آرام کے بنیادی شرائط میں سے ایک یہی مسکن کا مسئلہ ہے وہ بھی ایسا پاک و پاکیزہ مسکن، جو ہر قسم کی ظاہری و باطنی آلودگی سے پاک ہو کہ جس میں انسان راحت و آرام کے ساتھ رہ سکے۔

راغب "مفردات" میں کہتا ہے: طیّب کا معنی اصل میں ایک ایسی چیز ہے جس سے ظاہری اور باطنی حواس لذّت حاصل کریں۔ یہ ایک جامع معنی ہے جو ایک مسکن کے تمام مناسب شرائط کو اپنے اندر

---

[1] "فی ظلال" جلد ۸ ص ۸۷

لیے ہوئے ہے۔

قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ قرآن میں تین چیزیں آرام وسکون کا سبب شمار کی گئی ہیں :

رات کی تاریکی وجعل اللیل سکنًا (انعام۔۹۶)

سکونت کے لیے گھر واللہ جعل لکم من بیوتکم سکنًا (نحل۔ ۸۰)

محبت کرنے والی بیویاں ومن اٰیاتہ ان خلق لکم من انفسکم ازواجًا لتسکنوا الیھا (روم۔ ۲۱)

۳ : دنیا اولیاء خدا کا تجارت خانہ ہے

نہج البلاغۃ میں آیا ہے کہ امام علیؑ نے ایک ایسے دعویٰ کرنے والے شخص سے، جو اصطلاح کے مطابق "جانماز آب می کشید" (جائے نماز کو بھی غسل دیتا تھا) اور مسلسل دُنیا کی مذمت کیا کرتا تھا، فرمایا: تجھے غلطی لگی ہے، دُنیا ان لوگوں کے لیے جو بیدار و آگاہ ہیں، بہت بڑا سرمایہ ہے۔ اس کے بعد آپ نے تشریح بیان فرمائی۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ دُنیا "متجر اولیاء اللہ" دوستانِ خدا کا تجارتخانہ ہے[1]

اِس بناء پر اگر ایک جگہ دُنیا کو "مزرعۃ اٰخرت" سے تشبیہ دی گئی ہے تو یہاں اسے تجارت خانہ سے تشبیہ دی گئی ہے کہ انسان نے جو سرمایے خُدا سے لیے ہیں، انھیں گراں ترین قیمت میں خود اسی کے ہاتھ بیچ دے اور ناچیز وحقیر مال ومتاع کے بدلے میں اس سے عظیم ترین نعمت حاصل کرلے۔

اصولی طور پر تجارت کی تعبیر اور وہ بھی ایسی فائدہ مند تجارت، انسان کے اہم ترین محرکات کو تحریک دینے کے لیے ہے۔ وہ جلبِ منفعت اور دفعِ ضرر کے محرکات ہیں، کیونکہ یہ خُدائی تجارت صرف سودمند ہی نہیں بلکہ "عذابِ الیم" کو بھی دفع کرتی ہے۔

اسی مطلب کی نظیر سورۂ توبہ کی آیت ۱۱۱ میں بھی آئی ہے: ان اللہ اشتری من المؤمنین انفسھم و اموالھم بانّ لھم الجنۃ : خدا مومنین سے ان کی جانوں اور مالوں کو خرید لیتا ہے اور اس کے بدلے میں انھیں جنّت عطا فرماتا ہے۔

ہم نے اس سلسلے میں سورۂ توبہ کی تفسیر میں بھی تشریح کی ہے۔[2]

* * *

---

[1] نہج البلاغۃ کلمات قصار جملہ ۱۳۱ (تلخیص کے ساتھ) [2] تفسیر نمونہ جلد ۸ (سورۂ توبہ کی آیت ۱۱۱ کے ذیل میں)

(۱۴) يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْٓا اَنْصَارَ اللّٰهِ كَمَا قَالَ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ لِلْحَوَارِيّٖنَ مَنْ اَنْصَارِيْٓ اِلَى اللّٰهِ ؕ قَالَ الْحَوَارِيُّوْنَ نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰهِ فَاٰمَنَتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْۢ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ وَكَفَرَتْ طَّآئِفَةٌ ۚ فَاَيَّدْنَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا عَلٰى عَدُوِّهِمْ فَاَصْبَحُوْا ظٰهِرِيْنَ ۝

* * *

ترجمہ

(۱۴) اے ایمان لانے والو! خدا کے ناصر و مددگار ہو جاؤ، جیسا کہ عیسیٰ ابن مریمؑ نے حواریوں سے کہا تھا۔ خدا کیطرف کون میرا یاور و مددگار بنے گا؟ تو حواریوں نے جواب دیا تھا ہم خُدا کے یاور و مددگار ہیں۔ اس موقع پر بنی اسرائیل کا ایک گروہ تو ایمان لے آیا اور ایک گروہ کافر ہوگیا، ہم نے ان لوگوں کی جو ایمان لائے تھے، ان کے دشمنوں کے مقابلہ میں مدد کی، اور انجام کار وہ ان پر غالب ہوئے۔

* * *

تفسیر

حواریوں کی طرح ہو جاؤ

سُورۃ صف کی اس آخری آیت میں امرِ جہاد پر دوسری مرتبہ تاکید کی گئی ہے کہ جو اس سورۃ کا محور اصلی ہے۔ البتہ اس مسئلے کو ایک دُوسرے طریقہ سے بیان کیا اور بہشت اور بہشت کی نعمتوں سے بھی زیادہ ایک اہم مطلب کو بیان

کرتے ہوئے فرماتا ہے :

"اے ایمان لانے والو ! خدا کے ناصر و مددگار بن جاؤ" (یاایھا الذین امنوا کونوا انصار اللہ)۔

ہاں ! خدا کے مددگار ، وہ خدا جو تمام قدرتوں اور طاقتوں کا سرچشمہ ہے اور سب کی بازگشت اسی کی طرف ہے ۔ وہ خدا جس کی قدرت بے پایاں اور شکست ناپذیر ہے ۔ تعجب کی بات یہ ہے کہ یہاں اُس نے بندوں کو اپنی مدد کے لیے پکارا ہے ۔ اور یہ ایک ایسا افتخار و اعزاز ہے کہ جس کی کوئی نظیر نہیں ہے ۔ اگرچہ اس کا معنیٰ مفہوم وہی پیغمبرؐ اور اس کے دین کی مدد و نصرت ہے ، لیکن اس میں ایک عجیب لطف و رحمت موجود ہے ۔

اس کے بعد ایک تاریخی نمونہ کی طرف اشارہ کرتا ہے تاکہ وہ یہ جان لیں کہ یہ راستہ نہ تو راہ نورد کے بغیر تھا اور نہ ہے ۔ فرماتا ہے :

جیسا کہ عیسیٰ بن مریمؑ نے حواریوں سے کہا تھا : "خدا کی طرف میری مدد کرنے والا کون ہے" (کما قال عیسی ابن مریم للحواریین من انصاری الی اللہ)۔

اور حواریین نے بڑے فخر کے ساتھ جواب دیا : "ہم خدا کے انصار ہیں" (قال الحواریون نحن انصار اللہ)۔

اور اسی راہ میں دشمنانِ خدا کے ساتھ مبارزہ کے لیے اُٹھ کھڑے ہوئے ۔ بنی اسرائیل کا ایک گروہ تو ایمان لے آیا (اور حواریوں کے ساتھ مل گیا) اور ایک گروہ کافر ہوگیا ۔ (فاٰمنت طائفۃ من بنی اسرائیل وکفرت طائفۃ)۔

اِس موقع پر ہماری نصرت اور مدد ان کی کمک کے لیے آپہنچی ۔ "ہم نے ان لوگوں کو جو ایمان لا چکے تھے دشمنوں کے مقابلے میں تقویت دی اور انجام کار وہ غالب آگئے" (فایدنا الذین امنوا علیٰ عدوھم فاصبحوا ظاھرین)۔

تم بھی محمدؐ کے حواری ہو اور اس اعزاز کے ساتھ متفخر ہو کہ اللہ کے انصار ہو جاؤ ، جیسا کہ عیسیٰ کے حواری دشمنوں پر غالب آگئے تھے ، تم بھی کامیاب ہو جاؤ گے ۔ تمھیں اس جہان میں اور دُوسرے جہان میں بھی سربلندی اور افتخار نصیب ہوگا ۔

یہ موضوع رسول اللہؐ کے انصار و اصحاب میں ہی منحصر نہیں تھا ، بلکہ ہمیشہ ہی جبکہ حق کے طرفدار اہلِ باطل کے مقابلے میں مسلسل ٹکراتے رہیں تو وہ خدا کے یاور و انصار ہیں اور انجام کار انھیں بھی کامیابی نصیب ہوگی ۔

رگ رگ است ایں آبِ شیریں و آب شور
بر خلائق می رود تا نفخِ صور !

یہ میٹھا اور کڑوا پانی خون کی رگیں ہیں ۔

جو لوگوں کے اندر نفخ صور تک دوڑتا رہے گا۔

❊ ❊ ❊

ایک نکتہ

حواریّین کون ہیں؟

قرآن مجید میں پانچ مرتبہ عیسیٰؑ کے حواریوں کے بارے میں ذکر آیا ہے، ان میں سے دو مرتبہ تو اسی سورہ میں ہے۔ یہ تعبیر حضرت عیسیٰؑ کے مخصوص بارہ اصحاب کی طرف اشارہ ہے کہ جن کے نام موجودہ اناجیل (انجیل متی و لوقا باب ۶) میں ذکر ہوئے ہیں جیسا کہ ہم نے پہلے بھی اشارہ کیا تھا۔ یہ لفظ مادہ "حور" سے دھونے اور سفید کرنے کے معنی میں ہے۔ چونکہ وہ پاک دل اور باصفا روح رکھتے تھے اور اپنی اور دوسروں کی روح و جان کو پاک و صاف کرنے کی کوشش کرتے تھے، اِس لیے اس لفظ کا ان پر اطلاق ہوا ہے۔

بعض روایات میں آیا ہے کہ حضرت عیسیٰؑ نے ان میں سے ہر ایک کو اپنی نمائندگی کے عنوان سے دُنیا کے مختلف علاقوں کی طرف بھیجا تھا۔ وہ مخلص ایثار کرنے والے مجاہد اور مبارزہ کرنے والے افراد تھے اور انھیں حضرت عیسیٰ سے بہت عشق اور محبت تھی۔

لیکن عیسائیوں کی روایات میں آیا ہے کہ حضرت عیسیٰؑ نے ان میں سے ایک کہ جس کا نام "یھودای اسخریوطی" تھا، آخر کار حضرت عیسیٰ سے خیانت کی اور وہ مطرود و مردود قرار پایا۔

اِس سلسلے میں سورہ آل عمران کے ذیل میں بہت سی وضاحتیں پیش کی جا چکی ہیں۔[1]

ایک حدیث میں آیا ہے کہ پیغمبر گرامیؐ جب عقبہ میں اہلِ مدینہ کی اُس جماعت سے ملے جو بیعت کے لیے آئی تھی تو آپ نے فرمایا:

"اپنے میں سے بارہ افراد کو منتخب کر کے ان کا مجھ سے تعارف کراؤ تاکہ وہ اپنی قوم کے نمائندے ہوں جیسا کہ حواریین کی حضرت عیسیٰ ابن مریمؑ سے نسبت تھی۔[2]

یہ بات ان بزرگواروں کے مقام و مرتبہ کو بھی ظاہر کرتی ہے۔

❊ ❊ ❊

خداوندا! ہمیں توفیق دے کہ ہم اس سودمند تجارت میں شرکت کریں کہ جسے تو نے اپنے اولیاء

---

[1] تفسیر نمونہ جلد ۲ (سورہ آل عمران آیت ۵۲ کے ذیل میں)

[2] الدر المنثور جلد ۶ ص ۲۱۴

کے لیے فراہم کیا ہے، تاکہ ہم بھی اس کی عظیم برکتوں سے بہرہ مند ہوں۔

پروردگارا! اختلاف و پراگندگی نے مسلمانانِ عالم کی صفوں کو دشمنوں کے مقابلے میں متزلزل کر دیا ہے، تو انھیں ایسی آگاہی اور بیداری مرحمت فرما کہ ساری دنیا کے مسلمان "بنیانٍ مرصوص" (سیسہ پلائی ہوئی دیوار) کی طرح خونخوار دشمن کے مقابلے میں ڈٹ جائیں۔

بارِ الٰہا! تیرا دین بے ناصر و مددگار نہیں رہ سکتا، یہ اعزاز و افتخار ہمیں نصیب فرما کہ ہم ان یارانِ اسلام کے زمرہ میں داخل ہوں۔ آمین یا رب العالمین

* * *

سورۂ صف کا اختتام
۱۰ رمضان المبارک ۱۴۰۶، ۲۰۳۰، ۱۳۶۵ ش
ترجمہ کا اختتام
۱۴ ذیقعدہ ۱۴۰۷ھ بمطابق ۱۱ جولائی ۱۹۸۷ء
بر مکانِ حقیر، قُم

سورۂ جُمُعَة

یہ سُورہ مدینہ میں نازل ہُوا اور اِس کی گیارہ آیات ہیں

شروع ۱۰ رمضان المبارک ۱۴۰۶ھ۔ ۳۰/۲/۱۳۶۵ش

سُورۂ جُمعہ کے مضامین

یہ سورہ حقیقت میں دو اصلی اور بنیادی محوروں پر گردش کرتی ہے :

۱ : توحید ، صفاتِ خدا ، پیغمبر اسلامؐ کی بعثت کا ہدف اور مسئلۂ معاد کی طرف توجہ ۔

۲ : نمازِ جمعہ کا اصلاحی نقشہ اور اس عظیم عبادت کی بعض خصوصیات ۔

لیکن دوسرے لحاظ سے اس سورہ کے مطالب کو چند حصّوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے :

۱ : موجودات کی عمومی تسبیح ۔

۲ : تعلیم و تربیت کے لحاظ سے پیغمبرِ اسلامؐ کی بعثت کا ہدف ۔

۳ : مومنین کو تنبیہ کہ وہ دینِ حق کے اصولوں سے منحرف نہ ہوں کہ جس طرح یہودی منحرف ہو گئے ہیں ۔

۴ : موت کے عمومی قانون کی طرف اشارہ جو عالمِ بقاء کی طرف ایک دریچہ ہے ۔

۵ : نمازِ جمعہ کا فریضہ انجام دینے کے لیے تاکیدی حکم ، اور اِس میں شرکت کے لیے کاروبار کی تعطیل ۔

* * *

سُورۂ جُمعہ کی تلاوت کی فضیلت

اِس سورہ کی تلاوت کی فضیلت کے بارے میں بہت سی روایات وارد ہوئی ہیں ۔ چاہے اسے مستقل طور پر پڑھا جائے یا یومیہ نمازوں کے ضمن میں پڑھا جائے ۔

ایک حدیث میں پیغمبرِ اکرمؐ سے مروی ہے :

"و من قرء سورة الجمعة اعطى عشر حسنات بعدد من اتى الجمعة ، وبعدد من لم يأتها فى امصار المسلمين"

"جو شخص سُورہ جمعہ کی تلاوت کرے ، خدا اُسے بلادِ مُسلمین میں سے ان لوگوں کی تعداد سے جو نمازِ جمعہ میں شرکت کرتے ہیں اور ان لوگوں کی تعداد سے جو اس میں شرکت نہیں کرتے ، دس گنا حسنہ بخشے گا" ۔ [1]

---

[1] مجمع البیان آغاز سورۂ جمعہ ، نور الثقلین ج ۵ ص ۳۲۰

ایک اور حدیث میں امام جعفر صادقؑ سے مروی ہے :

"ہمارے شیعوں میں سے ہر مومن پر لازم ہے کہ شب جمعہ میں سورہ "جمعہ" اور سورہ "الاعلیٰ" پڑھے اور جمعہ کے ظہر میں، سورہ، جمعہ اور منافقین پڑھے۔ جب وہ ایسا کرے گا تو گویا اس نے رسول اللہؐ کا عمل انجام دیا اور خدا کے ہاں اس کا اجر و ثواب بہشت ہے۔"[1]

خصوصیت کے ساتھ اس بات کی بہت تاکید ہوئی ہے کہ نماز جمعہ میں سورہ، جمعہ اور منافقین پڑھیں۔ ان روایات میں سے بعض میں یہ آیا ہے کہ حتی الامکان اس کو ترک نہ کریں۔[2]

باوجود اس کے کہ قرأت نماز میں سورہ "توحید" اور "کافرون" سے عدول جائز نہیں ہے، لیکن نماز جمعہ میں خصوصیت سے یہ استثناء ہوا ہے۔ یعنی ان دونوں سورتوں سے سورہ جمعہ اور منافقین کی طرف عدول جائز بلکہ مستحب شمار کیا گیا ہے۔

یہ سب امور قرآن مجید کی اس سورہ کی حد سے زیادہ اہمیت کا نشان ہیں۔

* * *

---

[1] مجمع البیان آغاز سورۃ جمعہ نور الثقلین ج ۵ ص ۳۲۰

[2] نور الثقلین ج ۵ ص ۳۲۱

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

① یُسَبِّحُ لِلّٰہِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الۡاَرۡضِ الۡمَلِکِ الۡقُدُّوۡسِ الۡعَزِیۡزِ الۡحَکِیۡمِ ۝

② ھُوَ الَّذِیۡ بَعَثَ فِی الۡاُمِّیّٖنَ رَسُوۡلًا مِّنۡھُمۡ یَتۡلُوۡا عَلَیۡھِمۡ اٰیٰتِہٖ وَ یُزَکِّیۡھِمۡ وَ یُعَلِّمُھُمُ الۡکِتٰبَ وَ الۡحِکۡمَۃَ ۚ وَ اِنۡ کَانُوۡا مِنۡ قَبۡلُ لَفِیۡ ضَلٰلٍ مُّبِیۡنٍ ۙ

③ وَّ اٰخَرِیۡنَ مِنۡھُمۡ لَمَّا یَلۡحَقُوۡا بِھِمۡ ؕ وَ ھُوَ الۡعَزِیۡزُ الۡحَکِیۡمُ ۝

④ ذٰلِکَ فَضۡلُ اللّٰہِ یُؤۡتِیۡہِ مَنۡ یَّشَآءُ ؕ وَاللّٰہُ ذُو الۡفَضۡلِ الۡعَظِیۡمِ ۝

* * *

ترجمہ

رحمٰن و رحیم خدا کے نام سے

① آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے، وہ ہمیشہ خدا کی تسبیح کرتے رہتے ہیں، اس خدا کی جو مالک اور حاکم ہے اور ہر عیب و نقص سے مبرّا اور عزیز و حکیم ہے۔

② وہی ہے کہ جس نے امیین میں، خود انھیں میں سے ایک رسول مبعوث کیا، تاکہ وہ

اس کی آیات کی ان پر تلاوت کرے ، انھیں پاک کرے اور کتاب وحکمت کی انھیں تعلیم دے ، اگرچہ وہ اِس سے پہلے واضح گمراہی میں تھے ۔

(۳) اور وہ ان دُوسرے لوگوں کے لیے بھی رسُول ہے جو ابھی ان سے مُلحق نہیں ہُوئے ، اور وہ عزیز وحکیم ہے ۔

(۴) یہ خدا کا فضل ہے ، وہ جسے چاہے (اور لائق دیکھے) اسے عطا کر دے ، اور خُدا صاحبِ فضلِ عظیم ہے ۔

* * *

تفسیر

پیغمبر کی بعثت کا مقصد

یہ سُورہ بھی خدا کی تسبیح وتقدیس سے شروع ہو رہا ہے اور اس کے صفاتِ جمال وجلال کے ایک حصّہ اور اس کے اسماءِ حسنیٰ کی طرف اشارہ کر رہا ہے ، جو حقیقت میں آئندہ کے مباحث کے لیے ایک مقدمہ ہے ۔

فرماتا ہے : "آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے وہ ہمیشہ خُدا کی تسبیح کرتے رہتے ہیں ، اور زبانِ حال وقال کے ساتھ اس کو تمام نقائص اور عیوب سے پاک شمار کرتے ہیں" (یسبح للہ ما فی السماوات وما فی الارض) ۔

"وہی خدا جو مالک وحاکم ہے ، اور ہر عیب ونقص سے مبرّا ہے" (الملک القدوس) ۔

"وہ خدا جو عزیز وحکیم ہے" (العزیز الحکیم) ۔

اور اس طرح سے پہلے اس کی "مالکیت اور حاکمیت" کی اور پھر ہر قسم کے ظلم وستم اور نقص وعیب سے اس کے منزّہ ہونے کی تاکید کرتا ہے ، کیونکہ ملوک اور بادشاہوں کے بے حساب مظالم کی طرف توجہ کرتے ہُوئے لفظ "ملک" سے غیر مقدس معانی کا گمان ہوتا ہے جو لفظ "قدوس" سے پاک وپاکیزہ ہو جاتا ہے ۔

اور ایک طرف سے "قدرت اور علم" پر تکیہ کرتا ہے ، جو حکومت کے دو اصلی رُکن ہیں ، اور جیسا کہ آئندہ چل کر معلوم ہو جائے گا کہ یہ صفات اس سُورہ کے آنے والے مباحث کے ساتھ قریبی ربط رکھتے ہیں ، اور یہ اس بات کی نشاندہی کرتے ہیں کہ مختلف آیاتِ قرآنی میں ، حق تعالیٰ کے اوصاف کا انتخاب ، حساب وکتاب اور ایک

خاص قسم کے نظم و ربط کے ماتحت ہوتا ہے۔

موجوداتِ عالم کی عمومی تسبیح کے بارے میں ہم پہلے ہی تفصیلی بحثیں کر چکے ہیں۔[1]

* * *

اس مختصر اور پُرمعنی اشارہ کے بعد، جو مسئلہ توحید اور صفاتِ خدا کی طرف ہوا ہے، پیغمبر اسلام کی بعثت اور اس عظیم رسالت کے ہدف کو، جو خدا کے عزیز و حکیم اور قدوس ہونے کے ساتھ مربوط ہے، بیان کرتے ہوئے اس طرح کہتا ہے: "وہی ہے کہ جس نے امیین میں انھیں میں سے ایک رسول کو مبعوث کیا، تاکہ وہ ان کے سامنے اس کی آیات کی تلاوت کرے"۔ (هو الذی بعث فی الامیین رسولاً منهم یتلوا علیهم آیاته)۔

اور اس تلاوت کے ذریعہ "انھیں ہر قسم کے شرک، کفر، انحراف، فساد اور خرابی سے پاک و پاکیزہ کر دے اور انھیں کتاب و حکمت کی تعلیم دے"۔ (و یزکیهم و یعلمهم الکتاب والحکمة)۔

"اگرچہ وہ اس سے پہلے ضلال مبین اور واضح گمراہی میں تھے"۔ (و ان کانوا من قبل لفی ضلال مبین)۔

قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ پیغمبرِ اسلام کی بعثت کو ان خصوصیات کے ساتھ جن کی طریقِ اعجاز کے علاوہ اور کوئی تعبیر نہیں کی جا سکتی، عظمتِ خدا کی نشانی اور اس کے وجود کی دلیل قرار دیتے ہوئے کہتا ہے:

"خدا وہی ہے کہ جس نے اس شان کے پیغمبر کو مبعوث کیا اور آفرینش میں اس طرح کا شاہکار عالمِ وجود میں لایا ہے۔"

"امیین" جمع ہے "امّی" کی، جس کا معنی ہے "جس نے کسی سے درس نہ پڑھا ہو۔ (جو "ام" (ماں) کے ساتھ منسوب ہے، یعنی ماں کی گود کے علاوہ اور کوئی مدرسہ نہ دیکھا ہو) اور بعض نے اسے "اہلِ مکہ" کے معنی میں سمجھا ہے، کیونکہ "مکہ" کو "ام القریٰ" (آبادیوں کی ماں) کہتے تھے۔ لیکن یہ احتمال بعید نظر آتا ہے، چونکہ نہ تو پیغمبر اسلام صرف اہلِ مکہ کے لیے مبعوث ہوئے اور نہ ہی سورہ جمعہ مکہ میں نازل ہوئی ہے۔

بعض مفسرین نے اس کی یہودیوں اور دوسرے لوگوں کے مقابلہ میں "امتِ عرب" کے معنی میں بھی تفسیر کی ہے، اور وہ سورہ آل عمران کی آیت ۷۵ کو اس معنی پر شاہد سمجھتے ہیں جو یہ کہتی ہے:

قالوا لیس علینا فی الامیین سبیل: "یہودیوں نے کہا کہ ہم امیین (غیر یہود) کے مقابلہ میں جوابدہ نہیں ہیں"۔

اگر ہم اس تفسیر کو قبول بھی کر لیں تو بھی اس کی وجہ یہ ہے کہ یہودی اپنے آپ کو اہلِ کتاب اور پڑھے لکھے افراد سمجھتے تھے اور امتِ عرب کو اَن پڑھ اور بے علم کہتے تھے۔ اس بناء پر پہلی تفسیر زیادہ مناسب ہے۔[2]

---

[1] تفسیر نمونہ جلد ۱۲، ذیل آیت ۴۴ سورۃ اسراء و جلد ۱۴ ذیل آیت ۴۱ سورۃ نور

[2] "امّی" کے معنی کے بارے میں سورہ اعراف کی آیت ۱۵۷ کے ذیل میں ہم نے بہت تفصیل سے بیان کیا ہے (تفسیر نمونہ جلد ۶ کی طرف رجوع کریں)

قابل توجہ بات یہ ہے کہ فرماتا ہے: "پیغمبر اسی گروہ اور اَن پڑھ طبقہ میں سے مبعوث ہوا ہے تاکہ اس کی رسالت کی عظمت کو واضح کرے اور یہ چیز اس کی حقانیت کی دلیل بنے۔ کیونکہ قرآن جیسی کتاب، ایسے عمیق و عظیم مطالب اور اسلام جیسی ثقافت کے ساتھ، محال ہے کہ یہ کسی بشر کی فکر کا ثمرہ ہو۔ وہ بشر بھی ایسا بشر کہ جس نے نہ تو خود کسی کے سامنے تعلیم کے لیے زانوئے ادب تہ کیا ہو اور نہ ہی علم و دانش کے ماحول میں اُس نے پرورش پائی ہو۔ یہ ایک ایسا نور ہے جو ظلمت کی سرزمین سے اٹھا ہے، اور ایک سرسبز باغ ہے جو شورزار سے نکلا ہے، اور یہ خود پیغمبرؐ کی حقانیت کا ایک واضح معجزہ اور ایک روشن سند ہے۔

اوپر والی آیت میں اِس بعثت کے مقصد کا تین چیزوں میں خلاصہ کیا ہے، جن میں سے ایک تو تمہیدی پہلو رکھتی ہے، اور وہ آیاتِ الٰہی کی تلاوت ہے اور دُوسرے دو حصے، یعنی "تہذیب و تزکیۂ نفوس" اور "تعلیم کتاب و حکمت" دو اصلی اور اہم مقاصد ہیں۔

ہاں! پیغمبر اسی لیے آئے ہیں کہ علم و دانش کے سلسلہ میں اور اخلاق و عمل کے بارے میں بھی انسان کی تربیت کریں تاکہ وہ ان دونوں پروں کے ذریعے آسمانِ سعادت کی بلندی پر پرواز کریں اور خدائی راستہ کو اختیار کرکے اس کے مقامِ قرب کو حاصل کریں۔

یہ نکتہ بھی قابلِ توجہ ہے کہ بعض آیاتِ قرآنی میں تو 'تزکیہ' 'تعلیم' پر مقدم ہے اور بعض میں 'تعلیم' 'تزکیہ' پر مقدم شمار ہوئی ہے۔ یعنی چار موارد میں سے تین میں تربیت، تعلیم پر مقدم ہے اور ایک مقام پر تعلیم تربیت پر مقدم ہے۔

یہ تعبیر جہاں ضمناً یہ بتاتی ہے کہ یہ دونوں اُمور ایک دُوسرے میں تاثیرِ متقابل رکھتے ہیں (یعنی اخلاق علم کی پیداوار ہے جیسا کہ علم اخلاق سے پیدا ہوتا ہے) وہاں تربیت کی اصالت کو بھی مشخص کرتی ہے، البتہ اس سے مُراد حقیقی علوم ہیں نہ کہ اصطلاحی کہ جو علم کے لباس میں موجود ہیں۔

ممکن ہے کتاب و حکمت میں یہ فرق ہو کہ کتاب تو قرآن کی طرف اشارہ ہے اور حکمت، پیغمبرؐ کے ارشادات کی طرف اشارہ ہے کہ جس کا نام سُنّت ہے۔

اور یہ بھی ممکن ہے کہ کتاب تو اِسلام کے اصل احکام کی طرف اشارہ ہو اور "حکمت" ان کے فلسفہ اور اسرار کی طرف راجع ہو۔

یہ نکتہ بھی قابلِ توجہ ہے کہ "حکمت" اصل میں بغرض اصلاح کسی کو منع کرنے اور روکنے کے معنی میں ہے اور گھوڑے کی لگام کو اس وجہ سے حکمت کہتے ہیں کہ وہ اسے روک کر صحیح راستے پر ڈالتی ہے۔ اِس بناء پر حکمت سے مُراد عقلی دلائل ہیں۔ یہیں سے واضح ہو جاتا ہے کہ کتاب و حکمت کا ایک دُوسرے کے بعد ذکر ہو سکتا ہے کہ شاید یہ معرفت و شناخت کے دو سرچشموں یعنی "وحی" و "عقل" کی طرف اشارہ ہو یا دوسرے لفظوں میں احکام آسمانی اور تعلیماتِ اسلام کہ ان کا سرچشمہ وحی الٰہی ہے اور وہ عقلی لحاظ سے بھی قابلِ فہم اور لائقِ ادراک ہیں (مراد کلیاتِ

احکام ہیں)

باقی رہا "ضلال مبین" (واضح گمراہی) جو آیت کے ذیل میں قوم عرب کے سابقہ حالات کے عنوان سے بیان ہوا ہے، زمانۂ جاہلیت کی طرف ایک سربستہ اور پُرمعنی اشارہ ہے۔ جس میں گمراہی ان کے پُورے مُعاشرے پر چھائی ہوئی تھی۔ اس سے بدتر گمراہی اور کیا ہوگی کہ وہ اُن "بتوں کی پُوجا کرتے تھے، جنھیں وہ پتھر اور لکڑی سے اپنے ہاتھ سے تراش کر بناتے تھے اور اپنی مشکلات میں انھیں بے شعور موجودات کی پناہ لیتے تھے۔

اپنی بیٹیوں کو اپنے ہاتھ سے زندہ درگور کر دیتے تھے۔ یہ تو آسان تھا۔ لیکن اس عمل پر فخر و مباہات بھی کیا کرتے تھے کہ ہم نے اپنے ناموس کو بیگانوں کے ہاتھ میں نہیں جانے دیا۔

ان کے مراسم نماز و عبادت، خانۂ کعبہ کے پاس تالیاں پیٹنا اور سیٹیاں بجانا تھے، یہانتک کہ عورتیں مادر زاد برہنہ صورت میں خانۂ خدا کے گرد طواف کرتیں اور اسے عبادت شمار کرتی تھیں۔

ہاں! پیغمبر اکرمؐ تشریف لائے اور انھیں کتاب و حکمت کی برکت سے اس ضلال مُبین اور واضح گمراہی سے نجات دلائی اور انھیں تعلیم و تربیت دی اور واقعتاً اِس قسم کے گمراہ معاشرے میں نفوذ پیدا کرنا عظمتِ اسلام کی دلیل اور ہمارے عظیم پیغمبرؐ کا ایک آشکار مُعجزہ ہے۔

* * *

لیکن چُونکہ پیغمبر اسلام صرف اسی اُمّی قوم کے لیے مبعوث نہیں ہُوئے تھے بلکہ آپ کی دعوت پورے عالم کے لیے تھی اِس لیے بعد والی آیت میں مزید کہتا ہے: "اور وہ ان دُوسرے مومنین کے لیے بھی رسُول ہے، جو ابھی تک ان سے مُلحق نہیں ہُوئے۔" (و آخرین منھم لما یلحقوا بھم)[1]

وہ دُوسری قومیں جنھوں نے اصحابِ پیغمبرؐ کے بعد عرصۂ وجود میں قدم رکھا انھوں نے بھی پیغمبرؐ کی تعلیم و تربیت کے مکتب میں پرورش پائی ہے اور وہ بھی قرآن اور سُنّتِ محمدی کے چشمۂ زلال سے سیراب ہُوئے ہیں۔ ہاں! وہ بھی اِس عظیم دعوت میں شامل ہیں۔

اِس طرح سے اوپر والی آیت، عرب و عجم میں ان تمام اقوام کو شامل ہے جو صحابۂ پیغمبر کے بعد وجُود میں آئی ہیں۔

ایک حدیث میں آیا ہے کہ جب پیغمبر اکرمؐ نے اس آیت کی تلاوت فرمائی تو لوگوں نے پوچھا کہ یہ کون لوگ ہیں؟ تو پیغمبرؐ نے اپنا ہاتھ سلمان کے کاندھے پر رکھ کر فرمایا:

"لو کان الایمان فی الثریا لنالتہ رجال من ھٰؤلاء"

"اگر ایمان ثریا (ایک بہت دُور ستارہ ہے جو اس سلسلہ میں ضرب المثل ہے) میں

---

[1] "آخرین" "امیین" پر عطف ہے اور "منھم" کی ضمیر "مومنین" کی طرف لوٹتی ہے جو کلام کے اندر سے معلوم ہوتی ہے۔ بعض نے یہ احتمال بھی دیا ہے کہ "یعلمھم" کی ضمیر پر عطف ہو لیکن پہلا معنی زیادہ مناسب ہے۔

بھی ہو تو اس گروہ (ایرانیوں) میں سے کچھ افراد اس کو وہاں سے بھی حاصل کر لیں گے۔" [1]

چونکہ ان تمام امور کا سرچشمہ خدا کی قدرت و حکمت ہے، لہٰذا آیت کے آخر میں مزید کہتا ہے: "وہ عزیز و حکیم ہے۔" (وھو العزیز الحکیم)۔

اس کے بعد اس عظیم نعمت، یعنی پیغمبر گرامی اسلام کی بعثت اور ان کے ذریعے تعلیم و تربیت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مزید کہتا ہے۔ "یہ خدا کا فضل ہے، وہ جسے چاہے (اور لائق دیکھے اسے) عطا کر دے اور خدا فضل عظیم کا مالک ہے۔" (ذالک فضل اللہ یؤتیہ من یشاء واللہ ذو الفضل العظیم)۔

حقیقت میں یہ آیت سورہ آل عمران کی آیت ۱۶۴ کے مانند ہی ہے جو یہ کہتی ہے: لقد من اللہ علی المؤمنین اذ بعث فیھم رسولاً من انفسھم یتلوا علیھم اٰیاتہ و یزکیھم ویعلمھم الکتاب والحکمۃ وان کانوا من قبل لفی ضلال مبین۔ اور اس آیت کی تمام باتیں تقریباً زیر بحث آیات سے مشابہ ہیں۔

بعض نے یہ احتمال بھی دیا ہے کہ "ذالک فضل اللہ" (یہ اللہ کا فضل ہے) اصل میں مقام نبوت کی طرف اشارہ ہے کہ خدا یہ مقام جسے اس لائق دیکھتا ہے اُسے عطا فرماتا ہے۔

لیکن پہلی تفسیر زیادہ مناسب ہے۔ اگرچہ دونوں تفاسیر کے درمیان جمع بھی ممکن ہے کہ پیغمبر کی رہبری بھی امت کے لیے اللہ کا فضل ہے اور مقام نبوت بھی پیغمبر کے لیے اللہ کا فضل ہے۔

یہ بات کہے بغیر ہی واضح ہے کہ "من یشاء" (جسے چاہے) کی تعبیر کا مفہوم یہ نہیں کہ خدا کسی حساب کتاب کے بغیر ہی اپنے فضل و رحمت سے کسی کو دے دیتا ہے بلکہ یہاں مشیت حکمت کے ساتھ توأم ہے جیسا کہ سورہ کی پہلی آیت میں خدا کی عزیز و حکیم سے توصیف بھی اسی مطلب کو واضح کرتی ہے۔

امیر المومنین علیؑ بھی اس فضل الٰہی کی تشریح میں نہج البلاغۃ میں فرماتے ہیں:

"فانظروا الی مواقع نعم اللہ علیھم، حین بعث الیھم رسولاً، فعقد بملتہ طاعتھم، وجمع علی دعوتہ الفتھم. کیف نشرت النعمۃ علیھم جناح کرامتھا. واسالت لھم جداول نعیمھا. والتفت الملۃ بھم فی عوائد برکتھا فاصبحوا فی نعمتھا غرقین. وفی

---

[1] اس حدیث کو طبرسی نے "مجمع البیان" میں علامہ طباطبائی نے "المیزان" میں سیوطی نے در المنثور میں، زمخشری نے "کشاف" میں، قرطبی نے اپنی تفسیر میں، رازی نے اپنی تفسیر میں اور سید قطب نے "فی ظلال" میں زیر بحث آیت کے ذیل میں نقل کیا ہے۔ یہ حدیث اصل میں صحیح بخاری سے لی گئی ہے۔

خضرة عیشها فکهین".

"اس امت پر خدا کی نعمتوں کی طرف دیکھو! اس زمانے میں جب اپنے رسولؐ کو ان کی طرف بھیجا تو اپنے دین کا انھیں مطیع بنا دیا اور اس کی دعوت کے ساتھ انھیں متحد کیا۔ دیکھو! اس عظیم نعمت نے اپنی کرامت کے پر و بال کس طرح ان پر پھیلا دیئے، اور اپنی نعمتوں کی نہریں ان کی طرف جاری کیں اور دین حق نے اپنی تمام برکتوں کے ساتھ انھیں گھیر لیا۔ وہ اس کی نعمتوں کے درمیان غرق ہیں، اور خوش و خرم زندگی میں شادمان ہیں"۔ [1]

ایک نکتہ

فضلِ خدا حساب سے ہوتا ہے

ایک حدیث میں آیا ہے کہ امت کے فقراء کی ایک جماعت رسولِ خدا کی خدمت میں حاضر ہوئی اور عرض کیا: "اے اللہ کے رسولؐ! دولت مندوں کے پاس تو خرچ کرنے کے لیے مال ہے اور ہمارے پاس ایسی کوئی چیز نہیں ہے۔ ان کے پاس حج کرنے کا ذریعہ ہے۔ ہمارے پاس نہیں ہے۔ ان کے پاس غلاموں کو آزاد کرنے کے وسائل ہیں، ہمارے پاس نہیں ہیں"۔

پیغمبرؐ نے فرمایا: "جو شخص سو مرتبہ "تکبیر" کہے وہ ایک غلام کے آزاد کرنے سے افضل ہے، اور جو شخص سو مرتبہ خدا کی تسبیح کرے وہ سو گھوڑے زین و لگام کے ساتھ جہاد کے لیے آمادہ کرنے سے افضل ہے اور جو سو مرتبہ لا الٰہ الا اللہ کہے، اس کا عمل تمام لوگوں کے اس دن کے عمل سے افضل ہے مگر یہ کہ کوئی اس سے زیادہ کہے"۔

یہ بات انصار کے کانوں تک پہنچی تو وہ بھی یہ اذکار کرنے لگے۔ فقرائے امت پھر پیغمبرؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا۔ "آپ کا ارشاد ان کے کانوں تک بھی پہنچ گیا ہے اور وہ بھی اس ذکر میں مشغول ہو گئے ہیں"۔

پیغمبرؐ نے فرمایا: ذالک فضل اللہ یؤتیہ من یشاء: یہ اللہ کا فضل ہے جسے وہ چاہتا ہے، دے دیتا ہے۔ (یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ یہ تم جیسے لوگوں کے لیے ہے جو خرچ کرنے کا شوق تو رکھتے ہیں لیکن اس کا کوئی ذریعہ اپنے پاس نہیں رکھتے۔ لیکن دولت مندوں کے لیے فضلِ الٰہی کے حصول کا طریقہ، ان کا اپنے مالوں سے خرچ کرنا ہی ہے۔ [2]

یہ حدیث بھی اسی بات کی شاہد ہے جو ہم نے اوپر بیان کی ہے کہ فضلِ الٰہی حکیمانہ طریقے سے ہوتا ہے۔

---

[1] نہج البلاغۃ خطبہ ۱۹۲ (خطبہ قاصعہ)

⑤ مَثَلُ الَّذِيْنَ حُمِّلُوا التَّوْرٰىةَ ثُمَّ لَمْ يَحْمِلُوْهَا كَمَثَلِ الْحِمَارِ يَحْمِلُ اَسْفَارًا ؕ بِئْسَ مَثَلُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِى الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ۝

⑥ قُلْ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ هَادُوْۤا اِنْ زَعَمْتُمْ اَنَّكُمْ اَوْلِيَآءُ لِلّٰهِ مِنْ دُوْنِ النَّاسِ فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۝

⑦ وَلَا يَتَمَنَّوْنَهٗۤ اَبَدًا ۢ بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْهِمْ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِالظّٰلِمِيْنَ ۝

⑧ قُلْ اِنَّ الْمَوْتَ الَّذِىْ تَفِرُّوْنَ مِنْهُ فَاِنَّهٗ مُلٰقِيْكُمْ ثُمَّ تُرَدُّوْنَ اِلٰى عٰلِمِ الْغَيْبِ وَ الشَّهَادَةِ فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ۝

* * *

ترجمہ

⑤ جو لوگ تورات کے مکلّف قرار دیئے گئے، پھر انھوں نے اس کا حق ادا نہ کیا، وہ اس گدھے کے مانند ہیں جو کتابوں کا بوجھ اُٹھائے ہُوئے ہو۔ جس قوم نے آیاتِ الٰہی کو جھٹلایا وہ بُری مثال رکھتے ہیں اور خدا ظالم لوگوں کو ہدایت نہیں کیا کرتا۔

⑥ کہہ دیجئے، اے یہودیو! اگر تمہارا گمان یہ ہے کہ تمام لوگوں کو چھوڑ کر تم ہی خدا کے دوست ہو، تو پھر موت کی تمنا کرو، اگر تم سچ کہتے ہو، (تاکہ تم اپنے محبوب کی ملاقات کرو)

⑦ لیکن وہ ان اعمال کی وجہ سے جو وہ آگے بھیج چکے ہیں ہرگز موت کی تمنا نہیں کریں گے۔ اور خدا ظالموں کو اچھی طرح جانتا ہے۔

⑧ کہہ دیجئے کہ یہ موت جس سے تم بھاگتے ہو، آخرکار تم سے ملاقات کرکے رہے گی۔ اس کے بعد تمہیں اس پنہاں و آشکار باتوں کی خبر رکھنے والے کی طرف پلٹا دیا جائے گا اور وہ تمہیں ان باتوں سے آگاہ کرے گا جو تم کیا کرتے تھے۔

* * *

تفسیر

ایسا چوپایہ جس پر کتابیں لدی ہوں

بعض روایات میں آیا ہے کہ یہودی یہ کہا کرتے تھے: اگر محمدؐ مبعوث برسالت ہوا ہے تو اس کی رسالت ہمارے لیے نہیں ہے۔ اس لیے پہلی زیربحث آیت ان کے گوش گزار کر رہی ہے کہ اگر تم نے اپنی آسمانی کتاب کو غور سے پڑھا ہوتا اور اس پر عمل کیا ہوتا تو یہ بات نہ کرتے، کیونکہ اس میں پیغمبر اسلامؐ کے ظہور کی بشارت آئی ہے۔

فرماتا ہے: "وہ لوگ جن پر تورات نازل ہوئی اور وہ اس کے مکلف قرار دیئے گئے، لیکن انھوں نے اس کا حق ادا نہیں کیا اور اس کی آیات پر عمل نہیں کیا، وہ اس گدھے کی مانند ہیں جو اپنی پشت پر کتابیں اٹھائے ہوئے ہو" (مثل الذین حملوا التوراۃ ثم لم یحملوھا کمثل الحمار یحمل اسفارًا)۔

وہ کتاب سے سوائے اس کے بوجھ کے اور کسی چیز کا احساس نہیں کرتا اور اس کے لیے کوئی فرق نہیں ہے کہ وہ پشت پر پتھر اور لکڑی اٹھائے ہوئے ہے، یا ایسی کتابیں جن میں آفرینش کے دقیق ترین اسرار اور زندگی کے مفید ترین ضابطے درج ہیں۔

یہ خود پسند قوم جس نے صرف تورات کے نام یا اس کی تلاوت پر قناعت کی ہوئی ہے اور اس کے مضامین پر غور و خوض کرکے اس پر عمل نہیں کرتے، وہ اسی جانور کے مانند ہیں جو حماقت اور نادانی میں ضرب المثل اور مشہور خاص و عام ہے۔

یہ بہترین مثال ہے جو عالم بے عمل کے لیے بیان کی جاسکتی ہے، جو علم کی مسئولیت کا بوجھ تو اپنے کاندھے پر اٹھائے ہوئے ہے، لیکن اس کی برکات سے بہرہ اندوز نہیں ہوتا ـــــ اسی طرح سے وہ لوگ جو قرآن کے الفاظ سے تو سروکار رکھتے ہیں لیکن اس کے مطالب اور عملی تقاضوں سے بے خبر ہیں (اور مسلمانوں کی صفوں میں ایسے لوگ بہت ہی زیادہ ہیں) وہ اسی آیت کے مصداق ہیں۔

یہ احتمال بھی ہے کہ یہودیوں نے اس سورہ کی پہلی آیات اور اس کے مانند دوسری آیات کو جو بعثتِ پیغمبرؐ کی نعمت کی گفتگو کرتی ہیں، سننے کے بعد کہا ہو کہ ہم بھی اہلِ کتاب ہیں، اور حضرت موسیٰ کلیم اللہ کی بعثت کے ساتھ مفتخر ہیں۔ قرآن ان کے جواب میں کہتا ہے: اس کا کیا فائدہ ہے تم نے تو تورات کے احکام کو پاؤں تلے روند ڈالا ہے اور ان پر اپنے مسائلِ زندگی میں ہرگز عمل نہیں کیا۔

لیکن بہرحال یہ تمام مسلمانوں کے لیے ایک تنبیہ ہے کہ وہ اس بات کو نظر میں رکھیں کہ یہودیوں جیسی سرنوشت پیدا نہ ہو۔ یہ خدا کا عظیم فضل ہے، جو ان کے شاملِ حال ہوا ہے اور یہ قرآن جو ان پر نازل ہوا ہے اس لیے نہیں ہے کہ گھروں میں اس پر گرد پڑتی رہے، یا نظر بد اور آسیب کے لیے تعویذ کے طور پر حمائل کرلیں، یا سفر کرنے کے موقع پر حوادث سے محفوظ رہنے کے لیے اس کے نیچے سے گزریں یا برکت اور نیک شگون کے لیے نئے گھر میں "آئینہ" اور "جھاڑو" کے ساتھ اُسے بھی بھیجیں اور اس کو اس حد تک نیچے لے آئیں، یا ان کی آخری ہمت یہ ہو کہ اس کی تجوید، خوبصورت قرأت و تلاوت، ترتیل اور حفظ کرنے کی سعی و کوشش کریں، لیکن ان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں اس کا معمولی سا انعکاس بھی نہ ہو اور عقیدہ و عمل میں اس کا کوئی اثر نظر نہ آئے۔

اس کے بعد اسی مثال کو جاری رکھتے ہوئے کہتا ہے: "وہ قوم جس نے آیاتِ الٰہی کی تکذیب کی یقیناً وہ بُری مثال رکھتی ہے۔" (بئس مثل القوم الذین کذبوا بآیات اللہ)۔

وہ لوگ "بوجھ اٹھانے والے گدھے" کے مشابہ کیوں نہ ہوں؟ حالانکہ انھوں نے نہ صرف عمل بلکہ زبان سے بھی آیاتِ الٰہی کا انکار کیا ہے جیسا کہ سورہ بقرہ کی آیت ۸۷ میں اسی قوم یہود کے بارے میں آیا ہے: افکلما جاءکم رسول بما لاتھوٰی انفسکم استکبرتم ففریقاً کذبتم و فریقاً تقتلون: "کیا جب بھی کوئی پیغمبر تمھاری خواہش کے برخلاف آیا تو تم نے اس کے سامنے تکبر نہیں کیا پس ایک گروہ کو تم نے جھٹلایا، اور ایک گروہ کو قتل کر ڈالا۔"

آیت کے آخر میں ایک مختصر اور پُرمعنی جملہ میں فرماتا ہے: "خدا ستمگر قوم کو ہدایت نہیں کرتا۔" (واللہ لا یھدی القوم الظالمین)۔

یہ ٹھیک ہے کہ ہدایت کرنا خدا کا کام ہے لیکن اس کے لیے ایک مقدمہ اور تمہید کی ضرورت ہے، اور اس کا مقدمہ جو حق طلبی اور حق جوئی کی روح ہے اسے انسانوں کی طرف سے فراہم ہونا چاہیے اور ستمگر اس مرحلہ سے بہت دور ہیں۔

ہم بیان کر چکے ہیں کہ یہودی اپنے آپ کو برگزیدہ اور منتخب اُمت اور اصطلاح کے مطابق "نافتہ ای جدا بافتہ" (یعنی سب سے الگ مخلوق) سمجھتے تھے۔ یہانتک کہ کبھی تو وہ یہ دعوٰی کرتے کہ "وہ خُدا کے بیٹے ہیں اور کبھی اپنے آپ کو خُدا کے مخصوص دوست بتلاتے۔ جیسا کہ سورۂ مائدہ کی آیت ۱۸ میں آیا ہے: وقالت الیھود والنصاری نحن ابنٰؤا اللہ و احباؤہ: یہود و نصاریٰ نے کہا کہ ہم خُدا کے بیٹے اور اس کے خاص دوست ہیں (خواہ ان کی مُراد مجازی اولاد ہی ہو۔)

قرآن ان بے دلیل بلند پروازیوں کے مُقابلہ میں، وہ بھی ایسے گروہ کی طرف سے جو کتابِ الٰہی کے حامل ہونے کے باوجود اس پر عامل نہیں تھے، کہتا ہے: "ان سے کہہ دیجئے، اے یہودیو! اگر تمہارا گمان یہ ہے کہ تمام لوگوں کو چھوڑ کر تم ہی خدا کے دوست ہو، تو پھر موت کی تمنا کرو، اگر تم سچ کہتے ہو۔" (قل یاایھا الذین ھادوا ان زعمتم انکم اولیاء للہ من دون الناس فتمنوا الموت ان کنتم صادقین)۔ [1]

کیونکہ دوست تو ہمیشہ دوست کی مُلاقات کا مشتاق ہوتا ہے اور ہم جانتے ہیں کہ قیامت میں پروردگار کی معنوی مُلاقات ہوگی۔ جب عالمِ دُنیا کے حجاب ہٹ جائیں گے اور شہوات اور ہوس رانیوں کے غبار چھٹ جائیں گے، تو پردے اُٹھ جائیں گے اور انسان چشمِ دل سے محبوب کا جمالِ دلآرام دیکھے گا اور اس کے قرب کی بساط پر قدم رکھے گا اور "فی مقعد صدق عند ملیک مقتدر" (صاحبِ اقتدار شہنشاہ کے قرب میں صداقت کی جگہ میں) کا مصداق بن کر حریمِ دوست میں راہ پائے گا۔

اگر تم سچ کہتے ہو، اور اس کے دوست خاص ہو، تو پھر دُنیا کی زندگی کے ساتھ اس قدر کیوں چمٹے ہوئے ہو؟ موت سے اتنا کیوں ڈرتے ہو؟ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ تم اپنے اس دعوٰے میں سچے نہیں ہو۔

قرآن نے اسی بات کو ایک دوسری تعبیر کے ساتھ سورۃ بقرہ کی آیت ۹۶ میں بھی بیان کیا ہے، جہاں کہتا ہے: ولتجدنھم احرص الناس علٰی حیاۃ ومن الذین اشرکوا یود احدھم لو یعمر الف سنۃ وما ھو بمزحزحہ من العذاب ان یعمر واللہ بصیر بما یعملون: "تم انھیں اس دُنیاوی زندگی کے لیے سب سے زیادہ حریص پاؤ گے۔ یہاں تک کہ مُشرکین سے بھی زیادہ حریص، یہاں تک کہ ان میں سے ہر ایک یہ چاہتا ہے کہ ہزار برس تک زندہ رہے، حالانکہ یہ طولانی زندگی اُسے عذابِ الٰہی سے نہیں چھڑا سکے گی اور خدا اُن کے اعمال کو دیکھتا ہے۔"

* * *

اس کے بعد ان کے موت سے ڈرنے کی اصل وجہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مزید کہتا ہے: "وہ اپنے ان اعمال کی وجہ سے، جو انھوں نے آگے بھیجے ہوئے ہیں ہرگز موت کی تمنا نہیں کریں گے۔" (ولا یتمنونہ ابدًا

---

[1] "من دون الناس" بعض مفسرین کے قول کے مطابق اسم "انّ" کا حال ہے اور بعض کے نزدیک اولیاء کی صفت ہے۔

بما قدمت ایدیھم)۔

"لیکن خدا ظالموں کو اچھی طرح سے پہچانتا ہے۔" (واللہ علیم بالظالمین)۔

حقیقت میں انسان کا موت سے خوف دو عوامل میں سے کسی ایک کی وجہ سے ہوتا ہے۔ یا تو وہ موت کے بعد کی زندگی پر ایمان نہیں رکھتا اور موت کو فنا و نیستی کا ایک ہیولا اور عدم کا ظلمت کدہ خیال کرتا ہے۔ یہ ایک طبعی اور فطری امر ہے کہ انسان نیستی اور عدم سے گریز کرے۔

اور یا وہ موت کے بعد والے عالم کا عقیدہ تو رکھتا ہے لیکن وہ اپنے نامۂ اعمال کو ایسا تاریک و سیاہ دیکھتا ہے کہ جس کی وجہ سے اس عظیم دادگاہ اور عدالت میں حاضر ہونے سے ڈرتا ہے۔

اور چونکہ یہودی معاد اور موت کے بعد کے جہان کا عقیدہ رکھتے تھے، لہٰذا طبعی طور پر ان کے موت سے ڈرنے کا عامل دوسری چیز تھی۔

"ظالمین" کی تعبیر ایک وسیع مفہوم رکھتی ہے جو یہودیوں کے تمام ناروا اعمال، خدا کے عظیم پیغمبروں کو قتل کرنے سے لے کر ان کی طرف ناروا نسبتوں، لوگوں کے حقوق غصب کرنے، ان کے اموال ہتھیانے، سرائے غارت کرنے اور انواع و اقسام کے اخلاقی مفاسد سے آلودہ ہونے تک کو شامل ہے۔

لیکن مسلمہ طور پر یہ وحشت و اضطراب کسی مشکل کو حل نہیں کرتا۔ موت ایک ایسا اونٹ ہے جو تمام گھروں کے دروازے پر بیٹھا ہے۔ لہٰذا قرآن کہتا ہے: "اے پیغمبر! ان سے کہہ دیجئے کہ یہ موت جس سے تم بھاگتے ہو آخرکار تم سے ملاقات کرے گی۔" (قل ان الموت الذی تفرون منہ فانہ ملاقیکم)۔

اس کے بعد تمھیں اس کے پاس لے جایا جائے گا جو پنہاں و آشکار سے باخبر ہے۔ اور تم جو کچھ عمل کیا کرتے تھے وہ تمھیں اس کی خبر دے گا۔" (ثم تردون الیٰ عالم الغیب والشھادۃ فینبئکم بما کنتم تعملون)۔

موت کا قانون اِس عالم کے قوانین میں سب سے زیادہ عام اور سب سے زیادہ وسیع ہے، خدا کے عظیم پیغمبر اور مقرب فرشتے سب مرجائیں گے اور خدا کی پاک ذات کے سوا اس جہان میں کوئی باقی نہیں رہے گا: "کل من علیھا فان ویبقیٰ وجہ ربک ذوالجلال والاکرام"[1]

موت اور دادگاہِ عدلِ الٰہی میں حاضر ہو کر حساب دینا بھی اس عالم کے مسلّمہ قوانین میں سے ہے اور خدا بندوں کے تمام اعمال سے دقیقاً آگاہ بھی ہے۔

اس بناء پر اِس خوف و وحشت کے ختم ہونے کی صرف ایک ہی راہ ہے اور وہ اعمال کی پاکیزگی اور گناہ کی آلودگی سے دل کو پاک صاف کرنا ہے۔ کیونکہ جس کا حساب پاک صاف ہو اُسے محاسب سے ڈرنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ بس یہی ایک صورت ہے جس میں علیؑ کی طرح کہا جا سکتا ہے:

---

[1] سورہ رحمٰن آیت ۲۶، ۲۷

"عیہات بعد اللتیا والتی واللہ لابن ابی طالب انس بالموت من الطفل بثدی امہ"

"ہیہات! ان تمام جنگوں اور حوادث کے بعد، خدا کی قسم! ابوطالب کا بیٹا موت سے اس سے بھی زیادہ انس اور لگاؤ رکھتا ہے جتنا انس بچے کو اپنی ماں کی چھاتی سے ہوتا ہے۔"[1]

اور جب آپ کی پیشانی مبارک "اشقی الآخرین" (ابن ملجم) کی ضرب سے شگافتہ ہوئی تو بآواز بلند فرمایا: "فزت ورب الکعبۃ" کعبہ کے پروردگار کی قسم! میں کامیاب ہوا اور نجات پاگیا۔

* * *

چند نکات

: عالم بے عمل

اس میں شک نہیں کہ تحصیل علم میں بہت زیادہ مشکلات پیش آتی ہیں، لیکن یہ مشکلات چاہے جتنی بھی ہوں، علم سے حاصل ہونے والی برکات کے مقابلے میں کوئی حیثیت نہیں رکھتیں۔ انسان کی بیچارگی اس دن ہوگی جب وہ تحصیل علم کی زحمت کو تو برداشت کرے لیکن اس کی برکتوں کا اسے کوئی فائدہ حاصل نہ ہو، وہ ٹھیک اس چوپائے کی مانند ہوتا ہے، جو کتابوں کی ایک گانٹھ کا وزن تو اپنی پشت پر محسوس کرتا ہے لیکن اس کے مطالب سے کوئی فائدہ نہیں اٹھاتا۔

بعض تعبیرات میں عالم بے عمل کو "شجر بلاثمر" (بغیر پھل کے درخت) یا "سحاب بلا مطر" (بغیر بارش کے بادل) یا اس شمع سے جو جلتی ہے اور اپنے اطراف کو روشن کرتی ہے لیکن خود ختم ہو جاتی ہے، یا اس چوپائے سے جسے خراس کے ساتھ جوت دیتے ہیں، وہ مسلسل زحمت اٹھاتا اور راستہ طے کرتا رہتا ہے، لیکن چونکہ وہ اپنے ہی چکروں میں گھومتا ہے لہٰذا وہ کوئی راستہ طے نہیں کرتا اور کہیں بھی نہیں پہنچتا۔ اسی قسم کی دوسری تشبیہیں دی جاتی ہیں جن میں سے ہر ایک عالم بے عمل کی منحوس سرنوشت کے کسی ایک گوشے کو بیان کرتی ہے۔

اسلامی روایات میں بھی اس قسم کے علماء کی مذمت میں دل ہلا دینے والی تعبیریں آئی ہیں۔ منجملہ ان کے حضرت رسولؐ سے نقل ہوا ہے کہ آپ نے فرمایا:

"من ازداد علما ولم یزدد ھدی لم یزدد من اللہ الا بعدا"

---

[1] نہج البلاغۃ خطبہ ۵

جس شخص کا علم زیادہ ہو لیکن اس کی ہدایت میں اضافہ نہ ہو تو یہ علم اُسے خُدا سے دُوری کے سوا کچھ نہیں دیتا۔"[1]

دوسری جگہ امیرالمومنین علیؑ سے منقول ہے :

"العلم مقرون بالعمل ، فمن علم عمل، والعلم یهتف بالعمل فان اجابه والا ارتحل عنه۔[2]

"علم عمل کے ساتھ توام ہے جو شخص جس چیز کو جانتا ہے اُسے اس پر عمل کرنا چاہیئے۔ علم فریاد کرتا اور عمل کی دعوت دیتا ہے۔اگر وہ اُسے مثبت جواب نہ دے تو علم اس کے ہاں سے کوچ کر جاتا ہے۔"

اصُولی طور پر بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ عالم بے عمل "عالم" کہلانے کے لائق نہیں ہے۔ حضرت رسُولؐ فرماتے ہیں :

"لا یکون المرء عالما حتّٰی یکون بعلمه عاملا"[3]

اس سے بڑھ کر یہ بات ہے کہ وہ عالم کی تمام ذمہ داریوں کے بوجھ کو اپنے دوش پر اُٹھائے ہُوئے ہوتا ہے جبکہ علم کی خصُوصیات سے بہرہ مند نہیں ہوتا، جیساکہ امیرالمومنین علیؑ سے مروی ہے کہ آپ نے ایک خطبہ کے ضمن میں فرمایا :

"ایها الناس ! اذا علمتم فاعملوا بما علمتم لعلکم تهتدون . ان العالم العامل بغیره کالجاهل الحائر الذی لا یستفیق عن جهله بل قد رأیت ان الحجة علیه اعظم والحسرة ادوم۔"[4]

"اے لوگو! جب تم کسی چیز کو جان لو تو اس پر عمل کرو تاکہ ہدایت پاؤ۔ کیونکہ وہ عالم جو اپنے علم کے برخلاف عمل کرتا ہے اس سرگرداں جاہل کی طرح ہے جو اپنی جہالت سے کبھی ہوش میں نہیں آتا۔ بلکہ میں تو یہ دیکھ رہا ہوں کہ اس قسم کے عالم پر حجت بہت بھاری اور اُس کے لیے حسرت دائمی ہے۔

---

[1] محجۃ البیضاء جلد ۱ ص ۱۲۵، ۱۲۶

[2] "نہج البلاغۃ" کلمات قصار ، جملہ ۳۶۶

[3] محجۃ البیضاء جلد ۱ ص ۱۲۵ ، ۱۲۶

[4] اصول کافی جلد ۱ باب استعمال العلم حدیث ۶

بلاشک وشبہ اس قسم کے عُلماء اور دانشوروں کا وجود ایک مُعاشرے کے لیے بہت بڑی مصیبت ہے۔ جن لوگوں کا عالم و دانشور اس قسم کا ہو ان کی سرنوشت خطرناک ہے۔ بقولِ شاعر :

وراعی الشاة یحمی الذئب عنها
فکیف اذا الرعاة لها ذئاب

"چرواہا بکریوں کو بھیڑیے سے بچاتا ہے۔
لیکن ان بکریوں کی حالت پر افسوس ہے کہ جن کے چرواہے ہی بھیڑیے بن جائیں۔

* * *

۲ : میں موت سے کیوں ڈروں ؟

عام طور پر اکثر لوگ موت سے ڈرتے ہیں۔ صرف ایک چھوٹا سا گروہ ہے جو موت کا چہرہ دیکھ کر مسکرا دیتا ہے، اسے پُورے زور سے اپنی آغوش میں لے لیتا ہے اور رنگ برنگی گودڑی دے کر جاودانی زندگی حاصل کر لیتا ہے۔

لیکن آیئے دیکھتے ہیں کہ موت اور اس کی علامات، یہاں تک کہ اس کا نام بھی ایک گروہ کے لیے کیوں تکلیف دہ ہے ؟ اس کی سب سے بڑی وجہ تو یہ ہے کہ وہ موت کے بعد کی زندگی پر ایمان نہیں رکھتے اور اگر ایمان رکھتے بھی ہیں تو یہ ایمان ایک گہرے یقین کی صورت میں نہیں اور وہ ان کے افکار و حالات پر اچھی طرح سے مُؤثر نہیں ہُوا ہے۔

فنا و نیستی سے انسان کی وحشت طبیعی اور فطری ہے، انسان رات کی تاریکی تک سے ڈرتا ہے۔ کیونکہ ظلمت، نور کی نیستی ہے۔ انسان بعض اوقات مُردہ سے بھی ڈرتا ہے کیونکہ وہ بھی فنا کے راستے پر گامزن ہے۔

لیکن اگر انسان اپنے تمام وجُود کے ساتھ یہ باور کرلے : "الدنیا سجن المؤمن وجنة الکافر"[1] دُنیا مومن کا زِنداں اور کافر کے لیے بہشت ہے،"

اگر انسان باور کرلے کہ یہ جسمِ خاکی اس کے طائرِ رُوح کے لیے ایک قفس ہے، جب یہ قفس ٹوٹ جائے گا تو وہ آزاد ہو جائے گا اور کوئے دوست کی فضا میں پرواز کرے گا۔

اگر وہ یہ باور کرلے کہ "حجاب چہرۂ جان می شود غبار تنش" اُس کے بدن کا غُبار جان کے چہرے کا حجاب ہے تو یقیناً وہ اس وقت کے انتظار میں ہو گا کہ جب اس چہرے سے پردہ ہٹ جائے گا۔

اگر انسان یہ باور کرلے کہ طائرِ رُوح عالمِ خاک سے نہیں باغِ ملکوت سے ہے اور صرف دو تین دن کے لیے

---

[1] سفینۃ البحار ج ۱ ص ۶۰۳

اس کے بدن کو اُس کا قفس بنایا گیا ہے۔

"ہاں! اگر موت کے بارے میں انسان کا نظریہ اس طرح کا ہو تو وہ ہرگز موت سے نہیں ڈرے گا جبکہ وہ ارتقاء کی راہ طے کرنے کے لیے زندگی چاہتا ہے۔

اسی لیے حدیثِ عاشورہ میں آیا ہے: امام حسین اور ان کے انصار پر دشمن کے محاصرہ کا گھیرا جتنا تنگ ہوتا اور دشمن کا دباؤ بڑھتا جاتا تھا، اُتنے ہی اُن کے چہرے زیادہ چمکتے اور کھلتے جاتے تھے۔ یہاں تک کہ آپ کے اصحاب میں سے بوڑھے مُسکرا رہے تھے، جب ان سے پُوچھا گیا کہ وہ کیوں مُسکرا رہے ہیں تو ان کا جواب تھا: "ہم چند لمحہ کے بعد ہی شربتِ شہادت نوش کرلیں گے اور پھر حورُالعین سے ہم آغوش ہوں گے۔[1]

موت کے خوف کا ایک اور سبب، دُنیا کے ساتھ حد سے زیادہ دل لگانا ہے، کیونکہ موت اس کے اور اس کی محبُوب دُنیا کے درمیان جُدائی ڈال دے گی۔ جبکہ وہ تمام امکانات و وسائل جو اُس نے عیش و نوش کی زندگی کے لیے فراہم کیے تھے ان سے دل کو ہٹانا اس کے لیے طاقت فرسا ہے۔

خوف کا تیسرا عامل نامۂ اعمال کا نیکیوں سے خالی اور بُرائیوں اور سیئات سے پُر ہونا ہے۔

ایک حدیث میں آیا ہے کہ کوئی شخص پیغمبرؐ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا: "میں موت کو کیوں پسند نہیں کرتا؟"

آپ نے فرمایا: کیا تیرے پاس کچھ دولت ہے؟

اس نے عرض کیا: جی ہاں!

آپ نے فرمایا: کیا تو نے اس میں سے کوئی چیز آگے بھی بھیجی ہے؟

اس نے عرض کیا: نہیں!

آپ نے فرمایا: یہی وجہ ہے کہ تو موت کو دوست نہیں رکھتا، کیونکہ تیرا نامۂ اعمال حسنات سے خالی ہے۔[2]

ایک دُوسرا شخص ابوذر کے پاس آیا اور یہی سوال کیا کہ ہم موت سے نفرت کیوں کرتے ہیں؟ آپ نے فرمایا: "لانکم عمرتم الدنیا، وخربتم الاٰخرۃ. فتکرھون ان تنتقلوا من عمران الی خراب" یہ اس بناء پر ہے کہ تم نے دُنیا کو تو آباد کر رکھا ہے اور آخرت کو ویران بنایا ہُوا ہے، لہٰذا یہ بات طبعی اور فطری ہے کہ تم آباد جگہ کو چھوڑ کر ویران و برباد جگہ کی طرف جانا پسند نہیں کرتے۔

❖ ❖ ❖

---

[1] مقتل الحسین مقرم ص ۲۶۳

[2] محجۃ البیضاء جلد ۸ ص ۲۵۸

⑨ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا نُوْدِيَ لِلصَّلٰوةِ مِنْ يَّوْمِ الْجُمُعَةِ فَاسْعَوْا اِلٰى ذِكْرِ اللّٰهِ وَ ذَرُوا الْبَيْعَ ؕ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝

⑩ فَاِذَا قُضِيَتِ الصَّلٰوةُ فَانْتَشِرُوْا فِي الْاَرْضِ وَابْتَغُوْا مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ وَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَثِيْرًا لَّعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ۝

⑪ وَ اِذَا رَاَوْا تِجَارَةً اَوْ لَهْوَا ۨ انْفَضُّوْٓا اِلَيْهَا وَ تَرَكُوْكَ قَآئِمًا ؕ قُلْ مَا عِنْدَ اللّٰهِ خَيْرٌ مِّنَ اللَّهْوِ وَ مِنَ التِّجَارَةِ ؕ وَ اللّٰهُ خَيْرُ الرّٰزِقِيْنَ ۝

❊ ❊ ❊

ترجمہ

⑨ اے ایمان لانے والو! جب جمعہ کے دن کی نماز کے لیے اذان کہی جائے تو ذکرِ خدا کی طرف دوڑ کر آؤ اور خرید و فروخت کو چھوڑ دو۔ یہ تمھارے لیے بہتر ہے اگر تم جانتے ہو۔

⑩ اور جب نماز ختم ہو جائے تو تم آزاد ہو۔ زمین میں پھیل جاؤ اور خدا کا فضل طلب کرو اور خدا کو بہت بہت یاد کرو تاکہ تم فلاح پاؤ۔

⑪ اور جب وہ کوئی تجارت یا کھیل تماشا کی چیز کو دیکھتے ہیں تو اُدھر کو چل کھڑے ہوتے

ہیں اور تجھے اپنی حالت میں کھڑا ہوا چھوڑ جاتے ہیں، آپ کہہ دیجئے جو کچھ خدا کے پاس ہے، وہ کھیل تماشے اور تجارت سے بہتر ہے اور خدا بہترین روزی دینے والا ہے۔

٭ ٭ ٭

شانِ نزول

ان آیات کے شان نزول میں خصوصاً " و اذا رأوا تجارۃ " کے بارے میں مختلف روایات نقل ہوئی ہیں جو سب کی سب ایک ہی مطلب کی خبر دیتی ہیں کہ: ایک سال مدینہ کے لوگ خشک سالی، قحط اور اجناس کے نرخ کی زیادتی میں گرفتار تھے تو "دحیہ" ایک قافلہ کے ساتھ شام سے یہاں آن پہنچا، وہ اپنے ساتھ غذائی اشیاء لے کر آیا تھا۔ اُس روز جمعہ کا دن تھا اور پیغمبرؐ نماز جمعہ کے خطبہ میں مشغول تھے کہ انھوں نے معمول کے مطابق قافلہ کے ورود کے اعلان کے لیے طبل بجایا اور دوسرے آلات موسیقی بھی بجائے تو لوگ تیزی کے ساتھ بازار میں پہنچ گئے۔ اس موقع پر جو مسلمان مسجد میں نماز کے لیے جمع ہوئے ہوئے تھے، انھوں نے خطبہ سننا چھوڑ دیا اور اپنی ضروریات پوری کرنے کے لیے بازار کی طرف چل پڑے۔ صرف بارہ مرد اور ایک عورت مسجد میں باقی رہ گئے۔ (تو اوپر والی آیت نازل ہوئی اور جانے والوں کی سخت مذمت کی) پیغمبرؐ نے فرمایا: اگر یہ چھوٹا سا گروہ بھی چلا جاتا تو ان سب پر آسمان سے پتھروں کی بارش ہوتی۔

٭ ٭ ٭

تفسیر

ہفتہ کا عظیم ترین عبادی سیاسی اجتماع

گزشتہ آیات میں توحید، نبوت، معاد اور دُنیا پرست یہودیوں کی مذمت کے بارے میں مختصر مباحث آئے تھے، زیر بحث آیات ایک اہم ترین اسلامی فریضہ کے بارے میں ہیں جو ایمان کی بنیادوں کی تقویت کے لیے حد سے زیادہ تاثیر رکھتا ہے اور ایک لحاظ سے سورۃ کا ہدف اصلی یہی ہے، یعنی نماز جمعہ۔ یہ آیات اس کے احکام کو بیان کرتی ہیں۔

لہ مجمع البیان ج ۹ ص ۲۸۷ اور دیگر تفاسیر

سب سے پہلے تمام مسلمانوں کو مخاطب کرتے ہوئے فرماتا ہے: "اے ایمان لانے والو! جب جمعہ کے دن نماز کے لیے اذان کہی جائے تو ذکرِ خدا (خطبہ و نماز) کی طرف جلدی سے آؤ اور خرید و فروخت چھوڑ دو، یہ تمھارے لیے بہتر ہے اگر تم جانتے ہو۔" (یاایھا الذین اٰمنوا اذا نودی للصلٰوۃ من یوم الجمعۃ فاسعوا الٰی ذکر اللہ و ذروا البیع ذالکم خیر لکم ان کنتم تعلمون)۔

"نُودی" "نِدا" کے مادہ سے پکارنے کے معنی میں ہے۔ اور یہاں اس سے مراد اذان ہے، کیونکہ اسلام میں نماز کے لیے اذان کے علاوہ اور کوئی ندا نہیں ہے جیسا کہ سورہ مائدہ کی آیت ۵۸ میں آیا ہے: "و اذا نادیتم الی الصلٰوۃ اتخذوھا ھزوًا و لعبًا ذالک بانھم قوم لا یعقلون"۔ جب تم لوگوں کو نماز کے لیے پکارتے ہو (اور اذان کہتے ہو) تو وہ اس کا مذاق اڑاتے اور اسے کھیل تماشا سمجھتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ ایک بے عقل قوم ہیں۔

اس طرح سے جس وقت نماز جمعہ کی اذان کی آواز بلند ہوتی ہے تو لوگوں کا فرض ہے کہ وہ کاروبار کو چھوڑ کر نماز کی طرف دوڑ کر آئیں کہ جو اہم ترین ذکرِ خدا ہے۔

ذالکم خیر لکم کا جملہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اس موقع پر کاروبار کو چھوڑ کر نماز جمعہ کو قائم کرنا مسلمانوں کے لیے بہت ہی نفع کی بات ہے۔ بشرطیکہ وہ اس بارے میں ٹھیک طور پر غور و فکر کریں۔ ورنہ خدا تو سب سے بے نیاز اور سب پر مہربان ہے۔

یہ جملہ نمازِ جمعہ کے فلسفہ اور فوائد کی طرف ایک اجمالی اشارہ ہے۔ اس کے بارے میں ہم انشاء اللہ نکات کی بحث میں گفتگو کریں گے۔

البتہ خرید و فروش کو ترک کرنا ایک وسیع مفہوم رکھتا ہے جو ہر مزاحم کام کو شامل ہے۔

باقی رہی یہ بات کہ جمعہ کے دن کو جمعہ کا نام کیوں دیا گیا ہے؟ تو اس کی وجہ اس دن لوگوں کا نماز جمعہ کے لیے جمع اور اکٹھا ہونا ہے، اس مسئلہ کی ایک مختصر سی تاریخ ہے جو نکات کی بحث میں آئے گی۔

قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ بعض اسلامی روایات میں روزانہ کی نماز کے بارے میں یہ آیا ہے: "اذا اقیمت الصلٰوۃ فلا تأتوھا و انتم تسعون و أتوھا و انتم تمشون وعلیکم السکینۃ۔" جب نماز (یومیہ) کھڑی ہو جائے تو نماز میں شرکت کے لیے دوڑو نہیں اور آرام کے ساتھ قدم اٹھاؤ۔ [1]

لیکن نمازِ جمعہ کے بارے میں اوپر والی آیت یہ کہتی ہے: فاسعوا (دوڑ کر آؤ) یہ نماز جمعہ کی حد سے زیادہ اہمیت کی دلیل ہے۔

ذکر اللہ سے مراد پہلے تو نماز ہی ہے۔ لیکن ہم جانتے ہیں کہ نمازِ جمعہ کے خطبات بھی کہ جن میں خدا ہی کا

---

[1] روح المعانی جلد ۲۸ ص ۹۰

ذکر ہوتا ہے حقیقت میں نماز جمعہ کا ایک حصہ ہیں، اس بناء پر ان خطبوں میں شرکت کے لیے بھی دوڑ کر آنا چاہیئے۔

❊ ❊ ❊

بعد والی آیت میں مزید کہتا ہے: "جب نماز ختم ہو جائے تو پھر تم آزاد ہو، زمین میں چلو پھرو اور خدا کا فضل تلاش کرو اور خدا کو بہت بہت یاد کرو تاکہ تم نجات پاؤ" (فاذا قضیت الصلوٰۃ فانتشروا فی الارض وابتغوا من فضل اللہ واذکروا اللہ کثیرًا لعلکم تفلحون)۔

اگرچہ "ابتغوا من فضل اللہ (اللہ کا فضل طلب کرو) کا جملہ یا قرآن مجید میں اس سے مشابہ تعبیریں غالبًا روزی طلب کرنے اور کسب وتجارت کے معنی میں آئی ہیں، لیکن یہ بات واضح ہے کہ اس جملہ کا مفہوم وسیع ہے اور کسب وکار اس کے مصادیق میں سے ایک ہے، اسی لیے بعض نے عیادتِ مریض، زیارتِ مومن، یا تحصیلِ علم ودانش کے معنی میں اس کی تفسیر کی ہے، اگرچہ یہ ان میں بھی منحصر نہیں ہے۔

یہ بات کہے بغیر واضح ہے کہ "زمین میں پھیل جانے" اور "روزی طلب کرنے کا امر" امرِ وجوبی نہیں ہے، بلکہ اصطلاح کے مطابق یہ "امر بعد از حظر" ونہی ہے اور جواز کی دلیل ہے، لیکن بعض نے اس تعبیر سے یہ مطلب لیا ہے کہ نمازِ جمعہ کے بعد روزی کی تحصیل وطلب ایک مطلوبیت اور برکت رکھتی ہے۔ اور ایک حدیث میں آیا ہے کہ پیغمبرؐ نمازِ جمعہ کے بعد بازار میں تشریف لے جاتے تھے۔

"واذکروا اللہ کثیرًا" کا جملہ ان تمام نعمتوں کے لیے جو خدا نے انسان کو دی ہیں، خدا کو یاد کرنے کی طرف اشارہ ہے اور بعض نے یہاں "ذکر" کو "فکر" کے معنی سے تعبیر کیا ہے، جیسا کہ حدیث میں آیا ہے۔ تفکر ساعۃ خیر من عبادۃ سنۃ ایک ساعت غور وفکر کرنا ایک سال کی عبادت سے بہتر ہے۔[1]

اور بعض نے اس کو بازاروں میں معاملات کے وقت، خدا کی طرف توجہ اور اصولِ حق وعدالت سے انحراف نہ کرنے سے بھی تعبیر کیا ہے۔

لیکن واضح ہے کہ آیت ایک وسیع مفہوم رکھتی ہے جو ان تمام مطالب کو اپنے دامن میں سموئے ہوئے ہے۔ یہ بھی مسلم ہے کہ 'ذکر' کی روح فکر ہے اور وہ ذکر جو فکر کے بغیر ہو تعلقہ زبانی سے زیادہ نہیں اور جو بات فلاح ونجات کا سبب ہے وہ وہی ذکر ہے جو تمام حالات میں غور وفکر کے ساتھ ہو۔

اصولی طور پر بار بار "ذکر" کرنے سے خدا کی یاد انسان کی جان کی گہرائیوں میں راسخ ہو جاتی ہے اور غفلت اور بے خبری کی جڑیں جل جاتی ہیں جو ہر قسم کے گناہ کا اصلی عامل ہوتی ہیں۔ پس یوں انسان فلاح ونجات کے راستے پر چلنے لگتا ہے اور "لعلکم تفلحون کی حقیقت حاصل ہو جاتی ہے۔

❊ ❊ ❊

زیرِ بحث آخری آیت میں ان لوگوں کو جنھوں نے پیغمبر اکرمؐ کو نماز جمعہ کے وقت چھوڑ دیا اور آنے والے قافلہ سے مال خریدنے کے لیے بازار کی طرف بھاگ کھڑے ہوئے تھے، شدت کے ساتھ ملامت کرتے ہوئے کہتا ہے:

[1] مجمع البیان جلد ۱۰ ص ۲۸۹

"جب وہ کوئی تجارت یا کھیل تماشہ کی بات دیکھتے ہیں تو پراگندہ ہو جاتے ہیں اور آپ کو (نمازِ جمعہ کا خطبہ پڑھنے کے دوران) کھڑا ہوا چھوڑ کر چل دیتے ہیں۔" (واذا رأوا تجارة او لهوا انفضوا اليها وتركوك قائما)۔

لیکن ان سے کہہ دیجئے کہ جو کچھ خدا کے پاس ہے وہ لہو ولعب اور تجارت سے بہتر ہے اور خدا بہترین روزی دینے والا ہے۔" (قل ما عند الله خير من اللهو ومن التجارة والله خير الرازقين)۔

نمازِ جمعہ میں حاضر ہونے اور پیغمبرؐ کے مواعظ و نصائح سننے سے جو خدائی اجر و ثواب اور برکتیں اور معنوی و روحانی تربیت تمہیں حاصل ہوتی ہے۔ ان سب برکات کا کسی دوسری چیز کے ساتھ مقابلہ نہیں ہو سکتا۔ اگر تم اس بات سے ڈرتے ہو کہ تمہاری روزی منقطع ہو جائے گی تو تم غلطی پر ہو۔ خدا بہترین روزی دینے والا ہے۔

لہو کی تعبیر، طبل اور ان تمام دوسرے آلاتِ لہو کی طرف اشارہ ہے جو وہ لوگ مدینہ میں کسی نئے قافلہ کے وارد ہونے کے وقت بجایا کرتے تھے۔ یہ ایک طرح سے ان کے آنے کی خبر اور اعلان بھی ہوتا تھا اور مال و متاع کو بیچنے کے لیے تشہیر بھی، جیسا کہ وہ منڈیاں اور بازار، جو مغربی طرز کے ہیں، ان میں بھی اس کے نمونے دکھائی دیتے ہیں۔

"انفضوا" کی تعبیر، پراگندہ ہونے، نمازِ جمعہ سے منصرف ہونے اور قافلہ کا رُخ کرنے کے معنی میں ہے۔ جیسا کہ شانِ نزول میں بیان کیا گیا ہے کہ جس وقت "دحیہ" کا قافلہ مدینہ میں وارد ہوا (اس نے ابھی تک اسلام قبول نہیں کیا تھا) تو اس نے طبل اور دوسرے آلاتِ لہو کے ساتھ لوگوں کو بازار کی طرف بلایا۔ مدینہ کے لوگ، یہاں تک کہ وہ مسلمان بھی جو مسجد میں پیغمبرؐ کا خطبہ جمعہ سن رہے تھے، اس کی طرف بھاگ کھڑے ہوئے اور مسجد میں صرف تیرہ مرد اور ایک روایت کے مطابق اس سے بھی کم افراد باقی رہ گئے۔

"اليها" کی ضمیر تجارت کی طرف لوٹتی ہے، یعنی وہ مال تجارت کی طرف دوڑ گئے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ لہو ولعب ان کا اصلی ہدف نہیں تھا بلکہ وہ تو قافلہ کے وارد ہونے کے اعلان کی ایک تمہید تھی۔ یا مال تجارت کے پروپیگنڈہ میں زور پیدا کرنے کے لیے تھا۔

"قائما" کی تعبیر بتاتی ہے کہ پیغمبرؐ کھڑے ہو کر نمازِ جمعہ کا خطبہ دے رہے تھے، جیسا کہ "جابر بن سمرہ" کی حدیث میں نقل ہوا کہ وہ کہتا ہے: "میں نے پیغمبرؐ کو خطبہ کی حالت میں کبھی بھی بیٹھے ہوئے نہیں دیکھا اور جو شخص یہ کہے کہ آپ بیٹھ کر خطبہ پڑھتے تھے تو اسے جھوٹا سمجھو"۔[1]

یہ روایت بھی آئی ہے: "لوگوں نے عبداللہ بن مسعود سے پوچھا: "کیا پیغمبرؐ کھڑے ہو کر خطبہ دیا کرتے تھے؟ عبداللہ نے کہا: کیا تم نے نہیں سنا کہ خدا فرماتا ہے: وتركوك قائما اور وہ تجھے کھڑا ہوا ہی چھوڑ کر چل

---

[1] مجمع البیان جلد ۱۰ ص ۲۸۶

دیکھئے۔[1]

تفسیر "در المنثور" میں آیا ہے کہ سب سے پہلا شخص جس نے نمازِ جمعہ کا خطبہ بیٹھ کر دیا، وہ معاویہ تھا۔[2]

* * *

چند نکات

۱: اسلام میں پہلی نمازِ جمعہ

بعض اسلامی روایات میں آیا ہے کہ مدینہ کے مسلمانوں نے پیغمبرؐ کی ہجرت سے پہلے باہم مل کر بات کی اور کہا کہ یہودی ہفتہ میں ایک دن (بروز ہفتہ) اجتماع کرتے ہیں اور عیسائی بھی اجتماع کے لیے (اتوار کا) ایک دن رکھتے ہیں۔ لہٰذا ہم بھی ایک دن مقرر کر لیتے ہیں تاکہ اس میں جمع ہو کر ذکرِ خدا کریں اور اس کا شکر بجا لائیں۔ انھوں نے ہفتہ سے پہلے کا دن کہ جسے اُس زمانہ میں "یوم العروبہ" کہتے تھے، اِس مقصد کے لیے منتخب کیا اور (بزرگانِ مدینہ میں سے ایک شخص) اسعد بن زرارہ کے پاس گئے۔ اس نے ان کے ساتھ مل کر جماعت کی صورت میں نماز ادا کی اور انھیں وعظ و نصیحت کی۔ پس وہی دن "روزِ جمعہ" کے نام سے موسوم ہو گیا کیونکہ وہ مسلمانوں کے اجتماع کا دن تھا۔

"اسعدؓ" کے حکم پر ایک گوسفند ذبح کیا گیا اور سب نے دوپہر اور شام کا کھانا اسی گوسفند سے کھایا، کیونکہ اس وقت مسلمانوں کی تعداد بہت تھوڑی تھی۔

یہ پہلا جمعہ تھا جو اسلام میں پڑھا گیا۔

لیکن وہ پہلا جمعہ جو حضرت رسولؐ نے اپنے اصحاب کے ساتھ پڑھا وہ اس وقت پڑھا گیا جب آپ نے مدینہ کی طرف ہجرت فرمائی۔ جب آپ مدینہ میں وارد ہوئے تو اس دن پیر کا دن بارہ ربیع الاوّل اور ظہر کا وقت تھا۔ حضرت چار دن تک "قبا" میں رہے اور مسجد قبا کی بُنیاد رکھی، پھر جُمعہ کے دن مدینہ کی طرف روانہ ہوئے (قبا اور مدینہ کے درمیان فاصلہ بہت ہی کم ہے اور موجودہ وقت میں قبا مدینہ کا ایک داخلی محلّہ ہے) اور نمازِ جُمعہ کے وقت آپ محلّہ "بنی سالم" میں پہنچے۔ وہاں نمازِ جمعہ ادا فرمائی اور یہ اسلام میں پہلا جمعہ تھا جو حضرت رسولؐ نے ادا کیا۔ جمعہ کی اس نماز میں آپ نے خطبہ بھی پڑھا۔ جو مدینہ میں آنحضرتؐ کا پہلا خطبہ تھا۔[3]

---

[1] مجمع البیان جلد ۱۰ ص ۲۸۶ [2] تفسیر در المنثور جلد ۶ ص ۲۲۲۔ اس روایت کو دوسرے مفسرین مثلاً "آلوسی" نے "روح المعانی" میں اور "قرطبی" نے بھی اپنی تفسیر میں نقل کیا ہے۔ [3] مجمع البیان جلد ۱۰ ص ۲۸۶

ایک محدث نے "عبدالرحمٰن بن کعب" سے نقل کیا ہے کہ میرا باپ جب جمعہ کی اذان کی آواز سنتا، تو اسعد بن زرارہ کے لیے رحمت کی دُعا کیا کرتا تھا۔ جب میں نے اس کی وجہ پوچھی تو اُس نے کہا: اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ پہلا شخص تھا جس نے ہمارے ساتھ نماز جمعہ ادا کی۔ میں نے کہا: اُس وقت کتنے افراد حاضر تھے؟ اس نے کہا: صرف چالیس نفر[1]

۲: نماز جُمعہ کی اہمیّت

سب سے پہلے تو اس عظیم اسلامی فریضہ کی اہمیت کی بہترین دلیل اسی سورہ کی آیات ہیں جو تمام مُسلمانوں اور اہل ایمان کو یہ حکم دیتی ہیں کہ جمعہ کی اذان سُنتے ہی اس کی طرف دوڑ پڑیں۔ ہر قسم کے کاروبار اور زکاوٹ ڈالنے والے کام چھوڑ دیں۔ یہانتک کہ اگر کسی سال لوگ غذائی اشیاء کی کمی میں گرفتار ہوں اور کوئی ایسا قافلہ آ جائے جو ان کی ضرورت کی چیزیں ساتھ لے کر آیا ہو تو وہ اس کی طرف نہ جائیں اور نمازِ جمعہ کے اعمال کو جاری رکھیں۔

اسلامی روایات میں بھی اس سلسلہ میں بہت سی تاکیدیں وارد ہُوئی ہیں، ان میں سے ایک خطبہ ہے کہ جسے موافق و مخالف سب نے پیغمبرؐ گرامی سے نقل کیا ہے۔ اس میں آیا ہے:

ان الله تعالیٰ فرض علیکم الجمعة فمن ترکها فی حیاتی او بعد موتی استخفافًا بها او جحودًا لها فلا جمع الله شمله، ولا بارك له فی امره الا ولا صلوٰة له، الا ولا زکوٰة له، الا ولا حج له الا ولا صوم له، الا ولا برله حتی یتوب.

"خُدا نے نمازِ جمعہ تم پر واجب کی ہے۔ اگر کوئی شخص اسے میری زندگی میں یا میری وفات کے بعد استخفاف یا انکار کے طور پر ترک کرے تو خُدا اُسے پریشان حال کر دے گا اور اس کے کسی کام میں برکت نہیں دے گا۔ جان لو کہ اُس کی نماز قبول نہیں ہے اس کی زکوٰۃ قبول نہیں ہے اور جان لو کہ اُس کے نیک اعمال قبُول نہیں ہیں جب تک کہ اپنے اس عمل سے توبہ نہ کرے۔[2]

ایک اور حدیث میں امام محمد باقرؑ سے مروی ہے:

صلوٰة الجمعة فریضة، والاجتماع الیها فریضة مع الامام. فان ترك رجل من غیر علة ثلاث جمع فقد ترك ثلاث فرائض، ولا یدع ثلاث فرائض من غیر علة الا منافق:

"نمازِ جمعہ ایک فریضہ ہے اور اس کا اجتماع امام (معصُوم) کے ساتھ واجب ہے۔ جب کوئی شخص تین جمعے بغیر کسی عُذر کے ترک کر دے تو اس نے تین فریضے ترک کیے ہیں۔ اور تین فرائض بغیر کسی علّت کے ترک نہیں کرتا مگر منافق۔[3]

---

[1] وسائل الشیعہ جلد ۵ ص ۷، باب وجوب صلوٰۃ الجمعۃ حدیث ۲۸ [2] وسائل الشیعہ جلد ۵ ص ۴ حدیث ۵
[3] روح المعانی جلد ۲۸ ص ۸۸

ایک اور حدیث میں حضرت رسولؐ سے منقول ہے :

"من اتی الجمعة ایمانًا و احتسابًا استأنف العمل"

"جو شخص از روئے ایمان خدا کے لیے نماز جمعہ میں شرکت کرے تو اس کے گناہ بخش دیئے جائیں گے اور وہ اپنے عمل کا سلسلہ نئے سرے سے شروع کرے گا۔" [1]

اس سلسلے میں روایات بہت زیادہ ہیں، اور ان سب کا بیان کرنا باعثِ طوالت ہو گا۔ ہم یہاں ایک اور حدیث نقل کرکے اس بحث کو ختم کرتے ہیں۔

ایک شخص حضرت رسولؐ کی خدمت میں آیا اور عرض کیا : "یا رسول اللہؐ! میں کئی مرتبہ حج کے لیے تیار ہوا ہوں لیکن مجھے توفیق حاصل نہ ہوئی۔ اس پر آپ نے فرمایا :

"علیک بالجمعة فانها حج المساکین"

"تو نماز جمعہ پڑھا کر کیونکہ مساکین کا حج یہی ہے۔"

یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ حج کے عظیم اسلامی اجتماع کے بہت سے برکات نمازِ جمعہ کے اجتماع میں موجود ہوتے ہیں۔ [2]

البتہ یہ بات مدِنظر رہے کہ شدید مذمتیں نمازِ جمعہ کے ترک کرنے کے بارے میں آئی ہیں جن میں جمعہ کے ترک کرنے والوں کو منافقین کے زمرہ میں شمار کیا گیا ہے۔ یہ اس صورت میں ہے کہ جب نماز جمعہ واجب عینی ہو۔ یعنی امام معصوم کے حضور اور ان کے مبسوط الید ہونے کا زمانہ ہو۔ لیکن چونکہ زمانۂ غیبت میں یہ واجب تخییری ہے (نمازِ جمعہ اور نمازِ ظہر کے درمیان اختیار ہے) اور بطور استخفاف و انکار بھی ترک نہ ہو تو پھر وہ ان مذمتوں کا مشمول نہیں ہو گا۔ اگرچہ نمازِ جمعہ کی عظمت اور اس کی حد سے زیادہ اہمیت اس حالت میں بھی محفوظ ہے۔ (اس مسئلہ کی مزید وضاحت کے لیے فقہ کی کتابوں کا مطالعہ کرنا چاہیے۔)

۳ : نماز عبادی سیاسی جمعہ کا فلسفہ

نمازِ جمعہ ہر چیز سے پہلے ایک عظیم اجتماعی عبادت ہے اور عبادات کی عمومی تاثیر کہ جو روح و جان کو لطیف بنانا، دل کو گناہ کی آلودگیوں سے پاک کرنا اور دل سے معصیت کے زنگ کو اتارنا ہے وہ، اس میں موجود ہے۔ خاص طور پر یہ بات کہ اس میں دو خطبے ہوتے ہیں جو انواع و اقسام کے مواعظ، پند و نصائح اور تقویٰ و پرہیزگاری کا حکم دینے پر مشتمل ہوتے ہیں۔

---

[1] وسائل شیعہ جلد ۵ حدیث ۱۰

[2] وسائل شیعہ جلد ۵ حدیث ۱۷

لیکن اجتماعی اور سیاسی لحاظ سے یہ ایک عظیم ہفتہ وار کانفرنس ہے، جو حج کی سالانہ کانفرنس کے بعد بزرگ ترین اسلامی کانفرنس ہے۔ اسی وجہ سے اس روایت میں جو پہلے ہم پیغمبر اکرمؐ سے پہلے نقل کر چکے ہیں، یوں آیا ہے کہ جمعہ ان لوگوں کا حج ہے جو مراسم حج میں شرکت کی قدرت نہیں رکھتے۔

حقیقت میں اسلام تین عظیم اجتماعوں کو اہمیت دیتا ہے:

۱: روزانہ کے اجتماعات جو نماز جماعت میں حاصل ہوتے ہیں۔

۲: ہفتہ وار اجتماع جو نمازِ جمعہ کے اعمال سے حاصل ہوتا ہے۔

۳: حج کا اجتماع جو خانۂ خدا کے پاس ہر سال ایک مرتبہ انجام پاتا ہے۔

ان سب میں سے نماز جمعہ کا اثر بہت ہی اہم ہے۔ خاص طور پر یہ بات کہ نماز جمعہ کے خطبہ میں خطیب کا ایک موضوع اہم سیاسی اجتماعی اور اقتصادی مسائل کے بارے میں ہوتا ہے۔ اس طرح سے اس عظیم اور پُرشکوہ اجتماع سے ذیل کے برکات حاصل ہو سکتے ہیں:

ا: لوگوں کو معارفِ اسلامی اور اہم اجتماعی و سیاسی حالات و واقعات سے آگاہ کرنا۔

ب: مسلمانوں کی صفوں میں ایسی ہم آہنگی اور زیادہ سے زیادہ نظم و اتحاد پیدا کرنا جو دشمنوں کو وحشت میں ڈال دے اور انھیں لرزہ بر اندام کر دے۔

ج: مسلم عوام میں دینی رُوح اور نشاط معنوی کی تجدید۔

د: عام مشکلات کے حل کے لیے باہمی تعاون حاصل کرنا۔

اسی وجہ سے دشمنانِ اسلام ہمیشہ ایک ایسی جامع الشرائط نمازِ جمعہ سے خوفزدہ رہتے تھے جس میں خصوصیت کے ساتھ احکام اسلامی کی رعایت کی جاتی ہو۔

اسی بناء پر نماز جمعہ حکومتوں کے ہاتھ میں ہمیشہ ایک طاقتور ہتھیار رہی ہے۔ البتہ عادلانہ حکومتیں جیسے پیغمبر اکرمؐ کی حکومت، اس سے اسلام کے نفع کے لیے بہترین استفادہ کیا کرتے تھے اور حکومتہائے جور، جیسے بنی اُمیہ کی حکومت، اس سے اپنی طاقت اور قدرت کی بنیادوں کو مضبوط و محکم کرنے کے لیے سوء استفادہ کیا کرتی تھیں۔

ہم طول تاریخ میں مشاہدہ کرتے ہیں کہ جو شخص یہ چاہتا کہ وہ کسی حکومت کے خلاف قیام کرے تو سب سے پہلے وہ اس کی نمازِ جمعہ میں شرکت سے رُک جایا کرتا تھا جیسا کہ واقعۂ کربلا میں بیان ہوا ہے کہ شیعوں کا ایک گروہ "سلیمان بن صرد خزاعی" کے گھر میں جمع ہوا اور انہوں نے کوفہ سے امام حسینؑ کی خدمت میں ایک خط لکھا کہ جس کا مضمون یہ تھا:

کوفہ میں بنی اُمیہ کا گورنر نعمان بن بشیر گوشہ نشین ہو گیا ہے اور ہم اس کی نمازِ جمعہ میں شرکت نہیں کرتے۔ اگر ہمیں یہ معلوم ہو جائے کہ آپ ہماری طرف آ رہے ہیں تو ہم اُسے کوفہ سے نکال دیں گے۔ [1]

[1] بحار الانوار جلد ۴۴ ص ۳۳۲

صحیفۂ سجادیہ میں امام علی بن الحسین علیہما السلام سے وارد ہوا ہے :

" اللّٰھم ان ھذا المقام لخلفائك و اصفیائك و مواضع امنائك فی الدرجۃ الرفیعۃ التی اختصصتھم بھا قد ابتزوھا"

"خداوندا! یہ مقام (نمازِ جمعہ اور عید قربان) تیرے خلفاء برگزیدہ ہستیوں اور بلند پایہ امینوں کے لیے مخصوص ہے اور تو نے اس کے لیے انھیں کو مخصوص کیا تھا۔ لیکن (بنی اُمیہ کے خلفاء جور) نے زبردستی اسے اولیاء حق سے لے لیا اور غصب کر لیا ہے"۔[1]

بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ دشمنانِ اسلام ہفتہ بھر رات دن زہریلے پروپیگنڈے میں مصروف رہتے ہیں لیکن وہ سب کے سب نمازِ جمعہ کے ایک ہی خطبہ اور اُس کے پُرشکوہ اور حیات بخش اعمال سے بے اثر ہو کر رہ جاتے ہیں۔ جبکہ مسلمانوں کے جسموں میں ایک نئی رُوح پھونک دی جاتی ہے اور ان کی رگوں میں ایک تازہ خون دوڑنے لگتا ہے۔

اس نکتہ کی طرف توجہ کرتے ہوئے کہ شیعہ فقہ کے مطابق ہر طرف سے ایک فرسخ کے علاقہ میں ایک سے زیادہ نمازِ جمعہ جائز نہیں ہے تاکہ وہ لوگ جو نمازِ جمعہ کے انعقاد کی جگہ سے دو فرسخ (تقریباً گیارہ کیلومیٹر) کے اندر رہتے ہیں، وہ اس نماز میں شرکت کریں۔ اِس حکم سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ عملی طور پر ہر چھوٹے اور بڑے شہر اور اس کے اطراف میں ایک سے زیادہ نمازِ جمعہ منعقد نہیں ہوگی۔ اِس بناء پر یہی نمازِ جمعہ اِس علاقے کا ایک عظیم ترین اجتماع ہوگا۔

لیکن انتہائی افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ یہ عبادی سیاسی مراسم جو اسلامی معاشروں میں ایک عظیم تحرک کا باعث بن سکتے تھے، ان میں فاسد حکومتوں کے نفوذ کی وجہ سے بعض اسلامی ممالک میں یہ ایسے بے رُوح اور بے جان ہو گئے ہیں کہ عملی طور پر ان سے کوئی مثبت اثر حاصل نہیں ہوتا اور ان اجتماعات نے ایک رسمی سے عمل کی شکل اختیار کر لی ہے۔ مگر واقعاً یہ ان عظیم سرمایوں میں سے ہے کہ جن کے ضائع ہونے پر رونا چاہیئے۔

سال بھر کی اہم ترین نمازِ جمعہ وہ ہے جو عرفات کی طرف جانے سے پہلے مکہ میں انجام پاتی ہے۔ اِس میں ساری دنیا سے آئے ہوئے خانۂ خدا کے تمام حجاج شرکت کرتے ہیں جو کرۂ ارض کے مسلمانوں کے تمام طبقات کے واقعی نمائندے ہوتے ہیں۔ ایسی اہم اور حساس نماز کا خطبہ تیار کرنے کے لیے مناسب ہے کہ بہت سے علماء کئی کئی ہفتوں اور مہینوں تک مطالعہ اور تیاری کریں۔ پھر اس کا ماحصل اس حساس دن کے تاریخی خطبے میں تمام مسلمانوں کے سامنے پیش کریں۔ یوں وہ یقینی طور پر اس کی برکت سے اسلامی معاشرے کو زیادہ سے زیادہ

---

[1] صحیفۂ سجادیہ دعا ۴۸

آگاہی دیتے ہوئے اس کی بڑی بڑی مشکلات کو حل کر سکتے ہیں۔

لیکن ان دنوں یہ ایک انتہائی افسوس کی بات دکھائی دیتی ہے کہ حرم پاک میں اس جمعہ پر بہت ہی معمولی اور عام مسائل و مطالب پیش کیے جاتے ہیں جن سے تقریباً سبھی لوگ واقف ہوتے ہیں۔ لیکن وہاں اصولی مسائل کی بالکل کوئی خبر ہی نہیں ہوتی۔ کیا اس قسم کی عظیم فرصت اور عظیم سرمایوں کے ہاتھ سے نکل جانے کے لیے گریہ نہیں کرنا چاہیے؟ اور اس کو بدلنے کے لیے قیام نہیں کرنا چاہیئے؟

❊ ❊ ❊

۴: نماز جمعہ کے آداب اور خطبوں کے مطالب و مضامین

نمازِ جمعہ (ضروری شرائط کی موجودگی میں) بالغ اور صحیح و سالم مردوں پر واجب ہے جو نماز میں شرکت کی طاقت رکھتے ہیں۔ مسافروں اور بوڑھے لوگوں پر واجب نہیں ہے۔ اگرچہ مسافر کے لیے نمازِ جمعہ میں حاضر ہونا جائز ہے۔ اسی طرح سے عورتیں بھی نمازِ جمعہ میں شرکت کر سکتی ہیں اگرچہ وہ ان پر واجب نہیں ہے۔

وہ کم سے کم تعداد پانچ مرد ہے جس سے نماز جمعہ منعقد ہو سکتی ہے۔ نماز جمعہ دو رکعت ہے اور وہ نماز ظہر کی جگہ لے لیتی ہے۔ نیز دو خطبے جو نمازِ جمعہ سے پہلے پڑھے جاتے ہیں وہ حقیقت میں دو رکعتوں کی جگہ محسوب ہوتے ہیں۔

نماز جمعہ صبح کی نماز کی طرح ہے اور مستحب ہے کہ اس میں حمد و سورہ کو بلند آواز میں پڑھا جائے۔ اس کے علاوہ مستحب ہے کہ پہلی رکعت میں سورۂ جمعہ اور دوسری رکعت میں سورۂ منافقین کی قرأت کی جائے۔

نمازِ جمعہ میں دو قنوت مستحب ہیں۔ ایک رکعت اوّل میں رکوع سے پہلے اور دوسرا دوسری رکعت میں رکوع کے بعد ہے۔

دو خطبوں کا پڑھنا نمازِ جمعہ سے پہلے واجب ہے، جیسا کہ خطیب کا کھڑے ہو کر خطبہ دینا بھی واجب ہے۔ جو شخص خطبہ دیتا ہے حتمی طور پر نمازِ جمعہ کا امام وہی ہونا چاہیئے۔

خطیب کو اپنی آواز اتنی بلند کرنا چاہیے کہ لوگ اس کی آواز کو سن لیں، تاکہ خطبہ کا مضمون سب کے کانوں تک پہنچ جائے۔

خطبہ کے دوران سامعین کو خاموش رہنا اور خطیب کی باتوں پر کان دھرنا چاہیئے۔ نیز خطیب کے روبرو بیٹھنا چاہیے۔

خطیب کو مرد فصیح و بلیغ، اوضاع و احوال مسلمین سے آگاہ، اسلامی معاشرے کے مصالح سے باخبر، شجاع، صریح اللہجہ اور اظہارِ حق میں قاطع ہونا چاہیے۔ اس کے اعمال و رفتار اس کے کلام کی تاثیر و نفوذ کا سبب ہونے چاہئیں اور اس کی زندگی لوگوں کو خدا کی یاد دلانے والی ہونی چاہیے۔

مناسب ہے کہ وہ پاکیزہ ترین لباس پہنے ہوئے ہو۔ اپنے بدن کو خوشبو لگائے، وقار اور سکینہ کے ساتھ قدم اٹھائے اور جب منبر پر جائے لوگوں کو سلام کرے، پھر ان کے سامنے کھڑا ہو جائے اور شمشیر یا کمان یا عصا پر ٹیک لگائے۔ پہلے وہ منبر پر بیٹھ جائے۔ یہاں تک کہ اذان مکمل ہو جائے۔ اذان ختم ہونے کے بعد اٹھے اور خطبہ شروع کرے۔

خطبہ کا مضمون پہلے خدا کی حمد اور پیغمبر پر درود ہے (احتیاط اس میں ہے کہ یہ حصہ عربی زبان میں ہو لیکن باقی حصہ سننے والوں کی زبان میں پڑھا جائے) پھر لوگوں کو خوفِ خدا اور تقویٰ کی وصیت و نصیحت کرے۔ قرآن مجید کی کوئی مختصر سی سورہ پڑھے اور اس امر کی دونوں خطبوں میں رعایت کرے۔ دوسرے خطبہ میں پیغمبر پر درود کے بعد آئمہ مسلمین کے لیے دعا کرے اور مومنین و مومنات کے لیے استغفار کرے۔

مناسب ہے کہ خطبہ کے ضمن میں ایسے اہم مسائل پیش کرے جو مسلمانوں کے دین اور دنیا کے ساتھ مربوط ہیں۔ اسلامی ممالک کے اندر اور باہر اور اس علاقے کے داخل و خارج میں جن باتوں کی مسلمانوں کو ضرورت و احتیاج ہے ان پر بحث کرے۔ وہ سیاسی، اجتماعی، اقتصادی اور دینی مسائل کو ترجیح کا لحاظ رکھتے ہوئے پیش کرے۔ لوگوں کو آگاہی بخشے اور دشمنوں کی سازشوں سے باخبر کرے۔ بعد اسلامی معاشرے کی حفاظت اور مخالفین کی سازشوں کو ناکام بنانے کے لیے مختصر اور طویل مدت منصوبے ان کے سامنے بیان کرے۔

خلاصہ یہ کہ خطیب کو بہت ہی ہوشیار، بیدار اور اسلامی مسائل کے بارے میں اہلِ فکر اور صاحبِ مطالعہ ہونا چاہیے۔ اسے جمعہ کے ان عظیم مراسم کی موقعیت و حیثیت سے اسلام اور مسلمانوں کے اہداف و مقاصد کی کامیابی کے لیے زیادہ سے زیادہ استفادہ کرنا چاہیے۔ [1]

ایک حدیث میں امام علی بن موسیٰ رضا ؑ سے آیا ہے:

"انما جعلت الخطبة یوم الجمعة لان الجمعة مشهد عام، فاراد ان یکون للامیر سبب الی موعظتهم وترغیبهم فی الطاعة، وترهیبهم من المعصیة وتوقیفهم علی ما اراد من مصلحة دینهم ودنیاهم ویخبرهم بما ورد علیهم من الافاق من الاهوال التی لهم فیها المضرة والمنفعة ..... وانما جعلت خطبتین لیکون واحدة للثناء علی الله والتمجید والتقدیس لله عزوجل والاخری للحوائج والاعذار والانذار والدعاء ولما یرید ان یعلمهم من امره ونهیه ما فیه

---

[1] نماز جمعہ کے احکام کی خصوصیات و جزئیات اور اس کے خطبوں میں فقہاء کے فتاوی میں جزئی اختلاف ہے۔ جو کچھ اوپر بیان ہوا ہے وہ مختلف فتاوی کا خلاصہ ہے۔

الصلاح والفساد"۔

جمعہ کے دن خطبہ اس لیے شروع کیا گیا ہے کہ نماز جمعہ ایک عمومی اجتماع ہے۔ خدا چاہتا ہے کہ مسلمانوں کے امیر کو یہ موقع فراہم کرے کہ وہ لوگوں کو وعظ و نصیحت کرے، اطاعت کی ترغیب دے، معصیت الٰہی سے ڈرائے اور انھیں اس چیز سے آگاہ کرے کہ جس میں ان کے دین و دنیا کی سلامت اور بہتری ہے۔ نیز وہ اخبار و واقعات جو مختلف علاقوں سے اس تک پہنچے ہیں جو لوگوں کے لیے ان کے سود و زیاں میں مؤثر ہیں، انھیں ان کی اطلاع دے ..... اور دو خطبے اس لیے قرار دیئے گئے ہیں تاکہ ایک میں خدا کی حمد و ثنا اور تمجید و تقدیس کرے اور دوسرے میں احتیاجات، ضرورتیں، تنبیہیں اور دعائیں قرار دے اور ان کے سامنے اوامر و نواہی، اور ایسے احکام کا اعلان کرے جو اسلامی معاشرے کی اصلاح اور فساد کے ساتھ مربوط ہیں۔ [1]

٭ ٭ ٭

۵ : نماز جمعہ کے وجوب کی شرائط

اس بارے میں کوئی شک و شبہ نہیں ہے کہ ہر دوسرے امام جماعت کی طرح امام جمعہ کو بھی عادل ہونا چاہیئے۔ لیکن بحث اس بات میں ہے کہ اس کے علاوہ بھی اس میں کچھ شرائط ہونی ضروری ہیں یا نہیں؟

ایک گروہ کا نظریہ ہے کہ یہ نماز امام معصوم یا ان کے نمائندۂ خاص کے فرائض میں سے ہے ـــــ دوسرے لفظوں میں یہ امام معصوم کے زمانہ حضور کے ساتھ مربوط ہے۔

مگر بہت سے محققین کا نظریہ ہے کہ یہ شرط نماز جمعہ کے وجوب عینی کی ہے۔ لیکن وجوب تخییری کے لیے یہ شرط ضروری نہیں ہے۔ لہٰذا زمانۂ غیبت میں بھی نماز جمعہ کو قائم کیا جا سکتا ہے اور وہ نماز ظہر کی جانشین بن سکتی ہے۔ ہاں حق بھی یہی ہے۔ بلکہ جب اسلامی حکومت اپنی شرائط کے ساتھ امام کے نائب عام کی طرف سے تشکیل پائے تو احتیاط یہ ہے کہ امام جمعہ اس کی طرف سے منصوب ہو، اور مسلمان نماز جمعہ میں شرکت کریں۔

اس سلسلے میں اور نماز جمعہ سے مربوط دوسرے مسائل کے بارے میں بہت زیادہ اختلاف ہے۔ یہاں ان سب امور کا بیان کرنا ایک تفسیری بحث کے احاطہ سے خارج ہے۔ لہٰذا انھیں فقہ اور حدیث کی کتابوں میں تلاش کرنا چاہیے۔ [2]

٭ ٭ ٭

---

[1] وسائل الشیعہ جلد ۵ ص ۳۹ [2] (اگلے صفحہ پر لکھا گیا ہے)

خداوندا ! ہمیں توفیق مرحمت فرما کہ ہم ان عظیم شعائر سے نفوس کی تربیت اور مسلمانوں کو دشمن کے چنگل سے نجات دلانے کے لیے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھائیں۔

پروردگارا ! ہمیں ایسے لوگوں میں سے قرار دے کہ ہم تیری ملاقات کے مشتاق ہوں اور موت سے ہرگز نہ ڈریں۔

بارِ الٰہا ! نعمتِ ایمان اور انبیاء ؑ کی تعلیم و تربیت کو ہم سے ہرگز سلب نہ کرنا۔

آمین یارب العالمین

❊ ❊ ❊

سورۂ جمعہ کا اختتام

۱۴ رمضان المبارک ۱۴۰۶ھ

اختتام ترجمہ ۱۶ ذیقعدۃ ۱۴۰۷ھ مطابق ۱۳ جولائی ۱۹۸۷ء بروز پیر بر مکان حقیر، قم مقدس ، ایران

ؑ مرحوم علامہ مجلسی نے بحار الانوار کی جلد ۸۹، ۹۰ میں اس اہم مسئلہ اور جمعہ کی باقی خصوصیات کو بیان کیا ہے

سُورۂ
مُنافِقُوْنَ

یہ سُورہ مدینہ میں نازل ہُوا اور اس کی ۱۱ آیات ہیں۔

شروع ۱۵ رمضان المبارک ۱۴۰۶ھ

سورہ منافقون کے مَطالب

سورۂ منافقون ایسے مطالب ومضامین سے بھرے ہوئے سوروں میں سے ہے جن کے مباحث کا اصلی محور "منافقین" سے مربوط حساس مسائل ہیں۔ لیکن اس سورہ کے ذیل میں کچھ آیات مختلف سلسلوں میں مسلمانوں کے پند و نصائح کے عنوان سے بھی آئی ہیں۔

مجموعی طور پر اس کے مضامین کو چار حصّوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے :

۱ : منافقین کی نشانیاں جو خود کئی حساس عنوانوں پر مشتمل ہیں۔

۲ : مومنین کو منافقین سے ہوشیار رہنے کی تلقین اور اس سلسلے میں ہمیشہ نگرانی کی ضرورت۔

۳ : مومنین کو تنبیہ کہ دنیا کی مادّی نعمتیں انھیں ذکرِ خدا سے غافل نہ کر دیں۔

۴ : خدا کی راہ میں خرچ کرنے موت کے آنے اور انسان کی جان میں حسرت کی آگ بھڑکنے سے پہلے، اموال سے فائدہ اٹھانے کی وصیت و نصیحت۔

اس کا نام "سورۂ منافقون" رکھنے کی وجہ بھی خود بخود واضح ہے۔

قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ ہم نے جو کچھ سورۂ جمعہ کی تفسیر میں بیان کیا ہے اس کے مطابق نمازِ جمعہ کے آداب میں سے ایک یہ ہے کہ پہلی رکعت میں سورۂ جمعہ اور دوسری رکعت میں سورۂ منافقون پڑھی جائے تاکہ مسلمان ہر ہفتہ ان عظیم عبادی و سیاسی مراسم میں منافقین کی سازشوں کو تازہ بہ تازہ معلوم کرتے رہیں اور ہمیشہ ان کی منحوس تحریکوں، تخریب کاریوں اور منصوبوں پر نظر رکھیں۔[1]

سورۂ منافقون کی تلاوت کی فضیلت

ایک حدیث میں پیغمبرِ گرامی سے مروی ہے :

"من قرأ سورة المنافقون برء من النفاق"

"جو شخص سورۂ منافقون کو پڑھے وہ ہر قسم کے نفاق سے پاک ہو جاتا ہے۔[1]

---

[1] "مجمع البیان" آغاز سورہ منافقون

ایک اور حدیث میں امام صادقؑ سے آیا ہے :

"ہمارے شیعوں میں سے ہر مومن کے لیے ضروری ہے کہ وہ شب جمعہ میں "سورۂ جمعہ" اور "سورۂ اعلیٰ" پڑھے اور جمعہ کے دن نماز ظہر میں "سورۂ جمعہ" اور "سورۂ منافقون پڑھے۔" ۱

اس کے بعد آپ نے مزید فرمایا :

"فاذا فعل ذالك فكانما يعمل بعمل رسول الله (ص) وكان جزاؤه وثوابه على الله الجنة."

"جب وہ ایسا کرے گا تو گویا اُس نے حضرت رسولؐ کے عمل کو انجام دیا اور اس کی جزا اور ثواب اللہ کے ہاں جنت ہے۔" ۲

ہم نے ہر سورہ کے فضائل کے ذکر کے بعد بارہا یہ کہا ہے کہ یہ اہم فضائل و آثار، فکر و عمل سے خالی صرف تلاوت کا نتیجہ نہیں ہو سکتے۔ مذکورہ بالا روایات بھی اس بات کی گواہ ہیں کہ زندگی کا طریقہ اس کے مطابق بنائے بغیر اس سورۃ کا پڑھنا انسان میں سے رُوح نفاق کو ہرگز خارج نہیں کرتا۔

٭ ٭ ٭

---

۱ "ثواب الاعمال" مطابق نقل نور الثقلین جلد ۵ ص ۳۳۱

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

① اِذَا جَآءَکَ الۡمُنٰفِقُوۡنَ قَالُوۡا نَشۡهَدُ اِنَّکَ لَرَسُوۡلُ اللّٰهِ ۘ وَاللّٰهُ یَعۡلَمُ اِنَّکَ لَرَسُوۡلُهٗ ؕ وَاللّٰهُ یَشۡهَدُ اِنَّ الۡمُنٰفِقِیۡنَ لَکٰذِبُوۡنَ ۚ

② اِتَّخَذُوۡۤا اَیۡمَانَهُمۡ جُنَّةً فَصَدُّوۡا عَنۡ سَبِیۡلِ اللّٰهِ ؕ اِنَّهُمۡ سَآءَ مَا کَانُوۡا یَعۡمَلُوۡنَ ۝

③ ذٰلِکَ بِاَنَّهُمۡ اٰمَنُوۡا ثُمَّ کَفَرُوۡا فَطُبِعَ عَلٰی قُلُوۡبِهِمۡ فَهُمۡ لَا یَفۡقَهُوۡنَ ۝

④ وَاِذَا رَاَیۡتَهُمۡ تُعۡجِبُکَ اَجۡسَامُهُمۡ ؕ وَاِنۡ یَّقُوۡلُوۡا تَسۡمَعۡ لِقَوۡلِهِمۡ ؕ کَاَنَّهُمۡ خُشُبٌ مُّسَنَّدَةٌ ؕ یَحۡسَبُوۡنَ کُلَّ صَیۡحَةٍ عَلَیۡهِمۡ ؕ هُمُ الۡعَدُوُّ فَاحۡذَرۡهُمۡ ؕ قٰتَلَهُمُ اللّٰهُ ۚ اَنّٰی یُؤۡفَکُوۡنَ ۝

ترجمہ

رحمٰن و رحیم خدا کے نام سے۔

① جب منافقین تیرے پاس آتے ہیں تو کہتے ہیں: ہم گواہی دیتے ہیں کہ یقیناً تو اللہ کا رسول ہے، خدا جانتا ہے کہ تو یقیناً اس کا رسول ہے۔ لیکن خدا گواہی دیتا ہے کہ منافقین جھوٹے ہیں۔

(۲) اُنھوں نے اپنی قسموں کو ڈھال بنا لیا ہے تاکہ وہ لوگوں کو اللہ کی راہ سے روکیں۔ بیشک وہ بہت ہی بُرے کام انجام دیتے ہیں۔

(۳) یہ اس بناء پر ہے کہ وہ پہلے تو ایمان لائے اور پھر کافر ہو گئے۔ لہٰذا اُن کے دلوں پر مُہر لگا دی گئی ہے اور وہ حقیقت کو درک نہیں کرتے۔

(۴) جب تم انھیں دیکھتے ہو تو ان کا جسم اور حلیہ تمھیں تعجب میں ڈال دیتا ہے اور اگر وہ کوئی بات کرتے ہیں تو تُو ان کی باتوں کو کان دھر کے سنتا ہے۔ حالانکہ وہ ایسی خشک لکڑیاں ہیں جنھیں دیوار کے سہارے کھڑا کر دیا گیا ہو۔ جو آواز بھی کہیں سے بلند ہوتی ہے اُسے وہ اپنے برخلاف خیال کرتے ہیں۔ وہ تمھارے حقیقی دشمن ہیں۔ تم ان سے بچتے رہو، خدا انھیں ہلاک کرے، وہ حق سے کس طرح منحرف ہو جاتے ہیں؟

❊ ❊ ❊

تفسیر

سرچشمۂ نفاق اور منافقین کی نشانیاں

(ان آیات کی تفسیر بیان کرنے سے پہلے ایک مقدمہ کا ذکر کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ مسئلہ نفاق اور منافقین، اسلام میں پہلی مرتبہ اس وقت سامنے آیا جب پیغمبرؐ نے مدینہ کی طرف ہجرت فرمائی اور اسلام کی بنیادیں قوی اور کامیابی آشکار ہو گئی۔ ورنہ مکہ میں تقریباً کوئی منافق موجود نہیں تھا کیونکہ دشمن اسلام کے برخلاف جو چاہتے کھلم کھلا کہتے اور کرتے اور کسی کو خاطر میں نہ لاتے۔ انھیں منافقانہ طرزِ عمل کی کوئی ضرورت نہ تھی۔)

لیکن جب مدینہ میں اسلام کے نفوذ اور پھیلاؤ نے دشمنوں کو ضعیف و ناتواں بنا دیا تو اب مخالفت کا اظہار کھلے عام کرنا مشکل اور بعض اوقات ناممکن تھا۔ لہٰذا شکست خوردہ دشمنوں نے اپنی تخریبی سرگرمیاں جاری و ساری رکھنے کے لیے اپنے چہرے بدل لیے۔ وہ ظاہراً مسلمانوں کی صفوں میں شامل ہو گئے، لیکن مخفیانہ طور پر اپنے بُرے مقاصد کے حصول کے لیے کوشاں رہے۔)

اصولی طور پر ہر انقلاب کی طبیعت و مزاج یہی ہے کہ نمایاں کامیابی کے بعد اُسے منافقین کا سامنا کرنا پڑتا

ہے۔ کل کے سخت ترین دشمن آج کے بااثر افراد کی صورت میں ظاہری دوستوں کے لباس میں جلوہ گر ہوتے ہیں۔ یہی وہ مقام ہے جس سے یہ سمجھا جا سکتا ہے کہ منافقین سے مربوط یہ تمام آیات مدینہ میں کیوں نازل ہوئیں اور مکہ میں کیوں نازل نہ ہوئیں۔

یہ نکتہ بھی قابل توجہ ہے کہ نفاق اور منافقین کا مسئلہ پیغمبرؐ کے زمانہ کے ساتھ ہی مخصوص نہیں تھا، بلکہ ہر معاشرہ اور خصوصاً انقلابی معاشرے، اس سے دوچار ہوتے ہیں۔ اسی وجہ سے اس مسئلہ کے بارے میں قرآن کی تحلیلوں، تجزیوں اور موشگافیوں کو ایک تاریخی مسئلہ کے عنوان سے نہیں ایک بالفعل نیاز و احتیاج کے عنوان سے مورد تحقیق و تدقیق قرار دیا جانا چاہیے۔ اس سے موجودہ وقت کے اسلامی معاشروں میں روح نفاق اور منافقین کے طریقوں سے مبارزہ کرنے کے لیے ہدایت حاصل کرنی چاہیے۔

نفاق کی نشانیاں جنھیں قرآن نے شرح و بسط سے بیان کیا ہے، وقت کے ساتھ ان کو بھی پہچاننا چاہیئے اور ان نشانیوں کے ذریعے منافقوں کے ملوّن طریقوں اور منصوبوں کی تہ تک پہنچ جانا چاہیئے۔

ایک دوسرا اہم نکتہ یہ ہے کہ منافقین کا خطرہ ہر معاشرے کے لیے ہر دشمن کے خطرے سے زیادہ ہے، کیونکہ ایک طرف تو ان کی شناخت عام طور پر آسان نہیں ہوتی اور دوسری طرف وہ داخلی دشمن ہوتے ہیں۔ بعض اوقات وہ معاشرے کے تانے بانے میں اس طرح سے نفوذ کرتے ہیں کہ انھیں الگ کرنا بہت مشکل کام ہوتا ہے۔ تیسری طرف سے ان کے باقی ارکان کے معاشرہ سے مختلف روابط ان سے مبارزہ کے کام کو دشوار بنا دیتے ہیں۔

چنانچہ اسی وجہ سے اسلام نے اپنی طویل تاریخ میں زیادہ تر منافقین ہی کے ہاتھوں چوٹ کھائی ہے۔ اسی وجہ سے قرآن نے اپنے سخت ترین حملے منافقین ہی پر کیے ہیں اور جس قدر ان کی سرکوبی کی ہے اپنے کسی بھی دشمن کے لیے روا نہیں رکھی۔

اس مقدمہ پر توجہ کے ساتھ اب ہم آیات کی تفسیر کی طرف لوٹتے ہیں۔

* * *

پہلی بات جو قرآن یہاں منافقین کے بارے میں پیش کرتا ہے ان کا وہی جھوٹے ایمان کا اظہار ہے کہ جو نفاق کی اصل بنیاد ہے۔ فرماتا ہے: جس وقت منافقین تیرے پاس آتے ہیں تو کہتے ہیں ہم گواہی دیتے ہیں کہ تو یقیناً اللہ کا رسول ہے۔ (اذا جاءك المنافقون قالوا نشهد انك لرسول الله)۔[1]

اس کے بعد قرآن مزید کہتا ہے: "خدا جانتا ہے کہ تو اس کا بھیجا ہوا ہے لیکن خدا گواہی دیتا ہے کہ منافقین جھوٹے ہیں: (والله يعلم انك لرسوله والله يشهد ان المنافقين لكاذبون)۔

اس سے نفاق کی پہلی نشانی واضح ہو جاتی ہے اور وہ ظاہر و باطن کا متفاوت ہونا ہے۔ یعنی وہ تاکید کے ساتھ زبان سے تو اظہار ایمان کرتے ہیں لیکن ان کے دل میں ایمان کی کوئی رمق نہیں ہوتی۔ یہ دوغلگی اور یہ اندر اور باہر

---

[1] یہاں "ان" مکسورہ صورت میں ذکر ہوا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ خبر کے اوپر لام تاکید آیا ہے اور اس صورت میں تقدیر میں مقدم ہے (البیان فی غریب اعراب القرآن)۔

کی دورنگی ہی نفاق کے اصلی محور ہیں۔

قابل توجہ بات یہ ہے کہ صدق وکذب (سچ اور جھوٹ) دو قسم کے ہوتے ہیں :

۱ : صدق وکذب خبری

۲ : صدق وکذب "مخبری"

پہلی قسم میں تو واقعہ کے موافق یا مخالف ہونا معیار ہوتا ہے جبکہ دوسری قسم میں اعتقاد کی موافقت ومخالفت مدنظر ہوتی ہے۔ اس معنی میں کہ اگر انسان کوئی ایسی خبر دیتا ہے جو واقعہ کے مطابق ہے لیکن اس کے عقیدہ کے خلاف ہے تو اس کو ہم کذب مخبری کہتے ہیں اور اگر اس کے عقیدہ کے مطابق ہے تو صدق ہے۔

اس طرح سے منافقوں کا پیغمبر اسلامؐ کی رسالت کی گواہی دینا خبر دینے کے لحاظ سے بالکل جھوٹ نہیں تھا بلکہ یہ ایک واقعیت تھی۔ لیکن کہنے والے اور مخبر کے لحاظ سے چونکہ یہ ان کے عقیدہ کے برخلاف تھا۔ لہٰذا جھوٹ شمار ہوتا تھا۔ اسی لیے قرآن کہتا ہے کہ تو خدا کا پیغمبر تو ہے لیکن یہ منافق جھوٹ بولتے ہیں۔

دوسرے لفظوں میں منافقین یہ نہیں چاہتے تھے کہ پیغمبرؐ کی رسالت کی خبر دیں۔ بلکہ وہ یہ چاہتے تھے کہ آنحضرتؐ کی نبوت کے بارے میں اپنے اعتقاد کی خبر دیں۔ اور یقیناً اس خبر میں وہ جھوٹے تھے۔

یہ نکتہ بھی قابل توجہ ہے کہ انھوں نے اپنی گواہی میں انواع واقسام کی تاکیدیں استعمال کی ہیں[1]۔ اور خدا تعالےٰ بھی قطعیت کے ساتھ، اسی لب ولہجہ میں ان کی تکذیب کرتا ہے۔ یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ ایسی قطعیت کے مقابلہ میں اسی قسم کی قطعیت ضروری ہے۔

یہاں اس نکتہ کا ذکر کرنا بھی ضروری ہے کہ "منافق" اصل میں "نفق" (بروزن نفخ) کے مادہ سے نفوذ وپیش روی کے معنی میں ہے۔ لیکن "نفق" (بروزن شفق) کمال اور اس نقب کے معنی میں ہے جو زیر زمین لگاتے اور اس سے چھپنے یا بھاگنے کے لیے فائدہ اٹھاتے ہیں۔

بعض مفسرین نے کہا ہے کہ بعض جانور جیسے صحرائی چوہے، لومڑی اور سوسمار اپنے رہنے کے لیے بلوں میں دو سوراخ بناتے ہیں، ایک ظاہری جس سے داخل اور خارج ہوتے ہیں اور دوسرا پوشیدہ۔ جب وہ کوئی خطرہ محسوس کرتے ہیں تو مخفی راستے سے بھاگ جاتے ہیں اور اس پوشیدہ سوراخ کو "نافقاء" کہتے ہیں[2]

اس طرح سے منافق شخص وہ ہے جس نے ایک پوشیدہ اور مخفی راستہ اپنے لیے رکھا ہوا ہوتا ہے تاکہ پوشیدہ اور مخفی طریقہ سے کام کرتے ہوئے معاشرے میں نفوذ کرے اور خطرے کے وقت دوسری راہ سے فرار ہو جائے۔

* * *

---

[1] منافقین نے "جملہ اسمیہ" سے استفادہ کیا اور اسی طرح "ان" اور "لام تاکید" سے اپنے قول کو صداقت پر مبنی ظاہر کیا۔

[2] "روح البیان جلد ۹ ص ۵۲۹

بعد والی آیت میں ان کی دُوسری نشانی بیان کرتے ہُوئے اِس طرح کہتا ہے: "انھوں نے اپنی قسموں کو ڈھال بنایا ہُوا ہے تاکہ وہ لوگوں کو خدا کی راہ سے باز رکھیں"۔ (اتخذوا ایمانھم جنۃ فصدوا عن سبیل اللہ)۔

"وہ بہت ہی بُرے کام انجام دیتے ہیں"۔ (انھم ساء ما کانوا یعملون)۔

کیونکہ ظاہر میں تو وہ ایمان کا اظہار کرتے ہیں اور باطن میں کفر کرتے ہیں۔ یوں دینِ حق کی طرف لوگوں کی ہدایت کی راہ میں رکاوٹ ڈالتے ہیں۔ ہاں تو اس سے بدتر اور قبیح تر عمل اور کیا ہوگا۔

"جُنَّۃ" "جن" (بروزنِ فن) کے مادّہ سے۔ اصل میں کسی چیز کو حس سے پنہاں کرنے کے معنی میں ہے۔ نیز "جِن" (بروزنِ سن) ایک نظر نہ آنے والا موجود ہے۔ لہٰذا اس لفظ کا اس پر اطلاق ہوتا ہے۔ چُونکہ "ڈھال" ان کو دشمن کے اسلحہ کی ضربوں سے چھپا کر رکھتی ہے۔ اس لیے عربی زبان میں اُسے "جنۃ" کہا جاتا ہے۔ چنانچہ درختوں سے بھرے پُرے باغ کو ان کی زمین کے مستور ہونے کی بناء پر "جنّت" کہتے ہیں۔

بہرحال یہ نفاق کی نشانیوں میں سے ایک ہے کہ وہ اپنے آپ کو خُدا کے مقدس نام اور شدید قسموں کی آڑ میں چھپا لیتے ہیں تاکہ ان کا اصلی چہرہ دکھائی نہ دے۔ اِس طرح وہ لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کرکے انھیں غفلت میں ڈال دیتے ہیں اور "صدعن سبیل اللہ" (لوگوں کو خدا کی راہ سے باز رکھتے ہیں۔)

ضمنی طور پر یہ تعبیر اس بات کی نشان دہی کرتی ہے کہ منافق ہمیشہ مومنین کے ساتھ جنگ وجدال کی حالت میں ہیں۔ لہٰذا ان کی ظاہر داری اور چرب زبانی سے ہرگز دھوکا نہیں کھانا چاہیئے۔ کیونکہ ڈھال کا انتخاب جنگ کے میدانوں کے ساتھ مخصوص ہے۔

یہ ٹھیک ہے کہ بعض مواقع پر انسان کے لیے قسم کے سوا اور کوئی چارۂ کار نہیں ہوتا یا کم از کم قسم موردِ نظر موضوع کی اہمیت میں اضافہ کرتی ہے۔ لیکن وہ جھوٹی قسم نہیں ہے اور نہ ہی ہر چیز اور ہر کام کے لیے قسم کہ یہ منافقین کا شیوہ اور طریقہ ہے۔

سورۂ توبہ کی آیت ۷۴ میں آیا ہے یحلفون باللہ ما قالوا ولقد قالوا کلمۃ الکفر "وہ خدا کی قسم کھاتے ہیں کہ انھوں نے (پیغمبر کی پیٹھ پیچھے چبھنے والی باتیں) نہیں کیں۔ حالانکہ یقیناً انھوں نے کفر آمیز باتیں کی ہیں"۔

مفسّرین نے "صدوا عن سبیل اللہ" کے جُملہ کے دو معانی بیان کیے ہیں۔ پہلا راہِ خُدا سے اعراض کرنا اور دوسرا اوروں کو اس راہ سے باز رکھنا۔ اگرچہ زیرِ بحث آیت میں دونوں معانی کو جمع کرنا ممکن ہے۔ لیکن ان کے جھوٹی قسمیں کھانے کی طرف توجہ کرتے ہُوئے دُوسرا معنی زیادہ مناسب نظر آتا ہے۔ کیونکہ ان قسموں کا ہدف اور مقصد دوسروں کو غفلت میں رکھنا ہوتا ہے۔

وہ ایک جگہ "مسجدِ ضرار" بناتے ہیں۔ جب ان سے پوچھا جاتا ہے کہ اس سے تمہارا مقصد کیا ہے تو قسم کھا کر

کہتے ہیں کہ خیر کے سوا ہمارا اور کوئی مقصد نہیں ہے۔ (توبہ: ۱۰۷)

دُوسرے مواقع پر ان جنگوں میں شریک ہوتے ہیں جن کا فاصلہ تھوڑا اور غنیمتوں کا احتمال زیادہ ہے۔ لیکن معرکہ تبوک جو مشکلات سے پُر ہے اس میں شرکت نہ کرنے کے لیے ہزارہا بہانے اور عذر کرتے ہیں بلکہ قسم کھاتے ہیں کہ اگر ہم میں توانائی ہوتی تو تمھارے ساتھ ضرور چل پڑتے۔ (توبہ: ۴۲)

وہ نہ صرف لوگوں کے سامنے جھوٹی قسم کھاتے ہیں بلکہ جیسا کہ سورہ مجادلہ کی آیت ۱۸ میں آیا ہے۔ وہ عرصہ محشر میں بارگاہِ خداوندی میں بھی جھوٹی قسم سے متوسل ہوں گے۔ یہ چیز اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ یہ عمل ان کے وجود میں رچ بس چکا ہے یہاں تک کہ وہ عرصۂ محشر میں خدا کی بارگاہ میں بھی اس سے دستبردار نہیں ہوں گے۔

❊ ❊ ❊

بعد والی آیت میں اس قسم کے ناروا اعمال کی علّتِ اصلی کو پیش کرتے ہوئے مزید کہتا ہے: "اس کی وجہ یہ ہے کہ پہلے تو وہ ایمان لائے اور اس کے بعد کافر ہو گئے ہیں۔ اِس لیے ان کے دلوں پہ مہر لگا دی گئی اور وہ حقیقت کا ادراک نہیں کر سکتے۔" (ذالك بانهم امنوا ثم كفروا فطبع على قلوبهم فهم لا يفقهون)۔

بہت سے مفسرین کا نظریہ ہے کہ اس ایمان سے مراد یہاں ایمان ظاہری ہے جبکہ وہ باطن میں کافر ہی تھے۔

لیکن آیت کا ظاہر اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ ابتداء میں وہ حقیقتاً ایمان لے آئے تھے۔ لیکن ایمان کا ذائقہ چکھنے اور اسلام و قرآن کی حقانیت کی نشانیاں دیکھ لینے کے بعد اُنھوں نے کفر کی راہ اختیار کر لی مگر ایسا کفر جو نفاق سے تو آلودہ تھا نہ کہ آشکارا اور صراحت کے ساتھ۔ اور یہی بات اس چیز کا سبب بن گئی کہ خدا ان سے حسِ تشخیص سلب کرے اور وہ حقائق کے ادراک سے محروم رہ جائیں۔ کیونکہ اگر انھوں نے ابتداء سے ہی حق کی تشخیص نہ کی ہوتی تو پھر وہ کچھ عذر رکھتے تھے۔ لیکن حق کو پہچان لینے اور ایمان لانے کے بعد اگر وہ اسے ٹھکرا دیں تو خدا اُن سے اپنی توفیق سلب کر لیتا ہے۔

حقیقت میں منافقین کے دو گروہ ہیں۔ ایک گروہ تو وہ ہے جن کا ایمان پہلے سے ہی نمائشی اور ظاہری تھا دوسرا گروہ وہ ہے جو ابتداء میں تو حقیقتاً ایمان لے آیا لیکن بعد میں اس نے ارتداد و نفاق کی راہ اختیار کر لی۔ زیرِ بحث آیت کا ظاہر دُوسرے گروہ کی بات کرتا ہے۔

حقیقت میں یہ آیت سورہ توبہ کی آیت ۷۴ کے مشابہ ہے کہ جو کہتی ہے: وكفروا بعد اسلامهم "وہ اسلام لانے کے بعد کافر ہو گئے"۔

بہرحال یہ ان کی تیسری نشانی ہے کہ وہ واضح حقائق کے ادراک سے عام طور محروم ہیں۔ یہ بات کہے بغیر واضح ہے کہ یہ چیز ہرگز جبر و اکراہ نہیں ہے۔ کیونکہ اس کے مقدمات کو انھوں نے خود فراہم کیا ہے۔

بعد والی آیت ان کی مزید نشانیاں بتاتے ہوئے کہتی ہے :

"جب تم انھیں دیکھو گے تو ان کا جسم اور صورت تمھیں تعجب میں ڈال دے گا" (و اذا رأیتھم تعجبك اجسامھم)۔

ان کا ظاہر آراستہ اور ان کی شکل وصورت بڑی عمدہ نظر آتی ہے۔

علاوہ ازیں وہ ایسی شیریں اور پرکشش باتیں کرتے ہیں کہ "جب وہ گفتگو شروع کرتے ہیں تو تم بھی ان کی باتوں کو کان دھر کے سنتے ہو" (و ان یقولوا تسمع لقولھم)۔

جہاں پیغمبرؐ ظاہراً ان کی باتوں کی کشش سے متاثر ہو جائے وہاں دوسروں کا معاملہ تو اور بھی آگے جاتا ہے۔

یہ تو ظاہری لحاظ سے ہے، لیکن باطنی طور پر : "وہ ایسی خشک لکڑیوں کے مانند ہیں جنھیں دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر کھڑا کر دیا گیا ہو" (کانھم خشب مسندۃ)۔

وہ ایسے جسم ہیں جن میں روح نہیں ہے۔ بے معنی شکلیں اور اندر سے خالی ہیکلیں ہیں۔ نہ خود سے کوئی استقلال رکھتے ہیں نہ باطن میں کوئی نور وصفائی۔ نہ کوئی محکم ارادہ ہے اور نہ ہی اس میں کچھ ایمان ہے۔ وہ ٹھیک خشک لکڑیوں کی طرح ہیں جنھیں دیوار کے ساتھ لگا دیا گیا ہو۔

بعض مفسرین نے روایت کی ہے کہ منافقین کا سرغنہ "عبداللہ بن ابی" ایک موٹا تازہ، خوبصورت، فصیح وبلیغ اور چکنی چپڑی باتیں بنانے والا آدمی تھا۔ جب وہ اپنے ساتھیوں کے ہمراہ حضرت رسولؐ کی مجلس میں داخل ہوتا تو اصحاب اس کے ظاہر سے تعجب کرتے اور اس کی باتیں کان دھر کے سنتے۔ لیکن وہ (اپنے غرور ونخوت کی بنا پر) دیوار کے پاس جا کر اس کا تکیہ بناتے اور مجلس کو اپنی ظاہری صورت اور باتوں سے متاثر کرتے۔[1] یہ آیت ان کی اس حالت کو بیان کر رہی ہے۔

اس کے بعد مزید کہتا ہے : "وہ اس طرح اندر سے کھوکھلے، خدا پر توکل اور اپنے نفس پر اعتماد سے محروم ہیں کہ وہ ہر آواز کو چاہے وہ جہاں سے بھی بلند ہو اپنے برخلاف سمجھتے ہیں" (یحسبون کل صیحۃ علیھم)۔

ایک عجیب قسم کا خوف اور دہشت ہمیشہ اُن کے دل وجان پر چھائی رہتی ہے۔ ایک بدظنی اور جانکاہ بدبینی کی حالت نے ان کی روح کو سرتاسر گھیرے میں لیا ہوا ہے اور "المؤمن خائف" کے مطابق ہر چیز سے، یہاں تک کہ اپنے سائے سے بھی ڈرتے ہیں۔ اور یہ ان کی نشانیوں میں سے ایک اور نشانی ہے۔

آیت کے آخر میں پیغمبرؐ کو خبردار کرتا ہے کہ "یہ لوگ واقعی تمھارے دشمن ہیں۔ لہٰذا ان سے بچتے رہو (ھم

---

[1] کشاف جلد ۴ ص ۵۴۰

العدوّ فاحذرھم)۔

اس کے بعد کہتا ہے: "خدا انھیں ہلاک کرے۔ وہ حق سے کس طرح منحرف ہوتے ہیں؟" (قاتلھم اللہ انّٰی یؤفکون)۔

یہ بات واضح ہے کہ یہ تعبیر خبر کے طور پر نہیں ہے۔ بلکہ نفرین کی صورت میں ہے اور اس گروہ کی مذمت، سرزنش اور تحقیر کے طور پر ذکر ہوئی ہے، ان روزمرہ کی تعبیروں کی مانند جو افراد انسانی ایک دوسرے کے بارے میں کرتے رہتے ہیں۔ اسی طرح قرآن خود لوگوں کی زبان میں ان سے بات چیت کرتا ہے۔

اسی طرح سے زیر بحث آیت میں منافقین کی مزید نشانیاں بھی بیان کی گئی ہیں، منجملہ ان کے: ظاہری فریب دینے والی وضع و کیفیت، اندر سے کھوکھلے پن کے ساتھ، اسی طرح ہر چیز اور ہر حادثہ و واقعہ کے بارے میں خوف، دہشت اور بدگمانی وغیرہ ہے۔

❖ ❖ ❖

⑤ وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ تَعَالَوْا يَسْتَغْفِرْ لَكُمْ رَسُوْلُ اللّٰهِ لَوَّوْا رُءُوْسَهُمْ وَرَاَيْتَهُمْ يَصُدُّوْنَ وَهُمْ مُّسْتَكْبِرُوْنَ ۝

⑥ سَوَآءٌ عَلَيْهِمْ اَسْتَغْفَرْتَ لَهُمْ اَمْ لَمْ تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ ؕ لَنْ يَّغْفِرَ اللّٰهُ لَهُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِى الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ ۝

⑦ هُمُ الَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ لَا تُنْفِقُوْا عَلٰى مَنْ عِنْدَ رَسُوْلِ اللّٰهِ حَتّٰى يَنْفَضُّوْا ؕ وَلِلّٰهِ خَزَآئِنُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَلٰكِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَا يَفْقَهُوْنَ ۝

⑧ يَقُوْلُوْنَ لَئِنْ رَّجَعْنَاۤ اِلَى الْمَدِيْنَةِ لَيُخْرِجَنَّ الْاَعَزُّ مِنْهَا الْاَذَلَّ ؕ وَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ وَلِرَسُوْلِهٖ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ وَلٰكِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝

❊ ❊ ❊

ترجمہ

⑤ جب ان سے یہ کہا جاتا ہے کہ (تم رسولؐ کے پاس) آؤ تاکہ حضرت رسولؐ تمہارے لیے استغفار کریں، تو وہ اپنے سروں کو (استہزاء، تکبر اور غرور سے) ہلانے لگتے ہیں اور تم دیکھو گے کہ وہ تمہاری باتوں سے اعراض کرتے ہوئے تکبر کر رہے ہیں۔

⑥ تم ان کے لیے استغفار کرو یا نہ کرو، ان کے لیے کوئی فرق نہیں ہے۔ خدا انھیں ہرگز

نہیں بخشے گا۔ کیونکہ خدا فاسق قوم کو ہدایت نہیں کرتا۔

⑦ وہ تو ایسے لوگ ہیں جو یہ کہتے ہیں کہ ان لوگوں پر جو رسُول اللہ کے پاس ہیں کچھ خرچ نہ کرو تاکہ وہ سب کے سب پراگندہ ہو جائیں اور (وہ اس بات سے غافل ہیں کہ) آسمانوں اور زمین کے خزانے خدا ہی کے لیے ہیں لیکن منافقین نہیں سمجھتے۔

⑧ وہ یہ کہتے ہیں اگر ہم مدینہ کی طرف لوٹ گئے تو عزت دار لوگ ذلیلوں کو باہر نکال دیں گے حالانکہ عزّت خُدا اس کے رسولؐ اور مومنین کے لیے مخصُوص ہے۔ لیکن منافق نہیں جانتے۔

٭ ٭ ٭

شانِ نزول

تاریخ، حدیث اور تفسیر کی کتابوں میں اوپر والی آیات کے لیے ایک مفصل شانِ نزول بیان کی گئی ہے جس کا خلاصہ یہ ہے:

غزوۂ بنی المصطلق کے بعد (یہ جنگ ہجرت کے چھٹے سال سرزمین "قدید" میں واقع ہُوئی) مسلمانوں میں سے دو افراد کے درمیان جن میں سے ایک انصار میں سے اور دُوسرا مہاجرین میں سے تھا، کنوئیں سے پانی لینے کے وقت اختلاف ہو گیا۔ ایک نے انصار کو اور دُوسرے نے مہاجرین کو اپنی مدد کے لیے پکارا۔ مہاجرین میں سے ایک شخص اپنے ساتھی کی مدد کے لیے آیا اور "عبداللہ بن ابیؓ" جو منافقین کے مشہور سرغنوں میں سے تھا، وہ انصاری کی مدد کے لیے آگے بڑھا اور تب اُن دونوں کے درمیان شدید تو تکار ہوئی۔ "عبداللہ بن ابیؓ" سخت غصّہ میں آگیا جب کہ اس کی قوم کے کچھ اور لوگ بھی وہاں موجود تھے۔ اُس نے کہا: "ہم نے اس گروہِ مُہاجرین کو پناہ دی اور ان کی مدد کی لیکن ہمارا معاملہ اس ضرب المثل کی مانند ہے جو کہتی ہے: "سمن کلبك یأکلك" (اپنے کتّے کو موٹا کر دے تاکہ وہ تجھے کاٹ کھائے)، و اللہ لئن رجعنا الی المدینۃ لیخرجن الاعز منھا الاذل۔ "خدا کی قسم! اگر ہم مدینہ پلٹ گئے تو عزّت دار ذلیلوں کو باہر نکال دیں گے!" یہاں عزّت داروں سے اس کی مُراد وہ خود اور اس کے پیروکار تھے، اور ذلیلوں سے مُراد مہاجرین تھے۔ اس کے بعد اس نے اپنے ساتھ والوں سے کہا: "یہ اس کام کا نتیجہ ہے جو خُود تم نے اپنے سروں پر تھوپ لیا ہے۔ تم نے انھیں اپنے شہر میں جگہ دی، اور اپنے مال ان میں تقسیم کیے۔ اگر تم اپنی بچی ہُوئی غذا اس جیسوں کو (اس کے مقابل مہاجر کی طرف اشارہ ہے) نہ دیتے تو یہ تمھاری گردن پر سوار نہ ہوتے، تمھاری سرزمین سے چلے جاتے اور اپنے قبائل سے جا ملتے۔

اس موقع پر "زید بن ارقم" نے جو اس وقت ایک نوخیز جوان تھا "عبداللہ بن ابیؔ کی طرف منہ کر کے کہا: "خدا کی قسم! ذلیل اور کمینہ تو ہی ہے۔ محمدؐ خدا کی عزت اور مسلمانوں کی محبت میں ہیں۔ خدا کی قسم! میں آج سے تجھے دوست نہیں رکھوں گا۔" عبداللہ نے چلا کر کہا: "اے لڑکے خاموش رہ۔ تو اپنے کھیل کود سے کام رکھ"! زید بن ارقم حضرت رسولؐ کی خدمت میں آیا اور سارا ماجرا کہہ سنایا۔

پیغمبر نے کسی کو "عبداللہ" کے پاس بھیج کر اُسے بلایا اور فرمایا:

"یہ کیا بات ہے جو مجھ سے بیان کی گئی ہے"؟

عبداللہ نے کہا: "اس خدا کی قسم ہے جس نے آپ پر آسمانی کتاب نازل کی ہے میں نے ایسی کوئی بات نہیں کی اور زید جھوٹ بولتا ہے۔"

انصار کے کچھ لوگ وہاں موجود تھے۔ اُنھوں نے عرض کیا: "یا رسول اللہؐ! عبداللہ ہمارا بزرگ ہے۔ لہٰذا انصار کے بچوں میں سے ایک بچے کی بات اس کے برخلاف قبول نہ کیجئے۔ لہٰذا پیغمبرؐ نے ان کا عذر قبول کر لیا تو اس موقع پر گروہِ انصار نے "زید بن ارقم" کو ملامت اور سرزنش کی۔

پیغمبرؐ نے کوچ کرنے کا حکم دے دیا۔ بزرگانِ انصار میں سے ایک شخص "اُسید" نامی آپ کی خدمت میں آیا اور عرض کیا: "یا رسول اللہؐ! آپ نے ایک نامناسب وقت میں کوچ کر دیا ہے۔" آپ نے فرمایا: "ہاں! کیا تو نے سُنا نہیں ہے کہ تیرے ساتھی عبداللہ نے کیا کہا ہے؟ اُس نے یہ کہا ہے کہ جب وہ مدینہ پلٹ جائے گا تو عزت والے ذلیلوں کو وہاں سے نکال دیں گے۔"

اُسید نے کہا: "یا رسول اللہ! اگر آپ چاہیں تو اُسے مدینے سے باہر نکال سکتے ہیں۔ خدا کی قسم آپ عزت دار ہیں اور وہ ذلیل ہے۔" پھر اُس نے عرض کیا: "یا رسول اللہؐ! اس کے ساتھ نرمی کیجئے۔"

عبداللہ کی باتیں اس کے بیٹے کے کانوں تک پہنچیں تو وہ رسول اللہؐ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا: "میں نے سُنا ہے کہ آپ یہ چاہتے ہیں کہ میرے باپ کو قتل کر دیں۔ اگر ایسا معاملہ ہے تو خود مجھے حکم دیجیے کہ میں اس کا سر قلم کر کے آپ کی خدمت میں لے آؤں، کیونکہ سب لوگ جانتے ہیں کہ کوئی بھی شخص اپنے ماں باپ کی نسبت مجھ سے زیادہ نیک رفتار نہیں ہے۔ میں اس سے ڈرتا ہوں کہ کوئی اور اُسے قتل کرے اور میں اس کے بعد اپنے باپ کے قاتل کو نہ دیکھ سکوں گا اور خدانخواستہ میں اُسے قتل کر دوں اور اس قتلِ مومن کی پاداش میں جنت کے بجائے جہنم میں چلا جاؤں۔

پیغمبرؐ نے فرمایا: "تیرے باپ کے قتل کا مسئلہ درپیش نہیں ہے۔ جب تک وہ ہمارے ساتھ ہے، تو اس کے ساتھ مدارا اور نیکی کرتا رہ۔"

اس کے بعد پیغمبرؐ نے حکم دیا کہ سارا دن اور ساری رات لشکر چلتا رہے۔ دُوسرے دن جب سورج نکل آیا تو آپ نے ٹھہرنے کا حکم دیا۔ لشکر اس قدر تھک گیا تھا کہ زمین پر سر رکھتے ہی سب گہری نیند سو گئے (اور پیغمبرؐ

کا مقصد بھی یہی تھا کہ لوگ کل کا ماجرا اور عبداللہ بن ابی کی بات کو بھول جائیں۔)

آخر کار پیغمبرؐ مدینہ میں وارد ہوئے۔ زید بن ارقم کہتے ہیں کہ میں شدتِ غم اور شرم کے مارے گھر کے اندر ہی رہا اور باہر نہ نکلا۔ اس موقع پر سورۂ منافقون نازل ہوئی کہ جس نے زید کی تصدیق اور عبداللہ کی تکذیب کی۔ پیغمبرؐ نے زید کا کان پکڑ کر فرمایا: "اے جوان! خدا نے تیری بات کی تصدیق کر دی، بالکل اسی طرح سے جیسا کہ تو نے اپنے کانوں سے سنا اور دل میں محفوظ رکھا تھا، خدا نے اس چیز کے بارے میں جو تو نے کہی، قرآن کی آیات نازل کی ہیں۔"

اس موقع پر عبداللہ بن ابی مدینہ کے قریب پہنچ چکا تھا۔ جب اس نے چاہا کہ مدینہ میں داخل ہو جائے تو اس کے بیٹے نے آکر اس کا راستہ روک لیا۔ عبداللہ نے کہا: "وائے ہو تجھ پر۔ یہ کیا کر رہا ہے؟" اس کے بیٹے نے کہا۔ "خدا کی قسم! رسول خداؐ کی اجازت کے بغیر تو مدینہ میں داخل نہیں ہو سکتا۔ اور آج تو سمجھ لے گا کہ عزیز کون ہے، اور ذلیل کون؟"

عبداللہ نے اپنے بیٹے کی شکایت رسول خداؐ کی خدمت میں پہنچائی، تو پیغمبرؐ نے اس کے بیٹے کو پیغام بھیجا کہ اپنے باپ کو مدینہ میں داخل ہونے دو۔ تب اس کے بیٹے نے کہا: "اب رسولِ خدا کی اجازت ہو گئی ہے لہٰذا اب تمہارے داخل شہر ہونے میں کوئی رکاوٹ نہیں ہے۔"

عبداللہ شہر میں داخل ہوا لیکن کچھ زیادہ دن نہیں گزرے تھے کہ وہ بیمار پڑ گیا اور پھر دنیا سے چل بسا (اور شاید اُسے جان لیوا تپ دق ہو گیا تھا۔)

جس وقت یہ آیات نازل ہوئیں اور عبداللہ کا جھوٹ ظاہر ہو گیا تو بعض لوگوں نے اُس سے کہا:

"تیرے بارے میں شدید تر آیات نازل ہوئی ہیں تو پیغمبرؐ کی خدمت میں جا تاکہ وہ تیرے لیے استغفار کریں"۔ اس پر عبداللہ نے اپنے سر کو ہلاتے ہوئے کہا:

"تم نے مجھ سے کہا ایمان لے آؤ میں ایمان لے آیا۔ تم نے کہا زکوٰۃ دے تو میں نے زکوٰۃ دی۔ اب اس کے سوا کچھ باقی نہیں رہا کہ کہو، محمدؐ کے لیے سجدہ کر! اس موقع پر آیت و اذا قیل لھم تعالوا نازل ہوئی[1]

* * *

تفسیر

منافقین کی دیگر نشانیاں

ان آیات میں منافقین کے اعمال اور ان کی گوناگوں نشانیوں کا بیان اسی طرح سے جاری ہے۔ فرماتا ہے:

---

[1] "مجمع البیان" زیر بحث آیات کے ذیل میں کامل ابن اثیر جلد ۲ ص ۱۹۲؛ سیرت ابن ہشام جلد ۲ ص ۳۰۲ (تھوڑے فرق کے ساتھ)

"جب ان سے یہ کہا جاتا ہے کہ آؤ تاکہ رسولِ خدا تمھارے لیے استغفار کریں تو وہ اپنے سروں کو استہزاء اور کبر و نخوت کے ساتھ ہلاتے ہیں۔ اور تو دیکھے گا کہ وہ تیری باتوں سے اعراض کرتے ہوئے تکبّر کر رہے ہیں"۔ (واذا قیل لھم تعالوا یستغفر لکم رسول اللہ لووا رؤوسھم ورأیتھم یصدون وھم مستکبرون)۔

ہاں! ان لغزشوں کے مقابلہ میں جو ان سے سرزد ہوتی ہیں اور ان کے پاس توبہ اور تلافی کی فرصت بھی ہوتی ہے ان کا کبر و غرور انھیں تلافی کرنے کی اجازت ہی نہیں دیتا۔ اس کا واضح نمونہ "عبداللہ بن ابیّ" تھا کہ جس کا عجیب و غریب ماجرا شانِ نزول میں بیان ہوا ہے۔

جس وقت اُس نے وہ قبیح اور ناروا بات پیغمبرؐ اور مومن مہاجرین کے بارے میں کہی: "جب ہم مدینہ کی طرف پلٹ کر جائیں گے تو عزت والے ذلیلوں کو باہر نکال دیں گے"۔ اس پر قرآنی آیات نازل ہوئیں اور اس کی شدید مذمت ہوئی۔ لوگوں نے اُس سے کہا کہ وہ رسولِ خدا کے پاس آئے تاکہ حضورؐ اس کے لیے بارگاہِ خداوندی سے بخشش طلب کریں۔ مگر اُس نے ایک اور ناروا بات کی کہ جس کا ماحصل یہ تھا: "تم نے کہا ایمان لے آ، میں ایمان لے آیا تم نے کہا زکوٰۃ دے، میں نے زکوٰۃ دی۔ اب بجز اس کے کوئی چیز باقی نہیں رہی کہ کہو محمدؐ کے لیے سجدہ کر"!

یہ بات واضح ہے کہ روحِ اسلام حق کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنا ہے اور کبر و غرور ہمیشہ اس تسلیم میں رکاوٹ ہے۔ اسی بناء پر منافقین کی ایک نشانی، بلکہ اسی غرور، خود خواہی اور خود کو برتر سمجھنے ہی کو نفاق کا ایک سبب شمار کیا جاسکتا ہے۔

"لووا" "لیّ" کے مادہ سے اصل میں "رسّی کو بل دینے" کے معنی میں ہے۔ اور اسی مناسبت سے منہ پھیرنے، یا سر کو حرکت دینے اور ہلانے کے معنی میں بھی آیا ہے۔

یصدون جیسا کہ ہم پہلے بھی بیان کر چکے ہیں دو معانی میں استعمال ہوتا ہے۔ "منع کرنا" اور "اعراض کرنا" زیرِ بحث آیت میں دوسرا معنی اور گزشتہ آیت میں پہلا معنی مناسب ہے۔

* * *

بعد والی آیت میں ہر قسم کے ابہام کو دور کرنے کے لیے اس سلسلہ میں مزید کہتا ہے: "بالفرض اگر وہ تیرے پاس آئیں اور تو ان کے لیے استغفار بھی کرلے تو ان میں بخشش کے اسباب موجود ہی نہیں ہیں۔ اس بناء پر اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ تو ان کے لیے استغفار کرے یا نہ کرے، خدا انھیں ہرگز نہیں بخشے گا"۔ (سواء علیھم استغفرت لھم ام لم تستغفر لھم لن یغفر اللہ لھم)۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ "خدا فاسق قوم کو ہدایت نہیں کرتا"۔ (ان اللہ لا یھدی القوم الفاسقین)۔

دوسرے لفظوں میں پیغمبرؐ کی استغفار بخشش کے لیے علّتِ تامہ نہیں، بلکہ مقتضیٰ ہے۔ یہ صرف اسی صورت

میں اثر کرتی ہے جبکہ موافق اسباب اور ضروری قابلیت فراہم ہو۔ اگر وہ واقعاً توبہ کرلیں، اپنی راہ کو بدل لیں، کبر و غرور کی سواری سے اتر آئیں اور حق کے سامنے سر تسلیم خم کر دیں تو پیغمبرؐ کی استغفار یقیناً مؤثر ہے۔ اس صورت کے علاوہ کچھ بھی اثر نہ ہوگا۔

اسی معنی کے مشابہ سورۂ توبہ کی آیت ۸۰ میں بھی آیا ہے جو منافقین کے ایک اور گروہ کے بارے میں کہتی ہے: استغفر لهم اولا تستغفر لهم ان تستغفر لهم سبعين مرة فلن يغفر الله لهم ذالك بانهم كفروا بالله ورسوله والله لا يهدى القوم الفاسقين۔

"چاہے تم ان کے لیے استغفار کرو یا نہ کرو اس کا کوئی اثر نہیں ہوگا۔ اگر تم ستر مرتبہ بھی ان کے لیے استغفار کرو گے تو بھی خدا ان کو نہیں بخشے گا۔ کیونکہ وہ خدا اور اس کے رسولؐ کے منکر ہو گئے ہیں اور خدا فاسق قوم کو ہدایت نہیں کرتا۔

یہ بات واضح ہے کہ ستر تکثیر کا عدد ہے۔ یعنی چاہے جتنی مرتبہ بھی ان کے لیے استغفار کرو اس کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔

یہ نکتہ بھی معلوم ہے کہ فاسق سے مراد ہر قسم کا گنہگار نہیں ہے۔ کیونکہ پیغمبر گناہگاروں کی نجات کے لیے ہی آئے ہیں، بلکہ اس سے مراد وہ گنہ گار ہیں جو گناہوں پر اصرار کرتے ہیں، ہٹ دھرم ہیں اور حق کے مقابلے میں سرکش ہیں۔

* * *

اس کے بعد ان کی ایک بہت ہی بری بات کی طرف، جو ان کے نفاق کی واضح ترین نشانی شمار ہوتی ہے، اشارہ کرتے ہوئے کہتا ہے: "یہ وہی لوگ ہیں جو کہتے ہیں ان افراد پر جو رسول خدا کے پاس ہیں کچھ خرچ نہ کرو اور اپنے مال اور امکانات کو ان کے اختیار میں نہ دو تاکہ وہ پراگندہ ہو جائیں!" (هم الذين يقولون لا تنفقوا على من عند رسول الله حتى ينفضوا)۔

"وہ اس بات سے غافل ہیں کہ آسمانوں اور زمین کے تمام خزانے خدا ہی کے لیے ہیں، لیکن منافقین سمجھتے نہیں ہیں۔" (ولله خزائن السماوات والارض ولكن المنافقين لا يفقهون)۔

* * *

یہ بدبخت نہیں جانتے کہ ہر شخص کے پاس جو کچھ ہے وہ خدا ہی کا دیا ہوا ہے اور تمام بندے اسی کے خوان سے روزی کھاتے ہیں۔ اگر انصار مہاجرین کو پناہ دے سکتے ہیں اور انھیں اپنے مال میں حصہ دار اور شریک بنا سکتے ہیں تو یہ ایک بہت بڑا اعزاز ہے جو انھیں نصیب ہے۔ لہٰذا انھیں نہ صرف یہ کہ احسان نہیں جتانا چاہیے، بلکہ خدا کا اس عظیم توفیق پر شکر ادا کرنا چاہیے، لیکن جیسا کہ شان نزول میں بیان ہوا ہے منافقین کی منطق کچھ اور ہی تھی۔

* * *

اِس کے بعد ان کی ایک اور نفرت انگیز بات کی طرف اشارہ کرتے ہُوئے مزید کہتا ہے: (یقولون لئن رجعنا الی المدینۃ لیخرجن الاعز منھا الاذل)۔

یہ وہی گفتگو ہے جو عبداللہ بن ابیؒ کے آلودہ دہن سے نکلی اور اس کی مراد یہ تھی کہ ہم مدینہ کے رہنے والے رسُول اللہؐ اور مومن مہاجرین کو مدینہ سے باہر نکال دیں گے۔ مدینہ کی طرف لوٹنے سے مُراد غزوۂ "بنی المصطلق" سے لوٹنا تھا، اور اس کی طرف شانِ نزول میں تفصیل کے ساتھ اشارہ ہو چُکا ہے۔

اگرچہ یہ بات صرف ایک ہی شخص نے کہی تھی لیکن چُونکہ سب منافقین کا طرزِ عمل اور طریقۂ کار یہی تھا۔ لہٰذا قرآن جمع کی صُورت میں تعبیر کرتے ہُوئے فرماتا ہے: یقولون... (وہ کہتے ہیں)

اِس کے بعد قرآن انھیں دندان شکن جواب دیتے ہُوئے کہتا ہے: "عزّت تو خدا، رسولؐ اور مومنین کے لیے مخصوص ہے لیکن منافقین نہیں جانتے۔" (وللہ العزۃ ولرسولہ وللمؤمنین ولکن المنافقین لا یعلمون)۔

یہ صرف مدینہ کے منافقین ہی نہیں تھے کہ جنھوں نے مومن مہاجرین کے مقابلہ میں یہ بات کہی، بلکہ اس سے پہلے سردارانِ قریش بھی مکہ میں یہی بات کہا کرتے تھے: اگر ہم مسلمانوں کے اس چھوٹے سے فقیر گروہ کا اقتصادی محاصرہ کرلیں یا انھیں مکہ سے باہر نکال دیں تو معاملہ ختم ہو جائے گا۔

موجودہ زمانہ میں بھی استعماری اور سامراجی حکومتیں اس خیال سے کہ آسمان و زمین کے خزانے ان کے پاس ہیں، یہ کہتی ہیں کہ وہ قومیں جو ہمارے سامنے سرِتسلیم خم نہیں کرتیں ان کا اقتصادی محاصرہ کرنا چاہیے تاکہ ان کی عقل ٹھکانے آجائے اور وہ سرِتسلیم خم کردیں۔

ان تاریخ کے اندھوں کو، جن کا شیوہ کل بھی یہی تھا اور آج بھی یہی ہے، اس بات کی خبر نہیں کہ خُدا کے ایک ہی اشارہ پر ان کی تمام ثروت اور امکانات تباہ ہو جائیں گے اور ان کی عارضی اور ظاہری عزّت قانونِ فنا کے ہاتھوں تباہ و برباد ہو گی۔

بہرحال یہ طرزِ فکر (کہ اپنے آپ کو عزّت دار سمجھنا اور دوسروں کو ذلیل، اپنے آپ کو ولی نعمت شمار کرنا اور دوسروں کو محتاج) ایک منافقانہ طرزِ فکر ہے۔ یہ ایک طرف تو غرور و تکبّر سے اور دوسری طرف خدا کے مقابلے میں استقلال کے گمان سے پیدا ہوتی ہے۔ اگر وہ عبُودیّت کی حقیقت سے آشنا ہوتے اور خُدا کی مالکیّت کو ہر چیز پر مسلّم سمجھتے تو ہرگز ان خطرناک غلطیوں کا شکار نہ ہوتے۔

قابلِ توجّہ بات یہ ہے کہ گزشتہ آیت میں منافقین کے بارے میں "لا یفقھون" (نہیں سمجھتے) کی تعبیر آئی ہے اور یہاں "لا یعلمون" (نہیں جانتے) کی تعبیر آئی ہے۔ تعبیر کا یہ فرق ممکن ہے تکرار سے پرہیز کے لیے ہو جو فصاحت کے خلاف ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اس بناء پر ہو کہ خدا کا تمام آسمانوں اور زمین کے خزائن کا مالک ہونا بہت ہی پیچیدہ مسئلہ ہے جو بہت زیادہ دقّت اور فہم و فراست کا محتاج ہے، جبکہ عزّت کا، خدا پیغمبرؐ اور مومنین کے ساتھ

مخصوص ہونا کسی پر مخفی نہیں ہے۔

* * *

چند نکات

۱: منافق کی دس نشانیاں

اوپر والی تمام آیات سے منافق کی متعدد نشانیوں کا پتہ چلتا ہے، ان کا یکجا طور پر دس نشانیوں میں خلاصہ کیا جاسکتا ہے:

۱: صریح و آشکار جھوٹ (واللہ یشھد ان المنافقین لکاذبون)

۲: لوگوں کو گمراہ کرنے کے لیے جھوٹی قسمیں کھانا۔ (اتخذوا ایمانھم جنۃ)

۳: دین کی شناخت کے بعد اُسے چھوڑ دینے کی بناء پر حقیقت اور واقعیت کو نہ سمجھ سکنا۔ (لا یفقھون)

۴: باطن کے خالی ہونے کے باوجود ظاہر میں آراستہ اور چکنی چپڑی باتیں کرنا۔ (واذا رأیتھم تعجبک اجسامھم)

۵: معاشرے میں بے ہودگی اور حق سے عدم توجہ کی بناء پر لکڑی کے ایک خشک ٹکڑے کی مانند ہونا۔ (کانھم خشب مسندۃ)

۶: خائن ہونے کی بناء پر ہر حادثہ اور ہر چیز سے بدگمانی اور خوف و دہشت۔ (یحسبون کل صیحۃ علیھم)

۷: حق کا مذاق اُڑانا اور تمسخر کرنا۔ (لووا رءوسھم)

۸: فسق و گناہ۔ (ان اللہ لا یھدی القوم الفاسقین)

۹: اپنے آپ کو ہر چیز کا مالک جاننا اور دوسروں کو اپنا محتاج سمجھنا۔ (ھم الذین یقولون لا تنفقوا علی من عند رسول اللہ حتّٰی ینفضوا)

۱۰: اپنے آپ کو عزّت دار اور دوسروں کو ذلیل سمجھنا۔ (لیخرجن الاعز منھا الاذل)

اس میں شک نہیں کہ منافق کی نشانیاں انھیں چیزوں میں نہیں ہیں بلکہ، قرآنی آیات، اسلامی روایات اور نہج البلاغۃ سے ان کی اور بھی بہت سی نشانیوں کا پتہ چلتا ہے۔ یہانتک کہ روزمرہ کی معاشرت سے بھی ان کے دُوسرے اوصاف اور خصوصیات کا پتہ چلایا جا سکتا ہے۔ لیکن اس سورۃ کی آیات میں جو کچھ آیا ہے وہ ان اوصاف کا ایک اہم اور قابلِ توجہ حصّہ ہے۔

نہج البلاغۃ میں ایک خطبہ منافقین کی کیفیت کے لیے مخصوص ہے۔ اِس خطبہ کے ایک حصہ میں اس طرح آیا ہے:

"اے خدا کے بندو! میں تمھیں تقویٰ اور پرہیزگاری کی وصیت کرتا ہوں اور منافقین سے ڈراتا ہوں، کیونکہ وہ خود گمراہ اور گمراہ کرنے والے خطاکار اور غلط انداز ہیں"۔

"وہ ہر روز ایک نئے رنگ میں آتے ہیں اور مختلف قیافوں اور زبانوں کے ساتھ ظاہر ہوتے ہیں"۔

"وہ ہر طریقہ سے تمھیں فریب دینے اور درہم برہم کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور ہر کمین گاہ میں تمھاری گھات میں بیٹھے ہوئے ہیں"۔

"وہ بد باطن اور خوش ظاہر ہیں اور ہمیشہ پوشیدہ طور پر لوگوں کو فریب دیتے اور غلط راہ پر چلتے ہیں"۔

"ان کی گفتگو بظاہر شفا بخش ہے لیکن ان کا کردار ایک علاج ناپذیر بیماری ہے۔ وہ لوگوں کی خوش حالی پر حسد کرتے ہیں اور اگر کوئی شخص کسی مصیبت میں گرفتار ہو جائے تو وہ خوش ہوتے ہیں"۔

"ہمیشہ امیدواروں کو مایوس کرتے ہیں اور ہر جگہ ناامیدی کی آیت پڑھتے ہیں"۔

"ہر راستے میں ان کا کوئی نہ کوئی کشتہ (مارا ہوا) ہے۔ ہر دل میں نفوذ کرنے کے لیے کوئی نہ کوئی راہ رکھتے ہیں اور ہر مصیبت کے لیے بناوٹی آنسو بہاتے ہیں"۔

"ایک دوسرے کو مدح و ثنا کا قرضہ دیتے ہیں اور ایک دوسرے سے اجر و پاداش کی توقع رکھتے ہیں"۔

"اپنے تقاضوں میں اصرار کرتے ہیں اور ملامت کرنے میں پردہ دری کرتے ہیں۔ جب کوئی حکم لگاتے ہیں تو حد سے تجاوز کر جاتے ہیں"۔

"انھوں نے ہر حق کے مقابلے میں ایک باطل گھڑ لیا ہے۔ اور ہر دلیل کے مقابلے میں ایک شبہ کھڑا کر دیا ہے۔ انھوں نے ہر زندہ کے لیے موت کا عامل، ہر در کے لیے ایک کلید اور ہر رات کے لیے ایک چراغ مہیا کیا ہے"۔

"وہ اپنی طمع کاری اور گرمیٔ بازار کے لیے اور اپنے مال و اسباب کو گراں ترین قیمت پر بیچنے کے لیے دلوں میں یاس و ناامیدی کا بیج بوتے ہیں"۔

"اپنے باطل کو حق پر ظاہر کر کے دکھاتے ہیں اور تعریف و توصیف میں فریب کی راہ اختیار کرتے ہیں"۔

"اپنی خواہشات تک پہنچنے کی راہ کو آسان اور اپنے جال سے نکلنے کی راہ کو پُر پیچ و خم بنا کر دکھاتے ہیں، وہ شیطان کا لشکر اور جہنم کی آگ کے شرارے ہیں جیسا کہ خدا فرماتا ہے: "اولئک حزب الشیطان الا ان حزب الشیطان هم الخاسرون"۔ "وہ شیطان کا گروہ ہیں، جان لو کہ شیطان کا گروہ خسارے میں ہے"[1]

اس روشن خطبہ میں ان کے بہت سے اوصاف کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ جو گزشتہ مباحث کی تکمیل کرتے ہیں۔

* * *

---

[1] نہج البلاغۃ خطبہ ۱۹۴ (اختصار کی وجہ سے مکمل خطبہ کا متن نقل نہیں کیا گیا۔)

۲ : منافقین کا خطرہ

جیسا کہ ہم نے اس بحث کے مقدمہ میں بیان کیا ہے منافقین ہر معاشرے کے خطرناک ترین افراد ہوتے ہیں کیونکہ:

اوّلاً : وہ معاشرے کے اندر رہتے ہوئے تمام بھیدوں سے واقف ہوتے ہیں۔

ثانیاً : انھیں پہچاننا کوئی آسان کام نہیں ہوتا۔ کیونکہ وہ اکثر اپنے آپ کو اس طرح دوست کے لباس میں پیش کرتے ہیں کہ انسان کو یقین ہی نہیں آتا کہ وہ منافق ہیں۔

ثالثاً : چونکہ ان کا اصلی چہرہ بہت سے لوگوں کے لیے پہچانا ہوا نہیں ہوتا، اس لیے ان سے براہِ راست اُلجھنا اور صریح مبارزہ کرنا مشکل کام ہوتا ہے۔

رابعاً : مومنین کے ساتھ ان کے مختلف قسم کے تعلقات ہوتے ہیں (نسبی، سببی رشتے اور دوسرے تعلقات) اور انھیں رشتوں کی وجہ سے ان کے ساتھ مبارزہ پیچیدہ ہو جاتا ہے۔

خامساً : وہ معاشرے کی پیٹھ میں خنجر گھونپتے ہیں اور ان کی ضربیں غفلت کی حالت میں پڑتی ہیں۔

اسی قسم کی دوسری جہتوں سے بھی وہ معاشروں کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچاتے ہیں، اور اسی بناء پر ان کے شر کو دفع کرنے کے لیے دقیق و وسیع پروگرام مرتب کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔

ایک حدیث میں آیا ہے کہ پیغمبرؐ نے فرمایا:

"انی لا اخاف علی امتی مؤمنا ولا مشرکا اما المؤمن فیمنعه بایمانه، و اما المشرک فیخزیه الله بشرکه. ولکنی اخاف علیکم کل منافق عالم اللسان، یقول ما تعرفون ویفعل ما تنکرون"

"میں اپنی اُمت کے لیے نہ مومنین سے ڈرتا ہوں اور نہ ہی مشرکین سے۔ مومن کو اس کا ایمان اُس کے ضرر پہنچانے سے مانع ہے اور مشرک کو خدا اُس کے شرک کی وجہ سے رُسوا اور ذلیل کرتا ہے۔ لیکن میں تم میں اُس منافق سے ڈرتا ہوں کہ جس کی زبان سے علم ٹپکتا ہے (اور اس کے دل میں کفر و جہالت ہے) وہ ایسی باتیں کرتا ہے جو تمھارے دل پذیر ہیں لیکن (مخفیانہ طور پر) ایسے اعمال انجام دیتا ہے جو قبیح اور بُرے ہیں۔[1]

منافقین کے بارے میں ہم نے جلد اول (سورۂ بقرہ کی آیات ۸ تا ۱۶ کے ذیل میں اور جلد ۷ (سورۂ توبہ آیت ۴۲ تا ۴۵ کے ذیل میں) اور جلد ۸ (سورہ توبہ آیات ۶۰ تا ۸۵ کے ذیل میں) اور جلد ۱۷ (سورۂ احزاب آیات ۱۲ تا ۱۷ کے ذیل میں) تفصیلی بحث کی ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ بہت کم گروہ ایسے ہیں جن کے بارے میں قرآن نے اتنی بحثیں کی ہوں اور ان کی

---

[1] "سفینۃ البحار" جلد ۲ ص ۶۰۶ مادہ "نفق" اسی کے مشابہ نہج البلاغہ خط ۲۷ میں بھی آیا ہے۔

نشانیاں، اعمال اور خطرات بیان کیے ہوں، قرآن کا اس سلسلہ میں اتنا وسیع بیان منافقین کے حد سے زیادہ خطرے کی دلیل ہے۔

٭ ٭ ٭

۳: منافق بے اخلاص اور ٹوٹنے والا ہے

زندگی میں بہت سے طوفان اُٹھتے ہیں اور تُند و تیز لہریں اُبھرتی ہیں۔ مومنین ایمان و توکّل کی قوت سے فائدہ اُٹھاتے ہُوئے صحیح منصوبوں کے ذریعہ کبھی جنگ و گریز اور کبھی پے در پے حملے کر کے انھیں سر سے گزار کر کامیاب ہو جاتے ہیں لیکن منافق ہٹ دھرمی کرتے ہُوئے اکڑ کر کھڑا ہو جاتا ہے۔ یہاں تک کہ ٹوٹ کر بے بس ہو جاتا ہے۔

ایک حدیث میں پیغمبر گرامیؐ سے آیا ہے:

"مثل المؤمن کمثل الزرع لا تزال الریح تمیله، ولا یزال المؤمن یصیبه البلاء، ومثل المنافق کمثل شجرة الارز لا تهتز حتی تستحصد"

مومن زراعت کی شاخوں کی طرح ہے، جنھیں ہوائیں گرا دیتی ہیں، لیکن وہ پھر کھڑی ہو جاتی ہیں اور ہمیشہ سخت حادثات اور بلاؤں کو برداشت کرتی اور سر سے گزار دیتی ہیں۔ لیکن منافق صنوبر کے درخت کی مانند ہوتا ہے جو نرمی دکھائے بغیر کھڑا رہتا ہے، یہاں تک کہ اُسے جڑ سے اکھاڑ کر پھینک دیا جائے۔"[1]

٭ ٭ ٭

۴: عزّت خدا اور اس کے دوستوں کے لیے مخصوص ہے۔

اگرچہ روزمرہ کی فارسی (اور اردو زبان میں) "عزّت" آبرو، احترام اور گرانقدر ہونے کے معنی میں ہے، لیکن عربی زبان میں ایسا نہیں ہے۔ بلکہ "عزّت" شکست ناپذیر قُدرت کے معنی میں ہے۔ قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ اوپر والی آیات اور سورۂ فاطر کی آیت ۱۰ میں "عزّت" کی صفت خدا میں منحصر شمار کی گئی ہے۔ اور وہ زیرِ بحث آیات میں یہ اضافہ کرتا ہے: "اور اس کے رسول اور مومنین کے لیے ہے"۔ کیونکہ خدا کے اولیاء اور دوست اسی کی عزّت کا پرتو رکھتے اور اسی پر بھروسہ کرتے ہیں۔

---

[1] صحیح مسلم، جلد ۴ ص ۲۱۶۳ (باب مثل المومن کالزرع) اسی مضمون کے مشابہ تھوڑے سے فرق کے ساتھ تفسیر روح البیان جلد ۹ ص ۵۳۲ میں بھی آیا ہے۔

اسی وجہ سے اسلامی روایات میں اس مسئلہ پر تاکید ہوئی ہے کہ مومن کو اپنی ذات کے وسائل فراہم نہیں کرنے چاہئیں۔ خدا چاہتا ہے کہ مومن عزیز رہے تو پھر اُسے بھی اس عزت کی حفاظت کی کوشش کرنا چاہیئے۔

ایک حدیث میں امام صادقؑ سے اسی آیت (وللہ العزۃ ولرسولہ وللمؤمنین) کی تفسیر میں آیا ہے :

"فالمؤمن یکون عزیزا ولا یکون ذلیلا ..... المؤمن اعز من الجبل ان الجبل یستقل منہ بالمعاول ، والمؤمن لا یستقل من دینہ شیء"

"مومن عزیز ہے اور وہ ذلیل نہیں ہوتا۔ مومن پہاڑ سے بھی زیادہ سخت اور مستحکم ہوتا ہے، کیونکہ پہاڑ میں تو کدال سے سوراخ کرنا ممکن ہے۔ لیکن مومن کے ایمان میں سے ہرگز کسی چیز کو ہلایا نہیں جا سکتا۔"[1]

ایک اور حدیث میں امام صادقؑ ہی سے آیا ہے :

"لا ینبغی للمؤمن ان یذل نفسہ قیل لہ وکیف یذل نفسہ قال یتعرض لما لا یطیق"

"مناسب نہیں ہے کہ مومن اپنے آپ کو ذلیل کرے۔ سوال کیا گیا : وہ اپنے آپ کو کس طرح ذلیل کرتا ہے۔ فرمایا : ایسے کام کے پیچھے جائے جو اس سے نہیں ہو سکتا۔"[2]

ایک اور حدیث میں بھی اُنھی سے آیا ہے :

"ان اللہ تبارک وتعالیٰ فوض الی المؤمن امورہ کلھا و لم یفوض الیہ ان یذل نفسہ الم تر قول اللہ سبحانہ وتعالیٰ ھیھنا "وللہ العزۃ ولرسولہ وللمؤمنین" والمؤمن ینبغی ان یکون عزیزا ولا یکون ذلیلا"

"خدا نے مومن کے تمام کام خود اس کے سپرد کر دیئے ہیں۔ لیکن خدا نے اس کو اس بات کی اجازت نہیں دی کہ وہ اپنے آپ کو ذلیل و خوار کرے۔ کیا تم دیکھتے نہیں کہ خدا نے اس سلسلہ میں یہ فرمایا ہے : عزت خدا، اس کے رسول اور مومنین کے لیے ہی مخصوص ہے۔ لہٰذا مومن کے لیے یہی بات مناسب اور لائق ہے کہ وہ ہمیشہ عزیز رہے اور ذلیل و خوار نہ ہو۔"[3]

اس سلسلہ میں ہم نے جلد ۱۸، سورۃ فاطر آیت ۱۰ کے ذیل میں بھی بحث کی ہے۔

---

[1]، [2]، [3] "کافی" مطابق نقل نور الثقلین جلد ۵ ص ۳۳۶

⑨ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُلْهِكُمْ اَمْوَالُكُمْ وَلَآ اَوْلَادُكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ ۚ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ۝

⑩ وَاَنْفِقُوْا مِنْ مَّا رَزَقْنٰكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ فَيَقُوْلَ رَبِّ لَوْلَآ اَخَّرْتَنِيْٓ اِلٰٓى اَجَلٍ قَرِيْبٍ ۙ فَاَصَّدَّقَ وَاَكُنْ مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ ۝

⑪ وَلَنْ يُّؤَخِّرَ اللّٰهُ نَفْسًا اِذَا جَآءَ اَجَلُهَا ۭ وَاللّٰهُ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ۝

❊ ❊ ❊

ترجمہ

⑨ اے ایمان لانے والو! تمہارے مال اور اولاد تمہیں خُدا سے غافل نہ کر دیں اور جو شخص ایسا کرے گا وہ خسارے میں رہے گا۔

⑩ ہم نے تمہیں جو روزی دے رکھی ہے اس میں سے خرچ کرو، قبل اس کے کہ تم میں سے کسی کی موت آ پہنچے اور وہ یہ کہنے لگے۔ پروردگارا! تو نے میری موت میں تھوڑی سی تاخیر کیوں نہ کی تاکہ میں صدقہ دوں اور صالحین میں سے ہو جاؤں۔

⑪ جب کسی کی اجل آ پہنچتی ہے تو خدا ہرگز کسی کی موت کو تاخیر میں نہیں ڈالتا اور خُدا

تمھارے ان اعمال سے جنھیں تم انجام دیتے ہو آگاہ ہے۔

❊ ❊ ❊

تفسیر

مال اور اولاد تمھیں خدا کی راہ سے غافل نہ کردیں

چونکہ نفاق کا ایک اہم عامل حُبِّ دنیا اور مال و اولاد سے بہت زیادہ لگاؤ ہے، لہٰذا سورہ منافقون کی ان آخری آیات میں مومنین کو اس قسم کے اندھے لگاؤ سے باز رکھتے ہوئے کہتا ہے: "اے ایمان لانے والو! تمھارے مال اور اولاد تمھیں یادِ خدا سے غافل نہ کردیں" (یاایھا الذین اٰمنوا لا تلھکم اموالکم ولا اولادکم عن ذکر اللہ)۔

"اور جو ایسا کریں گے وہ خسارے میں رہیں گے۔" (و من یفعل ذالک فاولئک ھم الخاسرون)۔

یہ ٹھیک ہے کہ اموال اور اولاد عطیاتِ خداوندی میں سے ہیں، لیکن اس حد تک کہ خدا کی راہ اور سعادت کے حصول کے لیے اُن سے مدد لی جائے۔ لیکن اگر ان کے ساتھ اتنا زیادہ لگاؤ ہو جائے کہ وہ انسان اور خدا کے درمیان رکاوٹ بن جائیں تو پھر وہ سب سے بڑی بلا شمار ہوں گے۔ اور جیسا کہ منافقین کی داستان سے متعلق گزشتہ آیات میں ہم نے دیکھ لیا ہے کہ ان کے انحراف کا ایک عامل یہ حُبِّ دنیا ہی تھا۔

ایک حدیث میں امام باقرؑ سے اس مطلب کو انتہائی واضح صورت میں پیش کیا گیا ہے، جس میں آپ فرماتے ہیں کہ:

"ما ذئبان ضاریان فی غنم لیس لھا راع، بھذا فی اولھا وبھذا فی اٰخرھا باسرع فیھا من حب المال والشرف فی دین المؤمن"۔

"دو درندہ بھیڑیئے بغیر چرواہے کے بھیڑوں کے گلہ میں ہوں جن میں سے ایک اُس کے آگے اور دُوسرا پیچھے ہو، وہ اس قدر ضرر نہیں پہنچاتے جتنا مال پرستی اور جاہ طلبی مومن کے دین کو ضرر پہنچاتی ہے۔"[1]

یہاں ذکرِ خدا سے کیا مراد ہے؟ اس بارے میں مفسرین نے کئی احتمال ذکر کیے ہیں۔ بعض نے پانچ وقت کی نمازوں سے، بعض نے شکرِ نعمت، مصیبتوں پر صبر اور قضا پر راضی رہنے سے اور بعض نے حج و زکات اور تلاوتِ

---

[1] "اصول کافی" جلد ۲ باب "حب الدنیا" حدیث ۳

قرآن سے اور بعض نے تمام فرائض سے تعبیر کی ہے۔لیکن واضح ہے کہ ذکر خدا ایک وسیع معنی رکھتا ہے جو ان سب کو اور ان کے علاوہ دوسرے امور کو بھی شامل ہے۔ اس بناء پر اوپر والے امور سے تفسیر کرنا، واضح مصادیق کے ذکر کی قسم سے ہے۔

"خاسرون" (زیاں کاروں) کی تعبیر اس بناء پر ہے کہ دنیا کی محبت انسان کو اس طرح سرگرم کر دیتی ہے کہ وہ اپنے وجود کے سرمایوں کو ناپائیدار لذتوں کی راہ میں اور بعض اوقات اوہام و خیالات کی راہ میں صرف کر دیتا ہے، وہ اس دنیا سے خالی ہاتھ جاتا ہے، حالانکہ اس کے پاس عظیم سرمائے موجود تھے۔لیکن اس نے اپنی جاودانی زندگی کے لیے کچھ نہیں کیا۔

* * *

اس کے بعد مومنین کو اس شدید خطرے سے آگاہ کرتے ہوئے راہ خدا میں انفاق کرنے کا حکم صادر کرتے ہوئے فرماتا ہے: "اور جو روزی ہم نے تمہیں دی ہوئی ہے اس میں سے خرچ کرو قبل اس کے کہ تم میں سے کسی کی موت آپہنچے، اور وہ یہ کہنے لگے: پروردگارا! تو نے میری موت میں تھوڑی سی مدت کے لیے تاخیر کیوں نہ کی، تاکہ میں انفاق کروں اور صالحین میں سے ہو جاؤں" (و انفقوا مما رزقناکم من قبل ان یأتی احدکم الموت فیقول رب لولا اخرتنی الی اجل قریب فاصدق و اکن من الصالحین)۔[1]

اگرچہ بعض نے یہاں انفاق کی تفسیر ادائے زکوٰۃ میں تعجیل کے وجوب کے معنی میں کی ہے لیکن یہ بات واضح ہے کہ آیت کا مقصد ہر قسم کے واجب و مستحب انفاق کو شامل ہے جو آخرت میں انسان کی نجات کا ذریعہ ہے۔

یہ امر قابل توجہ ہے کہ آیت کے ذیل میں کہتا ہے: "میں انفاق کروں اور صالحین میں سے ہو جاؤں"۔ یہ تعبیر انسان کے صالح ہونے میں، انفاق کی گہری اور عمیق تاثیر کو بیان کرتی ہے۔ اگرچہ بعض نے یہاں صالح ہونے کی تفسیر "مراسم حج" انجام دینے سے کی ہے۔ بعض روایات میں بھی یہ صراحت کے ساتھ آیا ہے۔ لیکن یہ بھی واضح مصداق کی قسم سے ہے۔

"من قبل ان یأتی احدکم الموت" کا جملہ انسان کے آستانۂ موت پر پہنچنے اور اس کی علامات کے ظاہر ہونے کی طرف اشارہ ہے — کیونکہ یہ بات موت کے بعد نہیں کہے گا، بلکہ موت کی چوکھٹ پر کہے گا۔

مما رزقناکم (ہم نے جو روزی تمہیں دے رکھی ہے اس میں سے) کی تعبیر، اس بات کے علاوہ کہ یہ صرف مال میں منحصر نہیں بلکہ تمام مواہب اور نعمتوں کو اپنے دامن میں لیے ہوئے ہے، اس حقیقت کو بھی بیان کرتی ہے کہ یہ سب کچھ کسی دوسری جانب سے ملا ہے اور یہ امانت چند دن کے لیے ہمارے

---

[1] قابل توجہ بات یہ ہے کہ اوپر والی آیت میں 'اصدق' منصوب ہے اور 'اکن' مجزوم ہے۔ حالانکہ ان کا ایک دوسرے پر عطف ہے۔ یہ اس بناء پر ہے کہ 'اکن' کا 'اصدق' کی جگہ پر عطف ہے۔ اور تقدیر میں اس طرح ہے: ان اخرتنی اصدق و اکن من الصالحین۔

پاس ہے، اس بناء پر بخل کرنے کے کیا معنی؟

بہرحال بہت سے لوگ ایسے ہیں جو اس وقت جبکہ وہ برزخی آنکھ سے دیکھنے لگتے ہیں اور خود کو زندگی کے آخری لمحات میں قیامت کی چوکھٹ پر دیکھتے ہیں، غفلت کے پردے اور بے خبری کے حجاب ان کی آنکھوں کے سامنے سے ہٹ جاتے ہیں۔ وہ یہ دیکھتے ہیں کہ انھیں اموال اور سرمایوں کو چھوڑ کر جانا پڑے گا اور اب وہ اس میں سے اس طولانی سفر کے لیے کوئی زادِ راہ بھی نہیں لے سکتے تو وہ پشیمان ہوتے ہیں اور حسرت کی آگ ان کی جان میں لگ جاتی ہے۔ پھر وہ زندگی کی طرف لوٹنے کا تقاضا کرتے ہیں، چاہے وہ لوٹنا کتنا ہی مختصر اور جلدی سے گذر جانے والا ہی کیوں نہ ہو تاکہ وہ تلافی کر سکیں۔ لیکن ان کی اس التجا کو ٹھکرا دیا جائے گا کیونکہ سنتِ الٰہی یہ ہے کہ موت کے راستے میں بازگشت نہیں ہوتی۔

* * *

اسی لیے آخری آیت میں پوری قاطعیت کے ساتھ فرماتا ہے: "جب کسی کی اجل آپہنچتی ہے تو خدا ہرگز کسی کی موت کو تاخیر میں نہیں ڈالتا" (ولن یؤخر اللہ نفسًا اذا جاء اجلھا)۔

یہاں تک کہ ایک لمحہ کے لیے بھی آگے یا پیچھے نہیں ہوگی، جیسا کہ قرآن کی کئی دوسری آیات میں بھی اس امر کی طرف اشارہ ہوا ہے۔ سورۂ اعراف کی آیت ۳۴ میں آیا ہے: "فاذا جاء اجلھم لا یستأخرون ساعۃ ولا یستقدمون": جب ان کی اجل آجائے گی تو وہ نہ تو ایک ساعت کے لیے تاخیر کر سکیں گے اور نہ ہی پیشقدمی ہو سکے گی۔

انجامِ کار آیت کو اس جملہ کے ساتھ ختم کرتا ہے: "جو عمل بھی تم انجام دیتے ہو، خدا اس سے آگاہ ہے"۔ (واللہ خبیر بما تعملون)۔

ان سب اعمال کو جزا و سزا کے لیے ثبت کر لیا گیا ہے اور تمھیں ان سب کا بدلہ ملے گا۔

* * *

چند نکات

۱: پریشانیوں پر غلبہ کی راہ

عالم بزرگ شیخ عبداللہ شوشتری جو مرحوم علامہ مجلسی کے معاصرین میں سے تھے، ان کے حالات میں آیا ہے کہ ان کا ایک بیٹا تھا جس سے وہ بہت ہی محبت کرتے تھے۔ یہ بیٹا سخت بیمار ہو گیا۔ اس کے والد مرحوم شیخ عبداللہ جب نماز کی ادائیگی کے لیے مسجد میں آئے تو پریشان تھے۔ جب اسلامی دستور کے مطابق دوسری رکعت میں سورۂ منافقون پڑھی اور اس آیت پر پہنچے: یاایھا الذین اٰمنوا لا تلھکم اموالکم و لا

اولادکم عن ذکر اللہ۔" اے ایمان لانے والو! تمہارے مال اور اولاد تمہیں یادِ خدا سے غافل نہ کر دیں" تو اس آیت کی کئی بار تکرار کی۔ (نماز میں آیاتِ قرآن کی تکرار جائز ہے۔) جب وہ نماز سے فارغ ہوئے تو بعض دوستوں نے اس تکرار کا سبب پوچھا تو آپ نے فرمایا:

"جب میں اس آیت پر پہنچا تو مجھے اپنا بیٹا یاد آگیا۔ لہٰذا میں اس آیت کی تکرار کے ذریعہ اپنے نفس سے مبارزہ کرنے کے لیے کھڑا ہو گیا۔ میں نے اس طرح سے مبارزہ کیا کہ میں نے فرض کر لیا کہ میرا بیٹا مر گیا ہے اور اس کا جنازہ میرے سامنے ہے اور میں خدا سے غافل نہیں ہوں، چنانچہ اس کے بعد پھر میں نے آیت کی تکرار نہیں کی۔"[1]

۲: نفاق - "اعتقادی" و "عملی"

نفاق ایک وسیع معنی رکھتا ہے جو ہر قسم کی ظاہر و باطن کی دوگانگی کو اپنے اندر لیے ہوئے ہے۔ اس کا ظاہری مصداق تو اعتقادی نفاق ہے اور عام طور پر منافقین کے متعلق آیات اسی بارے میں ہیں۔ وہ ایسے لوگوں سے مربوط ہیں جو ظاہر میں تو ایمان کا اظہار کرتے ہیں لیکن دل میں شرک و کفر کو چھپائے رکھتے ہیں۔

لیکن نفاق عملی ان لوگوں کے ساتھ تعلق رکھتا ہے جن کا باطنی اعتقاد تو اسلام ہے لیکن وہ اس تعہد باطنی کے برخلاف اعمال انجام دیتے ہیں کہ جو اندر اور باہر کے چہرے کی دوگانگی کا پتہ دیتے ہیں۔ مثلاً عہد شکنی، جھوٹ اور امانت میں خیانت کرنا۔ اسی لیے پیغمبر گرامیؐ سے ایک حدیث میں آیا ہے:

"ثلاث من کن فیہ کان منافقا و ان صام وصلی و زعم انہ مسلم
من اذا ائتمن خان و اذا حدث کذب، و اذا وعد، اخلف"[2]

"تین چیزیں ایسی ہیں کہ جس شخص میں بھی ہوں وہ منافق ہے چاہے وہ روزے رکھتا ہو اور نماز پڑھتا ہو اور خود کو مسلمان سمجھتا ہو۔
جو امانت میں خیانت کرتا ہو۔
جب بات کرے تو جھوٹ بولے۔
جب وعدہ کرے تو اس سے تخلف کرے۔"

ایک اور حدیث میں رسولِ خداؐ سے آیا ہے:

---

[1] "سفینۃ البحار" جلد ۲ ص ۱۳۱ (مادہ عبد)۔ اس عالم بزرگوار نے، جو مختلف علوم میں صاحب نظر اور صاحب اثر تھے، ماہ محرم کی چھبیسویں رات ۱۰۲۱ھ صبح کے وقت نمازِ تہجد کے وقت وفات پائی۔ مرحوم سید داماد نے علماء کی ایک جماعت کے ساتھ ان کی نماز جنازہ پڑھی۔

[2] "سفینۃ البحار" جلد ۲ ص ۶۰۵

"ما زاد خشوع الجسد علی ما فی القلب فھو عندنا نفاق"

"جو کچھ دل میں ہے اس سے بڑھ کر خضوع و خشوع کرنا ہمارے نزدیک نفاق ہے"۔ [1]

ایک دوسری جگہ امام علی بن الحسین سے آیا ہے:

"ان المنافق ینھی ولا ینتھی ویأمر بما لا یأتی"

"منافق نہی عن المنکر تو کرتا ہے، لیکن خود اُسے ترک نہیں کرتا۔ وہ امر بالمعروف تو کرتا ہے لیکن خود اُسے انجام نہیں دیتا"۔ [2]

عملی نفاق کے شعبوں میں سے شرک و ریاکاری کا مسئلہ بھی ہے کہ جس کی طرف اسلامی روایات میں اشارہ ہوا ہے۔

❊ ❊ ❊

خداوندا! نفاق کا دامن بہت ہی وسیع و کشادہ ہے اور تیرے لطف و کرم کے بغیر اس سے نجات کی کوئی راہ نہیں ہے۔ تو اس پُرپیچ و خم راہ میں ہماری مدد فرما!

پروردگارا! ہمیں ایسے لوگوں میں سے قرار دے جو دنیا سے رخصت ہوتے وقت حسرت کی آگ میں نہیں جلتے اور واپس لوٹنے کا تقاضا نہیں کرتے۔

بارِ الٰھا! آسمانوں اور زمین کے خزانے تیری ہی ملکیت ہیں اور عزت تجھ سے اور تیرے اولیاء کے ساتھ مخصوص ہے۔ ہمیں ایمان کی برکت سے عزت والا بنا دے اور اپنے بے پایاں خزانوں میں سے ایک حصہ مرحمت فرما۔

آمین یا رب العالمین!

❊ ❊ ❊

سورۂ منافقون کا اختتام

۱۸ رمضان المبارک ۱۴۰۶ھ

اختتام ترجمہ بروز منگل بوقت پونے چھ بجے صبح بتاریخ ۲۴ ذیقعدہ ۱۴۰۷ھ مطابق ۲۱ جولائی ۱۹۸۷ء بر مکان سیٹھ نوازش علی۔ ۸۱، ای ماڈل ٹاؤن لاہور

---

[1] اصول کافی جلد ۲ (باب صفت النفاق حدیث ۶)

[2] اصول کافی جلد ۲ (باب صفت النفاق حدیث ۳)

سُورۃُ تَغَابُن

یہ سورہ مدینہ میں نازل ہوا اور اس کی ۱۸ آیات ہیں۔

تاریخ آغاز

۱۸ رمضان المبارک ۱۴۰۶ ھ

سورۂ تغابن کے مضامین و مطالب

اس بارے میں کہ یہ سورہ مدینہ میں نازل ہوا ہے یا مکہ میں، مفسرین کے درمیان سخت اختلاف ہے۔ اگرچہ اس کا مدنی ہونا مشہور ہے جبکہ بعض اس کو سارا مکی، بعض اس کی صرف تین آخری آیات کو مدنی اور باقی سورہ کو مکی جانتے ہیں۔

یقیناً اس سورہ کی آخری آیات کا لب ولہجہ مدنی سورتوں کے ساتھ ہم آہنگ نہیں ہے، لیکن اس کا درمیانی حصہ مکی سورتوں کے ساتھ زیادہ موافق ہے۔ بہرحال ہم اسے مجموعی طور پر اس کی شہرت کے مطابق مدنی قرار دیتے ہیں۔

"ابوعبداللہ زنجانی" اپنی نفیس کتاب "تاریخ القرآن" میں فہرست "ابن ندیم" سے نقل کرتا ہے کہ سورۂ تغابن چوسواں سورہ ہے جو مدینہ میں نازل ہوا۔ لیکن اس بات کی طرف توجہ کرتے ہوئے کہ مدنی سورتیں کل اٹھائیس ہیں یہ کہنا پڑے گا کہ یہ ان آخری سورتوں میں سے ہے جو پیغمبرؐ پر نازل ہوئیں۔[1]

تاہم مضامین و مطالب کے لحاظ سے اس سورہ کو چند حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے:

۱: سورہ کا آغاز جو توحید اور خدا کی صفات و افعال سے بحث کرتا ہے۔

۲: اس کے بعد یہ سورہ علم خدا سے فائدہ اٹھاتے ہوئے لوگوں کو خبردار کرتا ہے کہ وہ اپنے پوشیدہ اور آشکار اعمال کے نگران رہیں اور گزشتہ اقوام کی سرنوشت کو فراموش نہ کریں۔

۳: سورہ کا تیسرا حصہ معاد کے بارے میں گفت گو کرتا ہے۔ گویا کہ روز قیامت، روز "تغابن" یعنی ایک گروہ کے خسارے میں ہونے اور ایک گروہ کے بڑھ جانے کا دن ہے (سورہ کا نام بھی اسی سے لیا گیا ہے)

۴: ایک حصہ میں خدا اور پیغمبرؐ کی اطاعت کا حکم دیتا اور اس طرح اصل نبوت کی بنیادوں کو استحکام بخشتا ہے۔

۵: سورہ کا آخری حصہ لوگوں کو راہ خدا میں خرچ کرنے کا شوق دلاتا اور مال، اولاد اور بیویوں کے فریب میں آنے سے ڈراتا ہے۔ پھر سورہ کو خدا کے نام اور اس کی صفات پر ختم کرتا ہے، جیسا کہ آغاز کیا تھا۔

* * *

---

[1] "تاریخ القرآن" ص ۵۲، ۶۱

اس سورہ کی تلاوت کی فضیلت

رسول خدا کی ایک حدیث میں آیا ہے :

"من قرأ سورة التغابن دفع عنه موت الفجأة"

"جو شخص سورہ تغابن پڑھے گا اس سے ناگہانی موت دور ہو جائے گی"۔ [1]

ایک حدیث میں امام صادقؑ سے آیا ہے :

"من قرأ سورة التغابن فی فریضته کانت شفیعة له یوم القیامة و شاهد عدل عند من یجیز شهادتها ثم لا تفارقه حتّٰی یدخل الجنة"

"جو شخص سورہ تغابن کو اپنی واجب نماز میں پڑھے گا وہ قیامت کے دن اس کی شفاعت کرے گی اور اس ہستی کے سامنے ایک ایسی شاہد عادل ہو گی جس نے اس کی شفاعت کی اجازت دی ہے پھر اُس سے الگ نہیں ہو گی یہاں تک کہ وہ جنّت میں داخل ہو جائے"۔ [2]

ظاہر ہے کہ اس تلاوت کو غور و فکر سے توأم ہونا چاہیئے۔ ایسی فکر جو اس کے مضامین و مطالب کو عمل میں منعکس کرے تاکہ قاری پر یہ تمام آثار و برکات مرتّب ہوں۔

* * *

---

[1] ، [2] مجمع البیان جلد ۱۰ ص ۲۹۶

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

١ يُسَبِّحُ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۖ لَهُ الْمُلْكُ وَلَهُ الْحَمْدُ ۖ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ○

٢ هُوَ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ فَمِنْكُمْ كَافِرٌ وَّمِنْكُمْ مُّؤْمِنٌ ۭ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ○

٣ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ وَصَوَّرَكُمْ فَاَحْسَنَ صُوَرَكُمْ ۚ وَاِلَيْهِ الْمَصِيْرُ ○

٤ يَعْلَمُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَيَعْلَمُ مَا تُسِرُّوْنَ وَمَا تُعْلِنُوْنَ ۭ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ○

٥ اَلَمْ يَاْتِكُمْ نَبَؤُا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَبْلُ ۡ فَذَاقُوْا وَبَالَ اَمْرِهِمْ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ○

٦ ذٰلِكَ بِاَنَّهٗ كَانَتْ تَّاْتِيْهِمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ فَقَالُوْٓا اَبَشَرٌ يَّهْدُوْنَنَا ۡ فَكَفَرُوْا وَتَوَلَّوْا وَّاسْتَغْنَى اللّٰهُ ۭ وَاللّٰهُ غَنِيٌّ حَمِيْدٌ ○

ترجمہ

رحمٰن و رحیم خدا کے نام سے

① جو بھی آسمانوں اور زمین میں ہیں وہ خدا کی تسبیح کرتے ہیں۔ مالکیت اور حکومت بھی اسی کے لیے ہے اور حمد و ستائش بھی اسی کے لیے اور وہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔

② اسی نے تم کو پیدا کیا ہے (اور تمھیں آزادی اور اختیار دیا ہے) پس تم میں سے ایک گروہ تو کافر ہے اور ایک گروہ مومن اور خدا تمھارے اعمال کو دیکھ رہا ہے۔

③ اس نے آسمانوں اور زمین کو حق کے ساتھ پیدا کیا ہے اور تمھیں صورت عطا کی اور تمھاری بہترین صورت بنائی اور آخر میں سب کی بازگشت اسی کی طرف ہے۔

④ جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے وہ اسے جانتا ہے اور جو کچھ تم پنہاں یا آشکار کرتے ہو وہ اس سے باخبر ہے اور جو کچھ دل میں ہے خدا اس سے آگاہ ہے۔

⑤ کیا ان (کافر) لوگوں کی خبر جو تم سے پہلے تھے تم تک نہیں پہنچی کہ انھوں نے اپنے گناہوں کا مزہ کس طرح چکھا، اور ان کے لیے دردناک عذاب ہے۔

⑥ یہ اس بناء پر ہوا کہ ان کے رسول واضح دلائل کے ساتھ ان کے پاس آئے تھے، لیکن انھوں نے (کبر و غرور کی بناء پر یہ) کہا: کیا افرادِ بشر ہمیں ہدایت کرنا چاہتے ہیں اور اس طرح سے وہ کافر ہو گئے، اور انھوں نے رُوگردانی کی۔ اور خدا (ان کے ایمان اور اطاعت سے) بے نیاز تھا، اور خدا غنی اور لائقِ حمد و ستائش ہے۔

* * *

تفسیر

وہ دلوں میں چھپے ہوئے اسرار سے آگاہ ہے۔

اس سورہ کا بھی تسبیحِ خدا سے آغاز ہوتا ہے۔ وہ خدا جو کل جہانِ ہستی کا مالک اور اس پر حاکم ہے اور ہر چیز پر

قدرت رکھتا ہے، فرماتا ہے: "جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے خدا کی تسبیح کرتا ہے" (یسبح للہ ما فی السماوات و ما فی الارض)۔

اس کے بعد مزید کہتا ہے: مالکیت اور حاکمیت اسی کے لیے ہے۔ (لہ الملک)۔

"اور (اسی بناء پر) تمام حمد و ستائش کی بازگشت اسی کی پاک ذات کی طرف ہے" (ولہ الحمد)۔

"اور وہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے" (و ھو علی کل شیٔ قدیر)۔

چونکہ ہم تمام موجودات عالم کی تسبیح عمومی کے بارے میں بارہا بیان کر چکے ہیں اور متعدد تفاسیر جو اس موضوع کے بارے میں بیان ہوئی ہیں انھیں ہم نقل کر چکے ہیں اس لیے تکرار کی ضرورت نہیں ہے۔

یہ تسبیح اور حمد حقیقت میں اس کے ہر چیز پر قادر ہونے اور ہر چیز کے اس کی مالکیت ہونے کا لازمہ ہے۔ کیونکہ اس کے تمام اوصاف جمال و جلال انھیں دو امور میں چھپے ہوئے ہیں۔

* * *

اس کے بعد امرِ خلقت و آفرینش کی طرف، جو قدرت کا لازمہ ہے، اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے: "اسی نے تمھیں پیدا کیا ہے" (ھو الذی خلقکم)۔

اور تمھیں آزادی اور اختیار کی نعمت عطا کی۔ اس لیے تم میں سے ایک گروہ مومن اور ایک گروہ کافر ہو گیا: (فمنکم کافر و منکم مؤمن)۔[1]

اس طرح سے خدائی امتحان اور آزمائش کا بازار گرم ہو گیا، اور اس اثناء میں "جو عمل بھی تم انجام دیتے ہو خدا اُسے دیکھتا ہے" (واللہ بما تعملون بصیر)۔

* * *

اس کے بعد مسئلۂ "خلقت" کو مزید وضاحت کے ساتھ بیان کرتے ہوئے اور خلقت و آفرینش کے ہدف کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بعد والی آیت میں فرماتا ہے: "خدا نے آسمانوں اور زمین کو حق کے ساتھ پیدا کیا ہے" (خلق السماوات و الارض بالحق)۔

اس کی خلقت میں بھی حق اور ایک دقیق نظام ہے اور اس میں حکیمانہ ہدف اور حق پر مبنی مصلحتیں بھی ہیں۔ چنانچہ سورہ ص کی آیت ۲۷ میں بھی فرماتا ہے: "وما خلقنا السماء والارض وما بینھما باطلاً ذالک ظن الذین کفروا: ہم نے آسمان اور زمین کو اور جو کچھ ان دونوں کے درمیان ہے بے مقصد پیدا نہیں کیا ہے۔ یہ کافروں کا گمان ہے"۔

---

[1] "فاء" تفریع کا ذکر یہاں اس لیے نہیں ہے کہ ایمان و کفر بھی اللہ کی مخلوق ہیں، بلکہ یہ اس بناء پر ہے کہ خلقت کے بعد اس نے انسان کو ارادہ کی آزادی دی ہے۔ اور اس کا لازمہ یہ ہے کہ کافر و مومن دو گروہ پیدا ہوئے۔

اس کے بعد انسان کی خلقت کو بیان کرتے ہوئے اور ہمیں سیرِ آفاقی سے سیر انفسی کی طرف دعوت دیتے ہوئے مزید کہتا ہے: "اس نے تمھیں صورت عطا کی اور تمھاری بہترین تصویر بنائی" (وصورکم فاحسن صورکم)۔

اس انسان کو جس کا ظاہر آراستہ اور باطن پیراستہ ہے، ایک روشن عقل اور قوی شعور عطا کیا اور جو کچھ پورے عالم ہستی میں ہے اس کے نمونے اس کے وجود میں پیدا کیے، اس طرح سے کہ "عالم کبیر" اس "جرم صغیر" میں خلاصہ ہو گیا۔

لیکن جیسا کہ آیت کے آخر میں فرماتا ہے: "انجام کار ہر چیز کی بازگشت اسی کی طرف ہے" (و الیہ المصیر)۔

ہاں! وہ انسان جو مجموعۂ عالمِ ہستی کا ایک جزء ہے، خلقت کے لحاظ سے کل عالم کے باہدف ہونے کے ساتھ ہم آہنگ ہے۔ پست ترین مراحل سے اس نے چلنا شروع کیا، اور غیر متناہی منزل کی طرف، جو حق تعالےٰ کا وجودِ بے پایاں اور خدا کا قرب ہے، آگے بڑھ رہا ہے۔

"فاحسن صورکم" (تمھاری بہترین صورت بنائی) کی تعبیر ظاہری صورت کو بھی شامل ہے اور باطنی صورت کو بھی، جسم کے لحاظ سے بھی اور روح کے لحاظ سے بھی۔ سچ تو یہ ہے کہ انسان کے جسم و جان پر ایک اجمالی نظر ڈالنے سے پتہ چلتا ہے کہ عالمِ ہستی کا خوبصورت ترین موجود یہی ہے۔ خدا نے اس موجود کی خلقت میں عجیب و غریب قدرت نمائی کی اور اسے ہر لحاظ سے کامل بنایا ہے۔

* * *

چونکہ انسان کو ایک عظیم مقصد کے لیے پیدا کیا گیا ہے، لہٰذا اُسے ہمیشہ پروردگار کی نگرانی میں رہنا چاہیے۔ وہ پروردگار جو اس کے ظاہر و باطن سے باخبر ہے۔ اس لیے بعد والی آیت میں فرماتا ہے: "خدا اُسے بھی جانتا ہے جو آسمانوں اور زمین میں ہے اور اس سے بھی باخبر ہے جسے تم پنہاں یا آشکارا کرتے ہو، وہ ان عقاید اور نیتوں سے بھی آگاہ ہے جو تمھارے سینوں کے اندر ہیں" (یعلم ما فی السماوات والارض ویعلم ما تسرون وما تعلنون واللہ علیم بذات الصدور)۔

یہ آیت خدا کے بے پایاں علم کی تین مرحلوں میں تصویر کشی کرتی ہے:

اوّل: اس کا علم آسمانوں اور زمین کے تمام موجودات کے بارے میں۔

دوئم: اس کا علم انسانوں کے اعمال کے بارے میں چاہے وہ چھپا کر کرتے ہوں یا آشکارا کرتے ہوں۔

سوئم: خصوصیت کے ساتھ عقاید باطنی نیتوں کی کیفیت کو اور جو کچھ انسان کے دل و جان پر حکم فرما ہے اُسے بھی جانتا ہے۔

انسان میں خدا کے اس وسیع علم کی معرفت کا حد سے زیادہ تربیتی اثر ہوتا ہے۔ یہ اس کو خبردار کرتا ہے کہ تو چاہے جو کچھ بھی ہے اور جہاں کہیں بھی ہے تیرا ہر عقیدہ، تیرے دل کی ہر نیت اور تیری روح و جان کے سارے

اخلاق حق تعالیٰ کے بے پایاں علم کی بارگاہ میں آشکار ہیں۔ مسلّمہ طور پر اس حقیقت کی طرف توجہ انسان کی اصلاح و تربیت میں حد سے زیادہ مؤثر ہے۔ یہ ایسی تعلیمات ہیں جو انسان کو مقصدِ خلقت اور قانونِ تکامل تک پہنچنے کے لیے آمادہ کرتی ہیں۔

❊ ❊ ❊

چونکہ وسائل تربیت اور انذار کے طریقوں میں سے ایک موثر ترین ذریعہ، گزشتہ اقوام اور اُمتوں کی سرنوشت کی طرف توجہ دلانا ہے، لہٰذا بعد والی آیت ان کی زندگی پر ایک اجمالی نظر ڈالتے ہوئے انسان کو مخاطب کر کے کہتی ہے:

"کیا تم تک ان کافروں کی خبر نہیں پہنچی جو تم سے پہلے تھے۔ انھوں نے کس طرح اپنے گناہانِ کبیرہ کا تلخ ذائقہ چکھا اور ان کے لیے آخرت میں بھی دردناک عذاب ہے۔" (الم یأتکم نبؤا الذین کفروا من قبل فذاقوا وبال امرھم ولھم عذاب الیم)۔[1]

تم شام اور دوسرے علاقوں کی طرف جاتے ہوئے ان کے عذابی اور ویران شہروں کے قریب سے گزرتے ہو اور ان کے کفر، ظلم اور گناہوں کا نتیجہ اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہو۔ ہاں! ان کی خبروں کو تم تاریخ میں پڑھتے ہو۔ وہی لوگ جن کی زندگی کا دفتر طوفان و سیلاب سے درہم برہم ہوا یا بجلیوں نے جن کی خرمنِ عمر میں آگ لگا دی، یا ویران و تباہ کرنے والے زلزلوں نے انھیں زمین کے منہ کا لقمہ بنا دیا اور تیز آندھی نے ان کے بھاری بھرکم جسموں کو تنکوں کی طرح ہر طرف اڑا دیا۔ یہ تو ان کا دنیاوی عذاب تھا، لیکن آخرت میں بھی ایک دردناک عذاب ان کا منتظر ہے۔

❊ ❊ ❊

بعد والی آیت اس دردناک سرنوشت کے منشا، اصلی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مزید کہتی ہے: "اس کی وجہ یہ تھی کہ ان کے انبیاء و رُسل واضح دلائل اور معجزات کے ساتھ ان کی طرف آئے، لیکن وہ لوگ کبر و غرور کی وجہ سے یہ کہا کرتے تھے: "کیا انسان ہماری ہدایت کریں گے؟ کیا یہ بات ممکن ہے؟" (ذالک بانہ کانت تأتیھم رسلھم بالبینات فقالوا ابشر یھدوننا)۔

اس بیہودہ گفتگو کے ساتھ وہ ان کی مخالفت کے لیے اُٹھ کھڑے ہوئے، "یوں وہ کافر ہو گئے اور انھوں نے حق کو قبول کرنے سے روگردانی کی۔" (فکفروا وتولوا)۔

"حالانکہ خدا ان کے ایمان اور ان کی اطاعتوں سے بھی بے نیاز تھا۔" (واستغنی اللہ)۔

اگر انھیں ایمان، اطاعت اور پرہیزگاری کے لیے مکلّف فرمایا ہے تو وہ صرف ان کی منفعت یعنی اس جہان میں اور دوسرے جہان میں ان کی سعادت اور نجات کے لیے تھا۔

ہاں! "خدا بے نیاز ہے اور ہر قسم کی حمد و ستائش کے لائق ہے۔" (واللہ غنی حمید)۔

---

[1] 'وبال' 'وبل' اور 'وابل' کے مادہ سے سخت بارش کے معنی میں ہے ہر اس اہم موضوع کو جس کے نقصان سے انسان خائف ہو 'وبال' کہا جاتا ہے۔

اگر ساری کائنات کافر ہو جائے تو اس کے دامن کبریائی پر کوئی گرد نہیں بیٹھتی ۔ اسی طرح اگر تمام مخلوقات مومن اور اس کی مطیعِ فرمان ہو جائے تو اس کے جلال میں کسی چیز کا اضافہ نہیں ہوتا ۔ یہ تو ہم ہی ہیں جو اس قسم کے تربیتی ، اصلاحی اور تکامل و ارتقاء کے اصول و قوانین کے محتاج ہیں ۔

"واستغنی اللہ" (خدا بے نیاز تھا) کی تعبیر ، اس طرح مطلق ہے کہ ہر چیز سے ، یہاں تک کہ انسانوں کے ایمان اور اطاعت سے بھی ، اس کی بے نیازی کو بیان کرتی ہے تاکہ یہ تصور نہ آئے کہ یہ سب تاکیدیں اور اصرار اس بنا پر ہے کہ اس اطاعت کا فائدہ خدا کی طرف لوٹتا ہے ۔ اس نے مخلوقات کو ہرگز اس لیے پیدا نہیں کیا کہ اُسے اُن سے کوئی فائدہ ہو ، بلکہ وہ یہ چاہتا تھا کہ اپنے بندوں پر جود و سخا کرے ۔

بعض نے "واستغنی اللہ" کے جملہ کے لیے ایک اور تفسیر بھی بیان کی ہے کہ خدا نے اس قدر واضح آیات ، دلائل اور کافی وعظ و نصائح ان کے لیے بھیجے ہیں کہ اس کے علاوہ کچھ بھیجنے سے بے نیاز تھا ۔

* * *

⑦ زَعَمَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَنْ لَّنْ يُّبْعَثُوْا ؕ قُلْ بَلٰى وَ رَبِّيْ لَتُبْعَثُنَّ ثُمَّ لَتُنَبَّؤُنَّ بِمَا عَمِلْتُمْ ؕ وَ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرٌ ۝

⑧ فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ وَالنُّوْرِ الَّذِيْٓ اَنْزَلْنَا ؕ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ۝

⑨ يَوْمَ يَجْمَعُكُمْ لِيَوْمِ الْجَمْعِ ذٰلِكَ يَوْمُ التَّغَابُنِ ؕ وَ مَنْ يُّؤْمِنْ بِاللّٰهِ وَ يَعْمَلْ صَالِحًا يُّكَفِّرْ عَنْهُ سَيِّاٰتِهٖ وَ يُدْخِلْهُ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ؕ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ۝

⑩ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَآ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ؕ وَ بِئْسَ الْمَصِيْرُ ۝

* * *

ترجمہ

⑦ کافروں نے یہ گمان کر لیا ہے کہ انھیں ہرگز زندہ کرکے اُٹھایا نہیں جائیگا۔ کہہ دیجئے۔ ہاں! مجھے اپنے پروردگار کی قسم ہے۔ تم سب کے سب قیامت میں (زندہ کرکے ضرور) اٹھائے جاؤ گے۔ اس کے بعد جو کچھ تم عمل کیا کرتے تھے اس کی وہ تمھیں

خبر دے گا اور یہ خدا کے لیے آسان ہے۔

(۸) اب جبکہ یہ بات ہے تو خدا اور اس کے رسول اور اس نور پر ایمان لے آؤ جسے ہم نے نازل کیا ہے۔ اور یہ جان لو کہ خدا تمھارے ان اعمال سے آگاہ ہے جنھیں تم انجام دیتے ہو۔

(۹) یہ اس وقت ہوگا جب وہ تم سب کو اس "اجتماع کے دن" جمع کرے گا۔ وہ تغابن کا دن ہوگا۔ (وہ دن جس میں لوگوں کو معلوم ہوگا کہ گھاٹے میں کون رہا ہے) اور جو شخص خدا پر ایمان لے آئے اور عمل صالح انجام دے تو وہ اس کے گناہوں کو بخش دے گا اور وہ اس کو اس جنت کے باغوں میں وارد کرے گا جس کے درختوں کے نیچے نہریں جاری ہیں۔ اور وہ ہمیشہ ہمیشہ ان میں رہیں گے اور یہ ایک عظیم کامیابی ہے۔

(۱۰) لیکن وہ لوگ جو کافر ہو گئے ہیں اور انھوں نے ہماری آیات کی تکذیب کی ہے، وہ دوزخ والے ہیں اور وہ ہمیشہ ہمیشہ اس میں رہیں گے اور ان کا انجام بہت ہی بُرا ہے۔

* * *

تفسیر

تغابن کا دن اور غبنوں کا آشکار ہونا

ان مباحث کے بعد جو گزشتہ آیات میں خلقت کے بامقصد ہونے کے بارے میں آئے تھے ان آیات میں معاد اور قیامت کے مسئلہ کو پیش کرتا ہے جو انسان کے مقصدِ خلقت کی بحث کی ایک تکمیل ہے۔

پہلے منکرینِ قیامت کے دعوائے بے دلیل سے شروع کرتے ہوئے فرماتا ہے۔ "کافروں نے یہ خیال کر لیا ہے کہ وہ ہرگز مبعوث نہیں ہوں گے۔" (زعم الذین کفروا ان لن یبعثوا)۔

'زعم' زعم کے مادہ سے (بروزن طعم) اس بات کے معنی میں ہے کہ جس کے جھوٹ ہونے کا احتمال یا یقین ہو۔ کبھی باطل خیال کے معنی میں بھی اس کا اطلاق ہوتا ہے اور زیرِ بحث آیت میں وہی پہلا معنی مُراد ہے۔

اہلِ لغت کے بعض کلمات سے اس بات کا بھی پتہ چلتا ہے کہ یہ مادہ بطور مطلق خبر دینے کے معنی میں[1]

---

[1] مجمع البحرین مادہ 'زعم'

بھی آیا ہے۔

اگرچہ اس لفظ کے مواردِ استعمال اور مفسرین کے کلمات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ لفظ جھوٹ کے مفہوم کی آمیزش رکھتا ہے۔ اسی لیے انھوں نے یہ کہا ہے کہ ہر چیز کی ایک کنیت ہوتی ہے اور دروغ کی کنیت "زعم" ہے۔

بہرحال قرآن اس گفتگو کے بعد پیغمبرِ اسلام کو حکم دیتا ہے: "کہہ دیجئے، ہاں! مجھے میرے پروردگار کی قسم ہے، تم سب کے سب (زندہ کرکے) اٹھائے جاؤ گے۔ اس کے بعد جو کچھ تم نے عمل کیا ہے تمھیں اس کی خبر دیں گے اور یہ خدا کے لیے آسان ہے۔" (قل بلیٰ وربی لتبعثن ثم لتنبؤن بما عملتم و ذالک علی اللہ یسیر)۔

حقیقت میں پہلے قاطع لب ولہجہ میں منکرین قیامت کے دعوائے بلا دلیل کی نفی کرتا ہے۔ ایک ایسے تاکیدی لب ولہجہ اور قسم کی آمیزش کے ساتھ جو کہنے والے یعنی پیغمبرؐ کے اعتقاد راسخ کی حکایت کرتا ہے۔ اس کے بعد "وذالک علی اللہ یسیر" کے جملہ کے ساتھ اس پر استدلال کرتا ہے۔ کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ منکرین معاد کا اہم ترین شبہ اور اعتراض یہ تھا کہ بوسیدہ اور خاک شدہ ہڈیاں کیسے زندہ ہوں گی؟ اوپر والی آیت کہتی ہے کہ جب کام خداوندِ قادرِ متعال کے ہاتھ میں ہے تو پھر کوئی مشکل نہیں ہے۔ چونکہ ابتداء میں تو وہ انھیں عدم سے وجود میں لایا ہے اور مُردوں کو زندہ کرنا اس کی نسبت زیادہ آسان ہے۔ بلکہ بعض کے نظریہ کے مطابق تو "وربی" کی قسم ہی معاد کی دلیل کی طرف خود ایک لطیف اشارہ ہے۔ کیونکہ خدا کی ربوبیت کا تقاضا یہ ہے کہ انسان کی اس حرکت تکاملی کو دنیا کی بے قدر وقیمت زندگی کی حدود میں ہی بانجھ نہ کر دے۔ دوسرے لفظوں میں جب تک ہم معاد کے مسئلہ کو قبول نہ کریں تو خدا تعالیٰ کی ربوبیت کا انسان اور اس کی تربیت وتکامل کے بارے میں کوئی مفہوم نہیں ہوگا۔

بعض مفسرین و ذالک علی اللہ یسیر کے جملہ کو خصوصیت سے قیامت میں خدا کے انسانوں کو ان کے اعمال کی خبر دینے سے مربوط سمجھتے ہیں جس کا ذکر قبل کے جملہ میں آیا ہے۔ لیکن ظاہر ہے کہ یہ آیت کے پورے مضمون کی طرف لوٹتا ہے۔ (اصل قیامت اور اس کی فرع جو اعمال کی خبر دینے کا مسئلہ ہے، ایسی خبر جو حساب وجزا کے لیے ایک مقدمہ ہے۔)

* * *

بعد والی آیت میں اس سے یہ نتیجہ نکالتا ہے: "اب جبکہ قیامت یقینی طور پر برپا ہوگی تو تم سب کے سب خدا اُس کے رسولؐ اور اس نور پر ایمان لے آؤ جسے ہم نے نازل کیا ہے۔" (فآمنوا باللہ ورسولہ والنور الذی انزلنا)۔

"اور جان لو کہ خدا تمھارے ان اعمال سے آگاہ ہے جنھیں تم انجام دیتے ہو۔" (واللہ بما تعملون خبیر)۔

اس طرح سے یہ حکم دیتا ہے کہ وہ اپنے آپ کو قیامت کے لیے ایمان اور عمل صالح کے طریق سے آمادہ کریں۔ تین اصولوں پر ایمان "خدا"، "رسول" اور "قرآن" جس میں دوسرے اصول بھی درج ہیں۔

قرآن کی "نور" کے عنوان سے تعبیر متعدد آیات میں آئی ہے۔ اور لفظ "انزلنا" (ہم نے نازل کیا) کی تعبیر اس پر ایک اور شاہد ہے۔ اگرچہ متعدد روایات میں جو اہل بیت کے ذریعہ ہم تک پہنچی ہیں، زیر بحث آیت میں لفظ "نور" وجود "امام" سے تفسیر ہوا ہے۔ ممکن ہے یہ تفسیر اس لحاظ سے ہو کہ وجود امام کتاب اللہ کا عملی تجسم شمار ہوتا ہے۔ اسی لیے بعض اوقات پیغمبر اور امام کو قرآن ناطق سے یاد کیا گیا ہے۔ ان روایات میں سے ایک میں امام محمد باقر سے آیا ہے کہ آپ نے آئمہ علیہم السلام کے بارے میں فرمایا:

"وھم الذین ینورون قلوب المؤمنین"

"اور وہ (ائمہ) وہی ہیں جو مومنین کے دلوں کو نور اور روشنی بخشتے ہیں"۔ [1]

بعد والی آیت قیامت کے دن کی توصیف کرتے ہوئے کہتی ہے: "یہ بعث ونشور اور حساب وجزاء اس دن ہوگا جب وہ اجتماع کے دن تمھیں اکٹھا کرے گا" (یوم یجمعکم لیوم الجمع)۔[2]

قیامت کے ناموں میں سے ایک نام "یوم الجمع" بھی ہے۔ جس کی طرف آیات قرآنی میں مختلف تعبیروں کے ساتھ بارہا اشارہ ہوا ہے۔ منجملہ ان کے سورہ واقعہ کی آیت ۴۹، ۵۰ میں آیا ہے: قل ان الاولین والآخرین لمجموعون الی میقات یوم معلوم: "کہہ دیجئے۔ تمام اولین وآخرین ایک معین دن کی میقات میں جمع ہوں گے" اور اس سے اچھی طرح معلوم ہو جاتا ہے کہ تمام انسانوں کی قیامت ایک ہی دن ہے۔ اس کے بعد مزید کہتا ہے: "وہ دن تغابن کا دن ہے" (ذالک یوم التغابن)۔

وہ ایسا دن ہے کہ جس میں "غابن" (سبقت کرنے والا) اور "مغبون" (ہار جانے والا) پہچانا جائے گا۔ وہ دن جس میں یہ واضح ہو جائے گا کہ کون کون لوگ اپنی تجارت میں عالم دنیا میں غبن، زیان اور خسارے میں گرفتار ہوئے ہیں۔

وہ ایسا دن ہے کہ جس میں اہل جہنم جنت میں اپنی خالی جگہ کو دیکھیں گے اور افسوس کریں گے اور جنتی دوزخ میں اپنی خالی جگہ کو دیکھیں گے اور خوش ہوں گے۔ کیونکہ حدیث میں آیا ہے کہ ہر انسان کیلئے ایک جگہ جنت میں اور ایک جگہ جہنم میں ہے۔ اگر وہ جنت میں چلا گیا تو اس کی جہنم والی جگہ دوزخیوں کے سپرد کر دی جائیگی۔ اور اگر وہ جہنم میں چلا گیا تو اس کی جنت والی جگہ بہشتیوں کو دے دی جائے گی۔ اور احتمال یہ ہے کہ اس مورد

---

[1] نور الثقلین جلد ۵ ص ۳۴۱

[2] "یوم یجمعکم" ممکن ہے کہ "لتبعثن" یا جملہ "لتنبؤن" یا "خبیر" سے متعلق ہو۔ یہ احتمال بھی دیا گیا ہے کہ "اذکر" جیسے محذوف جملہ سے متعلق ہو لیکن یہ آخری احتمال بعید نظر آتا ہے بلکہ گذشتہ احتمالوں میں سے کوئی ایک مناسب ہے۔ [3] نور الثقلین جلد ۳ ص ۵۳۱

میں، آیاتِ قرآنی میں ارث کی تعبیر اسی مطلب کے لیے آئی ہے۔

اس طرح سے قیامت کا ایک نام "یوم التغابن" غبنوں کے ظہور کا دن ہے۔[1] اس کے بعد اُس دن میں مومنین کی حالت کو بیان کرتے ہوئے مزید کہتا ہے:

"جو شخص خدا پر ایمان لائے گا اور اعمال صالح انجام دے گا، خدا اس کے گناہوں کی پردہ پوشی کرتے ہوئے انھیں ختم کر دے گا۔ وہ انھیں جنّت کے ایسے باغوں میں وارد کرے گا جن کے درختوں کے نیچے نہریں جاری ہیں، وہ ہمیشہ ہمیشہ اسی میں رہیں گے اور یہ ایک عظیم کامیابی ہے"۔ (و من یؤمن باللہ و یعمل صالحا یکفر عنہ سیئاتہ و یدخلہ جنات تجری من تحتہا الانہار خالدین فیہا ابدا ذالک الفوز العظیم)۔

اس طرح سے جب دو اصل شرطیں یعنی ایمان اور عمل صالح حاصل ہو جائیں گی تو یہ عظیم نعمتیں اسے حاصل ہوں گی:

گناہوں کی بخشش، جو فکر انسانی کو ہر چیز سے زیادہ اپنی طرف مشغول رکھتی ہے:

گناہ سے پاک ہونے کے بعد دائمی بہشت میں داخل ہونا اور فوزِ عظیم حاصل کرنا۔

اس بناء پر تمام چیزیں ایمان اور عمل صالح کے محور پر ہی گردش کرتی ہیں اور یہی اصلی سرمائے ہیں۔ یہی وہ لوگ ہوں گے جو اس دن یعنی "یوم تغابن" نہ صرف مغبون نہیں ہوں گے بلکہ عظیم کامیابی پر فائز ہوں گے۔

* * *

اس کے بعد مزید کہتا ہے: "لیکن وہ لوگ جو کافر ہو گئے اور ہماری آیات کی تکذیب کی بیشک وہ اصحاب نار، یعنی دوزخ والے ہیں۔ وہ ہمیشہ ہمیشہ اسی میں رہیں گے اور ان کا انجام بہت ہی بُرا ہے"۔ (و الذین کفروا و کذبوا بآیاتنا اولئک اصحاب النار خالدین فیہا و بئس المصیر)۔

یہاں بھی دو چیزیں بدبختی کی عامل شمار ہوئی ہیں: "کفر" اور "آیاتِ الٰہی کی تکذیب" جو "ایمان" اور "عمل صالح" کی ضد ہیں۔ اس کے نتیجے میں وہاں بہشتِ جاودانی کے بارے میں اور یہاں ہمیشہ کے دوزخ کے بارے میں گفتگو ہے۔ وہاں فوزِ عظیم اور یہاں بئس المصیر اور مرگبار انجام ہے۔

ان دونوں آیات میں جنّتیوں اور دوزخیوں کے درمیان جو فرق نظر آتا ہے، ایک تو یہ ہے کہ جنّتیوں کے بارے میں ہر چیز سے پہلے گناہوں کی مغفرت کا ذکر ہوا ہے کہ جو دوزخیوں کے بارے میں نہیں آیا۔ دوسرا یہ

---

[1] "تغابن" باب تفاعل سے ہے اور عام طور پر ایسے مواقع میں بولا جاتا ہے جو دو جانبہ ہوں۔ جیسے تعارض و تزاحم وغیرہ اور قیامت کے بارے میں یہ معنی ممکن ہے اس طرح سے ہو کہ مومنین کے گروہ اور کفّار کے تعارض کا نتیجہ قیامت میں ظاہر ہو گا اور حقیقت میں قیامت کا دن تغابن کے ظہور کا دن ہو گا۔ اہل لغت کے بعض کلمات سے بھی اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ باب تفاعل ہمیشہ اس معنی کے لیے نہیں آتا اور یہاں ظہور غبن کے معنی میں ہے۔ (مفردات راغب مادہ غبن)

کہ وہاں جنت میں خلود یعنی ہمیشہ رہنا۔ لفظ "ابدًا" کے ساتھ ذکر ہوا ہے لیکن دوزخیوں کے بارے میں صرف خلود اور ہمیشہ رہنے کے مسئلہ پر اکتفا کی گئی ہے۔

تعبیر کا یہ فرق ممکن ہے اس بناء پر ہو کہ دوزخیوں کے درمیان ایسے کافر بھی ہوں گے جنھوں نے ایمان و کفر کے مسئلہ کو آپس میں ملا دیا ہے، پھر وہ اپنے ایمان کی بناء پر انجام کار عذاب سے رہائی پا جائیں۔ یا یہ اس کی رحمت کے اس کے غضب پر غلبہ کی طرف اشارہ ہے۔

لیکن بعض مفسرین کا خیال ہے کہ دوسرے جملے میں 'ابدًا' محذوف ہے کیونکہ یہ پہلے جملے میں آچکا ہے۔

* * *

(۱۱) مَآ اَصَابَ مِنْ مُّصِيْبَةٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ۭ وَمَنْ يُّؤْمِنْۢ بِاللّٰهِ يَهْدِ قَلْبَهٗ ۭ وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ○

(۱۲) وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ ۚ فَاِنْ تَوَلَّيْتُمْ فَاِنَّمَا عَلٰي رَسُوْلِنَا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ ○

(۱۳) اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۭ وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ ○

❊ ❊ ❊

ترجمہ

(۱۱) کوئی مصیبت رُونما نہیں ہوتی مگر خدا کے اذن سے اور جو شخص خدا پر ایمان لاتا ہے تو خدا اس کے دل کو ہدایت کر دیتا ہے اور خدا ہر چیز کا جاننے والا ہے۔

(۱۲) اور تم خدا کی اطاعت کرو اور پیغمبرؐ کی اطاعت کرو۔ اور اگر تم روگردانی کرو گے تو ہمارے رسُول پر تو واضح طور پر پہنچا دینے کے سوا اور کوئی ذمّہ داری نہیں ہے۔

(۱۳) اللہ وہی ہے اور اس کے سوا اور کوئی خدا نہیں پس مومنین کو اسی پر توکّل کرنا چاہیے۔

❊ ❊ ❊

تفسیر

تمام مصائب اسی کے فرمان سے ہیں

پہلی زیر بحث آیت میں اس جہان کے دردناک مصائب اور حوادث کے بارے میں ایک اصل کلّی کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ شاید اس وجہ سے کہ اس جہان میں مصائب کا وجود کفّار کے لیے ہمیشہ نفی عدالت کے بارے میں ایک دستاویز رہا ہے یا اس لحاظ سے کہ ایمان اور عمل صالح کی انجام دہی کی راہ میں ہمیشہ مشکلات موجود رہتی ہیں۔

جن کے مقابلہ میں مقاومت کے بغیر مومن کچھ بھی نہیں کر سکتا۔ اس طرح سے ان آیات کا رابطہ گذشتہ آیات سے واضح ہو جاتا ہے۔

پہلے فرماتا ہے: "کوئی مصیبت رُونما نہیں ہوتی مگر خدا کے اذن سے۔" (ما اصاب من مصیبة الّا باذن الله)۔

اس میں شک نہیں کہ اس جہان کے تمام حوادث اذنِ خدا سے ہیں۔ کیونکہ "توحیدِ افعالی" کے مقتضیٰ کے مطابق سارے عالمِ ہستی میں کوئی چیز حق تعالیٰ کے ارادہ کے بغیر تحقق نہیں پاتی، لیکن چونکہ مصائب ہمیشہ سے ایک سوالیہ نشان کی صورت میں ذہنوں میں بیٹھے ہوئے ہیں، اس لیے خصوصیت کے ساتھ اس پر توجہ ہوئی ہے۔

البتہ یہاں اذن سے مُراد وہی خدا کا ارادۂ تکوینی ہے نہ کہ ارادۂ تشریعی۔

یہاں ایک اہم سوال سامنے آتا ہے اور وہ یہ کہ ان میں سے بہت سے مصائب ظالموں کے ظلم اور جابروں کے ارادہ سے رونما ہوتے ہیں، یا انسان خود ہی اپنی کوتاہی یا جہالت سے کوئی کام کر بیٹھے یا غلط کاری کی وجہ سے ان میں گرفتار ہو جاتا ہے۔ تو کیا یہ سب کے سب اذنِ خدا سے ہوتے ہیں؟

اسی سوال کا جواب یہ ہے کہ وہ تمام آیات جو مصائب کے سلسلہ میں قرآن مجید میں آئی ہیں ان سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مصائب دو قسم کے ہیں:

۱: ایسے مصائب جو انسانی زندگی کی طبیعت میں اور مزاج میں رچے بسے ہوئے ہیں اور انسان کے ارادہ کا ان میں معمولی سا بھی دخل نہیں ہے۔ مثلاً موت اور کچھ دوسرے طبیعی اور دردناک حوادث۔

۲: وہ مصائب جن میں انسان کا کسی نہ کسی طرح دخل ہے۔

قرآن پہلی قسم کے مصائب کے بارے میں کہتا ہے کہ وہ سب اذنِ خدا سے رونما ہوتے ہیں۔ دوسری قسم کے بارے میں کہتا ہے کہ وہ خود تمہارے اعمال کی وجہ سے تمہیں دامنگیر ہوتے ہیں۔[1]

اس بنا پر کوئی شخص یہ بہانہ نہیں بنا سکتا کہ چونکہ تمام مصائب خدا کی طرف سے ہیں، لہٰذا ظالموں کے مقابلے میں خاموشی اختیار کرتے ہوئے ان سے مبارزہ کے لیے نہیں اُٹھنا چاہیے۔ نیز انسان اس بہانے سے بیماریوں اور آفات سے مقابلہ کرنے اور فقر و جہالت سے مبارزہ کرنے سے بھی دست بردار نہیں ہو سکتا۔

البتہ یہاں ایک اور نکتہ بھی ہے اور وہ یہ ہے کہ ایسے مصائب کہ جن میں انسان کا کچھ عمل دخل ہے، ان کے اسباب کی تاثیر بھی خدا کی طرف سے اور اس کے اذن و فرمان سے ہے کہ اگر وہ ارادہ کرے تو ہر سبب بے رنگ اور بے اثر ہو جاتا ہے۔

اس کے بعد آیت کے آخر میں مومنین کو بشارت دیتا ہے۔ "جو شخص خدا پر ایمان لے آئے خدا اس کے

---

[1] سورہ حدید کی آیت ۲۲، شوریٰ کی آیت ۳۰، اور آل عمران کی آیت ۱۶۵ کی طرف رجوع کرنے سے مطلب پورے طور پر واضح ہو جاتا ہے۔ اس سلسلہ میں سورہ حدید کی آیت ۲۲ کے ذیل میں زیادہ تفصیل آئی ہے۔

دل کو ہدایت کرتا ہے (اس طرح سے کہ وہ مصائب کے مقابلے میں گھٹنے نہ ٹیکے، مایوس نہ ہو اور شور و بیتابی نہ کرے) (ومن یؤمن باللہ یھد قلبہ)۔

یہ خدائی ہدایت جب انسان کے پاس آتی ہے تو وہ نعمتوں میں شاکر، مصیبتوں میں صابر اور قضائے الٰہی کے مقابلے میں سرِتسلیم خم کر دیتا ہے۔

البتہ ہدایتِ قلبی ایک وسیع معنیٰ رکھتی ہے کہ "صبر و شکر"، "رضا و تسلیم" اور "انا للہ و انا الیہ راجعون" کہنا، ان میں سے ہر ایک اس کی شاخ ہے۔ ہاں یہ جو بعض مفسرین نے خصوصیت کے ساتھ ان میں سے کسی ایک موضوع کو نقل کیا ہے، حقیقت میں وہ آیت کا پورا مفہوم نہیں بلکہ وہ واضح مصداق کا بیان ہے۔ آیت کے آخر میں فرماتا ہے۔ "خدا ہر چیز کو جانتا ہے۔" (واللہ بکل شیء علیم)۔

ممکن ہے اس تعبیر میں مصائب اور بلاؤں کے فلسفہ کی طرف اجمالی اشارہ ہو کہ خدا اپنے علم اور اپنی بے پایاں آگاہی کی وجہ سے بندوں کی تربیت، بیدار باش کے اعلان اور ہر قسم کے غرور و غفلت سے مبارزہ کے لیے کبھی کبھی ان کی زندگانی میں مصائب کو ایجاد کر دیتا ہے تاکہ وہ سوئے نہ رہیں۔ دنیا میں اپنی حیثیت کو بھول نہ جائیں اور طغیان و سرکشی کی طرف ہاتھ نہ بڑھائیں۔

* * *

چونکہ مبدء و معاد کی معرفت، جن کی گزشتہ آیات میں بنیاد رکھی گئی ہے، اس کا حتمی اثر، خدا اور پیغمبرؐ کی عین اطاعت کے لیے سعی و کوشش ہے، لہٰذا بعد والی آیت میں مزید کہتا ہے۔ "اور خدا کی اطاعت کرو اور پیغمبرؐ کی اطاعت کرو۔" (واطیعوا اللہ واطیعوا الرسول)۔

یہ بات واضح ہے کہ رسولِ خداؐ کی اطاعت بھی خدا کی اطاعت کا ہی ایک شعبہ ہے۔ کیونکہ رسول اپنی طرف سے کوئی چیز نہیں کہتا، یہاں "اطیعوا" کی تکرار اسی چیز کی طرف اشارہ ہے کہ یہ دونوں ایک دوسرے کے عرض میں نہیں ہیں بلکہ ان میں سے ایک دوسری سے قوت حاصل کرتی ہے۔ اس سے قطع نظر خدا کی اطاعت، اصول و قوانین اور تشریعِ الٰہی سے مربوط ہے۔ اس بناء پر ان میں سے ایک اصل ہے اور دوسری اس کی فرع ہے۔

اس کے بعد فرماتا ہے: "اگر تم روگردان ہو جاؤ اور اطاعت نہ کرو تو وہ تمہیں مجبور کرنے پر مامور نہیں ہے۔ کیونکہ ہمارے رسول کا وظیفہ اور ذمہ داری تو صرف واضح طور پر احکام پہنچا دینا ہے۔" (فان تولیتم فانما علیٰ رسولنا البلاغ المبین)۔[1]

---

[1] "فان تولیتم" جملہ شرطیہ ہے جس کی جزا محذوف ہے اور تقدیر میں اس طرح ہے: فان تولیتم فقد ادی وظیفتہ۔ یا۔ فان تولیتم لا یضرکم علی الایمان یا لا بأس علیہ وغیرہ۔ اگر تم روگردانی کرو تو وہ اپنی ذمہ داری پوری کر چکا ہے یا وہ تمہیں ایمان پر مجبور نہیں کرتا، یا اس کے لیے کوئی حرج نہیں ہے۔

ہاں وہ پیغام حق پہنچانے کا ذمہ دار ہے اور بس یہی اس کی ذمہ داری ہے ۔اس کے بعد تمھارا معاملہ خدا کے ساتھ ہے ، یہ تعبیر ایک قسم کی پختہ اور اجمالی تہدید ہے ۔

❊ ❊ ❊

بعد والی آیت میں توحید درعبودیت کے مسئلہ کی طرف اشارہ کرتا ہے ۔جو وجوب اطاعت کے لیے ایک دلیل کی حیثیت رکھتی ہے ۔ فرماتا ہے : "اللہ وہی ہے اور اس کے سوا اور کوئی معبود نہیں" ۔ (اللہ لا الہ الا ھو) ۔

پھر جب یہ بات ہے تو مومن کو اسی پر بھروسہ کرنا چاہیے ۔ (وعلی اللہ فلیتوکل المؤمنون) ۔

اس کے علاوہ کوئی بھی عبودیت کے لائق نہیں ہے ، کیونکہ مالکیت ، قدرت ، علم اور غنیٰ سب اسی کے لیے ہیں ۔ دوسروں کے پاس جو کچھ بھی ہے وہ اسی کی طرف سے ہے ۔ اسی وجہ سے انھیں اس کے علاوہ کسی غیر کے سامنے سر تسلیم و تعظیم خم نہیں کرنا چاہیے ، ہر قسم کی مشکل کے حل کے لیے اسی سے مدد مانگنی چاہیے اور صرف اسی پر توکل کرنا چاہیئے ۔

❊ ❊ ❊

(۱۴) يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّ مِنْ اَزْوَاجِكُمْ وَ اَوْلَادِكُمْ عَدُوًّا لَّكُمْ فَاحْذَرُوْهُمْ ۚ وَ اِنْ تَعْفُوْا وَ تَصْفَحُوْا وَ تَغْفِرُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ○

(۱۵) اِنَّمَآ اَمْوَالُكُمْ وَ اَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ ؕ وَ اللّٰهُ عِنْدَهٗٓ اَجْرٌ عَظِيْمٌ ○

(۱۶) فَاتَّقُوا اللّٰهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ وَ اسْمَعُوْا وَ اَطِيْعُوْا وَ اَنْفِقُوْا خَيْرًا لِّاَنْفُسِكُمْ ؕ وَ مَنْ يُّوْقَ شُحَّ نَفْسِهٖ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ○

(۱۷) اِنْ تُقْرِضُوا اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا يُّضٰعِفْهُ لَكُمْ وَ يَغْفِرْ لَكُمْ ؕ وَ اللّٰهُ شَكُوْرٌ حَلِيْمٌ ○

(۱۸) عٰلِمُ الْغَيْبِ وَ الشَّهَادَةِ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ○

❊ ❊ ❊

ترجمہ

(۱۴) اے ایمان لانے والو! تمھاری ازواج اور اولاد میں سے بعض تمھارے دشمن ہیں۔ ان سے بچ کے رہو، اور اگر معاف کر دو اور صرف نظر کر لو اور بخش دو (تو خدا تمھیں بخش دے گا) کیونکہ خدا بخشنے والا مہربان ہے۔

(۱۵) تمھارے اموال و اولاد تمھاری آزمائش کا ذریعہ ہیں اور عظیم جزا خدا ہی کے پاس ہے۔

(۱۶) اس لیے جہاں تک ہو سکے تقویٰ اختیار کرو اور کان دھر کے سنو اور اطاعت کرو اور انفاق کرو۔ یہ تمھارے لیے بہتر ہے اور جو لوگ اپنے بخل سے بچ جائیں وہی رست گار، کامیاب ہیں۔

(۱۷) اگر تم خدا کو قرضِ حسنہ دو گے تو وہ اسے تمھارے لیے کئی گنا کر دے گا اور تمھیں بخش دے گا اور خدا قدردان اور بُردبار ہے۔

(۱۸) وہ پنہاں و آشکار سے باخبر ہے اور وہ عزیز و حکیم ہے۔

❊ ❊ ❊

شانِ نزول

ایک روایت میں امام باقرؑ سے آیا ہے کہ آپ نے آیت "ان من ازواجکم ....." کے بارے میں فرمایا:

"اس سے مُراد یہ ہے کہ جس وقت بعض مرد ہجرت کرنا چاہتے تو ان کا بیٹا اور بیوی ان کا دامن پکڑ لیتے اور کہتے تھے: "تجھے خدا کی قسم کہ ہجرت نہ کر۔ کیونکہ اگر تو چلا گیا تو ہم تیرے بعد بے سرپرست رہ جائیں گے"۔ پھر بعض اس بات کو قبول کر لیتے اور وہ رہ جاتے تھے۔ لہٰذا اوپر والی آیت نازل ہوئی اور انھیں اس قسم کی گزارشوں کو قبول کر لینے اور اس سلسلہ میں اولاد اور بیویوں کی اطاعت کرنے سے ڈرایا، لیکن کچھ ایسے افراد بھی تھے جو بالکل پروا نہ کرتے اور چلے جاتے تھے لیکن وہ اپنے گھر والوں سے یہ کہتے تھے: "خدا کی قسم! اگر تم ہمارے ساتھ ہجرت نہیں کرو گے اور بعد میں (دارالہجرت) مدینہ میں ہمارے پاس آؤ گے تو ہم بالکل تمھاری پروا نہیں کریں گے۔ چنانچہ انھیں حکم دیا گیا کہ جس وقت ان کے گھر والے ان سے آملیں تو گذشتہ امور کو فراموش کر دیں اور وان تعفوا وتصفحوا وتغفروا فان اللہ غفور رحیم کا جملہ اسی معنی کو بیان کر رہا ہے۔[1]

❊ ❊ ❊

---

[1] "تفسیر علی ابن ابراہیم" مطابق نقل "نور الثقلین" جلد ۵ ص ۴۴۲، یہی مطلب مختصر صورت میں تفسیر "درالمنثور" اور دوسری (باقی اگلے صفحہ پر)

تفسیر

تمہارے اموال و اولاد تمہاری آزمائش کا ذریعہ ہیں۔

چونکہ گزشتہ آیات میں خدا اور اس کے رسول کی اطاعت کا حکم بلاکسی قید و شرط کے آیا تھا اور اس راستہ کے اہم موانع میں سے ایک اموال و ازواج و اولاد کے ساتھ زیادہ لگاؤ ہے۔ لہٰذا زیر بحث آیات میں مسلمانوں کو اس سلسلہ میں خبردار کرتے ہوئے پہلے کہتا ہے: "اے ایمان لانے والو! تمہاری ازواج اور اولاد میں سے بعض تمہارے دشمن ہیں ان سے بچ کے رہو" (یاایھا الذین اٰمنوا ان من ازواجکم و اولادکم عدوًا لکم فاحذروھم)۔

یقیناً اس عداوت کی نشانیاں کم نہیں ہیں، جب تم یہ چاہتے ہو کہ ہجرت جیسے کسی مثبت کام کو انجام دو تو وہ تمہارا دامن پکڑ لیتے ہیں اور اس فیضِ عظیم میں رکاوٹ بنتے ہیں۔ نیز بعض اوقات تمہاری موت کا انتظار کرتے رہتے ہیں تاکہ تمہاری دولت کے مالک بن جائیں اور۔ اسی قسم کی دوسری باتیں بھی ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ نہ تو تمام اولاد اور نہ ہی تمام بیویاں ایسی ہوتی ہیں۔ اسی لیے 'من' تبعیضیہ کے ذریعے اس معنی کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ ان میں سے بعض ایسے ہیں لہٰذا تم ان سے بچ کے رہو۔

البتہ یہ دشمنی کبھی دوستی کے لباس میں اور خدمت کے گمان میں ہوتی ہے۔ کبھی سچ مچ بُری نیت اور عداوت و دشمنی کے ارادہ سے انجام پاتی ہے یا اپنے منافع کی غرض سے ہوتی ہے۔

اہم بات یہ ہے کہ جب انسان دوراہے پر کھڑا ہوتا ہے جن میں سے ایک راستہ تو خدا کی طرف اور دوسرا بیوی اور اولاد کی طرف ہوتا ہے اور یہ دونوں کبھی ایک دوسرے سے الگ ہو جائیں تو پھر ضروری ہے کہ ارادہ و تصمیم کرتے وقت شک و تردّد کو اپنے اندر راہ نہ دے۔ بلکہ حق تعالیٰ کی رضا کو ہر چیز پر مُقدّم شمار کرے۔ کیونکہ دُنیا و آخرت کی نجات اسی میں ہے۔

اسی لیے سورہ توبہ آیت ۲۳ میں آیا ہے: یاایھا الذین اٰمنوا لا تتخذوا اٰباءکم و اخوانکم اولیاء ان استحبوا الکفر علی الایمان ومن یتولھم منکم فاولٰئک ھم الظالمون۔ "اے ایمان لانے والو اگر تمہارے آباؤ اجداد اور بھائی بند کفر کو ایمان پر مقدم شمار کریں تو تم انھیں اپنا دوست نہ بناؤ، وہ ظالم و ستمگر ہیں۔

چونکہ یہ ممکن ہے کہ یہ حکم آباؤ اجداد، شوہروں اور ازواج کی طرف سے خشونت، انتقام جوئی اور افراط کا بہانہ بن جائے، لہٰذا اسی آیت کے ذیل میں بلافاصلہ ان کے اعتدال میں رہنے کے لیے فرماتا ہے: "اور اگر تم معاف کر دو۔

(بقیہ صفر سابقہ) تفاسیر میں ابن عباس سے نقل ہوا ہے۔ لیکن کسی میں بھی مذکورہ بالا حدیث جیسی جامعیت نہیں ہے۔

صرف نظر کرلو اور بخش دو تو خدا بھی تمھیں اپنے عفو و رحمت کا مورد قرار دے گا۔ کیونکہ خدا غفور و رحیم ہے"۔ (و ان تعفوا و تصفحوا و تغفروا فان اللہ غفور رحیم)۔

اس بناء پر اگر وہ اپنے عمل سے پشیمان ہو جائیں اور عذر خواہی کریں یا ہجرت کے بعد تم سے آملیں تو انھیں اپنے آپ سے دور نہ کرو، اور عفو و درگزر کو اختیار کرو جیسا کہ تم توقع رکھتے ہو کہ خدا بھی تمھارے ساتھ ایسا ہی سلوک کرے۔

"بی بی عائشہ" کی داستان افک کے متعلق سورہ نور کی تفسیر میں آیا ہے: جب مدینہ میں چرچا کرنے والوں کا کام اونچا چلا گیا تو بعض مومنین کہ جن کے رشتہ دار یہ چرچا کرنے والوں میں سے تھے، انھوں نے یہ قسم کھالی، کہ انھیں کوئی مالی امداد نہیں دیں گے۔ تب اسی سورۂ نور کی آیت ۲۲ نازل ہوئی: "وہ لوگ جو مالی برتری اور زندگی میں وسعت رکھتے ہیں انھیں یہ قسم نہیں کھانی چاہیئے کہ وہ اپنے عزیزوں، حاجت مندوں اور راہِ خدا میں ہجرت کرنے والوں پر خرچ کرنے سے باز رہیں۔ انھیں چاہیئے کہ عفو و درگزر اور صرف نظر کریں"۔ الا تحبون ان یغفر اللہ لکم "کیا تم یہ نہیں چاہتے کہ خدا تمھیں بخش دے"۔

اس بارے میں کہ 'عفو' 'صفح' اور 'غفران' کے درمیان کیا فرق ہے؟ ان کے لغوی مفہوم کی طرف توجہ کرنے سے واضح ہو جاتا ہے کہ یہ بخشش گناہ کے مراتب کے سلسلہ کو بیان کرتا ہے۔ کیونکہ 'عفو' سزا سے صرف نظر کرنے کے معنی میں ہے، اور 'صفح' اس سے بالاتر مرتبہ ہے، یعنی ہر قسم کی سرزنش کو ترک کرنا۔ اور 'غفران' گناہ کی پردہ پوشی اور اسے فراموش کر دینے کے معنی میں ہے۔

اس طرح اہلِ ایمان کو اپنے اصول اعتقاد کی قطعی حفاظت کرتے ہوئے۔ اس اولاد اور بیوی کے سامنے جو انہیں راہِ خطا کی دعوت دیتے ہیں، سر تسلیم خم نہ کرتے ہوئے جتنا ہو سکے تمام مراحل میں محبت اور عفو و درگزر سے دریغ نہیں کرنا چاہیئے، کیونکہ یہ باتیں ان کی تربیت اور انھیں خدا کی اطاعت کی طرف لوٹانے کا ایک ذریعہ ہیں۔

❖ ❖ ❖

بعد والی آیت میں ایک اور اصل کلی کی طرف یعنی اموال اور اولاد کے بارے میں اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے: "تمھارے اموال اور اولاد تمھاری آزمائش کا ایک ذریعہ ہیں"۔ (انما اموالکم و اولادکم فتنۃ)۔

اگر تم اس آزمائش کے میدان میں کامیاب ہو جاؤ تو "اللہ کے ہاں (تمھارے لیے) عظیم اجر و پاداش ہے"۔ (واللہ عندہ اجر عظیم)۔

گزشتہ آیت میں انسان کے لیے صرف "بعض" بیویوں اور اولاد کی عداوت کی گفتگو تھی، جو اُسے خدا کی اطاعت کے راستے سے منحرف کر کے گناہ اور بعض اوقات کفر کی طرف کھینچ لے جاتے ہیں۔ لیکن یہاں تمام اولاد اور اموال کی بات ہو رہی ہے کہ وہ انسان کی آزمائش کا ایک ذریعہ ہیں۔

درحقیقت خدا انسان کی تربیت کے لیے ہمیشہ اُسے امتحان کی گرم بھٹی میں ڈال دیتا ہے اور مختلف امور

کے ساتھ اس کو آزماتا ہے۔ لیکن یہ دونوں (اموال و اولاد) اس کے امتحان کے اہم ترین وسائل ہیں کیونکہ ایک طرف سے ایمان کی کشش اور دوسری طرف سے اولاد سے لگاؤ، انسان میں اس قسم کی قوی کشش پیدا کر دیتے ہیں، ایسے مواقع پر جب خدا کی رضا ان کی رضا سے جُدا ہو جاتی ہے تو انسان سخت فشار اور دباؤ میں ہوتا ہے۔

"انما" کی تعبیر جو عام طور پر حصر کے لیے لائی جاتی ہے اس بات کی نشان دہی کرتی ہے کہ یہ دونوں موضوع دوسری ہر چیز سے زیادہ امتحان کا ذریعہ ہیں۔ اسی بنا پر امیرالمومنینؑ نے فرمایا:۔

لا یقولن احدکم "اللّٰھم انی اعوذبک من الفتنۃ" لانہ لیس احد الا و ھو مشتمل علی فتنۃ ، ولکن من استعاذ فلیستعذ من مضلات الفتن فان اللہ سبحانہ یقول : واعلموا انما اموالکم و اولادکم فتنۃ"

"تم میں سے کوئی شخص یہ نہ کہے کہ خداوندا! میں تجھ سے امتحان و آزمائش سے پناہ مانگتا ہوں، کیونکہ ہر شخص کے پاس آزمائش کا ذریعہ ہوتا ہے (اور کم از کم اس کے پاس مال و اولاد ہوتے ہیں۔ اور اصولی طور پر دُنیا کی زندگی کا مزاج، آزمائش اور امتحان کی کھٹالی ہے) لیکن جو شخص یہ چاہتا ہے کہ خدا سے پناہ لے تو وہ گمراہ کرنے والے امتحانوں سے پناہ لے۔ کیونکہ خدا کہتا ہے: "جان لو کہ تمھارے اموال و اولاد آزمائش کا ایک ذریعہ ہیں"۔ [1]

یہی مطلب تھوڑے سے فرق کے ساتھ سورہ انفال کی آیت ۲۸ میں بھی نظر آتا ہے (جو کچھ امیرالمومنین علیؑ کے کلام اور اوپر والی روایت کے ذیل میں بیان ہُوا ہے، وہی تعبیر ہے جو سورۃ انفال میں آئی ہے غور کیجیے۔)

اس موقع پر بہت سے مفسرین اور محدثین نے نقل کیا ہے کہ ایک دن رسُولِ خداؐ منبر پر خطبہ دے رہے تھے۔ حسن و حسین علیہما السلام، جو ان دنوں بچے تھے، مسجد میں وارد ہوئے۔ انھوں نے سُرخ رنگ کے کپڑے پہنے ہُوئے تھے اور چلتے چلتے کبھی پھسل کر گر جاتے تھے۔ جونہی رسُولِ خداؐ کی نگاہ ان پر پڑی تو خطبہ چھوڑ دیا اور منبر سے اُتر کر انھیں اپنی آغوش میں لے لیا، پھر ان کو منبر پر لے گئے اور اپنی گود میں بٹھا کر فرمایا: "خدا نے عزوجل نے درست فرمایا کہ جو کہتا ہے: "انما اموالکم و اولادکم فتنۃ"۔ جب میری نظر ان دونوں بچوں پر پڑی اور میں نے دیکھا کہ وہ چلتے چلتے پھسل جاتے ہیں تو مجھ سے نہ رہا گیا اور میں نے اپنی گفتگو کو چھوڑ کر انھیں اٹھا لیا"۔ اس کے بعد آپ نے اپنے خطبہ کو جاری کیا۔ [2]

---

[1] نہج البلاغہ، کلمات قصار جملہ ۹۳

[2] "مجمع البیان جلد ۱۰ ص ۳۰۱ (زیر بحث آیت کے ذیل میں)، اسی حدیث کو تفسیر قرطبی، روح المعانی، فی ظلال قرآن اور المیزان میں بھی مختصر اختلاف کے ساتھ نقل کیا گیا ہے۔

اس بات پر توجہ رکھنی چاہیے کہ فتنہ اور آزمائش کبھی تو خیر کی اور کبھی شر کی آزمائش ہوتی ہے۔ یہاں ممکن ہے خیر کی آزمائش مُراد ہو اس معنی میں کہ خدا چاہتا ہے اپنے پیغمبرؐ کو آزمائے۔ کیا ایسا ہو سکتا ہے کہ وہ منبر پر خطبہ دیتے وقت ان دونوں شہزادوں کی حالت سے غافل ہو جائے جو جگر گوشہ زہراؑ ہیں اور ان سے ہر ایک آئندہ بلند مقام پر فائز ہونے والا ہے۔ یا خطبہ کا جلال و شوکت، محبت و عاطفت کے اظہار میں مانع تو نہیں ہوتا۔ ورنہ مُسلّمہ طور پر پیغمبرؐ بچوں کی محبت کی بنا پر ہرگز خدا کی یاد اور تبلیغ و ہدایت کی بھاری ذمہ داریوں کے انجام دینے سے غافل نہیں ہوئے تھے۔

بہرحال پیغمبرؐ کا یہ عمل تمام مسلمانوں کے لیے ایک تنبیہ تھا کہ وہ علیؑ اور فاطمہؑ کے ان دونوں شہزادوں کی قدر و منزلت اور حیثیت کو پہچانیں۔

اسی لیے ایک حدیث میں جو اہلِ سُنّت کے مشہور منابع میں نقل ہوئی ہے یہ آیا ہے کہ "براء بن عازب" (مشہور صحابی) یہ کہتا ہے:

"رأیت الحسن بن علی علیٰ عاتق النبی صلی اللہ علیہ و آلہ وھو یقول:
اللّٰھم انی احبہ فاحبہ"

"میں نے حسنؑ بن علیؑ کو پیغمبرؐ کے دوش پر دیکھا جب کہ آپ فرما رہے تھے: خدایا میں اسے دوست رکھتا ہوں۔ تو بھی اسے دوست رکھ"۔[1]

دوسری روایات میں آیا ہے کہ بعض اوقات حسینؑ آتے اور سجدہ کی حالت میں پیغمبرؐ کے دوش پر سوار ہو جاتے اور حضرت انھیں نہ روکتے۔[2]

چنانچہ یہ سب احادیث ان دو عظیم اماموں کے مقام کی عظمت کو بیان کرتی ہیں۔

* * *

بعد والی آیت میں نتیجہ کے عنوان سے فرماتا ہے: "اب جبکہ ایسا ہے تو جتنا بھی تم سے ہو سکتا ہے تقوائے الٰہی اختیار کرو، اس کے فرامین کو سنو اور اطاعت کرو اور اس کی راہ میں انفاق کرو، یہ تمھارے لیے بہتر ہے": (فاتقوا اللہ ما استطعتم واسمعوا واطیعوا وانفقوا خیرًا لانفسکم)۔

پہلے گناہوں سے اجتناب کرنے کا حکم دیتا ہے (کیونکہ تقویٰ کی زیادہ تر نظر گناہ سے اجتناب کرنے کی طرف ہے) اس کے بعد اطاعت کرنے کا حکم اور سننے کا فرمان جو اطاعت کا مقدمہ ہے۔ پھر اطاعتوں میں سے خصوصیت کے ساتھ، مسئلہ انفاق پر تکیہ کرتا ہے جو خدا کی اہم ترین آزمائشوں میں سے ہے۔ انجام کار کہتا ہے کہ ان سب باتوں

---

[1] صحیح مسلم جلد ۴ ص ۱۸۸۳ (باب فضائل الحسن والحسین علیہما السلام حدیث ۸۵)

[2] بحار جلد ۴۳ ص ۲۹۶ حدیث ۵۷

کا فائدہ خود تمھیں کو ہے۔

بعض مفسرین نے خیرًا کی تفسیر مال سے کی ہے جو مثبت کاموں کے انجام دینے کا ایک ذریعہ ہے۔ جیسا کہ آیۂ وصیت میں بھی اسی معنی میں آیا ہے: کتب علیکم اذا حضر احدکم الموت ان ترک خیرًا الوصیۃ للوالدین والاقربین بالمعروف: تم پر واجب ہے کہ جب تم میں سے کسی کی موت کا وقت آجائے تو اگر وہ اپنی طرف سے یادگار کے طور پر خیر چھوڑ جائے تو ماں باپ اور قریبی رشتہ داروں کے لیے شائستہ طور پر وصیت کر جائے۔ (البقرۃ: ۱۸۰)

بہت سے مفسرین نے خیر کی ایک وسیع معنی میں بھی تفسیر کی ہے اور اسے "انفاق" کی قید سے مقید نہیں سمجھا ہے بلکہ اسے آیت سے مربوط سمجھا اور انھوں نے اس بارے میں یہ کہا ہے: "اس سے مراد یہ ہے کہ ان تمام احکام کی اطاعت خود تمھارے ہی فائدے میں ہے۔ (یہ تفسیر زیادہ مناسب نظر آتی ہے)[1]

اس نکتہ کا ذکر کرنا بھی ضروری ہے کہ طاقت کے مطابق تقویٰ کا حکم سورہ آل عمران کی آیت ۱۰۲ سے کوئی منافات نہیں رکھتا۔ جو یہ کہتی ہے: اتقوا اللہ حق تقاتہ "جیسا کہ تقویٰ اور پرہیزگاری کا حق ہے ویسا ہی خدا سے ڈرو" بلکہ یہ دونوں حکم ایک دوسرے کی تکمیل کرتے ہیں۔ کیونکہ ایک جگہ کہتا ہے: "جتنی تم میں طاقت ہے اتنا تقویٰ اختیار کرو" اور دوسری جگہ کہتا ہے: "تقویٰ کا حق ادا کرو"۔ مسلّم ہے کہ تقویٰ کا حق ادا کرنا، انسان کی قدرت اور توانائی کی مقدار پر منحصر ہے، کیونکہ تکلیف ما لایطاق کا کوئی معنی نہیں، اور ہدف و مقصد یہ ہے کہ انسان اس راستے میں اپنی آخری کوشش کو کام میں لائے۔

اس بناء پر جن لوگوں نے زیر بحث آیت کو آل عمران کی آیت کا ناسخ سمجھا، وہ غلطی پر ہیں۔

اس آیت کے آخر میں مسئلہ انفاق پر تاکید کے عنوان سے فرماتا ہے: "جو لوگ اپنے بخل اور حرص سے بچ جائیں وہی رستگار و کامیاب ہیں"۔ (ومن یوق شح نفسہ فاولئک ھم المفلحون)۔

"شح" بخل کے معنی میں ہے جو حرص سے توأم ہو، جیسا کہ ہم جانتے ہیں کہ یہ دو صفاتِ رذیلہ، انسان کی نجات کے سخت ترین مانع اور انفاق اور کارِ خیر کی راہ میں بہت بڑی رکاوٹ ہیں۔ اگر انسان لطفِ الٰہی کا دامن تھام لے، اپنے پورے وجود کے ساتھ اس کی طلب کرے، خود سازی اور تہذیبِ نفس کی کوشش کرے اور ان دونوں صفاتِ رذیلہ سے نجات حاصل کرلے تو پھر اس نے اپنی سعادت کی ضمانت حاصل کرلی ہے۔

اگرچہ بعض روایات میں امام جعفر صادق[2] سے آیا ہے:

"من ادی الزکوٰۃ فقد وقی شح نفسہ"

"جس شخص نے زکوٰۃ ادا کردی اس نے بخل اور حرص سے رہائی پالی۔"

---

[1] پہلی تفسیر کی بناء پر "خیرًا" (انفقوا) کا مفعول ہے اور دوسری تفسیر کے مطابق ایک فعل مقدر کی خبر ہے اور تقدیر میں اس طرح تھا۔ لیکن خیرًا لکم

[2] مجمع البیان جلد ۱۰ ص ۳۰۱

ایک اور حدیث میں آیا ہے کہ امام جعفر صادقؑ شام سے صبح تک خانۂ خدا کا طواف بجا لاتے اور یہ فرماتے رہتے تھے :

"اللھم قِ شح نفسی"

"خداوندا! مجھے میرے حرص و بخل سے بچا"۔

آپ کے اصحاب میں سے ایک نے عرض کیا : "میں آپ پر قربان جاؤں۔ آج رات میں نے اس دعا کے علاوہ اور کچھ نہیں سنا، کوئی اور دعا بھی کیجئے"۔ آپ نے فرمایا :

"نفس کے بخل اور حرص سے بڑھ کر اور کون سی چیز زیادہ خطرناک ہے، جبکہ خدا فرماتا ہے" :

"ومن یوق شح نفسہ فاولئك ھم المفلحون" [1]

❖ ❖ ❖

اس کے بعد انفاق کرنے کی تشویق اور نفس کو بخل و شح سے روکنے کے لیے فرماتا ہے : "اگر تم خدا کو قرضِ حسنہ دو گے تو وہ اسے کئی گنا کر دے گا اور تمہیں بخش دے گا اور خدا قدردان اور بُردبار ہے" : (ان تقرضوا اللہ قرضًا حسنًا یضاعفہ لکم ویغفرلکم واللہ شکور حلیم)۔

کتنی عجیب تعبیر ہے کہ جسے قرآن مجید میں "انفاق فی سبیل اللہ" کے بارے میں بارہا دُہرایا گیا ہے۔ وہ خدا جو ہمارے وجود کی اصل و فرع کا پیدا کرنے والا، تمام نعمتوں کا بخشنے والا اور تمام مکیتوں کا مالک ہے، وہ ہم سے قرض طلب کرتا ہے پھر اس کے مقابلے میں "اجرِ مضاعف" اور بخشش کا وعدہ دیتا اور ہمارا شکریہ بھی ادا کرتا ہے۔ اس سے بالاتر کسی لطف و محبت کا تصور ہو ہی نہیں سکتا اور اس سے بڑھ کر بزرگواری اور رحمت ممکن ہی نہیں ہے۔ ہم کیا ہیں اور ہمارے پاس کیا ہے کہ ہم اس کو قرض دیں؟ اور سب سے انوکھی بات یہ کہ ہم یہ سب عظیم اجر و ثواب کیوں لیں گے۔

کیا یہ سب کچھ ایک طرف سے مسئلہ انفاق کی اہمیت اور دُوسری طرف سے خدا کا بندوں کے بارے میں لطفِ بے پایاں نہیں ہے؟

"قرض" اصل میں قطع کرنے اور کاٹنے کے معنی میں ہے۔ اور جب لفظ حسن کے ساتھ ہو تو مال کو اپنے سے جدا کرنے اور راہِ خیر میں دینے کے معنی میں ہے۔

"یضاعفہ" "ضعف" (بروزن شعر) کے مادہ سے ہے۔ جیسا کہ ہم نے پہلے بھی بیان کیا ہے کہ یہ صرف دوگنا کے معنی میں نہیں بلکہ کئی گنا کے معنی بھی دیتا ہے۔ یہ لفظ انفاق کے بارے میں سات سو گنا تک، بلکہ اس سے زیادہ کے لیے بھی قرآن میں آیا ہے۔ (بقرۃ۔ ۲۶۱)

---

[1] نور الثقلین جلد ۵ ص ۳۴۶

ضمنی طور پر یغفرلکم کا جملہ اس بات کی دلیل ہے کہ انفاق گناہ کی بخشش کے بہت سے عوامل میں سے ایک ہے۔

شکور کی تعبیر کہ جو خدا کی ایک صفت ہے۔ اس بات کی دلیل ہے کہ خدا اپنے بندوں کا عظیم اجروں اور ثوابوں کے ذریعے شکریہ ادا کرتا ہے۔ نیز اس کا "حلیم" ہونا گناہوں کی بخشش اور بندوں کو سزا دینے میں جلدی نہ کرنے کی طرف اشارہ ہے۔

* * *

یہاں تک کہ آخری آیت میں فرماتا ہے: "وہ پنہاں و آشکار سے آگاہ اور قادر و حکیم ہے: (عالم الغیب والشہادۃ العزیز الحکیم)۔

وہ بندوں کے اعمال اور خصوصاً ان کے پنہاں و آشکار انفاق سے باخبر ہے۔ اگر وہ ان سے قرض کا تقاضا کرتا ہے تو یہ احتیاج و نیاز اور عدم قدرت کی وجہ سے نہیں۔ بلکہ کمال لطف و محبت کی وجہ سے ہے۔ اگر وہ ان کے انفاق کے مقابلہ میں ان تمام اجروں اور ثوابوں کا وعدہ دیتا ہے تو یہ بھی اس کی حکمت کا مقتضیٰ ہے۔

اس طرح خدا کے پنجگانہ اوصاف کہ جن کی طرف اس آیت اور اس سے پہلی آیت میں اشارہ ہوا ہے، یہ سب خدا کی راہ میں انفاق کے مسئلہ کے ساتھ ایک قسم کا ربط رکھتے ہیں۔ لیکن خدا کی ان پانچ صفات کی طرف توجہ۔ انفاق کی تشویق کے مسئلہ کے علاوہ انسان کو کلی طور پر پروردگار کی اطاعت اور گناہ سے رکنے میں زیادہ مصمم بناتی ہے اور اس کو قوت قلب، ارادہ کی طاقت اور روح تقویٰ بخشتی ہے۔

* * *

ایک نکتہ

ایک پُرمعنی حدیث

ایک حدیث میں پیغمبر گرامیؐ سے آیا ہے:

"ما من مولود یولد الا فی شبابیۃ رأسہ مکتوب خمس آیات من سورۃ التغابن"

"کوئی نومولود متولد نہیں ہوتا مگر یہ کہ اس کے سر کے مشکوں (جالیوں) پر سورۃ تغابن کی پانچ آیتیں لکھی ہوئی ہوتی ہیں"۔[1]

ممکن ہے اس سورہ کی یہی آخری آیات مراد ہوں جو اموال اور اولاد کے بارے میں گفتگو کرتی ہیں۔ ان پانچ

---

[1] روح البیان جلد ۱۰ ص ۲۴

آیات کا سر کی جالیوں پر لکھا جانا اس مسئلہ کے حتمی ہونے کی طرف اشارہ ہے یعنی ان آیات کا مضمون تمام اولادِ آدم کے لیے بغیر کسی استثناء کے مطلق ہے۔

"شبابیک" "شباک" (بروزن خفاش) کی جمع ہے۔ (شبک) جالی کے معنیٰ میں ممکن ہے سر کی ان ہڈیوں کی کی طرف اشارہ ہو جن کے ٹکڑے ایک دوسرے میں گھسے ہوئے ہوتے ہیں یا دماغ کی جالیوں کی طرف اشارہ ہو۔ بہرحال یہ انسان میں ان روحیات وخصوصیات کے موجود ہونے کی دلیل ہے۔

❊ ❊ ❊

خداوندا! مال و اولاد اور بیویوں کی اس عظیم آزمائش میں ہماری مدد فرما۔

پروردگارا! ہمیں بخل، حرص اور شح نفس سے دور رکھ! کیونکہ جسے تو ان سے دور رکھے گا وہی اہل نجات اور رستگار ہیں۔

بارالٰہا! تو ہمیں قیامت کے دن میں جب گنہگار بندوں کا غبن اور نقصان ظاہر ہو جائے گا، اپنے لطف کے دامن میں اس تغابن سے بچائے رکھ۔ آمین یارب العالمین۔

❊ ❊ ❊

سورہ تغابن کا اختتام

۲۲ رمضان المبارک ۱۴۰۶ھ

اختتام ترجمہ

۲۸، ذیقعدہ ۱۴۰۷ھ مطابق ۲۵ جولائی ۱۹۸۷

بروز ہفتہ صبح پونے پانچ بجے، ۸۱، ای

ماڈل ٹاؤن لاہور

سورۂ طلاق

یہ سورہ مدینہ میں نازل ہوا اور اس کی ۱۲ آیات ہیں۔

آغاز ترجمہ

۲۲ رمضان المبارک ۱۴۰۶ھ

سورۂ طلاق کے مضامین

اہم ترین مسئلہ جو اس سورہ میں پیش کیا گیا ہے، جیسا کہ اس سورہ کے نام سے ظاہر ہے، وہ مسئلہ طلاق، اس کے احکام وخصوصیات اور اس کے نتائج ہیں۔ اس کے بعد مبدء ومعاد، پیغمبرؐ کی نبوت اور بشارت و نذارت کے مباحث بیان کئے گئے ہیں۔

اس طرح اس سورہ کے مضامین کو دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے:

پہلا حصہ: اس سورہ کی پہلی سات آیات ہیں، جو طلاق اور اس سے مربوط مسائل کے بارے میں گفتگو کرتی ہیں۔ ان میں اس مسئلہ کی جزئیات کو مختصر اور پُرمعنی عبارتوں میں دقیق اور لطیف انداز میں اس طرح پیش کیا گیا ہے کہ انسان انھیں دیکھ کر خود کو اس موضوع میں پورے طور پر مستغنی سمجھتا ہے۔

دوسرا حصہ: جو حقیقت میں پہلے حصہ کے اجراء کا سبب ہے، خدا کی عظمت، اس کے رسولؐ کے مقامِ عظمت، صالحین کے اجر وثواب اور بدکاروں کی سزا وعذاب کے بارے میں بحث کرتا ہے۔ نیز اس اہم اجتماعی مسئلہ کے اجراء کی ضمانت کے طور پر ایک منظم محکم قاعدہ پیش کرتا ہے۔ ضمناً یہ سورہ ایک دوسرا نام بھی رکھتا ہے اور وہ سورہ نساء قصریٰ (بروزن ومعنی صغریٰ) مشہور سورہ نساء کے مقابلہ میں ہے، جو "نساء کبریٰ" ہے۔

* * *

تلاوت کی فضیلت

ایک حدیث میں پیغمبرؐ اکرم سے آیا ہے:

"من قرأ سورة الطلاق مات علیٰ سنة رسول الله صلی الله علیه وآله"

"جو شخص سورہ طلاق کو پڑھے (اور اسے اپنی زندگی کے امور میں اپنائے اور اس پر کاربند رہے) وہ دنیا سے سنتِ پیغمبرؐ پر جائے گا۔" [1]

* * *

---

[1] مجمع البیان جلد ۱۰ ص ۳۰۲

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

① يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ اِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَطَلِّقُوْهُنَّ لِعِدَّتِهِنَّ وَاَحْصُوا الْعِدَّةَ ۚ وَاتَّقُوا اللّٰهَ رَبَّكُمْ ۚ لَا تُخْرِجُوْهُنَّ مِنْۢ بُيُوْتِهِنَّ وَلَا يَخْرُجْنَ اِلَّآ اَنْ يَّاْتِيْنَ بِفَاحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ ۚ وَتِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ ۚ وَمَنْ يَّتَعَدَّ حُدُوْدَ اللّٰهِ فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَهٗ ۚ لَا تَدْرِيْ لَعَلَّ اللّٰهَ يُحْدِثُ بَعْدَ ذٰلِكَ اَمْرًا ○

❖ ❖ ❖

ترجمہ

رحمٰن ورحیم خدا کے نام سے۔

① اے پیغمبرؐ! جب تم عورتوں کو طلاق دینا چاہو تو عدت کے زمانہ میں طلاق دو۔ (وہ زمانہ جب وہ ماہانہ عادت سے پاک ہوگئی ہو اور مرد نے اپنی بیوی سے نزدیکی نہ کی ہو) اور عدّت کا حساب رکھو اور اس خدا سے ڈرتے رہو جو تمھارا پروردگار ہے۔ نہ تو تم انھیں ان کے گھروں سے باہر نکالو اور نہ وہ (عدت کے دوران) باہر جائیں۔ سوائے اس صورت کے کہ وہ ظاہر بظاہر کوئی برا کام انجام دیں۔ یہ اللہ کی حدود ہیں اور جو شخص حدود الٰہی سے تجاوز کرتا ہے تو وہ خود اپنے ہی اوپر ظلم کرتا ہے۔ تو نہیں جانتا، شاید خدا اس کے بعد کوئی اور نئی وضع (اور اصلاحی ذریعہ) فراہم کر دے۔

❖ ❖ ❖

تفسیر

طلاق اور علیحدگی کی شرائط

ہم بیان کر چکے ہیں کہ اس سورہ کی اہم ترین بحث وہی طلاق کے بارے میں ہے کہ جو اس کی پہلی آیت سے شروع ہو رہی ہے۔ مسلمانوں کے عظیم پیشوا و رہبر کے عنوان سے "روئے سخن پیغمبرؐ اسلام کی طرف کیا، اور اس کے بعد ایک عمومی حکم جمع کے صیغہ کے ساتھ بیان کرتے ہوئے فرماتا ہے: "اے پیغمبرؐ! جب تم عورتوں کو طلاق دینا چاہو تو انھیں عدت کے زمانہ میں طلاق دو"۔ (یاایھا النبی اذا طلقتم النساء فطلقوھن لعدتھن)۔

یہ ان پانچ احکام میں سے پہلا حکم ہے جو اس آیت میں آئے ہیں جیسا کہ مفسرین نے اس سے استفادہ کیا۔ اس سے مراد یہ ہے کہ صیغۂ طلاق ایسے زمانہ میں جاری کیا جائے جب عورت اپنی ماہانہ عادت سے پاک ہو گئی ہو اور اپنے شوہر سے اس کی نزدیکی نہ ہوئی ہو۔ کیونکہ سورہ بقرۃ کی آیت ۲۲۸ کے مطابق عدت طلاق "ثلاثۃ قروء" (تین مرتبہ پاک ہونے) کی مقدار میں ہونی چاہیے۔ اب یہاں یہ تاکید کرتا ہے کہ طلاق عدت کے آغاز کے ساتھ ہو۔ اور یہ اس صورت میں ممکن ہے کہ جب طلاق پاکیزگی کی حالت میں اختلاطِ جنسی کے بغیر متحقق ہو۔ اگر طلاق حیض کے زمانہ میں واقع ہو جائے تو عدت کے زمانہ کا آغاز، طلاق کے آغاز سے جدا ہو جائے گا۔ اور عدت کا آغاز پاک ہونے کے بعد ہو گا۔

اسی طرح سے اگر عورت ایسی طہارت کی حالت میں ہو کہ اس نے اپنے شوہر سے نزدیکی کی اور جدا ہونا مسلم ہوا ہو، کیونکہ اس قسم کی پاکیزگی اختلاط جنسی کی بناء پر رحم میں نطفہ کے نہ ہونے کی دلیل نہیں ہے۔ (غور کیجیے)۔

بہرحال یہ طلاق کی پہلی شرط ہے۔

متعدد روایات میں پیغمبر گرامیؐ سے نقل ہوا ہے کہ:

"جب کوئی شخص اپنی بیوی کو اس کی ماہانہ عادت میں طلاق دے تو اس طلاق کی پروا نہیں کرنی چاہیے اور پلٹ آنا چاہیئے۔ یہاں تک کہ عورت پاک ہو جائے"۔ اس کے بعد اگر وہ طلاق دینا چاہتا ہے تو دے دے"۔ [1]

یہی مطلب روایات اہل بیتؑ میں بھی بارہا بیان ہوا۔ یہاں تک کہ آیت کی تفسیر کے عنوان سے بھی ذکر ہوا ہے۔ [2]

اس کے بعد دوسرے حکم کو۔ جو عدت کا حساب رکھنے کا مسئلہ ہے، پیش کرتے ہوئے فرماتا ہے: "عدت

---

[1] یہ روایات کتاب "الطلاق" صحیح مسلم جلد ۲ میں صفحہ ۱۰۹۳ کے بعد نقل ہوئی ہیں۔ [2] وسائل الشیعہ جلد ۱۵ ص ۳۴۸ "باب کیفیۃ طلاق العدۃ"

کا حساب رکھو۔" (واحصوا العدّۃ)۔

غور کے ساتھ ملاحظہ کیجیے کہ عورت تین مرتبہ اپنی پاکیزگی کے دن ختم کرے اور ماہانہ عادت دیکھے، جب تیسرا دورِ پاکیزگی ختم ہو اور تیسری ماہانہ عادت میں داخل ہو تو اس کے ایّامِ عدّت کی مُدّت آخر کو پہنچی اور ختم ہوئی۔

اگر اس امر میں غور نہ کیا جائے تو ممکن ہے کہ عدّت کا دَور ضروری مقدار سے زیادہ شمار ہو جائے اور عورت کو کچھ ضرر اور نقصان پہنچے، کیونکہ یہ چیز اُسے نئے نکاح اور ازدواج سے مانع ہو گی۔ اگر یہ مُدّت کمتر ہو تو عدّت کے اصلی ہدف کی رعایت نہیں ہو گی کہ جو پہلے ازدواج کے حریم کی حفاظت اور انعقادِ نطفہ کا مسئلہ ہے۔

"احصوا"، "احصاء" کے مادہ سے شمار کرنے کے معنی میں ہے، اور اصل میں "حصی" سے لیا گیا ہے جس کے معنی سنگریزہ کے ہیں۔ کیونکہ قدیم زمانہ میں بہت سے لوگ جبکہ وہ پڑھنے لکھنے سے آشنا نہیں تھے، مختلف موضوعات کا حساب کتاب سنگریزوں کے ذریعے رکھتے تھے۔

قابلِ توجہ بات یہ ہے: عدّت کا حساب ۔۔۔ کے مخاطب مرد ہیں، اس کی وجہ ہے کہ نفقہ اور مسکن کا مسئلہ ان کے ذمہ ہے۔ اسی طرح حقِ رجوع بھی انہیں کو حاصل ہے ورنہ عورتیں بھی مؤنث ہیں کہ وہ اپنی ذمہ داری کے واضح ہونے کے لیے پورے غور کے ساتھ عدّت کا حساب رکھیں۔

اس حکم کے بعد تمام لوگوں کو تقویٰ اور پرہیزگاری کی دعوت دیتے ہوئے فرماتا ہے: "اس خُدا سے ڈرو جو تمھارا پروردگار ہے اور تقویٰ نثار کرو" (واتقوا اللہ ربکم)۔

وہ تمھارا پروردگار اور مُربّی ہے اور اس کے احکام تمھاری سعادت کے ضامن ہیں۔ اِس بناء پر اس کے فرامین پر کاربند ہو جاؤ، اور اس کی نافرمانی سے پرہیز کرو۔ خصوصاً طلاق اور عدّت کا حساب رکھنے میں دقّت سے کام لو۔

اس کے بعد تیسرے اور چوتھے حکم کے بارے میں، جن میں سے ایک شوہروں اور دوسرا بیویوں سے مربوط ہے۔ فرماتا ہے: "تم انھیں ان کے گھروں سے نہ نکالو، اور وہ بھی عدّت کے دوران گھروں سے باہر نہ نکلیں" (لا تخرجوھن من بیوتھن ولا یخرجن)۔

اگرچہ بہت سے بے خبر اس حکمِ اسلامی کو طلاق کے وقت اصلاً جاری نہیں کرتے اور محض صیغۂ طلاق کے جاری ہوتے ہی مرد بھی خود کو آمادہ کرتا ہے کہ عورت کو گھر سے باہر نکال دے اور عورت بھی اپنے آپ کو آزاد سمجھ لیتی ہے کہ شوہر کے گھر سے نکل کر اپنے عزیزوں کے گھر واپس چلی جائے۔ لیکن یہ اسلامی حکم بہت ہی اہم فلسفہ کا حامل ہے، کیونکہ یہ عورت کے احترام کے علاوہ عام طور پر شوہروں کی طلاق سے بازگشت اور رشتۂ زوجیت کے استحکام کے لیے بھی اسباب فراہم کرتا ہے۔

اِس اہم اسلامی حکم کو نظرانداز کر دینے سے، جو قرآن کے متن میں آیا ہے، بہت سی طلاقیں دائمی جدائی کا سبب بن جاتی ہیں۔ حالانکہ اگر اس حکم کا اجرا ہوتا تو یہ اکثر زوجین کی صُلح اور نئے سرے سے بازگشت پر

منتہی ہوتا۔

لیکن بعض اوقات ایسے حالات پیدا ہو جاتے ہیں کہ طلاق کے بعد عورتوں کو گھر میں رکھنا مشکل ہو جاتا ہے۔ لہٰذا پانچویں حکم کا استثناء کی صورت میں اضافہ کرتے ہوئے کہتا ہے: "سوائے اس صورت کے کہ وہ عورتیں کسی واضح برے کام کو انجام دیں۔" (الّا ان یأتین بفاحشة مبینة)۔

مثلاً وہ شوہر اور اس کے رشتہ داروں کے ساتھ اس قدر ناسازگاری، بدخلقی اور بدزبانی کرے کہ اُسے گھر میں رکھنا زیادہ مشکلات کا باعث بن جائے۔

یہ بات کئی ایک روایات میں نظر آتی ہے، جو آئمہ اہلِ بیت سے نقل ہوئی ہیں۔[1]

البتہ اس سے مُراد ہر قسم کی مخالفت اور جزئی ناسازگاری نہیں ہے، کیونکہ لفظ فاحشہ کے مفہوم کا تقاضا ہے کہ کوئی بہت بُرا کام ہو گیا ہے، خاص طور پر جب کہ وہ 'مُبیّنہ' کی صفت سے بھی موصوف ہوا ہے۔

یہ احتمال بھی ہے کہ "فاحشہ" سے مُراد عفّت اور پاکدامنی کے منافی عمل ہے، اور یہ ایک روایت میں امام جعفر صادقؑ سے بھی نقل ہوا ہے۔ اس صورت میں خارج کرنے سے مُراد اجراء حد کے لیے باہر لے جانا اور واپس گھر میں لے آنا ہے۔

ان دونوں معانی کے درمیان جمع کرنا بھی ممکن ہے۔

ان احکام کے بیان کرنے کے بعد پھر تاکید کے عنوان سے مزید کہتا ہے: "یہ خدائی حدود ہیں اور جو شخص حدودِ الٰہی سے تجاوز کرے تو اُس نے اپنے اوپر ظلم کیا ہے۔" (وتلك حدود الله ومن یتعد حدود الله فقد ظلم نفسه)۔

کیونکہ یہ قوانین اور احکامِ الٰہی خود مکلّفین کے مصالح کے ضامن ہیں اور ان سے تجاوز کرنے سے، چاہے وہ مرد کی طرف سے ہو یا عورت کی طرف سے، خود ان کی سعادت پر ضرب لگتی ہے۔

آیت کے آخر میں عدّت کے فلسفہ اور عورت کے گھر اور اصلی اقامت گاہ سے باہر نہ نکلنے کی علت کی طرف ضمناً اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے: "تو نہیں جانتا کہ خدا اس واقعہ کے بعد نئی وضع اور اصلاح کا ذریعہ فراہم کر دے۔" (لا تدری لعل الله یحدث بعد ذالك امرًا)۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ غیظ و غضب کا وہ طوفان رُک جائے گا جو عام طور طلاق و جدائی کے معاملہ میں ناگہانی فیصلوں کا موجب بن جاتا ہے۔ چنانچہ عدّت کی مُدّت میں عورت کا ہر وقت مرد کے ساتھ ہونا، نیز خصوصاً جہاں اولاد کا معاملہ بھی درمیان میں ہو، ایسے میں ایک دُوسرے سے محبّت کا اظہار رجوع کرنے کا سبب بن جاتا ہے اور دشمنی و عداوت کے تیرہ و تار بادلوں کو ان کے آسمانِ زندگی سے دُور کر دیتا ہے۔

---

[1] تفسیر نور الثقلین جلد ۵ ص ۳۵۰، ۳۵۱، حدیث ۱۷، ۱۸، ۱۹، ۲۰

یہاں قابلِ توجہ بات یہ ہے اور امام باقرؑ سے بھی مروی ہے:

"المطلقة تكتحل و تختضب وتطيب وتلبس ما شائت من الثياب لان الله عزوجل يقول لعل الله يحدث بعد ذالك امرًا لعلها ان تقع فى نفسه فيراجعها"

"مطلقہ عورت اپنی عدت کے دوران آرائش کرے، آنکھ میں سرمہ لگائے، اپنے بالوں کو رنگین کرے، اپنے آپ کو معطر کرے اور ہر وہ لباس جو اُسے پسند ہو پہنے۔ کیونکہ خدا فرماتا ہے: شاید خدا اس واقعہ کے بعد کوئی نئی کیفیت فراہم کر دے اور ممکن ہے کہ اس طریقہ سے عورت دوبارہ شوہر کے دل کو مسخر کرے اور مرد رجوع کرے۔" [1]

جیسا کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ عام طور پر علیحدگی اور طلاق کا ارادہ جلد گزر جانے والے ہیجانوں کی وجہ سے ہوتا ہے، جو وقت کے گزرنے اور مرد و عورت کے ایک مدت تک، جو نسبتاً طولانی (عدت) ہوتی ہے، مسلسل معاشرت کرنے اور انجام کار غور و فکر کرنے سے معاملہ کلی طور پر بدل جاتا ہے۔ اور بہت سی علیحدگیوں اور طلاقوں میں صلح ہو جاتی ہے۔ لیکن اس شرط کے ساتھ کہ مذکورہ اسلامی احکام عدت کے زمانہ میں عورت کے سابق شوہر کے گھر میں رہنے پر دقت کے ساتھ عمل ہو۔ انشاء اللہ ہم بعد میں بتائیں گے کہ یہ سب امور "طلاق رجعی" کے بارے میں ہیں۔

* * *

چند نکات

۱: طلاق حلال چیزوں میں سب سے زیادہ قابل نفرت ہے۔

اس میں شک نہیں کہ زوجیت کی قرارداد ایک ایسی قرارداد ہے کہ جسے جدائی کے قابل ہونا چاہیے، کیونکہ بعض اوقات ایسے علل و اسباب پیدا ہو جاتے ہیں جو عورت اور مرد کی مشترکہ زندگی کو غیر ممکن یا مشکلات اور مفاسد سے بھر دیتے ہیں۔ ایسے میں اگر ہم یہ اصرار کرتے رہیں کہ یہ قرارداد ابد تک باقی رہے تو یہ بات بہت زیادہ مشکلات کا سرچشمہ بن جاتی ہے، لہٰذا اسلام نے اصل طلاق کے ساتھ موافقت کی ہے۔ آج ہم عیسائی معاشروں میں طلاق کے بالکل ممنوع ہونے کا نتیجہ دیکھ رہے ہیں کہ بہت سے مرد اور عورتیں ایسی ہیں جو عیسائی مذہب کے تحریف شدہ قانون کے حکم کے مطابق طلاق کو ممنوع شمار کرتے ہیں۔ قانونی طور پر وہ دونوں ایک دوسرے کے شوہر و زوجہ ہیں لیکن عملی طور پر ایک دوسرے

---

[1] تفسیر نور الثقلین جلد ۵ ص ۳۵۲ حدیث ۲۴

سے الگ زندگی بسر کرتے ہیں، یہاں تک کہ ہر ایک نے اپنے لیے ایک غیر رسمی بیوی یا شوہر کا انتخاب کر رکھا ہے۔

اس بناء پر اصل مسئلہ طلاق ایک ضرورت ہے، لیکن ایک ایسی ضرورت جسے ایک ممکن حد تک کم ہونا چاہیے، اور جب تک زوجیت کو برقرار رکھنے کی راہ ہو کوئی اس پر عمل نہ کرے۔

اسی بناء پر اسلامی روایات میں شدت کے ساتھ طلاق کی مذمت کی گئی اور اسے (مبغوض ترین حلال) کے عنوان سے یاد کیا گیا ہے، جیسا کہ پیغمبر اکرمؐ سے ایک روایت میں آیا ہے:

"ما من شیء ابغض الی اللہ عزوجل من بیت یخرب فی الاسلام بالفرقة یعنی الطلاق"

"خداوند تعالیٰ کے نزدیک کوئی عمل اس سے زیادہ قابلِ نفرت نہیں ہے کہ اسلام میں کسی گھر کی بنیاد جدائی (یعنی طلاق) کے ساتھ ویران ہو۔"[1]

ایک اور حدیث میں امام جعفر صادقؑ سے آیا ہے:

"ما من شیء مما احله اللہ ابغض الیه من الطلاق"

"حلال امور میں سے کوئی چیز خدا کی بارگاہ میں طلاق سے زیادہ مبغوض نہیں ہے۔"[2]

اس کے علاوہ ایک اور حدیث میں رسول اکرمؐ سے آیا ہے کہ آپ نے فرمایا:

"تزوجوا ولا تطلقوا، فان الطلاق یهتز منه العرش"

"نکاح کرو اور طلاق نہ دو، کیونکہ طلاق عرشِ خدا کو لرزا دیتی ہے۔"[3]

ایسا کیوں نہ ہو جبکہ طلاق، عورتوں، مردوں، خاندانوں اور خصوصاً اولاد کے لیے بہت سی مشکلات پیدا کر دیتی ہے، جنھیں تین حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے:

۱: عاطفی مشکلات اس میں شک نہیں کہ وہ مرد اور عورت جو کئی سالوں یا مہینوں سے ایک دوسرے کے ساتھ زندگی بسر کر رہے تھے، طلاق کے بعد ایک دوسرے سے الگ ہو جاتے ہیں، وہ عاطفی و جذباتی لحاظ سے مجروح ہوں گے اور آئندہ کے ازدواج میں انھیں اس کی تلخ یاد ہمیشہ پریشان کرے گی، یہاں تک کہ دوسری بیوی یا شوہر کو ایک قسم کی بدبینی اور سوءِ ظن کے ساتھ دیکھیں گے۔ اس چیز کے نقصان دہ آثار کسی پر مخفی نہیں ہیں۔ اسی لیے اکثر یہ دیکھا گیا ہے کہ اس

---

[1] و [2] وسائل الشیعہ جلد ۱۵، ص ۲۶۶ (حدیث ۱۰۵)
[3] وسائل الشیعہ جلد ۱۵ ص ۲۶۸ (حدیث ۷)

قسم کی عورتیں اور مرد ہمیشہ کے لیے نکاح کرنے سے اعراض کرتے رہتے ہیں۔

۲: اجتماعی مشکلات طلاق کے بعد بہت سی عورتوں کو شائستہ اور دلخواہ طور پر نئی شادی کا موقع ہی نہیں ملتا۔ اس لحاظ سے وہ شدید پریشانی میں گرفتار ہو جاتی ہیں۔ یہاں تک کہ مردوں کو بھی اپنی بیویوں کو طلاق دینے کے بعد اپنے مطلب کی شادی کا موقع کم ہی ملتا ہے۔ خصوصاً اگر درمیان میں بچوں کا معاملہ بھی ہو۔ تب وہ اکثر ایسی شادی کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں جو انھیں امن و سکون نہیں پہنچاتی اور اس بناء پر آخر زندگی تک رنج و تکلیف میں مبتلا رہتے ہیں۔

۳: اولاد کی مشکلات اولاد کی مشکل ان سب سے زیادہ اہم ہے اور بہت کم دیکھا گیا ہے کہ سوتیلی مائیں سگی ماں کی طرح شفیق و مہربان ہوں یعنی وہ اس اولاد میں شفقت و محبت کے خلا کو پُر کر سکے جو ماں کی محبت بھری گود سے جدا ہوئی ہے۔ اسی طرح سے اگر عورت اپنے بچوں کو اپنے ساتھ لے جائے تو سوتیلے باپ کے بارے میں بھی یہی بات صادق آتی ہے۔ البتہ کچھ عورتیں اور مرد ایسے بھی ہوتے ہیں جو دوسروں کی اولاد کے لیے شفیق و مہربان اور وفادار ہوتے ہیں، لیکن مسئلہ طور پر ان کی تعداد بہت ہی کم ہوتی ہے، اسی وجہ سے طلاق کے بعد بیچاری اولاد بہت بڑی مصیبت میں گرفتار ہو جاتی ہے۔ شاید ان میں سے اکثر بچے آخر عمر تک روحانی سکون سے ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں۔

درحقیقت یہ ایک ایسا نقصان ہے جو نہ صرف اس گھرانے کے لیے بلکہ پورے معاشرے کے لیے ہے، کیونکہ اس قسم کے بچے جو ماں یا باپ یا دونوں کی محبت سے محروم ہو جاتے ہیں۔ بعض اوقات خطرناک افراد کی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ چنانچہ وہ مناسب توجہ نہ ہونے کی وجہ سے انتقام و کینہ کے جذبہ کے زیر اثر آجاتے ہیں اور اپنا انتقام پورے معاشرے سے لیتے ہیں۔

اگر اسلام نے طلاق کے بارے میں اس قدر سخت گیری کی ہے تو اس کی وجہ یہی نقصان دہ نتائج ہیں جو مختلف جہات میں نمودار ہوتے ہیں۔

اسی بناء پر قرآن مجید بھی صراحت کے ساتھ حکم دیتا ہے کہ جس وقت عورت اور مرد کے درمیان کوئی اختلاف پیدا ہو جائے تو دونوں کے عزیز و اقارب ان میں اصلاح کی کوشش کریں۔ وہ لوگ ایک "خاندانی صلح کمیٹی" بنا کر دونوں میاں بیوی کو شرعی عدالت تک جانے اور طلاق و جدائی کے عمل سے روکیں۔

(ہم نے صلح کمیٹی کی تفصیل تفسیر نمونہ جلد سوم میں سورہ نساء کی آیت ۳۵ کے ذیل میں بیان کی ہے۔)

اسی بناء پر جو چیز عورت اور مرد میں خوش بینی اور خاندانی تعلقات کی بنیادوں کو مستحکم کرنے میں مدد دے وہ اسلام کی نظر میں محبوب ہے اور جو اسے متزلزل کرے وہ بُری اور قابل نفرت ہے۔

* * *

۲ : اسبابِ طلاق

دُوسرے اجتماعی امور میں پیدا ہونے والے اختلافات کی طرح طلاق کی بھی مختلف وجوہات ہوتی ہیں کہ جن کا دقیق مطالعہ اور مقابلہ کیے بغیر ایسے حادثہ کو روکنا مشکل ہوتا ہے۔ اِس لیے ہر چیز سے پہلے ضروری ہے کہ ہم طلاق کے عوامل کو معلوم کریں اور معاشرے میں اس کی جڑوں کو ختم کریں۔ اگرچہ یہ عوامل بہت زیادہ ہیں لیکن ان میں سے ذیل کے اُمور زیادہ اہم ہیں :

الف : عورت یا مرد کی غیر محدود توقعات ، جُدائی اور علیٰحدگی کے اہم ترین عوامل میں سے ایک ہے۔ اگر ان میں سے ہر ایک اپنی توقع کے دامن کو محدود کر دے ، خواب و خیال کی دُنیا سے باہر نکل آئے ، طرفِ مقابل کو اچھی طرح سے سمجھ لے اور جتنی اس کی حدود میں ممکن ہو اتنی ہی توقع رکھے تو بہت سی طلاقوں کو روکا جا سکتا ہے۔

ب : بہت سے گھرانوں میں حُسن پرستی اور اسراف و تبذیر کی رُوح کا کارفرما ہونا ایک اور اہم عامل ہے جو خاص طور پر عورتوں کو ہمیشہ کے لیے ناراضی کی حالت میں رکھتا اور طرح طرح کے بہانوں سے طلاق و جُدائی کی راہ ہموار کرتا ہے۔

ج : دونوں میاں بیوی کی خصُوصی زندگی خصُوصاً ان کے اختلافات میں عزیز و اقارب اور جان پہچان والوں کی بے جا مداخلتیں طلاق کا ایک اور اہم عامل شمار ہوتی ہیں۔ تجربہ بتاتا ہے کہ اگر وہ دونوں میاں بیوی کے درمیان اختلافات کے ظہور کے وقت انھیں ان کی حالت پر چھوڑ دیں اور اِس کی یا اُس کی جانبداری میں اختلاف کی آگ کو ہوا نہ دیں تو زیادہ وقت نہیں گزرتا کہ وہ آگ خاموش ہو جاتی ہے۔ لیکن دونوں طرف کے لوگوں کی مداخلت کہ جو اکثر تعصب اور ناروا محبتوں کے ساتھ ہوتی ہے ، وہ مُعاملے کو دن بدن مشکل اور پیچیدہ تر بناتی رہتی ہے۔

البتّہ یہ بات اس معنی میں نہیں ہے کہ عزیز و اقارب ہمیشہ ہی اپنے آپ کو ان اختلافات سے دور رکھیں ، بلکہ مُراد یہ ہے کہ وہ انھیں معمولی اختلافات میں ان کی حالت پر چھوڑ دیں۔ لیکن جب اختلافات کُلی صورت میں جڑ پکڑ لیں تو پھر طرفین کی مصلحت پر توجہ رکھتے ہُوئے اور ہر طرح کی تعصب آمیز جانبداری سے اجتناب اور پرہیز کرتے ہُوئے مداخلت کریں اور فریقین کی صلح کے مقدمات فراہم کریں۔

د : عورت اور مرد کا ایک دُوسرے کی خواہش کے بارے میں بے اعتنائی کرنا خصوصاً ان چیزوں سے جو عاطفی اور جنسی مسائل سے تعلق رکھتے ہیں۔ مثلاً ہر مرد یہ توقع رکھتا ہے کہ اس کی بیوی پاک و صاف اور پُرکشش رہے۔ اسی طرح ہر بیوی بھی اپنے شوہر سے یہی توقع رکھتی ہے۔ لیکن یہ ایسے اُمور ہیں جن

کے اظہار کے لیے وہ عام طور پر تیار نہیں ہوتے ۔ یہ وہ مقام ہے کہ طرف مقابل کا بے اعتنائی برتنا، اپنی ظاہری وضع قطع کا خیال نہ رکھنا، ضروری تزئین کو ترک کر دینا ، اور پریشان بال اور گندہ رہنا ، بیوی یا شوہر کو اس قسم کی ازدواجی زندگی سے سیر کر دیتا ہے ۔ خاص طور پر اگر ان کی زندگی کے ماحول میں ایسے افراد بھی رہتے ہوں جو ان امور کی رعایت کرتے ہوں لیکن وہ اس مسئلہ سے بالکل ہی بے اعتنائی کریں ۔

اسی لیے اسلامی روایات میں اس مطلب کو بہت زیادہ اہمیت دی گئی ہے جیسا کہ ایک حدیث میں امام جعفر صادقؑ سے آیا ہے :

"لا ینبغی للمرئۃ ان تعطل نفسھا"

"عورت کے لیے یہ بات سزاوار نہیں ہے کہ وہ اپنے شوہر کے لیے زینت و آرائش کیے بغیر رہے ۔"[1]

ایک اور حدیث سے امام جعفر صادقؑ سے آیا ہے کہ آپ نے فرمایا :

"ولقد خرجن نساء من العفاف الی الفجور ما اخرجھن الا قلۃ تھیئۃ ازواجھن"

"بہت سی عورتیں جادۂ عفت سے خارج ہوگئیں اور اس کی وجہ اس کے علاوہ کچھ نہیں تھی کہ ان کے شوہر اپنے آپ کو آمادہ نہیں کرتے تھے ۔"

۵ : عورت اور مرد کے گھرانے کے تمدن اور رہنے سہنے کے طریقوں کا ایک دوسرے سے مناسبت نہ رکھنا بھی طلاق کا ایک اہم عامل ہے ۔ یہ ایک ایسا مسئلہ ہے جس پر بیوی یا شوہر کے انتخاب سے پہلے بڑی دقت کے ساتھ توجہ کرنی چاہیے ۔ انھیں "کفو شرعی" یعنی مسلمان ہونے کے علاوہ "کفو فرعی" بھی ہونا چاہیے ۔ یعنی ان دونوں کے درمیان مختلف جہات سے ضروری مناسبتوں کی رعایت ہونی چاہیئے اس اہتمام کے بغیر اس قسم کی شادیوں کے ٹوٹ جانے پر تعجب نہیں کرنا چاہیے ۔

۳ : عدّت کا فلسفہ

اس میں شک نہیں ہے کہ عدت کی دو بنیادی وجوہات ہیں جن کی طرف قرآن مجید اور اسلامی روایات میں اشارہ ہوا ہے :

اوّل : نسل کی حفاظت اور عورت کی وضع و حالت کا حاملہ ہونے یا نہ ہونے کے لحاظ سے مشخص ہونا ۔

---

[1] مکارم الاخلاق ص ۹۱ ، ۱۰۷

دوئم : پہلی زندگی کی طرف پلٹ آنے اور علیٰحدگی کے عوامل کو ختم کرنے کا وسیلہ ہونا کہ جس کی طرف اوپر والی آیت میں ایک لطیف اشارہ ہُوا تھا۔ خاص طور پر یہ بات کہ اسلام اس مسئلہ میں یہ تاکید کرتا ہے کہ عورت عدّت کے زمانہ میں اپنے شوہر کے گھر میں ہی رہے۔ اِس طرح طبعی طور پر ان کے درمیان چند ماہ کی ایک مسلسل معاشرت رہے گی جو انھیں اِس بات کا موقع فراہم کرے گی کہ وہ علیٰحدگی کے مسئلہ کا جلد گزر جانے والے ہیجانات سے بالاتر ہو کر حالات کا نئے سرے سے جائزہ لیں۔

خصوصاً طلاقِ رجعی [1] کے سلسلہ میں کہ جہاں زوجیت کی طرف لوٹنا کسی قسم کے تکلفات کا محتاج نہیں۔ اور ہر ایسا قول یا فعل، جو مرد کے بازگشت کی طرف مائل ہونے پر دلالت کرے، وہ رجُوع شمار ہوگا۔ یہاں تک کہ اگر وہ عورت کے بدن پر شہوت کے ساتھ یا بغیر شہوت کے ہاتھ رکھ دے، چاہے رجوع کا ارادہ نہ ہو تو بھی وہ رجُوع ہی شمار ہوگا۔

اِس طرح سے اگر یہ مدّت ان شرائط کے ساتھ گزر جائے جو ہم نے اوپر بیان کی ہیں، اور وہ دونوں آپس میں صلح نہ کریں تو معلوم ہو جائے گا کہ واقعتاً وہ مشترک زندگی کو برقرار رکھنے کے لیے آمادہ نہیں ہیں۔ لہٰذا مصلحت اسی میں ہے کہ وہ ایک دوسرے سے الگ ہو جائیں۔

اس سلسلہ میں ہم نے تفسیر نمونہ کی جلد دوم میں سورہ بقرہ کی آیت ۲۲۸ کے ذیل میں ایک اور تشریح بھی پیش کی ہے۔

* * *

---

[1] "طلاق رجعی" سے مراد وہ طلاق ہے جو پہلی یا دوسری مرتبہ دی جاتی ہے اور جدائی کا ارادہ مرد کی طرف سے ہوتا ہے۔ اِس طرح سے عورت نہ اپنے حق مہر کو اور نہ دوسرے مال کو خرچ کرتی ہے۔

② فَاِذَا بَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَاَمْسِكُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ فَارِقُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ وَّ اَشْهِدُوْا ذَوَىْ عَدْلٍ مِّنْكُمْ وَ اَقِيْمُوا الشَّهَادَةَ لِلّٰهِ ؕ ذٰلِكُمْ يُوْعَظُ بِهٖ مَنْ كَانَ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ۙ وَمَنْ يَّتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّهٗ مَخْرَجًا ۙ

③ وَّ يَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ ؕ وَمَنْ يَّتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ فَهُوَ حَسْبُهٗ ؕ اِنَّ اللّٰهَ بَالِغُ اَمْرِهٖ ؕ قَدْ جَعَلَ اللّٰهُ لِكُلِّ شَيْءٍ قَدْرًا ۝

❊ ❊ ❊

ترجمہ

② جب ان کی عدت ختم ہو جائے تو پھر یا تو شائستہ طور پر انھیں روک لو یا شائستہ طریقہ سے ان سے جُدا ہو جاؤ اور اپنے میں سے دو عادل مردوں کو گواہ بنالو، اور خدا کے لیے شہادت کو قائم کرو۔ یہ ایسی چیز ہے جس کی ان لوگوں کو نصیحت کی جاتی ہے جو خدا اور قیامت کے دن پر ایمان رکھتے ہیں۔ اور جو شخص تقوائے الٰہی اختیار کرتا ہے تو خدا اس کے لیے کوئی نہ کوئی نجات کی راہ فراہم کر دیتا ہے۔

③ اور اسے ایسی جگہ سے روزی عطا فرماتا ہے جس کا اُسے گمان بھی نہیں ہوتا۔ اور جو

شخص خدا پر توکل کرے تو خدا اس کے امر کی کفایت کرتا ہے۔ خدا اپنے امر کو انجام تک پہنچا کر رہتا ہے۔ اور خدا نے ہر چیز کے لیے ایک اندازہ مقرر کر دیا ہے۔

❖ ❖ ❖

تفسیر

صلح یا پسندِ خدا علیحدگی

طلاق سے مربوط مباحث جو گزشتہ آیات میں آئے ہیں ان کو جاری رکھتے ہوئے پہلی زیر بحث آیت میں چند مزید احکام کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پہلے فرماتا ہے: "جب ان کی مدت کی مدت آخر کو پہنچ جائے تو انھیں شائستہ طور پر، رجوع کے طریق سے روک لو یا شائستہ طور پر ان سے الگ ہو جاؤ"۔ (فاذا بلغن اجلھن فامسکوھن بمعروف او فارقوھن بمعروف)۔

"بلوغ اجل" (مدت کے آخر کو پہنچنے) سے مراد یہ نہیں ہے کہ عدت کی مدت پورے طور پر ختم ہو جائے بلکہ مراد مدت کا آخری دنوں تک پہنچنا ہے۔ ورنہ عدت کے ختم ہو جانے پر رجوع کرنا جائز ہی نہیں ہے۔ مگر یہ کہ انھیں روک رکھنا عقد جدید کے صیغہ کے ذریعہ ہو، لیکن یہ معنی آیت سے بہت بعید نظر آتا ہے۔

بہر حال اس آیت میں ازدواجی زندگی سے مربوط ایک اہم ترین اور مناسب ترین حکم پیش ہوا اور وہ یہ ہے کہ عورت اور مرد یا تو شائستہ طور پر آپس میں زندگی بسر کریں یا پھر شائستہ طریقے سے ایک دوسرے سے جدا ہو جائیں۔ جس طرح مشترک زندگی کو صحیح اصول، انسانی طرز اور شائستہ اور مناسب طور پر ہونا چاہیے، اسی طرح سے جدائی بھی ہر قسم کے نزاع اور جھگڑے، بدگوئی اور ناسزا کہنے، ظلم وستم اور حقوق ضائع کرنے سے خالی ہونی چاہیے۔ اہم بات یہ ہے کہ جس طرح تعلقات صلح صفائی کے ساتھ انجام پائیں اسی طرح علیحدگیاں بھی افہام وتفہیم کے ساتھ ہوں۔ کیونکہ ممکن ہے یہ مرد اور عورت مستقبل میں دوبارہ مشترک زندگی کی سوچ لیں لیکن جدائی کے وقت بدسلوکیاں ان کی فکری فضا کو اس طرح سے تیرہ وتاریک بنا دیتی ہیں کہ بازگشت کی راہ ان کے لیے بند کر دیتی ہیں اور بالفرض اگر وہ نئے سرے سے ازدواج کرنا بھی چاہیں تو مناسب فکری اور عاطفی ذریعہ موجود نہیں ہوتا۔ دوسری طرف آخر وہ مسلمان ہیں اور ایک ہی ہی معاشرے سے تعلق رکھتے ہیں، لہٰذا مخاصمت اور ناشائستہ طریقے سے جدائی نہ صرف انھیں میں اثر انداز ہو گی، بلکہ دونوں کے خاندانوں میں بھی نقصان دہ اثرات چھوڑے گی۔ اور بعض حالات میں آئندہ کے لیے بھی ان کی ہمکاریوں کا سلسلہ کلی طور پر برباد کر دے گی۔

واقعاً یہ کتنی اچھی بات ہے کہ نہ صرف ازدواجی زندگی میں بلکہ ہر قسم کی دوستی اور مشترک عمل میں بھی جہاں تک ہو

سکے، انسان شائستہ اور مناسب ہمکاری کو جاری رکھے۔ اگر ایسا نہ ہو سکے تو پھر شائستہ طور پر جدا ہو جانے کیونکہ شائستہ طور پر جدائی بھی طرفین کے لیے ایک قسم کی کامیابی اور موفقیت ہے۔

ہم نے جو کچھ بیان کیا ہے اس سے معلوم ہو گیا کہ "امساک بمعروف" اور "فراق بہ معروف" وسیع معنی رکھتے ہیں یہ ہر قسم کے واجب و مستحب شرائط اور اخلاقی کاموں کو اپنے اندر لیے ہوئے ہیں اور اسلامی و اخلاقی آداب کے ایک مجموعہ کو ذہن میں مجسم کرتے ہیں۔ اس کے بعد دوسرے حکم کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مزید کہتا ہے: "تم طلاق اور جدائی کے وقت اپنے (مسلمانوں) میں سے شاہد و گواہ بنالو" (واشهدوا ذوی عدل منکم)۔

تاکہ اگر آئندہ کوئی اختلاف پیدا ہو جائے تو طرفین میں سے کوئی انکار نہ کر سکے۔

بعض مفسرین نے یہ احتمال دیا ہے کہ گواہ بنانا طلاق کے سلسلہ میں اور رجوع کرنے کے سلسلہ میں بھی ہے۔ لیکن چونکہ رجوع بلکہ تزویج کے وقت بھی گواہ بنانا قطعاً واجب نہیں ہے، لہٰذا اس بناء پر اگر ہم فرض کر بھی لیں کہ اوپر والی آیت رجوع کو بھی شامل ہے تو یہ اس سلسلے میں ایک مستحبی حکم ہو گا۔

تیسرے حکم میں گواہوں کی ذمہ داری کو اس طرح بیان کرتا ہے: "شہادت کو خدا کے لیے قائم کرو" (و اقیموا الشهادة لله)۔

کہیں ایسا نہ ہو کہ تمہارا دونوں میں سے کسی ایک طرف قلبی میلان، حق کی شہادت سے مانع ہو جائے۔ لہٰذا رضائے خدا اور حق کو قائم کرنے کے سوا اور کسی چیز کو اس میں راہ نہیں پانا چاہیے۔ یہ ٹھیک ہے کہ گواہوں کو عادل ہونا چاہیے، لیکن عدالت کے باوجود بھی گناہ کا صدور محال نہیں ہے۔ اس بناء پر انھیں خبردار کرتا ہے کہ وہ اپنے نگران ہوں اور جان بوجھ کر یا نادانستہ طور پر حق کی راہ سے منحرف نہ ہوں۔

ضمناً "ذوی عدل منکم" کی تعبیر اس بات کی دلیل ہے کہ دونوں گواہ مسلمان، عادل اور مرد ہونے چاہئیں۔

آیت کے آخر میں تاکید کے عنوان سے تمام گزشتہ احکام کے متعلق مزید کہتا ہے: "صرف وہ لوگ جو خدا اور روز قیامت پر ایمان رکھتے ہیں، اس وعظ و نصیحت سے سبق حاصل کرتے ہیں" (ذلکم یوعظ به من کان یؤمن بالله والیوم الآخر)۔

بعض ذالکم کو صرف خدا کی طرف توجہ کرنے اور گواہوں کی طرف سے عدالت کی رعایت کرنے کے مسئلہ کی طرف اشارہ سمجھتے ہیں۔ لیکن ظاہر یہ ہے کہ یہ تعبیر ایک وسیع معنی رکھتی ہے اور طلاق کے بارے میں گزشتہ تمام مسائل کو اپنے اندر لیے ہوئے ہے۔

بہرصورت یہ تعبیر ان احکام کی حد سے زیادہ اہمیت کی دلیل ہے۔ اس طرح کہ اگر کوئی شخص ان کی رعایت نہیں کرتا اور ان سے وعظ و نصیحت حاصل نہیں کرتا تو گویا وہ خدا اور قیامت کے دن پر ایمان نہیں رکھتا۔

چونکہ بعض اوقات آئندہ کی معیشت اور زندگی سے مربوط مسائل یا دوسری گھریلو مجبوریاں، اس بات کا سبب بن جاتی ہیں کہ میاں بیوی طلاق کے وقت یا رجوع کے وقت یا دونوں گواہ شہادت دینے کے وقت حق و عدالت

کی راہ سے منحرف ہو جائیں۔ لہٰذا آیت کے آخر میں فرماتا ہے: "جو شخص خدا سے ڈرے اور گناہ کو ترک کر دے تو خدا اس کے لیے نجات کی راہ قرار دے دیتا ہے اور اس کی زندگی کی مشکلات کو حل کر دیتا ہے۔" (و من یتق اللہ یجعل لہ مخرجا)۔

❊ ❊ ❊

"اور اس کو ایسی جگہ سے جس کا اُسے گمان بھی نہ ہو گا روزی دے گا۔" (ویرزقہ من حیث لا یحتسب)۔

"اور جو شخص خدا پر توکل کرے اور اپنا امر اس کے سپرد کر دے تو خدا اس کی کفایت کرتا ہے۔" (و من یتوکل علی اللہ فھو حسبہ)۔

"کیونکہ خدا ہر چیز پر قادر ہے۔ اس کا فرمان ہر چیز میں نافذ ہے۔ اور جس کام کا وہ ارادہ کرے اُسے انجام دے دیتا ہے۔" (ان اللہ بالغ امرہ)۔

"لیکن خدا نے ہر کام اور ہر چیز کے لیے ایک اندازہ اور حساب قرار دیا ہے۔" (قد جعل اللہ لکل شیء قدرا)۔

اس طرح سے وہ مردوں، عورتوں اور گواہوں کو خبردار کرتا ہے کہ وہ حق کی مشکلات سے نہ گھبرائیں اور عدالت کو جاری کریں۔ پھر اپنے مشکل کاموں کی کشائش خدا سے چاہیں کہ خدا نے یہ ضمانت لی ہے کہ وہ پرہیزگاروں کی مشکل کو حل کرے گا اور انھیں ایسی جگہ سے روزی دے گا جہاں سے خود انھیں بھی گمان نہیں ہو گا۔

خدا نے ضمانت دی ہے کہ جو توکل کرے گا وہ مصیبت میں گرفتار نہیں رہے گا، اور خدا اس ضمانت کے ادا کرنے پر قادر ہے۔

یہ صحیح ہے کہ یہ آیات طلاق اور اس سے مربوط احکام کے سلسلہ میں نازل ہوئی ہیں، لیکن ان کا مضمون وسیع ہے جو دیگر موارد کو بھی شامل ہے۔ یہ خدا کی طرف سے تمام پرہیزگاروں اور توکل کرنے والوں کے لیے ایک امید بخش وعدہ ہے کہ انجام کار لطفِ الٰہی انھیں اپنی پناہ میں لے لے گا، انھیں مشکلات کے پیچ و خم سے گزار دے گا، سعادت کے تابناک افق کی طرف ان کی رہنمائی کرے گا، معیشت کی سختیوں کو برطرف کر دے گا اور مشکلات کے تیرہ و تاریک بادلوں کو ان کی زندگی کے آسمان سے ہٹا دے گا۔

"قد جعل اللہ لکل شیء قدرا" کا جملہ اس نظام کی طرف ایک لطیف اشارہ ہے جو عالمِ تشریع و تکوین پر حاکم ہے۔ یعنی یہ احکام جو خدا نے طلاق وغیرہ کے بارے میں صادر فرمائے ہیں سب کے سب ایک حساب اور دقیق حکیمانہ اندازے کے مطابق ہیں۔

اسی طرح سے وہ مشکلات جو انسان کی زندگی میں ازدواجی مسئلہ میں یا کسی اور مسئلہ میں رُونما ہوں، ان میں سے ہر ایک کا اندازہ و حساب اور مصلحت و اختتام ہوتا ہے۔ انھیں ان حوادث کے ظاہر ہونے پر گھبرانا نہیں چاہیے اور زبان پر گلہ اور شکوہ کے الفاظ نہیں لانے چاہئیں۔ نیز مشکلات کے حل کے لیے خلاف تقویٰ امور

سے متوسل نہیں ہونا چاہیے ، بلکہ تقویٰ اور خودداری کے ساتھ ان سے جنگ کرنی چاہیے اور ان کا حل خدا سے طلب کرنا چاہیے ۔

٭ ٭ ٭

چند نکات

۱ : مشکلات سے نجات اور تقویٰ

اوپر والی آیات قرآن مجید کی سب سے زیادہ امید دلانے والی آیات ہیں ۔ ان کی تلاوت دل کو صفائی اور روح کو نور و روشنی بخشتی ہے ۔ یہ تلاوت یاس و نا امیدی کے پردوں کو چاک کر دیتی ہے ، دل میں اُمید کی حیات بخش شعاعیں چمکاتی ہے اور تمام پرہیزگار اور باتقویٰ افراد کو نجات اور حل مشکلات کا وعدہ دیتی ہے ۔

ایک حدیث میں ابوذر غفاری سے نقل ہوا ہے کہ پیغمبرؐ نے فرمایا :

"انی لا علم اٰیة لو اخذ بھا الناس لکفتھم و من یتق اللہ یجعل لہ مخرجًا ... فما زال یقولھا ویعیدھا"

"میں ایک ایسی آیت کو پہچانتا ہوں کہ اگر تمام انسان اس کے دامن کو تھام لیں تو وہ ان کی مشکلات کے حل کے لیے کافی ہے ۔" اس کے بعد آپ نے آیۃ "ومن یتق اللہ" کی تلاوت فرمائی اور اس کی بار بار تکرار فرماتے رہے[1]

ایک اور حدیث میں رسولِ خداؐ سے نقل ہوا ہے کہ آپ نے اس آیت کی تفسیر میں فرمایا :

"من شبھات الدنیا و من غمرات الموت و شدائد یوم القیامة"

"خدا پرہیزگاروں کو دُنیا کے شبہات ، موت کی سختی اور روزِ قیامت کے شدائد سے رہائی بخشے گا ۔"[2]

یہ تعبیر اس بات کی دلیل ہے کہ اہلِ تقوٰے کے لیے امور کی کشائش دنیا میں ہی منحصر نہیں بلکہ قیامت کو بھی شامل ہے ۔

ایک اور حدیث میں بھی آنحضرتؐ سے آیا ہے :

"من اکثر الاستغفار جعلہ اللہ لہ من کل ھمّ فرجًا و من کل ضیق مخرجًا ۔"

---

[1] مجمع البیان جلد ۱۰ ص ۳۰۶ [2] نور الثقلین جلد ۵ ص ۳۵۶ حدیث ۴۴

"جو شخص کثرت سے استغفار کرے گا (اور لوحِ دل کو گناہوں کے زنگ سے دھوئے گا) تو خدا اس کے لیے ہر غم و اندوہ سے کشائش اور ہر تنگی سے نجات کی راہ قرار دے گا۔"[1]

مفسرین کی ایک جماعت نے کہا ہے کہ اوپر والی پہلی آیت عوف بن مالک کے بارے میں نازل ہوئی ہے جو اصحابِ پیغمبر میں سے تھا اور دشمنانِ اسلام نے اس کے بیٹے کو قید کر لیا تھا۔ وہ پیغمبرؐ کی خدمت میں آیا، اس واقعے اور فقر و فاقہ، نیز تنگدستی کی شکایت کی۔ آپ نے فرمایا تقویٰ اختیار کر، صبر کر اور لاحول ولاقوۃ الا باللہ کا بہت زیادہ ذکر کیا کر۔ اس نے اس کام کو انجام دیا تو اچانک جبکہ وہ اپنے گھر میں بیٹھا ہوا تھا اس کا بیٹا دروازے سے اندر آیا۔ معلوم ہوا کہ وہ دشمن کی غفلت کے ایک لمحہ سے فائدہ اٹھا کر بھاگ آیا ہے، یہانتک کہ دشمن کا اونٹ بھی اپنے ساتھ لے آیا ہے۔ یہ وہ مقام تھا جس پر اوپر والی آیت نازل ہوئی اور اس باتقویٰ شخص کی مشکل کی کشائش اور جہاں سے توقع نہیں تھی وہاں سے روزی کی خبر دی۔[2]

اس بات کا ذکر کرنا بھی ضروری ہے کہ آیت کا مفہوم ہرگز یہ نہیں ہے کہ انسان سعی و کوشش کو بالکل ہی ترک کر دے اور یہ کہے کہ میں گھر میں بیٹھ جاؤں گا، تقویٰ اختیار کروں گا اور لاحول ولاقوۃ الا باللہ کا ذکر کرونگا یہاں تک کہ جہاں سے مجھے گمان بھی نہیں ہے میری روزی پہنچ جائے گی۔ نہیں! آیت کا یہ مفہوم ہرگز نہیں ہے۔ تقویٰ و پرہیزگاری کا مقصد سعی و کوشش کے ساتھ ہے۔ اگر اس حالت میں انسان پر دروازے بند ہوں گے تو خدا نے انکے کھولنے کی ضمانت لی ہے۔

اسی لیے ایک حدیث میں آیا ہے کہ امام جعفر صادقؑ کا صحابی عمر بن مسلم ایک مدت تک آپ کی خدمت میں نہ آیا۔ حضرت نے اس کے حالات دریافت فرمائے تو لوگوں نے بتلایا کہ اس نے تجارت چھوڑ دی، اور عبادت کی طرف رُخ کر لیا ہے۔ آپ نے فرمایا: وائے ہو اس پر:

"اما علم ان تارك الطلب لا يستجاب له"

"کیا وہ یہ نہیں جانتا کہ جو شخص سعی و کوشش اور روزی طلب کرنے کو ترک کر دے تو اس کی دعا قبول نہیں ہوتی۔"

اس کے بعد مزید فرمایا:

---

[1] نور الثقلین جلد ۵ ص ۳۵۷ حدیث ۴۵

[2] مجمع البیان جلد ۱۰ ص ۳۰۶، یہی ماجرا "تفسیر فخر رازیؒ" اور روح البیان میں بھی تھوڑے سے فرق کے ساتھ آیا ہے اور بعض نے ایک سو اونٹ کی تعداد لکھی ہے۔

"اصحاب رسول میں سے ایک جماعت نے جب آیت "ومن یتق الله یجعل له مخرجًا و یرزقه من حیث لا یحتسب" نازل ہوئی تو اپنے دروازے بند کر لیے، عبادت میں مصروف ہو گئے، اور انھوں نے کہا: "خدا نے ہماری روزی کا ذمہ لے لیا ہے"۔ اس واقعہ کی اطلاع پیغمبر کو ہوئی تو آپ نے کسی کو ان کے پاس بھیج کر بلوایا اور اُن سے کہا: تم نے ایسا کیوں کیا ہے؟ انھوں نے جواب دیا: یا رسولؐ اللہ! چونکہ خدا ہماری روزی کا کفیل ہو گیا ہے لہٰذا ہم عبادت میں مشغول ہو گئے ہیں۔ پیغمبرؐ نے فرمایا:

"انه من فعل ذالك لم یستجب له، علیکم بالطلب".

"جو شخص ایسا کرے گا اس کی دُعا قبول نہیں ہوگی۔ تم پر لازم ہے کہ سعی و کوشش اور جدّوجہد کرو۔"[1]

* * *

۲: روحِ توکّل

خدا پر توکّل کرنے سے مراد یہ ہے کہ انسان اپنے کام کی سعی و کوشش کو اس کے سپرد کر دے اور اپنی مشکلات کا حل اسی سے چاہے۔ وہ خدا جو اس کی تمام احتیاجات سے آگاہ ہے، وہ خدا جو اس کے بارے میں رحیم و مہربان ہے، اور وہ خدا جو ہر مشکل کو حل کرنے کی قدرت رکھتا ہے۔

اب جو شخص روحِ توکّل کا حامل ہے، وہ ہرگز یاس و ناامیدی کو اپنے پاس پھٹکنے نہیں دیتا۔ مشکلات کے مقابلہ میں ضعف و زبوں حالی کا احساس نہیں کرتا اور سخت حوادث کے مقابلے میں ڈٹا رہتا ہے۔ اس کا یہی علم و عقیدہ اسے ایسی رُوحانی طاقت دیتا ہے جس سے وہ مشکلات پر غلبہ حاصل کر سکتا ہے۔ دوسری طرف سے غیبی امدادیں کہ توکّل کرنے والوں کو جن کی خوشخبری دی گئی ہے، وہ اس کی مدد کو آ جاتی ہیں اور اُسے شکست و ناتوانی سے نجات بخشتی ہیں۔

ایک حدیث میں پیغمبر گرامیؐ سے آیا ہے کہ آپ نے فرمایا: میں نے خدا کی وحی پہنچانے والے فرشتے جبرئیل سے پوچھا: توکّل کیا ہے؟ تو اس نے کہا:

العلم بان المخلوق لا یضر ولا ینفع، ولا یعطی ولا یمنع، و استعمال الیأس من الخلق، فاذا کان العبد کذالك لم یعمل لاحد سوی الله و

---

[1] "کافی" بحوالہ تفسیر نور الثقلین جلد ۵ ص ۳۵۴ (حدیث ۳۵)

ولم یرج ولم یخف سوی اللہ ولم یطمع فی احد سوی اللہ فھذا ھو التوکل۔"

"توکل کی حقیقت یہ ہے کہ انسان یہ جان لے کہ مخلوق نہ نقصان پہنچا سکتی ہے نہ ہی نفع، نہ کچھ عطا کر سکتی ہے نہ روک سکتی ہے۔ مخلوق سے کوئی اُمید نہ رکھنا (اور خدا ہی سے لَو لگانا) جس وقت ایسا ہو جائے تو پھر انسان خدا کے علاوہ کسی کے لیے کام نہیں کرتا اور اس کے غیر سے اُمید نہیں کرتا، نہ اس کے غیر سے ڈرتا ہے اور نہ ہی اس کے علاوہ کسی اور کے ساتھ دل لگاتا ہے۔ یہ ہے توکل کی روح۔[1]

اس عمیق مضمون کے ساتھ، توکل انسان کو ایک نئی شخصیت بخشتی ہے اور اس کے تمام اعمال میں اثر پیدا کرتی ہے۔ اسی لیے ایک حدیث میں آیا ہے کہ پیغمبر اکرمؐ نے شب معراج بارگاہِ خداوندی میں سوال کیا:

پروردگارا: ای الاعمال افضل؟

"کون سا عمل سب سے افضل و برتر ہے؟"

خداوند متعال نے فرمایا:

"لیس شیء عندی افضل من التوکل علیّ والرضا بما قسمت

"میرے نزدیک مجھ پر توکل کرنے اور جو کچھ میں نے تقسیم کیا ہے اس پر راضی رہنے سے افضل و برتر کوئی چیز نہیں ہے۔"[1]

یہ بات واضح ہے کہ اس معنیٰ میں توکل ہمیشہ جہاد اور سعی و کوشش کے ساتھ ہوتی ہے۔ سستی اور ذمہ داریوں سے فرار کے ساتھ نہیں ہوتی۔

ہم نے اس سلسلہ میں تفسیر نمونہ کی جلد ۱۰ میں (سورۂ ابراہیمؑ کی آیت ۱۲ کے ذیل میں ایک اور تشریح بھی پیش کی ہے۔

* * *

[1] بحار الانوار جلد ۶۹ ص ۳۷۳ حدیث ۱۹

④ وَالّٰٓـِٔيْ يَئِسْنَ مِنَ الْمَحِيْضِ مِنْ نِّسَآئِكُمْ اِنِ
ارْتَبْتُمْ فَعِدَّتُهُنَّ ثَلٰثَةُ اَشْهُرٍ ۙ وَّالّٰٓـِٔيْ لَمْ يَحِضْنَ ؕ
وَاُولَاتُ الْاَحْمَالِ اَجَلُهُنَّ اَنْ يَّضَعْنَ حَمْلَهُنَّ ؕ وَمَنْ
يَّتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّهٗ مِنْ اَمْرِهٖ يُسْرًا ۝

⑤ ذٰلِكَ اَمْرُ اللّٰهِ اَنْزَلَهٗٓ اِلَيْكُمْ ؕ وَمَنْ يَّتَّقِ اللّٰهَ
يُكَفِّرْ عَنْهُ سَيِّاٰتِهٖ وَيُعْظِمْ لَهٗٓ اَجْرًا ۝

⑥ اَسْكِنُوْهُنَّ مِنْ حَيْثُ سَكَنْتُمْ مِّنْ وُّجْدِكُمْ
وَلَا تُضَآرُّوْهُنَّ لِتُضَيِّقُوْا عَلَيْهِنَّ ؕ وَاِنْ كُنَّ اُولَاتِ
حَمْلٍ فَاَنْفِقُوْا عَلَيْهِنَّ حَتّٰى يَضَعْنَ حَمْلَهُنَّ ۚ فَاِنْ
اَرْضَعْنَ لَكُمْ فَاٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ ۚ وَاْتَمِرُوْا بَيْنَكُمْ
بِمَعْرُوْفٍ ۚ وَاِنْ تَعَاسَرْتُمْ فَسَتُرْضِعُ لَهٗٓ اُخْرٰى ۝

⑦ لِيُنْفِقْ ذُوْ سَعَةٍ مِّنْ سَعَتِهٖ ؕ وَمَنْ قُدِرَ عَلَيْهِ
رِزْقُهٗ فَلْيُنْفِقْ مِمَّآ اٰتٰىهُ اللّٰهُ ؕ لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا
اِلَّا مَآ اٰتٰىهَا ؕ سَيَجْعَلُ اللّٰهُ بَعْدَ عُسْرٍ يُّسْرًا ۝

❊ ❊ ❊

ترجمہ

(۴) تمھاری عورتوں میں سے جو ماہانہ عادت سے نا امید ہیں، اگر تمھیں ان کی وضع میں (حاملہ ہونے کے لحاظ سے) شک ہو تو ان کی عدّت تین ماہ ہے اور اسی طرح سے وہ عورتیں جنھوں نے ابھی ماہانہ عادت نہیں دیکھی ہے۔اور حاملہ عورتوں کی عدّت یہ ہے کہ وہ وضع حمل کریں۔اور جو شخص تقوائے الٰہی اختیار کرے گا، خدا اس پر کام کو آسان کر دے گا۔

(۵) یہ خدا کا فرمان ہے جو اُس نے تم پر نازل کیا ہے اور جو شخص خدائی تقویٰ اختیار کرے گا تو خدا اس کے گناہوں کو بخش دے گا اور اس کے اجر و ثواب کو بڑھا دے گا۔

(۶) جہاں تم سکونت رکھتے ہو اور جو تمھارے اختیار میں ہے، وہاں ان (مطلقہ عورتوں) کو سکونت دو، اور انھیں ضرر نہ پہنچاؤ کہ معاملے کو ان پر تنگ نہ کردو (اور وہ گھر چھوڑنے پر مجبور ہو جائیں) اور اگر وہ حاملہ ہوں تو ان کو نفقہ دو یہاں تک کہ وہ وضع حمل کریں اور اگر وہ تمھارے بچے کو دودھ پلائیں تو تم اس کی اُجرت دو (اور بچوں کے بارے میں معاملے کو) شائستہ مشورے کے ذریعے انجام دو، اور اگر تم میں باہم موافقت نہ ہو تو بچے کو دودھ پلانے کا کام دوسری عورت اپنے ذمہ لے گی۔

(۷) جن لوگوں کے پاس وسیع ذرائع و وسائل ہیں وہ تو اپنی وسعت کے مطابق خرچ کریں، لیکن جو تنگ دست ہیں تو جو کچھ خُدا نے انھیں دیا ہے وہ اس میں سے خرچ کریں۔خدا کسی شخص کو اس توانائی سے زیادہ جو اس نے اُسے دی ہے تکلیف نہیں دیتا۔خدا عنقریب سختی کے بعد آسانی قرار دے گا۔

❖ ❖ ❖

تفسیر

مطلقہ عورتوں کے احکام اور ان کے حقوق

منجملہ ان احکام کے جو گزشتہ آیات سے معلوم ہوئے ہیں، طلاق کے بعد عدت پوری کرنے کا ضروری ہونا ہے۔ چونکہ سورۂ بقرہ کی آیت ۲۲۸ میں عدت کے مسئلہ میں ان عورتوں کا حکم واضح ہو گیا ہے جو ماہانہ عادت دیکھتی ہیں کہ انھیں تین بار پاکیزہ ہو کر ماہانہ عادت دیکھنی چاہیے۔ جب وہ تیسری مرتبہ ماہانہ عادت میں وارد ہوں تو ان کی عدت ختم ہو جائے گی، لیکن انھیں میں سے کچھ ایسی عورتیں بھی ہیں جو کئی اسباب کی بنا پر ماہانہ عادت نہیں دیکھتیں یا وہ حاملہ ہوتی ہیں، تو اوپر والی آیات ان عورتوں کے حکم کو واضح کرتے ہوئے عدت کی بحث کی تکمیل کر رہی ہیں۔

پہلے فرماتا ہے: "تمھاری عورتوں میں سے جو ماہانہ عادت سے ناامید ہو گئی ہیں اگر ان کی وضع و کیفیت میں (حاملہ ہونے کے لحاظ سے) شک کرو تو ان کی عدت تین ماہ ہے۔" (واللائی یئسن من المحیض من نسائکم ان ارتبتم فعدتھن ثلاثۃ اشھر)۔

اور اسی طرح سے وہ عورتیں بھی جنھوں نے ماہانہ عادت دیکھی ہی نہیں وہ بھی تین ماہ عدت رکھیں"۔ (واللائی لم یحضن)۔

اس کے بعد تیسرے گروہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مزید کہتا ہے: "حاملہ عورتوں کی عدت یہ ہے کہ وہ وضع حمل کریں"۔ (واولات الاحمال اجلھن ان یضعن حملھن)۔

اس طرح سے اوپر والی آیت میں عورتوں کے دوسرے تین گروہوں کے لیے حکم مشخص ہو گیا ہے۔ یعنی دو گروہوں کو تو تین ماہ تک عدت رکھنی چاہیے اور تیسرے گروہ، یعنی حاملہ عورتوں کی عدت وضع حمل کے ساتھ ہی ختم ہو جاتی ہے چاہے وہ طلاق کے ایک لمحہ بعد یا آٹھ ماہ بعد وضع حمل کریں۔

"ان ارتبتم" (اگر تمھیں شک اور تردد ہو) کے جملہ سے کیا مراد ہے؟ اس بارے میں تین احتمال بیان کیے گئے ہیں:

۱: اس سے مراد وجود "حمل" میں احتمال اور شک ہے، اس معنی میں کہ اگر سن یاس (عام عورتوں میں پچاس سال کے سن اور قرشی عورتوں میں ساٹھ سال کے سن) کے بعد کسی عورت میں وجود حمل کا احتمال ہو تو اسے عدت گزارنی چاہیے۔ اگرچہ اس بات کا بہت کم اتفاق ہوتا ہے، لیکن بعض اوقات ایسا ہوا ہے (توجہ رہے کہ روایات اور کلمات فقہا میں لفظ "ریبۃ" حمل میں شک کے معنی میں بارہا آیا ہے) [1] (حاشیہ اگلے صفحہ پر)

۲ : ایسی عورتیں مُراد ہیں جن کے بارے میں ٹھیک طرح سے معلوم نہ ہو کہ سن یاس کو پہنچی ہیں کہ نہیں۔

۳ : اس مسئلہ کے حکم میں شک اور تردّد مراد ہے۔ اِس بناء پر آیت یہ کہتی ہے کہ اگر تم حکم خدا کو نہیں جانتے تو وہ یہ ہے کہ اس قسم کی عورتیں عدت گزاریں۔ لیکن ان تمام تفاسیر میں سے پہلی تفسیر زیادہ مناسب ہے۔ کیونکہ والی یئسن کے جملہ کا ظاہر یہ ہے، کہ یہ عورتیں سن یاس کو پہنچ گئی ہیں۔ ضمناً جب عورتوں کی ماہانہ عادت بیماریوں یا دوسرے عوامل کی بناء پر منقطع ہو جائے تو وہ اس حکم کی مشمول ہیں یعنی انھیں چاہیے کہ تین ماہ تک عدت گزاریں۔ (اس حکم کو قاعدۂ اولویت کے طریق سے یا لفظ آیت کے مشمول سے معلوم کیا جا سکتا ہے) [1]

واللائی لم یحضن" (وہ عورتیں جنھوں نے ماہانہ عادت نہیں دیکھی) کا جملہ ممکن ہے اِس معنی میں ہو کہ وہ سن بلوغ کو پہنچ گئی ہیں لیکن ابھی ماہانہ عادت شروع نہیں ہوئی۔ اس صورت میں بلاشک وشبہ انھیں تین ماہ تک عدت گزارنی چاہیئے۔ ایک اور احتمال جو علماء نے آیت کی تفسیر میں دیا وہ یہ ہے کہ اس سے مراد وہ تمام عورتیں ہیں جو ماہانہ عادت نہیں دیکھتیں، چاہے وہ سن بلوغ تک پہنچی ہوں یا نہ پہنچی ہوں۔

لیکن ہمارے فقہاء کے درمیان مشہور یہ ہے کہ اگر عورت سن بلوغ کو نہ پہنچی ہو تو طلاق کے بعد اس کی عدت نہیں ہے، لیکن اس مسئلہ کے مخالف بھی ہیں جنھوں نے اس سلسلے میں بعض روایات سے استدلال کیا اور اوپر والی آیت کا ظاہر بھی ان کے موافق ہے۔ (اس مسئلہ کی مزید تشریح کا بھی فقہ کی کتابوں میں مطالعہ کرنا چاہیئے) [2]

وہ شان نزول جو آخری جملوں کے لیے بیان کی گئی ہے۔ اِس سے بھی اوپر والی تفسیر ہی صحیح معلوم ہوتی ہے۔ شان نزول یہ ہے کہ ابی بن کعب نے حضرت رسولؐ سے عرض کیا کہ بعض عورتوں کی عدت قرآن میں نہیں آئی ہے، ان میں غیر بالغ لڑکیاں، کبیرہ (یائسہ) عورتیں اور حاملہ عورتیں ہیں۔ تو اوپر والی آیت نازل ہوئی اور ان کے احکام بیان کیے گئے۔ [3]

عدت اس صورت میں ہے کہ اس بارے میں حمل کا احتمال ہو، کیونکہ اوپر والی آیت میں یائسہ عورتوں پر عطف ہوا ہے۔ اس کا معنی یہ ہے کہ دونوں کا حکم یکساں ہے۔ [4]

(حاشیہ صفحہ سابقہ) [1] جواہر جلد ۳۲ ص ۲۴۹۔ "وسائل الشیعہ" جلد ۱۵ باب ۴، از ابواب عدد، حدیث ۷

[2] البتہ فقہاء کے درمیان مشہور یہ ہے کہ عورت جب سن یاس کو پہنچ جائے تو اس کی عدت بالکل نہیں ہے، لیکن اس قول کے مقابلے میں علماء قدیم کی ایک تھوڑی سی تعداد عدت کی قائل ہے۔ اور بعض روایات بھی اس پر شاہد ہیں۔ اگرچہ دوسری روایات اس سے معارضہ کرتی ہیں جو بات اوپر والی آیت کے ظاہر سے موافق ہے وہ یہ ہے کہ احتمالِ حمل کی صورت میں وہ عدت رکھتی ہیں۔ اس موضوع کی مزید تشریح فقہی کتابوں میں دیکھنی چاہیے۔

[3] "جواہر الکلام" جلد ۳۲ ص ۲۳۲، اور فقہ کی دوسری کتابیں۔

[4] مرحوم طبرسی مجمع البیان میں کہتے ہیں: تقدیرہ واللائی لم یحضن ان ارتبتم فعدتھن ایضاً ثلاثۃ اشھر۔

پھر آیت کے آخر میں نئے سرے سے مسئلہ تقویٰ پر تکیہ کرتے ہوئے فرماتا ہے: "اور جو شخص تقوائے الٰہی اختیار کرے گا، خدا معاملے کو اس پر آسان کر دے گا" (ومن یتق اللہ یجعل لہ من امرہ یسرًا)۔

وہ اس کی مشکلات کو اس جہان میں اور دوسرے جہان میں بھی چاہے وہ علیحدگی، مسئلہ طلاق اور اس کے احکام سے مربوط ہوں اور چاہے دوسرے مسائل سے تعلق رکھتی ہوں، اپنے لطف و کرم سے حل کر دے گا۔

❊ ❊ ❊

نیز بعد والی آیۃ میں تاکید کے لیے ان احکام کے بارے میں جو طلاق اور عدت کے سلسلے میں گزشتہ آیات میں آئے ہیں، مزید کہتا ہے: "یہ خدا کا حکم ہے جسے اس نے تم پر نازل کیا ہے" (ذالک امر اللہ انزلہ الیکم)۔

"اور جو شخص تقوائے الٰہی اختیار کرے گا اور اس کے فرمان کی مخالفت سے پرہیز کرے گا خدا اس کے گناہوں کو بخش دے گا۔ اور اس کے اجر و ثواب کو بہت بڑھا دے گا" (ومن یتق اللہ یکفر عنہ سیئاتہ ویعظم لہ اجرًا)۔

بعض مفسرین نے کہا ہے کہ یہاں 'سیئات' سے مراد 'گناہانِ صغیرہ' ہیں اور تقویٰ سے مراد "گناہانِ کبیرہ" سے پرہیز ہے۔ اور اس طرح کبائر سے پرہیز صغائر کے بخشے جانے کا سبب بن جاتا ہے۔ یہ بات اس کے مشابہ ہے جو سورۂ نساء کی آیت ۳۱ میں بیان ہوئی ہے، اس گفتگو کا لازمہ یہ ہے کہ طلاق اور عدت کے سلسلہ میں گذشتہ احکام کی مخالفت گناہانِ کبیرہ میں شمار ہوتی ہے۔[1]

البتہ یہ درست ہے کہ بعض اوقات 'سیئات' صغیرہ گناہوں کے معنی میں بھی آیا ہے لیکن قرآن مجید کی بہت سی آیات میں تمام گناہوں کے لیے، چاہے وہ صغیرہ ہوں یا کبیرہ لفظ سیئات کا اطلاق ہوا ہے۔ مثلاً سورہ مائدۃ کی آیت ۶۵ میں آیا ہے: ولو ان اھل الکتاب اٰمنوا واتقوا لکفرنا عنھم سیئاتھم اگر اہلِ کتاب ایمان لے آئیں اور تقویٰ اختیار کریں تو ہم ان کے تمام گذشتہ گناہوں کو بخش دیں گے۔" (یہ معنی دوسری آیات میں بھی آیا ہے۔)

مسلّمہ طور پر ایمان اور قبولِ اسلام تمام گذشتہ گناہوں کی بخشش کا سبب ہے۔

❊ ❊ ❊

بعد والی آیت طلاق کے بعد عورت کے حقوق کے بارے میں 'مسکن' اور 'نفقہ' کے لحاظ سے اور دوسرے جہات سے بھی وضاحت کرتی ہے۔

پہلے مطلقہ عورتوں کے مسکن کی کیفیت کے بارے میں فرماتا ہے: "جہاں تم سکونت رکھتے ہو اور تمہارے

---

[1] المیزان جلد ۱۹ ص ۳۶۰

وسائل تقاضا کرتے ہیں انھیں بھی وہیں سکونت دو"۔ (اسکنوھن من حیث سکنتم من وجدکم)۔

"وُجد" (بروزن حکم) توانائی اور تمکن کے معنی میں ہے۔ بعض مفسرین نے اس کی اور تفاسیر بھی بیان کی ہیں، جو نتیجہ میں اسی معنی کی طرف لوٹتی ہیں۔ "راغب" بھی مفردات میں یہی کہتا ہے کہ "من وجدکم" کی تعبیر کا مفہوم یہ ہے کہ مطلقہ عورتوں کو اپنی توانائی اور مقدور کے مطابق رہنے کے لیے مناسب مکان دو۔

فطری طور پر جب مکان شوہر کے ذمہ ہے تو باقی اخراجات بھی اسی کے ذمہ ہوں گے۔ آیت کا آخری حصہ جو حاملہ عورتوں کے نفقہ کے بارے میں ہے، وہ اسی مدعا پر شاہد ہے۔

اس کے بعد ایک دوسرے حکم کو پیش کرتے ہوئے کہتا ہے: "انھیں کوئی نقصان نہ پہنچاؤ کہ معاملے کو ان پر ایسا تنگ کر دو کہ وہ تمھارے مکان کو چھوڑنے اور نفقہ کو ترک کرنے پر مجبور ہو جائیں"۔ (ولا تضارّوھن لتضیقوا علیھن)۔

کہیں ایسا نہ ہو کہ کینہ پروری، عداوت اور نفرت تمھیں حق اور عدالت کے راستہ سے منحرف کر دے، تم انھیں ان کے مسلّمہ حقوقِ مسکن و نفقہ سے محروم کر دو اور ان پر اتنا دباؤ پڑے کہ وہ ہر چیز کو چھوڑ کر نکلنے کھڑی ہوں۔

تیسرے حکم میں حاملہ کے بارے میں کہتا ہے: "اور اگر وہ حاملہ ہوں تو جب تک وہ وضع حمل نہ کر لیں ان کے اخراجات دیتے رہو"۔ (وان کن اولات حمل فانفقوا علیھن حتّٰی یضعن حملھن)۔

کیونکہ جب تک انھوں نے وضع حمل نہیں کیا وہ حالتِ عدت میں ہیں اور ان کا نفقہ اور مسکن شوہر پر واجب ہے۔

چوتھے حکم میں دودھ پلانے والی عورتوں کے حقوق کے بارے میں فرماتا ہے: "اگر وہ علیحدگی کے بعد بچوں کو دودھ پلانے پر رضامند ہو جائیں تو ان کی اُجرت انھیں دے دو"۔ (فان ارضعن لکم فاٰتوھن اجورھن)۔

اتنی اُجرت جو عرف و عادت کے لحاظ سے دودھ پلانے کی مقدار اور وقت کے ساتھ مناسبت رکھتی ہو۔

چونکہ ایسا اکثر ہوتا ہے کہ طلاق کے بعد شوہر اور بیوی میں نوزاد بچے کے سلسلے میں مصالحت کرنے پر اختلاف پیدا ہو جاتے ہیں، لہٰذا پانچویں حکم میں اس سلسلے میں ایک قاطع حکم صادر فرماتے ہوئے کہتا ہے: "اولاد کی سرنوشت کے سلسلے میں ایک دوسرے کے مشورے سے شائستہ فیصلہ کرو"۔ (وأتمروا بینکم بمعروف)۔

کہیں ایسا نہ ہو کہ شوہر اور بیوی کے اختلافات بچوں کے منافع پر ایسی ضرب لگائیں کہ جس سے وہ جسمانی اور ظاہری لحاظ سے خسارے میں گرفتار ہو جائیں یا عاطفی لحاظ سے ضروری محبت اور شفقت سے محروم رہ جائیں۔ والدین کی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ خدا کو نظر میں رکھیں اور دفاع نہ کر سکنے والے نومولود کو اپنے اختلافات اور اغراض پر قربان نہ کر دیں۔

"وأتمروا" کا جملہ "ایتمار" کے مادہ سے بعض اوقات تو کسی دستور کو قبول کرنے اور کبھی مشاورت کے معنی میں آتا ہے۔ اور یہاں دوسرا معنی زیادہ مناسب ہے۔ نیز معروف کی تعبیر بڑی جامع ہے جو ہر قسم کے مشورے کو شامل ہے کہ جس میں خیر و صلاح ہو۔

چونکہ بعض اوقات طلاق کے بعد بچے کے مصالح اور اُسے دُودھ پلانے کے سلسلے میں بیوی اور شوہر میں ضروری اور لازمی موافقت پیدا نہیں ہوتی۔ لہٰذا پچھلے حکم میں فرماتا ہے: "اور اگر تم ایک دُوسرے کے لیے سخت ہو جاؤ اور موافقت نہ کرو، تو پھر کوئی دوسری عورت بچے کو دودھ پلانے کی ذمہ داری لے سکتی ہے۔ تاکہ کشمکش جاری نہ رہے۔" (وان تعاسرتم فسترضع له اخرٰی)۔

یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اگر اختلافات طول پکڑ جائیں تو اپنے آپ کو معطل نہ رکھو اور بچے کو کسی دوسری عورت کے سپرد کر دو۔ پہلے درجہ میں تو ماں ہی کا حق تھا کہ وہ اس بچے کو دودھ پلائے، لیکن جب سخت گیری اور کش مکش کی بنا پر یہ امر امکان پذیر نہیں رہا تو بچے کے منافع کو فراموشی کے سپرد نہیں کرنا چاہیے۔ لہٰذا اس کی ذمہ داری کسی دایہ کے سپرد کر دو۔

* * *

بعد والی آیت اس سلسلہ میں ساتویں اور آخری حکم کو بیان کرتے ہوئے مزید کہتی ہے: "وہ لوگ جو وسیع وسائل رکھتے ہیں وہ اپنے وسائل اور امکانات کے مطابق خرچ کریں۔ لیکن جو تنگ دست ہیں تو جو کچھ خدا نے انھیں دے رکھا ہے وہ اس میں سے خرچ کریں۔ خدا کسی شخص کو اس سے زیادہ تکلیف نہیں دیتا کہ جو اس کو عطا کیا ہُوا ہے ــــ" (لینفق ذوسعة من سعته ومن قدر علیه رزقه فلینفق مما اٰتاه الله لا یکلف الله نفسا الا ما اٰتاها)۔

کیا یہ حکم یعنی طاقت کے مطابق خرچ کرنا ان عورتوں سے مربوط ہے جو طلاق کے بعد بچوں کو دودھ پلانے کی ذمہ داری قبول کر لیتی ہیں یا عدت کے دنوں کے ساتھ مربوط ہے کہ جس کی طرف گزشتہ آیات میں اجمالی طور پر اشارہ ہوا یا یہ دونوں کے ساتھ مربوط ہے؟

آخری معنی سب سے مناسب ہے۔ اگرچہ مفسرین کی ایک جماعت اسے صرف دُودھ پلانے والی عورتوں سے مربوط سمجھتی ہے۔ حالانکہ گزشتہ آیات میں اس بارے میں اُجر (اُجرت) کی تعبیر آئی ہے۔ نفقہ اور انفاق کی تعبیر نہیں آئی۔

بہرحال جن لوگوں میں کافی طاقت اور توانائی ہے انھیں تنگ دلی اور سخت گیری نہیں کرنی چاہیے جن میں کچھ زیادہ مالی طاقت نہیں ہے وہ اپنی توانائی سے زیادہ پر مامور نہیں اور عورتیں ان پر اعتراض نہیں کر سکتیں۔

اِسی طرح جو وسعت رکھتے ہیں انھیں بخل نہیں کرنا چاہیے۔ اور جو وسعت نہیں رکھتے، وہ ملامت کے لائق نہیں ہیں۔

معیشت کی تنگی لوگوں کے حق و عدالت کے راستہ سے خارج ہونے کا سبب نہ بنے اور کوئی بھی شخص شکایت کے لیے زبان نہ کھولے۔ اس بناء پر آیت کے آخر میں فرماتا ہے: "خدا عنقریب سختی کے بعد راحت اور آسانی قرار دے گا" (سیجعل اللہ بعد عسر یسرًا)۔

یعنی غم نہ کھاؤ، بیتابی نہ کرو، دنیا ایک حالت پر باقی نہیں رہتی۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ منقطع ہو جانے والی اور جلدی سے گزر جانے والی مشکلات تمہارے صبر و شکیبائی کے رشتہ کو توڑ کر پارہ پارہ نہ کردیں۔

یہ تعبیر ہمیشہ کے لیے، خصوصا ان آیات کے نزول کے وقت کہ جب مسلمان معیشت کے لحاظ سے سخت تنگی میں تھے، صابرین کے مستقبل کی ایک اُمید بخش بشارت ہے، پھر اتفاق سے کچھ زیادہ دیر نہ گزری تھی کہ خدا نے اپنی رحمت و برکت کے دروازے ان پر کھول دیئے۔

* * *

چند نکات

۱: طلاقِ رجعی کے احکام

ہم بیان کر چکے ہیں کہ "طلاقِ رجعی" وہ ہے کہ جس میں شوہر عدت ختم ہونے سے پہلے پہلے جس وقت چاہے رجوع کر سکتا ہے اور میاں بیوی کے رشتہ کو بحال کر سکتا ہے۔ اور اس میں کسی نئے عقد کی ضرورت نہیں ہوتی۔ قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ رجوع کم سے کم بات اور عمل سے بھی حاصل ہو سکتا ہے کہ جو بازگشت کی علامت ہو۔

بعض احکام جو اوپر والی آیات میں بیان کیے گئے ہیں، جیسے نفقہ اور مسکن کے احکام، وہ طلاقِ رجعی کی عدت کے ساتھ مخصوص ہیں۔ اسی طرح عدت کی حالت میں عورت کا اپنے شوہر کے گھر سے نہ نکلنے کا مسئلہ بھی ہے۔ لیکن طلاق بائن یعنی وہ طلاق جو قابلِ رجوع نہیں (مثلاً تیسری طلاق)، تو اس میں اوپر والے احکام کا وجود نہیں ہے۔

صرف حاملہ عورت کے بارے میں وضع حمل کے وقت تک نان و نفقہ اور مسکن کا حق ثابت ہے۔

"لا تدری لعل اللہ یحدث بعد ذالک امرًا" (تو نہیں جانتا شاید خدا کوئی نئی وضع و کیفیت پیدا کر دے) کی تعبیر بھی اسی بات کی طرف اشارہ ہے کہ سب یا اوپر والے احکام کا ایک حصہ طلاق رجعی کے ساتھ مربوط ہے۔[1]

* * *

---

[1] مزید وضاحت کے لیے فقہ کی کتابوں منجملہ "جواہر الکلام" جلد ۳۲ ص ۱۲۱ کی طرف رجوع کریں۔

۲ : خدا طاقت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتا

نہ صرف عقل کا حکم یہی ہے ، بلکہ حکم شریعت بھی اسی مطلب کا گواہ ہے کہ انسانوں کی ذمہ داریاں ان کی طاقت کے مطابق ہونی چاہئیں: لا یکلف اللہ نفسًا الّا ما اٰتاھا کا جملہ جو اوپر والی آیات کے ضمن میں آیا ہے اس میں اسی معنی کی طرف اشارہ ہے۔ لیکن بعض روایات میں آیا ہے کہ ما اٰتاھا سے مراد ما اعلمھا ہے ۔ یعنی ہر شخص پر اتنی ہی ذمہ داری ڈالتا ہے جتنی اسے تعلیم دی ہے ۔ اسی لیے علماء نے "علم اصول" میں "اصل برأت" کے مباحث میں ، اس آیت کے ساتھ استدلال کیا ہے کہ اگر انسان کسی حکم کو نہیں جانتا تو وہ اس کے لیے جواب دہ نہیں ہے۔

لیکن چونکہ عدم آگاہی بعض اوقات عدم توانائی کا سبب بن جاتی ہے ، لہٰذا ممکن ہے اس سے مراد وہ جہالت ہو جو عجز و ناتوانی کا سرچشمہ بنے۔

اس بناء پر ممکن ہے یہ آیت ایک وسیع مفہوم رکھتی ہو کہ جو عدم قدرت کو اور اس جہالت کو بھی شامل ہو ، جو کسی کام کے انجام دینے میں عدم قدرت کی موجب ہو۔

❖ ❖ ❖

۳ : گھرانے کے نظام کی اہمیت

وہ باریکی اور عمدگی جس سے مطلقہ عورتوں کے احکام اور ان کے حقوق بیان کرنے کے سلسلہ میں اوپر والی آیت میں کام لیا گیا ہے ، یہاں تک کہ آیات قرآن میں اس مسئلہ کی بہت ساری جزئیات بیان ہوئی ہیں کہ جو حقیقت میں اسلام کا بنیادی قانون ہے ، اس اہمیت کی ایک واضح دلیل ہے کہ گھریلو نظام نیز عورتوں اور بچوں کے حقوق کی حفاظت کے لیے اسلام س کا قائل ہے۔

جہاں تک ہوسکتا ہے اسلام طلاق سے روکتا ہے اور اس کی جڑوں کو کاٹتا ہے لیکن جب معاملہ یہاں تک پہنچ جائے کہ ہر طرف کے راستے بند ہو جائیں اور طلاق و علیحدگی کے علاوہ اور کوئی چارۂ کار نہ ہو تو پھر اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ اس کشمکش میں اولاد یا عورتوں کے حقوق پامال ہو جائیں ۔ یہاں تک کہ علیحدگی کا طریقہ کار بھی اس طرح سے پیش کرتا ہے کہ عام طور پر رجوع اور بازگشت کا امکان موجود رہے۔

معروف طریقہ سے روکے رکھنا اور معروف سے جدائی ، عورتوں کو نقصان اور ضرر کا نہ پہنچانا اور تنگی اور سخت گیری نہ کرنا ، نیز بچوں کی سرنوشت کو محفوظ کرنے کے لیے شائستہ اور مناسب مشورہ کرنا ، اور اسی قسم کے دوسرے احکام جو اوپر والی آیات میں آئے ہیں ، وہ سب اس بات کے گواہ ہیں۔

لیکن افسوس کی بات ہے کہ ان امور سے بہت سے مسلمانوں کی لاعلمی یا علم کے باوجود عمل نہ کرنا ، اس بات

کا سبب ہوتا ہے کہ طلاق اور علیحدگی کے وقت گھرانوں اور خصوصًا اولاد کے لیے بہت سی مشکلات پیدا ہو جائیں۔ اس کا سبب سوائے اس کے اور کچھ نہیں ہے کہ مسلمان قرآن کے فیض بخش چشمہ سے دُور ہو گئے ہیں۔ مثلاً اس بات کے باوجود کہ قرآن صراحت کے ساتھ یہ کہتا ہے کہ عورتیں عدّت کے دوران شوہر کے گھر سے باہر نہ جائیں، اور نہ ہی شوہر کو یہ حق ہے کہ وہ انھیں گھر سے نکالے۔ یہ ایسا عمل ہے کہ اگر اسی طرح انجام پا جائے تو اکثر عورتوں کے ازدواجی زندگی کی طرف لوٹ آنے کی بہت زیادہ اُمید ہے۔ لیکن آپ بہت کم مسلمان مرد اور مسلمان عورت کو دیکھیں گے، جو طلاق وجُدائی کے بعد اس اسلامی حکم پر عمل کرتے ہوں۔ یہ امر واقعی طور پر قابلِ افسوس ہے ٭

٭ ٭ ٭

⑧ وَ كَاَيِّنْ مِّنْ قَرْيَةٍ عَتَتْ عَنْ اَمْرِ رَبِّهَا وَ رُسُلِهٖ فَحَاسَبْنٰهَا حِسَابًا شَدِيْدًا ۙ وَّ عَذَّبْنٰهَا عَذَابًا نُّكْرًا ۝

⑨ فَذَاقَتْ وَبَالَ اَمْرِهَا وَ كَانَ عَاقِبَةُ اَمْرِهَا خُسْرًا ۝

⑩ اَعَدَّ اللّٰهُ لَهُمْ عَذَابًا شَدِيْدًا ۙ فَاتَّقُوا اللّٰهَ يٰۤاُولِي الْاَلْبَابِ ۚ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۛ قَدْ اَنْزَلَ اللّٰهُ اِلَيْكُمْ ذِكْرًا ۝

⑪ رَّسُوْلًا يَّتْلُوْا عَلَيْكُمْ اٰيٰتِ اللّٰهِ مُبَيِّنٰتٍ لِّيُخْرِجَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ؕ وَ مَنْ يُّؤْمِنْۢ بِاللّٰهِ وَ يَعْمَلْ صَالِحًا يُّدْخِلْهُ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَاۤ اَبَدًا ؕ قَدْ اَحْسَنَ اللّٰهُ لَهٗ رِزْقًا ۝

* * *

ترجمہ

⑧ کتنے ہی شہر اور آبادیاں ایسی ہیں جن کے رہنے والوں نے خدا اور اس

کے رسولوں کے فرمان سے سرپیچی کی تو ہم نے بھی ان کا حساب شدت کے ساتھ چکایا اور انھیں بہت ہی بُرے عذاب میں گرفتار کر دیا۔

(۹) انھوں نے اپنے کردار و عمل کا وبال چکھا اور ان کا انجام کار خسارہ اور نقصان تھا۔

(۱۰) خُدا نے ان کے لیے شدید عذاب فراہم کیا، پس اے صاحبانِ ایمان وعقل! تم خُدا کے حکم کی مخالفت سے پرہیز کرو۔ (کیونکہ) خُدا نے تم پر وہ چیز نازل کی ہے جو تمھارے لیے ایک نصیحت ہے۔

(۱۱) تمھاری طرف ایک رسولؐ بھیجا ہے جو خدا کی واضح آیات کی تم پر تلاوت کرتا ہے، تاکہ ان لوگوں کی جو ایمان لانے اور عمل صالح انجام دیتے ہیں، تاریکیوں سے نور کی طرف ہدایت کرے۔ اور جو شخص خدا پر ایمان لاتا، اور عمل صالح انجام دیتا ہے، خدا اسے اس جنت کے باغات میں وارد کرے گا جن کے درختوں کے نیچے نہریں جاری ہیں، وہ ہمیشہ ہمیشہ ان میں رہیں گے اور خدا نے ان کے لیے اچھی روزی قرار دی ہے۔

❖ ❖ ❖

تفسیر

سرکشوں کا دردناک انجام

قرآن کا شیوہ یہ ہے کہ اکثر مواقع پر عملی احکام کے ایک سلسلے کو بیان کرنے کے بعد گذشتہ امتوں کے حالات کی طرف اشارہ کرتا ہے، تاکہ مسلمان ان کی سرگذشت میں اطاعت وعصیاں کا نتیجہ اپنی آنکھ سے دیکھ لیں اور یہ مسئلہ بطور خود ایک حسی صورت اختیار کرلے۔ اِسی لیے اس سورہ میں بھی طلاق وعلیحدگی کے موقع پر مردوں اور عورتوں کے وظائف اور ذمہ داریاں بیان کرنے کے بعد اسی مطلب کو پیش کر کے گنہگاروں اور سرکشی کرنے والوں کو خبردار کرتا ہے۔

پہلے فرماتا ہے: "کتنے ہی شہر اور آبادیاں ایسی تھیں جن کے رہنے والوں نے خُدا اور اس کے رسولوں کے فرمان سے سرپیچی کی تو ہم نے بھی ان کا حساب شدت کے ساتھ چکایا اور انھیں بہت ہی بُرے عذاب میں

گرفتار کر دیا۔" (وکأیّن من قریۃ عتت عن امر ربھا و رسلہ فحاسبناھا حسابًا شدیدًا وعذبناھا عذابًا نکرًا)۔[1]

"قریۃ" سے مُراد، جیسا کہ ہم نے پہلے بھی بیان کیا ہے، انسانوں کے اجتماع کی جگہ ہے، چاہے وہ شہر ہو یا گاؤں۔ اور یہاں مُراد اس میں رہنے والے ہیں۔

"عُتت"، "عتو" (بروزن غلو) کے مادّہ سے اطاعت سے روگردانی کرنے کے معنی میں ہے۔

"نُکرًا"، (بروزن شکر) ایسی مشکل کے معنی میں ہے کہ جس کی مثال نہ ہو یا بہت کم پائی جاتی ہو۔

"حسابًا شدیدًا" یا تو دقیق اور سخت گیری کے ساتھ حساب لینے کے معنی میں یا شدید عذاب کے معنی میں ہے کہ جو دقیق حساب کا نتیجہ ہے۔ بہرحال یہ ان سرکش اقوام کے اس دنیا میں عذاب کی طرف اشارہ ہے کہ کسی قوم کی طوفان کے ساتھ، کسی گروہ کی تباہ کرنے والے زلزلے کے ساتھ اور کسی گروہ کی صاعقہ یعنی بجلی اور اسی قسم کی چیزوں کے ساتھ بیخ کنی کی گئی، اور ان کے تباہ اور ویران شدہ شہر و دیار آنے والے لوگوں کے لیے درسِ عبرت کی صورت میں باقی رہ گئے۔

❊ ❊ ❊

لہٰذا بعد والی آیت میں مزید کہتا ہے: "انھوں نے اپنے کفر و گناہ کا عذاب چکھا اور ان کا انجام کار خسارہ اور نقصان تھا۔" (فذاقت وبال امرھا وکان عاقبۃ امرھا خسرًا)۔

اس سے بڑھ کر خسارہ اور کیا ہوگا کہ وہ خداداد سرمایہ کو ہاتھ سے گنوا بیٹھے اور اس دُنیا کے بازارِ تجارت سے نہ صرف یہ کہ انھوں نے کوئی مال و متاع نہیں خریدا بلکہ انجامِ کار عذاب الٰہی سے نابود ہو گئے۔

بعض نے یہاں "حساب شدید" اور "عذاب نکر" کو عذابِ قیامت کی طرف اشارہ سمجھا، اور فعل ماضی کو مستقبل کے معنی میں لیا ہے۔ لیکن ایسا کرنے کا کوئی سبب موجود نہیں ہے، بالخصوص جبکہ عذاب قیامت کے سلسلہ میں بعد والی آیت میں بات کی جائے گی اور یہ بات خود ایک زندہ گواہ ہے کہ یہاں عذاب سے مُراد عذابِ دنیا ہی ہے۔

❊ ❊ ❊

اس کے بعد اُن کے اُخروی عذاب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے: "خدا نے ان کے لیے شدید عذاب تیار کر رکھا ہے۔" (اعدّ اللہ لھم عذابًا شدیدًا)۔

---

[1] "کأیّن" مشہور علمائے ادب کے نظریہ کے مطابق یہ ایک مرکب اسم ہے۔ "کاف" تشبیہ اور "ئی" سے جو تنوین کے ساتھ قوام ہے۔ چونکہ تنوین اس اسم کی بناء میں داخل ہے اس لیے حالتِ وقف میں بھی پڑھی جاتی ہے، اور قرآن کی کتابت میں بھی لکھی جاتی ہے۔ اور اس کا معنی "کم" خبریہ کے مانند ہے، اگرچہ اس کے ساتھ کچھ فرق ہے، ایک غیر مشہور نظریہ یہ ہے کہ یہ ایک اسم بسیط ہے اور اس کا "کاف" اور "نون" جزو نہ ہے۔

ایک دردناک، شدید، وحشت انگیز، ذلیل کرنے والا اور رُسوا کرنے والا عذاب اور ان کے لیے دوزخ میں ہمیشہ رہنے کی جگہ ابھی سے فراہم ہے۔

جب یہ بات ہے تو "اے صاحبانِ عقل وخرد اور اے ایمان لانے والو! خُدا کے حکم کی مخالفت سے پرہیز کرو" (فاتقوا اللہ یا اولی الالباب الذین امنوا)۔

ایک طرف سے غور وفکر اور دُوسری طرف سے ایمان اور آیاتِ الٰہی تمھیں خبردار کرتی ہیں کہ تم سرکش اور زُوگردانی کرنے والی قوموں کی سرنوشت کو دیکھو اور اس سے عبرت حاصل کرو، کہیں ایسا نہ ہو کہ تم بھی ان کی صف میں جا کھڑے ہو، پھر خدا تمھیں اس جہان میں بھی ہولناک اور بے سابقہ عذاب میں گرفتار کر دے گا۔ اور آخرت کا شدید عذاب بھی تمھارے انتظار میں ہو گا۔

اس کے بعد غور وفکر کرنے والے مومنین کو مخاطب کرتے ہُوئے مزید کہتا ہے: "خُدا نے تم پر ایسی چیز نازل کی ہے جو تمھارے لیے باعثِ نصیحت ہے" (قد انزل اللہ الیکم ذکرا)۔

❖ ❖ ❖

"اور ایک رسُولؐ تمھاری طرف بھیجا ہے، جو خدا کی واضح آیات کی تمھارے سامنے تلاوت کرتا ہے تاکہ ایمان لانے والوں اور عمل صالح بجا لانے والوں کی تاریکیوں سے نور کی طرف ہدایت کرے" (رسولا یتلوا علیکم ایات اللہ مبینات لیخرج الذین امنوا وعملوا الصالحات من الظلمات الی النور)۔

یہاں ذکر سے کیا مُراد ہے؟ اور رسُول سے کون مُراد ہے؟ اس بارے میں مفسّرین کے درمیان اختلاف ہے۔

مفسّرین کا ایک گروہ 'ذکر' کو قرآن کے معنی میں لیتا ہے، جبکہ ایک جماعت نے اس کی رسُولِ خدا کے ساتھ تفسیر کی ہے، کیونکہ آپ لوگوں کے لیے یاد آوری کا سبب ہیں۔ اِس تفسیر کے مُطابق اس کے بعد جو لفظ رسولا آیا ہے اس سے پیغمبر کی ذات مُراد ہے۔ (اور اس کلام میں کوئی محذوف نہیں ہے،) لیکن یہاں "نازل کرنے سے مُراد" خدا کی طرف سے امت کو پیغمبر کے وجود کا عطا کرنا ہے۔

لیکن اگر ذکر کو قرآن مجید کے معنی میں لیں تو 'رسولا' اِس کا بدل نہیں ہو سکتا۔ لہٰذا اس جملے میں ایک محذوف ہے۔ اور تقدیر میں اِس طرح ہے: "انزل اللہ الیکم ذکرا وارسل رسولا" خُدا نے ایک نصیحت والی چیز نازل کی اور ایک رسُول بھیجا۔

بعض نے 'رسولؐ کی 'جبرئیل' کے ساتھ تفسیر کی ہے۔ اِس صُورت میں اس کا نزول نزولِ حقیقی ہو گا، کیونکہ وہ آسمان سے نازل ہوتا تھا۔ لیکن یہ تفسیر "یتلوا علیکم ایات اللہ" "وہ خدا کی آیات تمھارے سامنے پڑھتا ہے" کے جُملہ کے ساتھ سازگار نہیں ہے، کیونکہ جبرئیل براہِ راست مومنین کے سامنے نہیں پڑھتا تھا۔

خلاصہ یہ کہ ان میں سے ہر ایک تفسیر میں ایک اضافہ اور ایک مشکل موجُود ہے، لیکن مجموعی طور پر پہلی

تفسیر (یعنی ذکر کا معنی قرآن اور رسول کا معنی پیغمبر اکرمؐ ہیں) سب سے بہتر ہے۔ کیونکہ قرآن مجید کی بہت سی آیات میں لفظ ذکر کا قرآن پر اطلاق ہوا ہے، خصوصاً جہاں لفظ 'انزال' کے ساتھ ہو، اس طرح سے کہ جب "نزول ذکر" کہا جائے تو یہ قرآن کے معنی کا ہی ادعا کرتا ہے۔

سورۂ نحل کی آیت ۴۴ میں آیا ہے: و انزلنا الیک الذکر لتبین للناس ما نزل الیھم: "ہم نے ذکر کو تجھ پر نازل کیا ہے، تاکہ تو لوگوں کے لیے اس چیز کو بیان کرے جو ان پر نازل ہوئی ہے۔"

نیز سورۂ حجر کی آیت ۶ میں آیا ہے: "و قالوا یا ایھا الذی نزل علیہ الذکر انک لمجنون": دشمنوں نے کہا: "اے وہ شخص کہ جس پر ذکر نازل ہوا ہے تو ایک دیوانہ ہے۔"

اگر آئمہ اہلِ بیتؑ سے بعض روایات میں آیا ہے کہ ذکر سے مراد حضرت رسولؐ ہیں اور ہم 'اہلِ ذکر' ہیں، تو ممکن ہے کہ یہ آیت کے بطون کی طرف اشارہ ہو، کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ 'اہل الذکر' جو آیت فاسئلوا اھل الذکر ان کنتم لا تعلمون (اگر تم نہیں جانتے تو اہلِ ذکر سے پوچھ لو) (نحل ۴۳) میں آیا ہے یہ خاص طور پر اہلِ بیت کے معنی میں نہیں ہے، بلکہ اس کی شانِ نزول میں علماء اہلِ کتاب آتے ہیں۔ لیکن اس بات کی طرف توجہ رکھتے ہوئے کہ 'ذکر' ایک وسیع معنی رکھتا ہے کہ جو پیغمبر اسلامؐ کو شامل ہے تو یہ بھی اس کا ایک مصداق ہوگا۔[1]

بہرحال اس رسول کے بھیجنے اور اس کتاب آسمانی کے نازل کرنے کا اصلی مقصد یہ ہے کہ وہ انھیں آیات الٰہی کی تلاوت کے ذریعے کفر و جہالت، معصیت اور اخلاقی فساد کی تاریکیوں سے باہر نکالتے ہوئے ایمان، توحید اور تقویٰ کے نور کی رہنمائی کرے۔ جبکہ حقیقت میں بعثتِ پیغمبرؐ اور نزولِ قرآن کے تمام اہداف و مقاصد کا خلاصہ اسی ایک جملہ میں آگیا ہے: یعنی تاریکیوں سے باہر نکال کر نور کی طرف لانا۔ اور قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ 'ظلمات' کا صیغہ جمع کے ساتھ اور نور کا صیغہ واحد کے ساتھ ذکر ہوا ہے۔ کیونکہ شرک و کفر و فساد، پراگندگی و کثرت کے عامل ہیں، جبکہ ایمان و توحید و تقویٰ، وحدت و یگانگت کے عامل ہیں۔

آیت کے آخر میں ان لوگوں کے اجر و ثواب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے جو ایمان و عملِ صالح رکھتے ہیں، مزید کہتا ہے: "جو شخص خدا پر ایمان لائے، عملِ صالح بجا لائے اور اسی راستے پر چلتا رہے، تو خدا اُسے جنت کے ان باغات میں داخل کرے گا جن کے درختوں کے نیچے نہریں جاری ہیں۔ وہ ہمیشہ ہمیشہ وہیں پر رہے گا، اور خدا نے اس کے لیے اچھی روزی قرار دی ہے": (ومن یؤمن باللہ ویعمل صالحا یدخلہ جنات تجری من تحتھا الانھار خالدین فیھا ابدًا قد احسن اللہ لہ رزقًا)۔

'یؤمن' اور 'یعمل' کی تعبیر فعل مضارع کی صورت میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ ان کا ایمان اور عملِ صالح کسی خاص زمانہ کے ساتھ محدود نہیں بلکہ استمرار و دوام رکھتا ہے۔[2]

---

[1] مزید وضاحت کے لیے تفسیر نمونہ جلد ۱۱ سے رجوع کریں۔ [2] توجہ رکھنی چاہیے کہ جو ضمیریں آیت میں استعمال ہوئی ہیں بعض تو جمع کی صورت میں ہیں اور بعض مفرد کی صورت میں ہیں۔ یہ اس بنا پر ہے کہ جہاں مفرد کی صورت میں ہیں وہاں وہ جنس اور جمع کے معنی میں ہیں۔

خالدین کی تعبیر جنت کی ہمیشگی کی دلیل ہے۔ اس بناء پر اس کے بعد 'ابدًا' کے لفظ کا ذکر "خلود" کے لیے ایک تاکید شمار ہوتا ہے۔

"رزقًا" کی تعبیر "نکرہ" کی صورت میں ان اچھی اچھی روزیوں کی عظمت و اہمیت کی طرف اشارہ ہے جو خدا ان لوگوں کے لیے فراہم کرے گا۔ یہ ایک وسیع مفہوم رکھتا ہے جو آخرت میں ہر قسم کی خدائی نعمت، یہاں تک کہ دنیاوی موہبت کو بھی اپنے اندر لیے ہوئے ہے، کیونکہ ایمان و تقوٰی کا نتیجہ صرف آخرت کے ساتھ مربوط نہیں بلکہ مومن و پرہیز گار لوگ اس دنیا میں بھی پاکیزہ تر، آرام دہ اور زیادہ لذت بخش زندگی رکھتے ہیں۔

❖ ❖ ❖

(۱۲) اَللّٰهُ الَّذِیْ خَلَقَ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ وَّمِنَ الْاَرْضِ مِثْلَهُنَّ ؕ یَتَنَزَّلُ الْاَمْرُ بَیْنَهُنَّ لِتَعْلَمُوْۤا اَنَّ اللّٰهَ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ۙ۬ وَّ اَنَّ اللّٰهَ قَدْ اَحَاطَ بِكُلِّ شَیْءٍ عِلْمًا ۠

❖ ❖ ❖

ترجمہ

(۱۲) خدا نے ہی ساتوں آسمانوں کو پیدا کیا ہے اور اتنی ہی زمینیں (پیدا کی ہیں) اس کا حکم ہمیشہ ان کے درمیان نازل ہوتا ہے تاکہ تم جان لو کہ خدا ہر چیز پر قادر ہے، اور اس کا علم ہر چیز پر احاطہ رکھتا ہے۔

❖ ❖ ❖

تفسیر

خلقت عالم کا مقصد معرفت ہے

سورۂ طلاق کی یہ آخری آیت آسمانوں اور زمینوں کی خلقت میں اللہ کی قدرت کی عظمت اور اس خلقت کے مقصدِ اصلی کی طرف ایک پُرمعنی اور واضح اشارہ ہے۔ نیز یہ ان مباحث کی تکمیل کر رہا ہے جن میں پرہیزگار مومنین کے لیے ثوابِ عظیم کے وعدے کے سلسلے میں اور اسی طرح ان وعدوں کے سلسلے میں جو ان کی مشکلات کی گرہ کھولنے کے بارے میں کیے تھے۔ یہ بات واضح ہے کہ وہ خدا جو اس عظیم خلقت پر قدرت رکھتا ہے، وہ اس جہان میں بھی اور دوسرے جہان میں بھی ان وعدوں کو پورا کرنے کی طاقت اور قوت رکھتا ہے۔

پہلے فرماتا ہے: "خدا وہی ہے جس نے ساتوں آسمان پیدا کیے" (اللہ الذی خلق سبع سمٰوٰت)۔

"اور اتنی ہی زمینیں پیدا کی ہیں" (ومن الارض مثلھن)۔

یعنی جس طرح آسمان سات ہیں اسی طرح زمینیں بھی سات ہیں۔

یہ قرآن مجید کی واحد آیت ہے جو سات زمینوں کی طرف اشارہ کرتی ہے۔

اب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ ان سات آسمانوں اور اتنی ہی زمینوں سے کیا مُراد ہے؟ اس سلسلے میں ہم نے تفسیر نمونہ جلد اوّل میں، سورہ بقرہ کی آیت ۲۹ کے ذیل میں اور جلد ۲۰ میں سورہ حٰم سجدہ کی آیت ۱۲ کے ذیل میں تفصیلی بحث کی ہے۔ لہٰذا یہاں ایک مختصر سے اشارہ پر قناعت کرتے ہیں اور وہ یہ ہے:

ممکن ہے کہ سات کے عدد سے مُراد وہی کثرت ہو، کیونکہ یہ تعبیر قرآنِ مجید میں اور اس کے علاوہ بھی کثرت کے معنی میں آتی ہے، جیسے ہم کہتے ہیں اگر تم سات سمندر بھی لے آؤ تو کافی نہیں ہوں گے۔

اس بنا پر سات آسمانوں اور سات زمینوں سے مُراد آسمانی کواکب اور زمین سے مشابہ کُروں کی عظیم و کثیر تعداد ہے۔

لیکن اگر ہم سات کے عدد کو تعداد اور گنتی کے لیے سمجھیں تو اس کا مفہوم سات آسمانوں کا وجود ہوگا۔ چنانچہ سورۂ صافات کی آیت ۶ کہتی ہے: "انا زینا السماء الدنیا بزینۃ الکواکب: ہم نے نزدیکی آسمان (پہلے آسمان) کو کواکب اور ستاروں سے زینت بخشی ہے"۔ اس کی طرف توجہ کرنے سے واضح ہو جاتا ہے کہ جو کچھ ہم دیکھ رہے ہیں اور انسانی علم و دانش جس پر احاطہ رکھتی ہے وہ سب کچھ پہلے آسمان سے مربوط ہے۔ لیکن ان ثوابت و اشارات کے علاوہ اور بھی چھ عالم موجود ہیں جو ہمارے علم کی دسترس سے باہر ہیں۔

یہ بات تو سات آسمانوں کے بارے میں تھی۔ باقی رہا سات زمینوں کے بارے میں تو ممکن ہے کہ یہ کرہ زمین کے مختلف طبقات کی طرف اشارہ ہو۔ کیونکہ اِس وقت یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ زمین طرح طرح کے پردوں اور تہوں سے بنی ہے۔ یا یہ زمین کے سات بر اعظموں کی طرف اشارہ ہے۔ جیسا کہ آج کے زمانے میں اور گزشتہ زمانے میں بھی کرۂ زمین کو سات منطقوں میں تقسیم کرتے تھے۔ (البتہ گزشتہ اور موجودہ زمانے کے طرزِ تقسیم میں فرق ہے۔ موجودہ زمانہ میں دو منجمد منطقوں شمالی و جنوبی، دو معتدل منطقوں، دو گرم منطقوں اور ایک استوائی منطقہ میں تقسیم ہوتی ہے۔ لیکن گزشتہ زمانہ میں سات اقلیمیں (بر اعظم) دوسری شکل میں تقسیم ہوتی تھیں)

لیکن ممکن ہے کہ یہاں بھی سات کا عدد جو "مثلھن" کی تعبیر سے معلوم ہوتا ہے تکثیر کے لیے ہی ہو، اور یہ بھی متعدد زمینوں کی طرف اشارہ ہو کہ جو عالم ہستی میں موجود ہیں۔ یہاں تک کہ بعض ماہرین فلکیات کہتے ہیں کہ کرۂ زمین سے مشابہ وہ کرّے جو اس عظیم عالم میں مختلف آفتابوں کے گرد گردش کر رہے ہیں، ان کی کم از کم تعداد تین سو ملین ہے۔ [1]

اگرچہ منظومۂ شمسی کے علاوہ اجرام کے بارے میں ہم جو معلومات رکھتے ہیں۔ ان کے ناکافی ہونے کے باعث

---

[1] "تفسیر مراغی" جلد ۲۸ ص ۱۵۱۔ ایک حدیث جو امیر المومنین حضرت علیؑ سے نقل ہوئی ہے، اس میں بھی آیا ہے: (بقیہ اگلے صفحہ پر)

ان کی تعداد مقرر کرنا خاصا مشکل ہو جاتا ہے۔ لیکن بہرحال دوسرے ماہرینِ فلکیات بھی اس بات کی تائید کرتے ہیں، کہ اس کہکشاں میں کہ منظومہ شمسی جس کا ایک جزء ہے، کئی ملین کرّے موجود ہیں، جو کرۂ زمین سے مشابہ اور حیات و زندگی کا مرکز ہیں۔

البتہ ممکن ہے کہ آگے چل کر علم و دانش میں انسان کی پیش رفت، اس قسم کی آیات کے بارے میں ہمیں مزید اطلاعات مہیا کر سکے۔

اس کے بعد خدا کے حکم و فرمان کے ذریعے اس عظیم عالم کی تدبیر کے مسئلہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مزید کہتا ہے: "اس کا حکم و فرمان ہمیشہ ان کے درمیان نازل ہوتا رہتا ہے": (یتنزل الامر بینھن)۔

یہ بات واضح ہے کہ یہاں امر سے مراد وہی خدا کا حکم و امر تکوینی ہے جو وہ اس عالم بزرگ اور ساتوں آسمانوں اور زمینوں کی تدبیر کے سلسلے میں جاری کرتا ہے، کیونکہ وہ ہمیشہ اپنے مخصوص حکم کے ساتھ ایک منظم طریقے سے ہدایت و رہبری کرتا ہے۔ حقیقت میں یہ آیت سورہ سجدہ کی آیت ۴ کے مشابہ ہے جس میں فرماتا ہے: "یدبر الامر من السماءِ الی الارض: "وہ آسمان سے لے کر زمین تک تدبیرِ امور کرتا ہے۔"

بہرحال اگر اس کی تدبیر ایک لمحہ کے لیے بھی اس عالم سے جدا ہو جائے تو سارا نظام درہم برہم ہو جائے، اور سب کے سب فنا ہو جائیں۔

آخر میں اس عظیم خلقت کے ہدف کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتا ہے: "یہ سب کچھ اس بناء پر ہے تاکہ تم جان لو کہ خدا ہر چیز پر قادر ہے اور اس کا علم و آگہی ہر چیز پر محیط ہے": (لتعلموا ان اللہ علی کل شیء قدیر و ان اللہ قد احاط بکل شیء علما)۔

کتنی عمدہ تعبیر ہے کہ وہ اس عظیم خلقت کا ہدف یہ قرار دیتا ہے کہ انسان خدا کے علم اور اس کی قدرت کی صفات سے آگاہ ہو جائے کیونکہ ان دو صفات سے آگاہی انسان کی تربیت کے لیے کافی ہے۔

انسان کو یہ جان لینا چاہیے کہ خدا اس کے وجود کے تمام اسرار پر احاطہ رکھتا ہے اور اس کے تمام اعمال سے باخبر ہے۔ نیز اسے یہ بھی جان لینا چاہیے کہ معاد و قیامت، جزاء و سزا اور مومنین کی کامیابی کے بارے میں خدا کے وعدوں میں کسی تخلف کا شائبہ تک نہیں ہے۔

ہاں! وہ خدا جو اس قسم کا علم و قدرت رکھتا اور عالم ہستی کے نظام کا ادارہ کرتا ہے۔ اگر اس نے انسانوں کی زندگی کے بارے میں طلاق اور عورتوں کے حقوق سے مربوط کچھ احکام صادر فرمائے ہیں تو وہ سب کے سب دقیق اور پختہ حساب پر مبنی ہیں۔

(بقیہ صفحہ سابقہ) لھذہ النجوم التی فی السماء مدائن مثل المدائن التی فی الارض: "ان ستاروں میں بھی جو آسمان پر ہیں وئے زمین کے شہروں کی طرح کے شہر ہیں"۔ (تفسیر برہان جلد ۴ ص ۱۵)

"ہدف آفرینش" کے سلسلے میں ہم نے تفسیرِ نمونہ کی جلد ۲۲ سورہ ذاریات کی آیت ۵۶ کے ذیل میں ایک تفصیلی بحث کی ہے۔

قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ قرآن کی مختلف آیات میں انسان کی خلقت کے ہدف کی طرف یا اس جہان کی خلقت کے ہدف کی طرف ایسے اشارے ہوئے ہیں جو ابتداء میں مختلف دکھائی دے سکتے ہیں۔ لیکن اگر ہم غور سے دیکھیں تو وہ سب ایک ہی حقیقت کی طرف لوٹتے ہیں۔

۱ : سورۂ ذاریات کی آیت ۵۶ میں انسان اور جن کی خلقت کا مقصد "عبادت" کو قرار دیا ہے۔ "وما خلقت الجن والانس الا لیعبدون"۔

۲ : سورہ ہود کی آیت ۷ میں آسمانوں اور زمین کی عظیم خلقت کا ہدف و مقصد انسان کی آزمائش بتائی گئی ہے۔ "وھو الذی خلق السماوات والارض فی ستۃ ایام وکان عرشہ علی الماء لیبلوکم ایکم احسن عملاً"

۳ : سورہ ہود کی آیت ۱۱۹ میں ہدف و مقصد خدا کی رحمت کو قرار دیا ہے۔ "ولذالک خلقھم"

۴ : آخر میں زیرِ بحث آیت میں خدا کی صفات کے علم و آگہی کو ہدف بتایا ہے۔ (لتعلموا...)

ان آیات میں تھوڑا سا غور کرنے سے معلوم ہو جاتا ہے کہ ان میں سے بعض بعض کے لیے مقدمہ ہیں۔ آگاہی، معرفت، بندگی و عبادت کے لیے ایک مقدمہ ہے۔ وہ انسان کی آزمائش اور تربیت کے لیے ایک مقدمہ ہے اور وہ خدا کی رحمت سے فیض یاب ہونے کے لیے ایک مقدمہ ہے (غور کیجئے)

* * *

خداوندا! اب جبکہ تو نے ہمیں اپنی عظیم خلقت کے ہدف سے آشنا کر دیا ہے اس عظیم ہدف تک پہنچنے کے سلسلہ میں ہماری مدد فرما!

پروردگارا! تیرا علم و قدرت بے پایاں ہے اور تیری رحمت بھی غیر متناہی ہے، ہمیں اس بے انتہا رحمت کا ایک حصہ عنایت فرما!

بارِ الٰہا! تو نے قرآن و پیغمبرؐ کو ظلمات سے نور کی طرف لانے والے بنا کر بھیجا ہے۔ ہمیں گناہ اور ہوائے نفس کی ظلمت اور تاریکی سے باہر نکال لے اور ہمارے دلوں کو نورِ ایمان و تقویٰ سے منور کر دے!

آمین یا رب العالمین

* * *

سورۂ طلاق کا اختتام : ۲۸ رمضان المبارک ۱۴۰۶ھ

اختتام ترجمہ ۲ ذی الحجہ ۱۴۰۷ھ، مطابق ۲۹ جولائی ۱۹۸۷ء

بروز بدھ صبح ۵ بجکر ۴۱ منٹ، ۸۱، ای ماڈل ٹاؤن، لاہور

سورۂ تحریم

یہ سورہ مدینہ میں نازل ہوا اور اس کی ۱۲ آیات ہیں۔

آغاز
آخر رمضان المبارک ، ۱۴۰۶ھ

سورۂ تحریم کے مضامین

اِس سورہ کے بُنیادی طور پر چار حصّے ہیں :

پہلا حصّہ : یہ پہلی آیت سے پانچویں آیت تک ہے جو پیغمبرؐ اور ان کی بعض بیویوں کے ایک واقعہ سے مربُوط ہے ۔ آنحضرتؐ نے حلال غذاؤں میں سے کسی چیز کو اپنے اوپر حرام قرار دے لیا تو مذکورہ آیات نازل ہوئیں اور پیغمبرؐ کی ان بیویوں کو ملامت ہُوئی کہ جس کی تفصیل انشاء اللہ شانِ نزول میں بیان ہوگی ۔

دوسرا حصّہ : یہ آیت ۶ سے شروع ہو کر آیت ۸ تک جاتا ہے ، اور تمام مومنین سے ایک کلّی خطاب ہے ۔ یہ گھر والوں کی تعلیم و تربیت کے معاملے میں نگران رہنے اور گناہوں سے توبہ کے ضروری ہونے کے بارے میں ہے ۔

تیسرا حصّہ : یہ صرف ایک ہی آیت ہے جس میں پیغمبرؐ کو کفّار و منافقین سے جنگ اور جہاد کرنے کے بارے میں خطاب ہُوا ہے ۔

چوتھا حصّہ : یہ سُورۃ کا آخری حصّہ ہے جو آیت ۱۰ سے آیت ۱۲ تک ہے ۔ اس میں خدا نے گزشتہ بحث کو واضح کرنے کے لیے دو صالح اور نیک خواتین (مریمؑ اور آسیہ زوجۂ فرعون) اور دو غیر صالح خواتین (زوجۂ نوحؑ اور زوجۂ لُوطؑ) کے حالات کی تفصیل بیان فرمائی ہے ۔ اس میں درحقیقت تمام مسلمانوں کی بیویوں اور خصوصیت سے پیغمبرؐ کی بیویوں کو تنبیہ کرتا ہے کہ وہ خود کو پہلے گروہ (مریمؑ و آسیہ زوجہ فرعون) سے ہم آہنگ کریں ، دُوسرے گروہ کے ساتھ نہیں ۔

* * *

تلاوت کی فضیلت

ایک حدیث میں رسُولِ خُدا سے اس طرح نقل ہُوا ہے :

"جو شخص سورہ تحریم کو پڑھے گا ۔ اعطاہ اللہ توبۃ نصوحًا : تو خدا اسے خالص توبہ کی توفیق عطا فرمائے گا ۔"[1]

ایک حدیث میں امام جعفر صادقؑ سے آیا ہے :

---

[1] مجمع البیان جلد ۱۰ ص ۳۱۱

"جو شخص سورہ طلاق و تحریم کو واجب نماز میں پڑھے گا، خدا اُسے قیامت میں خوف و ہراس سے پناہ دے گا۔ جہنم کی آگ سے رہائی بخشے گا، اور اُسے اس سورہ کی تلاوت اور اس پر مداومت کی بنا، پر جنت میں داخل کرے گا، کیونکہ یہ دونوں سورتیں پیغمبرؐ کے ساتھ مخصوص ہیں۔" [1]

* * *

[1] "ثواب الاعمال" بحوالہ نقل "نور الثقلین" جلد ۵ ص ۳۶۷

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

۱ یٰۤاَیُّهَا النَّبِیُّ لِمَ تُحَرِّمُ مَاۤ اَحَلَّ اللّٰهُ لَكَ ۚ تَبۡتَغِیۡ مَرۡضَاتَ اَزۡوَاجِكَ ؕ وَاللّٰهُ غَفُوۡرٌ رَّحِیۡمٌ ۝

۲ قَدۡ فَرَضَ اللّٰهُ لَكُمۡ تَحِلَّةَ اَیۡمَانِكُمۡ ۚ وَاللّٰهُ مَوۡلٰىكُمۡ ۚ وَهُوَ الۡعَلِیۡمُ الۡحَكِیۡمُ ۝

۳ وَاِذۡ اَسَرَّ النَّبِیُّ اِلٰی بَعۡضِ اَزۡوَاجِهٖ حَدِیۡثًا ۚ فَلَمَّا نَبَّاَتۡ بِهٖ وَاَظۡهَرَهُ اللّٰهُ عَلَیۡهِ عَرَّفَ بَعۡضَهٗ وَاَعۡرَضَ عَنۡ بَعۡضٍ ۚ فَلَمَّا نَبَّاَهَا بِهٖ قَالَتۡ مَنۡ اَنۡۢبَاَكَ هٰذَا ؕ قَالَ نَبَّاَنِیَ الۡعَلِیۡمُ الۡخَبِیۡرُ ۝

۴ اِنۡ تَتُوۡبَاۤ اِلَی اللّٰهِ فَقَدۡ صَغَتۡ قُلُوۡبُكُمَا ۚ وَاِنۡ تَظٰهَرَا عَلَیۡهِ فَاِنَّ اللّٰهَ هُوَ مَوۡلٰىهُ وَجِبۡرِیۡلُ وَصَالِحُ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ ۚ وَالۡمَلٰٓئِكَةُ بَعۡدَ ذٰلِكَ ظَهِیۡرٌ ۝

۵ عَسٰی رَبُّهٗۤ اِنۡ طَلَّقَكُنَّ اَنۡ یُّبۡدِلَهٗۤ اَزۡوَاجًا خَیۡرًا مِّنۡكُنَّ مُسۡلِمٰتٍ مُّؤۡمِنٰتٍ قٰنِتٰتٍ تٰٓئِبٰتٍ عٰبِدٰتٍ سٰٓئِحٰتٍ ثَیِّبٰتٍ وَّاَبۡكَارًا ۝

❊ ❊ ❊

ترجمہ

رحمٰن و رحیم خدا کے نام سے

(۱) اے پیغمبرؐ! جو چیز خدا نے تیرے لیے حلال کی ہے اُسے اپنی بیویوں کو خوش رکھنے کے لیے اپنے اُوپر حرام کیوں کرتے ہو اور خدا غفور و رحیم ہے۔

(۲) خدا نے (ایسے موقعوں کے لیے) تمھاری قسموں کے کھولنے کی راہ کو واضح کر دیا ہے اور خدا ہی تمھارا مولا ہے اور وہ علیم وحکیم ہے۔

(۳) اور اس وقت کو یاد کرو کہ جب پیغمبرؐ نے اپنا ایک راز اپنی بیویوں میں سے بعض کو بتلایا، لیکن جب اس نے اس راز کو افشاء کر دیا تو خُدا نے پیغمبرؐ کو اِس سے آگاہ کیا اور پیغمبرؐ نے اس کا ایک حصّہ تو اس سے بیان کیا اور ایک حصّہ بیان نہ کیا۔ جب پیغمبرؐ نے اپنی بیوی کو اس کی خبر دی تو اس نے کہا کہ آپ کو اس بات سے کس نے آگاہ کیا ہے؟ تو آپ نے فرمایا کہ علیم وخبیر خدا نے مجھے اس بات سے آگاہ کیا ہے۔

(۴) اگر تم دونوں اپنے فعل سے توبہ کر لو (تو اس میں تمھارا نفع ہے) کیونکہ تمھارے دل حق سے پھر گئے ہیں، اور اگر تم دونوں اس کے برخلاف ایک دوسری کی مدد کرتی رہو گی (تب بھی تم اس کا کچھ نہ بگاڑ سکو گی) کیونکہ خُدا اس کا مددگار ہے۔ اور اسی طرح جبرئیل اور صالح مومنین اور ان کے علاوہ تمام فرشتے اس کے پشتیبان ہیں۔

(۵) اگر وہ تمھیں طلاق دے دے تو قریب ہے کہ اس کا پروردگار تمھاری جگہ اس کے لیے تم سے اچھی بیویاں قرار دے جو مُسلمان، مُومن، متواضع، توبہ کرنے والیاں، عبادت گذار اور ہجرت کرنے والیاں ہوں گی اور بیوہ اور باکرہ ہوں گی۔

شانِ نزول

اوپر والی آیات کے شانِ نزول کے بارے میں شیعہ اور اہلِ سُنّت کی تفسیر، حدیث اور تاریخ کی کتابوں میں بہت سی روایات نقل ہُوئی ہیں۔ اُن میں سے جو زیادہ مشہور اور زیادہ مُناسب نظر آتی ہیں وہ ہم یہاں پیش کرتے ہیں اور وہ یہ ہیں:

پیغمبرؐ بعض اوقات (اپنی ایک بیوی) زینب بنت جحش کے پاس جاتے تو زینب آپ کو بٹھا لیتیں اور جو شہد اُنہ کے پاس موجود ہوتا وہ آپ کی خدمت میں پیش کرتیں۔ یہ بات بی بی 'عائشہ' کے کانوں تک پہنچی تو اُن پر بہت گراں گزری، وہ کہتی ہیں: میں نے حفصہ (پیغمبرؐ کی دوسری بیوی) کے ساتھ یہ طے کیا کہ جب بھی پیغمبرؐ ہمارے قریب آئیں تو ہم فوراً یہ کہیں: کیا آپ نے "مغافیر" کھائی۔ (مغافیر ایک گوند تھی جو حجاز کے ایک درخت 'عُرفط' (بروزن ہرمز) سے نکلتی تھی اور اس کی بُو خوشگوار نہیں تھی) پیغمبرؐ اس بات کے پابند تھے کہ آپ کے دہن مُبارک یا لباس سے ہرگز کوئی نامناسب بو نہ آئے بلکہ اس کے برعکس آپ پابندی کے ساتھ خوشبو لگاتے اور مُعطّر رہتے تھے۔

اِس طرح ایک دن پیغمبرؐ حفصہ کے پاس آئے تو اس نے پیغمبرؐ سے یہی بات کہی۔ آنحضرتؐ نے فرمایا: میں نے مغافیر نہیں کھائی بلکہ زینب بنت جحش کے ہاں سے شہد نوش کیا ہے اور میں قسم کھاتا ہوں کہ اب اس کے بعد وہ شہد نہیں پیوں گا۔ (ممکن ہے کہ شہد کی مکھی کسی نامناسب نبات یا شاید مغافیر پر ہی بیٹھی ہو) لیکن تم یہ بات کسی سے نہ کہنا۔ (کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ بات لوگوں کے کانوں تک پہنچے تو وہ کہیں کہ پیغمبرؐ نے ایک حلال غذا کو اپنے اوپر حرام کیوں کر لیا ہے؟ یا وہ اس سلسلے میں یا اس سے مشابہ امور کے بارے میں پیغمبرؐ کے اس عمل کی پیروی کرنے لگیں، یا یہ بات زینب کے کان تک پہنچ جائے تو وہ شکستہ دل ہو)

لیکن انجامِ کار یہ راز اس نے فاش کر دیا اور بعد میں معلوم ہو گیا کہ اصل میں یہ معاملہ تو ایک سازش تھی۔ اس پر پیغمبرؐ کو بہت رنج ہوا تو اوپر والی آیات نازل ہُوئیں اور اس ماجرے کو اس طرح سے ختم کیا گیا کہ پھر پیغمبرؐ کے گھر میں اس قسم کے امُور کا تکرار نہ ہُوا۔[1]

بعض روایات میں یہ بھی آیا ہے کہ پیغمبرؐ اس ماجرے کے بعد ایک ماہ تک اپنی ازواج سے الگ رہے۔ یہاں تک کہ آنحضرتؐ کی طرف سے ان کو طلاق دینے کے ارادہ کی خبر منتشر ہو گئی۔ اس طرح ازواج سخت پریشان اور وحشت زدہ ہو گئیں اور اپنے فعل پر پشیمان ہُوئیں۔

* * *

---

[1] اس اصل حدیث کو بخاری نے اپنی صحیح کی جلد ۶ ص ۱۹۶ میں نقل کیا ہے اور جو وضاحتیں ہم نے قوسین میں لکھی ہیں وہ دوسری کتب سے معلوم ہُوئی ہیں۔

تفسیر

پیغمبرؐ کی بعض ازواج کی شدید سرزنش

اِس میں شک نہیں کہ پیغمبر اسلامؐ جیسے عظیم انسان صرف اپنی ذات سے ہی تعلق نہیں رکھتے تھے بلکہ ان کا تعلق پورے اسلامی مُعاشرے اور عالمِ انسانیت سے تھا۔ اس بناء پر اگر ان کے گھر کے اندر ان کے خلاف سازشیں ہوں، چاہے وہ کتنی ہی چھوٹی اور معمولی کیوں نہ ہوں، تو اُن کے قریب سے آسانی کے ساتھ نہیں گزر جانا چاہیئے۔ یعنی پیغمبرؐ کی حیثیت، مقام اور مرتبہ کو نعوذ باللہ کسی کے بھی ہاتھ میں کھلونا نہیں بننا چاہیئے۔ اگر اس قسم کا کوئی معاملہ پیش آئے تو قاطعیت کے ساتھ اس کا سامنا کرنا چاہیے۔

اوپر والی آیات حقیقت میں خدائے بزرگ و برتر کی طرف سے اس قسم کے واقعہ کے مقابلے اور اپنے پیغمبرؐ کی حیثیت و مقام کی حفاظت کے لیے ایک قطعی اور دو ٹوک فیصلہ ہے۔

سب سے پہلے خود پیغمبرؐ کی طرف رُوئے سخن کرتے ہُوئے کہتا ہے: "اے پیغمبرؐ! جو چیز خدا نے تیرے لیے حلال کی ہے اُسے اپنی بیویوں کو خوش رکھنے کے لیے اپنے اوپر حرام کیوں کرتے ہو"؟ (یاایھا النبی لم تحرم ما احل اللہ لک تبتغی مرضات ازواجک)۔

معلوم ہے کہ یہ شرعی تحریم نہیں تھی بلکہ جیسا کہ بعد والی آیات سے معلوم ہوتا ہے، پیغمبرؐ کی طرف سے قسم کھائی گئی تھی اور ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ بعض مباح چیزوں کے ترک کرنے کی قسم کھانا کوئی گناہ نہیں ہے۔

اس بناء پر "لم تحرم" (اپنے اوپر حرام کیوں کرتے ہو) کا جملہ عتاب اور سرزنش کے عنوان سے نہیں بلکہ ایک قسم کی ہمدردی اور شفقت کا اظہار ہے۔

ٹھیک اس طرح کہ جیسے ایک شخص جو اپنی معاش حاصل کرنے کے لیے بہت زیادہ زحمت اٹھاتا ہے لیکن خود اس سے کچھ زیادہ فائدہ نہیں لیتا، ہم اس سے کہتے ہیں کہ تم اپنے آپ کو اتنی زحمت کیوں دیتے ہو، اور اس زحمت کے ثمرے سے فائدہ کیوں نہیں اُٹھاتے۔

بعدہٗ آیت کے آخر میں مزید کہتا ہے: "خدا غفور و رحیم ہے۔" (واللہ غفور رحیم)۔

یہ عفو و رحمت کی بات ان بیویوں کے بارے میں ہے جنہوں نے اس واقعہ کے اسباب فراہم کیے ہیں۔ یعنی اگر واقعی وہ توبہ کرلیں تو وہ اس کی مشمول ہوں گی۔ یا یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ بہتر تھا پیغمبر اس کی قسم نہ کھاتے، کیونکہ یہ ایک ایسا کام تھا جو احتمالاً آنحضرتؐ کی بعض بیویوں کی جرأت اور جسارت کا سبب بن جاتا۔

بعد والی آیت میں اضافہ کرتا ہے: "خدا نے (ایسے موقعوں کے لیے) تمہاری قسموں کے کھولنے کی

راہ کو واضح کر دیا ہے۔" (قد فرض اللہ لکم تحلۃ ایمانکم)۔ [1]

البتہ اگر قسم کسی ایسے امر کے لیے ہو جس میں کسی کام کا ترک کرنا برتری رکھتا ہو تو پھر قسم پر عمل کرنا چاہیے اس کا توڑنا گناہ ہے اور اس کا کفارہ ہے۔ لیکن اگر وہ قسم کسی ایسی چیز کے لیے ہو جس کا ترک کرنا مناسب نہ ہو (زیر بحث آیت کی مانند) تو پھر اس صورت میں اس کا توڑنا جائز ہے۔ لیکن اس قسم کے احترام کی حفاظت کے لیے بہتر ہے کہ کفارہ بھی دیا جائے۔ [2]

اس کے بعد مزید کہتا ہے: "خدا تمھارا مولا اور تمھارا محافظ و مددگار ہے اور وہ علیم و حکیم ہے" (واللہ مولاکم وھو العلیم الحکیم)۔

اسی لیے اس نے اس قسم کی قسموں سے نجات کی راہ تمھارے لیے ہموار کر دی ہے اور اپنے علم و حکمت کے مطابق تمھارے لیے مشکل کشائی کی ہے۔

روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ پیغمبرؐ نے اس آیت کے نزول کے بعد ایک غلام آزاد کیا، اور جو کچھ اپنے اوپر قسم کی وجہ سے حرام کیا ہوا تھا، اُسے حلال کر لیا۔

* * *

بعد والی آیت میں اس واقعہ کے سلسلے میں مزید تشریح کرتے ہوئے فرماتا ہے: "اس وقت کو یاد کرو جب پیغمبرؐ نے اپنا ایک راز اپنی بیویوں میں سے بعض کو بتلایا، لیکن اس نے راز داری نہ کی اور دوسری کو خبر دے دی۔ خدا نے پیغمبرؐ کو اس افشائے راز سے آگاہ کیا تو پیغمبرؐ نے اس کا ایک حصہ تو اس سے بیان کیا اور ایک حصہ بیان نہ کیا" (واذ اسر النبی الیٰ بعض ازواجہ حدیثًا فلما نبأت بہ واظھرہ اللہ علیہ عرف بعضہ واعرض عن بعض)۔

یہ راز کیا تھا جو پیغمبرؐ نے اپنی بیویوں میں سے بعض کو بتلایا تھا اور اس نے راز داری نہ کی۔ مذکورہ شانِ نزول کے مطابق یہ راز دو مطالب پر مشتمل تھا، ایک اپنی بیوی زینب بنتِ جحش کے پاس شہد کا پینا اور دوسرا آئندہ کے لیے اس کے پینے کو اپنے اوپر حرام کر لینا۔ اس آیت میں اس بیوی سے مراد بی بی حفصہ تھی جو راز داری نہ کر سکی اور اس نے یہ بات سن کر بی بی عائشہ سے بیان کر دی۔

پیغمبرؐ چونکہ وحی کے ذریعے اس افشائے راز سے آگاہ ہو چکے تھے، لہٰذا آپ نے اس کا ایک حصہ

---

[1] راغب 'مفردات' میں کہتا ہے: "جہاں کہیں 'فرض' 'علیٰ' کے ساتھ ہو وہاں 'وجوب' کے معنی دیتا ہے اور جہاں لام کے ساتھ ہو، وہاں عدم ممنوعیت کے معنی میں ہے۔ اس بنا پر زیر بحث آیت میں 'فرض' وجوب کے معنی میں نہیں، بلکہ اجازت کے معنی میں ہے۔ تحلۃ (باب تفعیل کا مصدر ہے) حلال کرنے کے معنی میں ہے یا دوسرے لفظوں میں ایسا کام جو قسم کی گرہ کو کھول دے یعنی کفارہ۔

[2] جیسا کہ تفسیر نمونہ جلد ۵ سورۂ مائدہ کی آیت ۸۹ کی تفسیر سے معلوم ہوتا ہے۔ قسم کا کفارہ دس مسکینوں کو کھانا کھلانا، یا دس افراد کو لباس پہنانا، یا ایک غلام کو آزاد کرنا ہے۔ جو ان میں سے کوئی کام نہ کر سکتا ہو وہ تین روزے رکھے۔

بی بی حفصہ سے بیان کیا اور اس بناء پر کہ وہ زیادہ شرمندہ نہ ہو دوسرا حصہ بیان نہ کیا۔ (ممکن ہے پہلا حصہ اصل شہد کا پینا ہو، اور دوسرا حصہ اسے اپنے اوپر حرام کرنا ہو۔)

بہرحال جب پیغمبرؐ نے بی بی حفصہ کو اس افشائے راز کی خبر دی تو اس نے کہا: "آپ کو اس بات سے کس نے آگاہ کیا؟" (فلما نبأها به قالت من انبأك هذا)۔

آپ نے فرمایا: "علیم وخبیر خدا نے مجھے اس بات سے آگاہ کیا ہے۔" (قال نبأني العليم الخبير)۔

اس تمام آیت سے مجموعی طور پر معلوم ہوتا ہے کہ پیغمبرؐ کی بیویوں میں سے بعض، نہ صرف انھیں اپنی باتوں سے دکھ پہنچاتی تھیں، بلکہ رازداری کا مسئلہ جو ایک باوفا بیوی کی اہم ترین خوبیوں میں ہے، وہ بھی ان میں نہیں تھا۔ ان تمام باتوں کے باوجود، ان کے ساتھ پیغمبرؐ کا سلوک ایسا فراخدلانہ تھا کہ آنحضرتؐ اس تمام راز کو جو اس نے فاش کیا تھا، اس کے سامنے پر کہنے کے لیے تیار نہ ہوئے اور صرف اس کے ایک حصے کی طرف اشارہ کیا۔ اسی لیے ایک حدیث میں امیرالمومنین علیؑ سے آیا ہے:

ما استقصى كريم قط، لان الله يقول عرف بعضه واعرض عن بعض۔

"شریف اور بڑے آدمی اپنے احقاقِ حق کے لیے آخری مرحلے تک آگے نہیں جاتے کیونکہ خدا اس مقام پر پیغمبرؐ کے متعلق کہتا ہے، انھوں نے ایک حصے کی خبر دی اور ایک حصہ بیان نہ کیا۔"[1]

* * *

اس کے بعد ان دو بیویوں کی طرف جو اوپر والی سازش میں شریک تھیں، رُوئے سخن کرتے ہوئے کہتا ہے: "اگر تم اپنے فعل سے توبہ کرلو اور پیغمبرؐ کو دکھ دینے اور آزار پہنچانے سے دستبردار ہو جاؤ تو یہ بات تمھارے فائدہ میں ہے، کیونکہ تمھارے دل اس عمل کی بناء پر حق سے منحرف اور گناہ سے آلودہ ہو چکے ہیں۔" (ان تتوبا الى الله فقد صغت قلوبكما)۔

ان دو بیویوں سے مراد بالاتفاق مفسرین شیعہ واہلِ سنت بی بی حفصہ اور بی بی عائشہ ہیں جو بالترتیب عمر بن خطاب اور ابوبکر بن قحافہ کی بیٹیاں تھیں۔

"صغت" (صغو، کے مادہ سے (عفو کے وزن پر) کسی چیز کی طرف متمائل ہونے کے معنی میں ہے۔ اسی لیے کہتے ہیں: صغت النجوم "یعنی ستارے مغرب کی طرف متمائل ہوئے"۔ اور اسی لیے 'اصغاء' کسی دوسرے کی بات کان دھر کے سننے کے معنی میں آیا ہے۔

زیرِ بحث آیت میں 'صغت قلوبكما' سے مراد ان کے دلوں کا حق سے گناہ کی طرف انحراف تھا۔[2]

---

[1] المیزان جلد ۱۹ ص ۳۹۲

[2] اس تفسیر کے مطابق جو ہم نے اوپر بیان کی اور جسے بہت سے مفسرین نے اختیار کیا ہے، اس آیت میں کچھ محذوف ہے۔ (باقی اگلے صفحہ پر)

اِس کے بعد مزید کہتا ہے : " اگر تم دونوں نے اس (پیغمبرؐ) کے برخلاف اتفاق کر لیا تو بھی تم کچھ نہ کر سکو گی۔ کیونکہ خدا اس کا مولا و یاور و مددگار ہے، اِسی طرح جبرئیل، صالح مومنین اور ان کے علاوہ تمام فرشتے اس کے پشتیبان ہیں۔ (وان تظاهرا عليه فان الله هو مولاه وجبريل وصالح المؤمنين والملائكة بعد ذالك ظهير)۔

یہ تعبیر اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ اس ماجرے نے پیغمبرؐ کے پاک دل اور عظیم رُوح میں کس حد تک منفی اثر چھوڑا تھا، یہانتک کہ خود خدا کو ان کا دفاع کرنا پڑا۔ نیز باوُجود اس کے کہ اس کی قدرت ہر لحاظ سے کافی ہے۔ جبرئیل، صالح المومنین اور دُوسرے فرشتوں کی حمایت کا بھی اعلان کر رہا ہے۔

قابل توجہ بات یہ ہے کہ 'صحیح بخاری' میں ابن عباس سے نقل ہُوا ہے کہ اُنھوں نے فرمایا : میں نے عمر بن خطاب سے پوچھا : پیغمبرؐ کی وہ دو بیویاں کون تھیں جنھوں نے آنحضرتؐ کے خلاف اتفاق کر لیا تھا؟ انہوں نے جواب دیا وہ حفصہ اور عائشہ تھیں۔ اس کے بعد مزید کہا : خدا کی قسم! ہم جاہلیت کے زمانے میں عورتوں کے لیے کسی چیز کے قائل نہیں تھے۔ یہاں تک کہ خُدا نے ان کے بارے میں آیات نازل کر دیں اور ان کے لیے کچھ حقوق مقرر کر دیئے (اور وہ جسور ہو گئیں)۔[1]

تفسیر 'دُرّ المنثور' میں بھی ابن عباس سے ایک مفصل حدیث میں ہے کہ عمر بن خطاب کہتے ہیں : "اس ماجرے کے بعد مجھے معلوم ہُوا کہ پیغمبرؐ نے سب بیویوں سے کنارہ کشی کر لی ہے اور 'مشربۂ ام ابراہیم' نامی مقام پر ٹھہرے ہُوئے ہیں۔ میں آپ کی خدمت میں حاضر ہُوا اور عرض کیا : "یا رسول اللہ! کیا آپ نے اپنی بیویوں کو طلاق دے دی ہے؟" آپ نے فرمایا : "نہیں"! میں نے عرض کیا : "اللہ اکبر! ہم جمعیت قریش ہمیشہ اپنی بیویوں پر مُسلط رہتے تھے، لیکن جب سے ہم مدینہ میں آئے ہیں تو ہم نے کچھ لوگوں کو دیکھا کہ ان کی عورتیں ان پر مُسلط ہیں اور ہماری عورتوں نے بھی اُن سے یہ چیز سیکھ لی ہے۔ ایک دن میں نے دیکھا کہ میری بیوی مجھ سے جھگڑ رہی ہے تو میں نے اس عمل کو عجیب اور بُرا سمجھا۔ اس نے کہا کہ تجھے تعجب کیوں ہو رہا ہے؟ خدا کی قسم! پیغمبرؐ کی بیویاں بھی اُن کے ساتھ ایسا ہی کرتی ہیں۔ یہاں تک بعض اوقات ان سے زیادتی کرتی ہیں۔ تب میں نے اپنی بیٹی حفصہ کو نصیحت کی کہ وہ ایسا نہ کرے اور میں نے اس سے کہا کہ اگر تیری ہمسائی (مراد بی بی عائشہ ہے) ایسا کرے، تو بھی تُو ایسا

(بقیہ سابقہ صفحہ) اور تقدیر میں اس طرح تھی : ان تتوبا الی اللہ کانت خیرلکما (یا اسی معنی کے مشابہ کوئی اور دوسری تقدیر) لیکن بعض نے یہ احتمال دیا ہے کہ شاید آیت میں کوئی محذوف نہ ہو اور صغت قلوبکما کا جملہ شرط کی جزاء ہو (اس قید کے ساتھ کہ جُملہ کا مفہوم حق کی طرف تمایل ہو نہ کہ باطل کی طرف) لیکن یہ احتمال بہت ہی بعید ہے، کیونکہ شرط تو فعل مضارع کی صورت میں ہے اور اکثر نحویوں کے نظریہ کے مُطابق یہ صحیح نہیں ہے۔ ضمناً قلوبکما کا ذکر جمع کے صیغہ کے ساتھ نہ کہ تثنیہ کے صیغہ کے ساتھ اس بنا پر ہُوا ہے کہ دو تثنیوں کا ایک ساتھ ہونا فصاحت کے لحاظ سے نامناسب اور ناپسندیدہ ہے۔ اِس لیے جمع کی صورت میں ذکر ہُوا اور اس کا معنی تثنیہ ہے۔

[1] صحیح بخاری جلد ۶ ص ۱۹۵ (سورہ تحریم کے ذیل میں)

نہ کرنا، کیونکہ اس کے حالات تجھ سے مختلف ہیں"۔[1]

"صالح المومنین" کے بارے میں بھی ایک بحث ہے جو انشاء اللہ نکات کے بیان میں آئے گی۔

* * *

آخری زیر بحث آیت میں خدا تمام ازواج پیغمبر کی طرف رُوئے سخن کرتے ہوئے تہدید آمیز لب ولہجہ میں فرماتا ہے: "اگر وہ تمھیں طلاق دے دے تو اُمید ہے کہ پروردگار تمھاری جگہ اس کے لیے تم سے اچھی بیویاں قرار دے۔ ایسی بیویاں جو مسلمان، مومن، متواضع، توبہ کرنے والیاں، عبادت گزار، خدا کی اطاعت شعار، غیر باکرہ اور باکرہ عورتیں ہوں گی"۔ (عسٰی ربہ ان طلقکن ان یبدلہ ازواجًا خیرًا منکن مسلمات مؤمنات قانتات تائبات عابدات سائحات ثیبات وابکارًا)۔

اس طرح انھیں خبردار کرتا ہے کہ تم یہ خیال نہ کرنا کہ پیغمبرؐ تمھیں ہرگز طلاق نہیں دے گا، اور یہ بھی تصور نہ کرنا کہ اگر وہ تمھیں طلاق دے دے تو تمھاری جگہ آنے والی بیویاں تم سے بہتر نہیں ہوں گی۔ لہٰذا تم سازش جھگڑے اور آزار واذیت سے باز آجاؤ ورنہ پیغمبرؐ کی زوجیت کے اعزاز و افتخار سے ہمیشہ کے لیے محروم ہوجاؤ گی اور تم سے بہتر اور بافضیلت عورتیں تمھاری جگہ لے لیں گی۔

* * *

چند نکات

۱: اچھی بیوی کے اوصاف

یہاں قرآن نے ایک اچھی بیوی کے لیے چھ صفات بیان کی ہیں تاکہ وہ سب مسلمانوں کے لیے بیوی کا انتخاب کرتے وقت نمونہ بن سکیں۔

پہلی صفت "اسلام" ہے اور اس کے بعد "ایمان" ہے۔ یعنی ایسا اعتقاد جو انسان کے دل کی گہرائیوں میں نفوذ کر جائے۔ اس کے بعد "قنوت" یعنی تواضع، انکساری اور شوہر کی اطاعت ہے۔ اس کے بعد "توبہ" یعنی اگر اس سے کوئی غلط کام سرزد ہو جائے تو وہ عذر خواہی کرے اور اپنی غلطی پر اصرار نہ کرے۔ اس کے بعد خدا کی عبادت اور ایسی "عبادت" جو اس کی روح و جان کو سنوار دے، اور اسے پاک و پاکیزہ بنا دے۔ اس کے بعد "فرمانِ خدا کی اطاعت" اور ہر قسم کے گناہ سے پرہیز کا ذکر ہوا ہے۔

قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ بہت سے مفسرین نے 'سائحات' جمع 'سائح' کی تفسیر صائم (روزہ دار) کے معنی میں کی ہے۔ لیکن جیسا کہ راغب نے مفردات میں کہا، روزہ دو قسم کا ہوتا ہے "حقیقی روزہ" جو کھانے پینے

---

[1] درالمنثور جلد ۶ ص ۲۴۳ (تلخیص کے ساتھ)

اور تعلق جنسی کو ترک کرنے کے معنی میں ہے۔ دوسرا "حکمی روزہ" جس کا معنی بدن کے اعضاء و جوارح کو گناہوں سے بچانا ہے یہاں اس کا دوسرا معنی مراد ہے۔

(راغب کا یہ قول مقام کی مناسبت کی طرف توجہ کرتے ہوئے بہت ہی عمدہ معلوم ہوتا ہے۔ لیکن جاننا چاہیے کہ مفسرین نے سائح کی تفسیر اس شخص کے لیے بھی کی ہے جو خدا کی اطاعت کی راہ میں سیر کرتا ہے) [1]

یہ بات بھی قابلِ توجہ ہے کہ قرآن نے عورت کے باکرہ اور غیر باکرہ ہونے پر تکیہ نہیں کیا اور اس کو کوئی اہمیت نہیں دی ہے۔ کیونکہ مذکورہ معنوی اوصاف کے مقابلہ میں اس مسئلہ کی کچھ زیادہ اہمیت نہیں ہے۔

* * *

۲ : صالح المؤمنین سے کون مراد ہے ؟

اس میں شک نہیں کہ "صالح المومنین" ایک وسیع معنی رکھتا ہے جو تمام صالح باتقوٰی اور کامل الایمان مومنین کو شامل ہے۔ اگرچہ صالح یہاں مفرد ہے جمع نہیں ہے، لیکن چونکہ جنس کا معنی رکھتا ہے۔ اس لیے اس سے عمومیت کے معنی کا استفادہ ہوتا ہے۔ [2]

لیکن اس بارے میں کہ یہاں اس کا اتم و اکمل مصداق کون ہے ؟ متعدد روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سے مراد امیر المومنین علیؑ ہیں۔

ایک حدیث میں امام محمد باقرؑ سے آیا ہے :

لقد عرف رسول الله (ص) عليًا (ع) اصحابه مرتين : ١٠١ مرة فحيث قال : "من كنت مولاه فعلى مولاه" واما الثانية فحيث نزلت هذه الآية : "فان الله هو مولاه وجبريل و صالح المؤمنين ....." اخذ رسول الله (ص) بيد علي (ع) فقال : ايها الناس هذا صالح المؤمنين !

---

[1] "سائح" "سیاحت" کے مادہ سے اصل میں ان جہانگرد سیاحوں کو کہتے ہیں جو بغیر توشہ و زادِ راہ کے چل پڑتے اور لوگوں کی مدد سے زندگی بسر کرتے تھے۔ چونکہ روزہ دار اپنے آپ کو کھانے سے روکتا ہے یہاں تک کہ افطار کا وقت آ جائے، اس لحاظ سے یہ بات سیاحت کرنے والوں کے مشابہ ہے لہٰذا اس لفظ کا اطلاق "صائم" یعنی روزہ دار پر ہوا ہے۔

[2] بعض نے صالح کو یہاں جمع سمجھا ہے اور کہا ہے کہ اس بات کی طرف توجہ کرتے ہوئے کہ "صالحوا" کی واؤ اضافت کے وقت حذف ہو جاتی ہے، لہٰذا قرآن کے رسم الخط میں بھی نہیں آئی۔ لیکن یہ معنی بعید نظر آتا ہے۔

"حضرت رسُول نے امام علیؑ کا اپنے اصحاب سے دو مرتبہ (صراحت کے ساتھ) تعارُف کرایا۔ ایک مرتبہ تو اس وقت جبکہ آپ نے (غدیر خم میں) فرمایا: من کنت مولاہ فعلی مولاہ: "جس جس کا میں مولا ہوں اُس اُس کا علیؑ مولا ہے، دوسری مرتبہ اس وقت جبکہ آیت ان اللہ ھو مولاہ .... نازل ہُوئی۔ تب حضرت رسولؐ نے امام علیؑ کا ہاتھ پکڑا اور فرمایا: اے لوگو! یہ صالح المومنین ہے"[1]

اس معنی کو بہُت سے علماء اہلِ سُنّت نے بھی اپنی کتابوں میں نقل کیا ہے۔ ان میں علّامہ ثعلبی علّامہ گنجی، ابو حیان اندلسی اور سبط ابن جوزی وغیرہ شامل ہیں۔[2]

بہُت سے مفسّرین اور منجملہ ان کے 'سیوطی' نے 'دُرالمنثور' میں، 'قرطبی' نے اپنی مشہور تفسیر میں اور اسی طرح 'آلوسی' نے 'رُوح المعانی' میں اسی آیت کی تفسیر میں اس روایت کو نقل کیا ہے۔

'رُوح البیان' کا مولّف اس روایت کو 'مجاہد' سے نقل کرنے کے بعد کہتا ہے: "اس حدیث کی تائید مشہور حدیثِ 'منزلت' سے ہوتی ہے کہ جس میں پیغمبرؐ نے امام علیؑ سے فرمایا: 'انت منی بمنزلۃ ھارون من موسٰی': کیونکہ قرآن میں صالحین کا عنوان انبیاء کے لیے آیا ہے۔ منجملہ ان کے سُورۂ انبیاء کی آیت ۷۲ میں وکلًّا جعلنا صالحین اور سورہ یُوسف کی آیت ۱۰۱ میں الحقنی بالصالحین ہے۔ (پہلی آیت میں 'صالح' کا عنوان انبیاء کی ایک جماعت کے لیے اور دوسری میں حضرت یوسف کے لیے آیا ہے۔ اور جب علیؑ بمنزلۂ ہارونؑ ہوں تو آپ بھی صالح کا مصداق ہوں گے۔ (غور کیجیے)

خلاصہ یہ کہ اِس سلسلے میں بہت زیادہ احادیث ہیں، جیسے مفسّرِ معروف محدّث 'بحرانی' 'تفسیر برہان' میں اس سلسلہ کی ایک روایت ذکر کرنے کے بعد محمد بن عباسؒ[3] سے نقل کرتا ہے کہ اس نے اس بارے میں ۵۲ احادیث شیعہ اور اہلِ سُنّت کے طرق سے جمع کی ہیں۔ اس کے بعد وہ خود ان میں سے چند ایک احادیث نقل کرتا ہے۔[4]

۳: پیغمبرؐ کی اپنی بعض بیویوں سے ناراضی

طولِ تاریخ میں ایسے بہُت سے بزرگ گزرے ہیں جن کی بیویاں ان کے شایانِ شان نہیں تھیں اور ان میں ضروری اوصاف نہ ہونے کی وجہ سے اُنھیں تکلیف اُٹھانا پڑتی تھی۔ ان میں سے کچھ نمونے بزرگ انبیاء کے بارے میں قرآنِ مجید میں بیان ہُوئے ہیں:۔

---

[1] تفسیر مجمع البیان جلد ۱۰ ص ۳۱۶

[2] مزید وضاحت کے لیے "احقاق الحق" جلد ۳ ص ۳۱۱ کی طرف رجوع کریں۔

[3] ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ محمد بن عباس وہی ابوعبداللہ ہے جو ابن الحجام کے نام سے مشہور ہے اور کتاب ما نزل من القرآن من اھل بیتؑ کا مؤلف ہے۔ اس کتاب کے متعلق علماء کی ایک جماعت کا کہنا ہے کہ اس کی مثل کوئی کتاب ابھی تک تالیف نہیں ہوئی۔ (جامع الرواۃ جلد ۲ ص ۱۳۴)

[4] تفسیر برہان جلد ۴ ص ۳۵۳ حدیث ۲ کے ذیل میں۔

اوپر والی آیات اس بات کی نشان دہی کرتی ہیں کہ پیغمبرؐ اسلام کی حالت بھی اپنی بعض بیویوں کی طرف سے ایسی ہی تھی۔ ان رقابتوں کی وجہ سے جو وہ ایک دوسری سے رکھتی تھیں، بعض اوقات وہ آنحضرتؐ کی روح پاک کو مجروح کرتی تھیں، کبھی وہ آپ پر اعتراض کرتی تھیں یا آپ کے راز کو فاش کر دیا کرتی تھیں، یہاں تک کہ خدا نے انھیں سرزنش کی اور اپنے پیغمبرؐ کا دفاع کرتے ہوئے اس سلسلے میں تاکیدی فرمان دیا اور انھیں طلاق تک کی تہدید بھی کی۔ جیسا کہ ہم نے معلوم کر لیا ہے کہ اوپر والی آیات میں مذکور واقعہ کے بعد آپ تقریباً ایک ماہ تک اپنی بیویوں سے ناراض رہے کہ شاید وہ اپنی اصلاح کر لیں۔

اصولی طور پر آنحضرتؐ کی تاریخ زندگی اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ پیغمبرؐ کی بعض بیویاں نہ صرف مقام نبوّۃ کی ضروری اور لازمی معرفت نہیں رکھتی تھیں، بلکہ بعض اوقات آپ پر ایک عام آدمی کی طرح اعتراض کیا کرتی تھیں، یہاں تک کہ خدانخواستہ آپ کی توہین بھی کرتی تھیں۔ اس بناء پر اوپر والی آیات کی صراحت کو دیکھتے ہوئے بھی یہ اصرار کرنا کہ سب کی سب شائستہ اور کامل تھیں، بے دلیل نظر آتا ہے۔

تاریخ اسلام نے پیغمبرؐ کے بعد ان کی بیویوں کے بارے میں، خصوصاً داستانِ جنگ جمل نے، اس بات کی نشاندہی کی ہے کہ یہ بات نہ صرف آنحضرتؐ کے زمانے میں تھی بلکہ آپ کے بعد آپ کے جانشینوں کے بارے میں بھی دُہرائی گئی ہے۔ لیکن یہاں ان تمام مسائل کی تفصیل بیان کرنے کی گنجائش نہیں ہے۔

اصولی طور پر اوپر والی آیات کی تعبیر جو یہ کہتی ہے: "اگر پیغمبرؐ تمھیں طلاق دے دے تو خدا اُسے تم سے بہتر بیویاں دے گا جو آیات میں مذکور چھ صفات کی حامل ہوں گی، اس واقعیت و حقیقت کو بیان کر رہی ہے کہ کم از کم آنحضرتؐ کی بعض بیویاں ان اوصاف کی حامل نہیں تھیں۔

پیغمبرؐ کی بیویوں کے بارے میں سورۂ احزاب کی آیات کی طرف رجوع کرنے سے بھی اوپر والے نظریہ کی تائید ہوتی ہے۔

۴: افشائے راز

رازداری نہ صرف حقیقی مومنین کی صفات میں سے ہے بلکہ ہر بار ہر باحیثیت انسان کو راز دار ہونا چاہیے، پھر یہ بات قریبی دوستوں اور زوجہ و شوہر میں بہت زیادہ اہمیت رکھتی ہے۔ اوپر والی آیات میں ہم نے دیکھ لیا ہے کہ پیغمبرؐ کی بعض بیویوں کو رازداری ترک کرنے کی بناء پر خدا نے کیسی شدت کے ساتھ ملامت اور سرزنش کی ہے۔

امام علیؑ ایک حدیث میں فرماتے ہیں:

"جمع خیر الدنیا والآخرۃ فی کتمان السر و مصادقۃ الاخیار، وجمع الشر فی الاذاعۃ ومواخاۃ الاشرار:

"دنیا اور آخرت کی تمام خیر و خوبی ان دو چیزوں میں چھپی ہوئی ہے : راز کو پوشیدہ رکھنا اور نیک افراد سے دوستی۔ اور تمام شر ان دو چیزوں میں چھپا ہوا ہے : رازوں کا افشاء کرنا اور اشرار سے دوستی رکھنا۔

* * *

۵ : حلال خدا کو اپنے اوپر حرام نہیں کرنا چاہیے

وہ امور جو خدا کی طرف سے حلال یا حلام کر دیئے گئے ہیں وہ سب دقیق مصلحتوں کی بناء پر ہوئے ہیں۔ اسی بناء پر اس بات کی کوئی گنجائش نہیں ہے کہ انسان کسی حلال چیز کو اپنے اوپر حرام یا کسی حرام چیز کو اپنے اوپر حلال کرے، یہاں تک کہ اگر اس سلسلے میں قسم بھی کھا لے، جیسا کہ اوپر والی آیات میں آیا ہے تو اس قسم کو توڑ سکتا ہے۔

ہاں ! اگر کوئی ایسا مباح فعل جس کے ترک کی قسم کھائی ہے، کوئی مکروہ فعل ہو یا کسی جہت سے اس کا ترک کرنا اولیٰ اور بہتر ہو تو اس صورت میں اُسے قسم کی پابندی کرنا چاہیے۔

* * *

⑥ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قُوْٓا اَنْفُسَكُمْ وَ اَهْلِيْكُمْ نَارًا وَّقُوْدُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ عَلَيْهَا مَلٰٓئِكَةٌ غِلَاظٌ شِدَادٌ لَّا يَعْصُوْنَ اللّٰهَ مَآ اَمَرَهُمْ وَيَفْعَلُوْنَ مَا يُؤْمَرُوْنَ ۝

⑦ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَا تَعْتَذِرُوا الْيَوْمَ ؕ اِنَّمَا تُجْزَوْنَ مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ۝

⑧ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا تُوْبُوْٓا اِلَى اللّٰهِ تَوْبَةً نَّصُوْحًا ؕ عَسٰى رَبُّكُمْ اَنْ يُّكَفِّرَ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ وَ يُدْخِلَكُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۙ يَوْمَ لَا يُخْزِي اللّٰهُ النَّبِيَّ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ ۚ نُوْرُهُمْ يَسْعٰى بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَبِاَيْمَانِهِمْ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اَتْمِمْ لَنَا نُوْرَنَا وَاغْفِرْ لَنَا ۚ اِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝

❖ ❖ ❖

ترجمہ

⑥ اے ایمان لانے والو! اپنے آپ کو اور اپنے گھر والوں کو اس آگ سے بچاؤ جس کا ایندھن انسان اور پتھر ہوں گے۔ وہ آگ جس پر ایسے فرشتے مقرر ہیں جو بہت ہی سخت گیر اور تند و تیز ہیں۔ وہ کبھی بھی خدا کی مخالفت نہیں کرتے اور اس کے احکام و فرامین کی پوری پوری تعمیل کرتے

۷۔ اے کافرو! آج عذر خواہی نہ کرو، کیونکہ تمھیں تو صرف تمھارے اعمال کا ہی بدلہ دیا جائے گا۔

۸۔ اے ایمان لانے والو! توبہ کرو۔ اللہ کے حضور خالص توبہ۔ امید ہے کہ تمھارا پروردگار اس کی وجہ سے تمھارے گناہ بخش دے گا۔ اور تمھیں جنّت کے ان باغات میں جن کے درختوں کے نیچے نہریں جاری ہیں داخل کرے گا۔ خدا اس دن پیغمبرؐ کو اور ان کے ساتھ ایمان لانے والوں کو ذلیل وخوار نہیں کرے گا۔ ان کا نور ان کے آگے آگے اور ان کے دائیں جانب چل رہا ہوگا اور وہ کہہ رہے ہوں گے: پروردگارا! ہمارے نور کو کامل کر دے اور ہمیں بخش دے۔ بیشک تو ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔

❖ ❖ ❖

تفسیر

اپنے گھر والوں کو جہنم کی آگ سے بچاؤ۔

خدا پیغمبرؐ کی بعض بیویوں کو خبردار کرنے اور انھیں سرزنش کرنے کے بعد زیر بحث آیات میں رُوئے سخن تمام مومنین کی طرف کرتے ہوئے بیوی، اولاد اور گھر والوں کی تعلیم وتربیت کے بارے میں کچھ احکام دیتا ہے۔ پہلے فرماتا ہے: "اے ایمان لانے والو! اپنے آپ کو اور اپنے گھر والوں کو اس آگ سے بچاؤ کہ جس کا ایندھن آدمی اور پتھر ہیں" (یاایھا الذین اٰمنوا قوا انفسکم واھلیکم نارًا وقودھا الناس والحجارۃ)۔

خود کو بچانا تو گناہوں کو ترک کرنے اور سرکش خواہشات کے سامنے سرِ تسلیم خم نہ کرنے کے ساتھ ہے، اور گھر والوں کو بچانا تعلیم وتربیت اور امر بالمعروف ونہی از منکر کرنا نیز گھر اور گھرانے کی فضا میں ایک پاک اور ہر قسم کی آلودگی سے مبرّا ماحول فراہم کرنا ہے۔

یہ وہ طریقہ کار ہے جو گھرانے کے سنگِ بنیاد، یعنی ازدواج کے مقدمات سے اور اس کے بعد بچے کی پیدائش کے پہلے لمحہ سے شروع ہونا چاہیے۔ ان تمام مراحل میں صحیح لائحہ عمل ترتیب دے کر پورے انہماک سے اس پر عمل کرنا چاہیئے۔

دوسرے لفظوں میں بیوی اور اولاد کا حق صرف ان کی ضروریاتِ زندگی، مکان اور کھانے پینے کی چیزوں کے فراہم کرنے سے پورا نہیں ہوجاتا۔ ان سے زیادہ اہم ان کی رُوح اور جان کی غذا کا مُہیا کرنا اور صحیح اصولِ تعلیم وتربیت کو

عمل میں لانا ہے۔

قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ "قوا" (بچاؤ) کی تعبیر اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اگر تم انھیں خود ان کی اپنی حالت پر چھوڑ دو گے تو وہ خواہ نخواہ جہنم کی آگ کی طرف بڑھیں گے۔ صرف تمھیں ان کو جہنم کی آگ میں گرنے سے بچا سکتے ہو۔

"وقود" (بر وزن کبود) جیسا کہ ہم پہلے بھی اشارہ کر چکے ہیں "آتشگیر یعنی ایسے مادہ کے معنی میں ہے جو آگ پکڑنے کے قابل ہو۔ مثلاً ایندھن، (آگ لگانے والے مثلاً دیا سلائی کے معنی میں نہیں ہے) کیونکہ عرب اُسے 'زناد' (چقماق) کہتے ہیں۔

اس لحاظ سے جہنم کی آگ دنیا دی آگ کی مانند نہیں ہے۔ اس کے شعلے خود انسان کے وجود کے اندر سے ہی بلند ہوتے ہیں۔ (اور پتھروں کے اندر سے بھی) نہ صرف گندھک کے پتھر سے جس کی طرف بعض مفسرین نے اشارہ کیا ہے بلکہ ہر قسم کے پتھر سے، کیونکہ آیت کا لفظ مطلق ہے۔ موجودہ زمانے میں ہم جانتے ہیں کہ پتھر کا ہر ٹکڑا ایٹم کے اربوں کھربوں ذرات سے مرکب ہے اور اگر ان کے اندر موجود ذخیرہ آزاد ہو جائے تو ایسی آگ پیدا کر دے کہ انسان دنگ رہ جائے۔

بعض مفسرین نے یہاں 'حجارۃ' کی تفسیر بتوں کے ساتھ کی ہے جو پتھر سے بنائے جاتے تھے اور مشرکین انھیں پوجا کرتے تھے۔

اس کے بعد مزید کہتا ہے: "اس آگ پر ایسے فرشتے مقرر کیے گئے ہیں جو بہت ہی سخت اور تند و تیز ہیں، وہ ہرگز خدا کے حکم کی نافرمانی نہیں کرتے۔ وہ انھیں جو بھی حکم دیتا ہے، اس کی بے چون و چرا تعمیل کرتے ہیں" (علیھا ملائکۃ غلاظ شداد لا یعصون اللہ ما امرھم ویفعلون ما یؤمرون)۔

اس طرح نہ تو بھاگنے کی ہی کوئی راہ ہے اور نہ ہی گریہ و زاری، التماس و التجا اور جزع و فزع ہی موثر ہے۔

یہ بات واضح ہے کہ ہر مامور جس بھی کام پر مقرر ہوتا ہے وہ اس لحاظ سے مناسب جذبات رکھتا ہے۔ لہٰذا عذاب پر مامور افراد کو طبعی طور پر سخت اور تند و تیز ہونا چاہیے۔ کیونکہ جہنم رحمت کا مرکز نہیں ہے بلکہ خدا کے غیظ و غضب کا مرکز ہے۔ لیکن اس کے باوجود وہ مامورین ہرگز عدالت کی سرحد سے خارج نہیں ہوں گے اور حکم خدا کو بے کم و کاست جاری کریں گے۔

یہاں مفسرین کی ایک جماعت نے ایک سوال پیش کیا ہے کہ اوپر والی آیت میں عدم عصیاں کی تعبیر قیامت میں عدم وجود تکلیف کے مسئلہ کے ساتھ کس طرح سازگار ہے؟

لیکن اس بات پر توجہ رکھنی چاہیے کہ فرشتوں کی اطاعت اور ترکِ عصیاں ایک قسم کی تکوینی اطاعت ہے نہ کہ تشریعی اور اطاعتِ تکوینی ہمیشہ موجود رہتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں وہ اس طرح بنائے گئے ہیں کہ خدائی فرامین کا انتہائی میل و رغبت اور خاص لگاؤ کے ساتھ عین اختیار کے ساتھ اجرا کرتے ہیں۔

بعد والی آیت میں کفار کو مخاطب کر کے اس دن کی وضع و کیفیت بیان کرتے ہوئے فرماتا ہے: "اے کافرو آج عذر و معذرت نہ کرو، کیونکہ تمھیں تو صرف تمھارے اعمال ہی کی جزا دی جائے گی" (یاایھا الذین کفروا لا تعتذروا الیوم انما تجزون ما کنتم تعملون)۔

اس آیت کا گزشتہ آیت کے بعد قرار پانا کہ جس میں مخاطب مومنین تھے، اس واقعیت کی طرف اشارہ ہے کہ اگر تم اپنی بیوی اولاد اور گھر والوں کی حالت کا خیال نہ رکھو گے تو ممکن ہے تمھارا معاملہ اس حد تک پہنچ جائے کہ قیامت کے دن اس خطاب سے مخاطب کیے جاؤ۔

انما تجزون ما کنتم تعملون کی تعبیر دوبارہ اس حقیقت کی تائید کرتی ہے کہ قیامت میں گنہگاروں کی جزا، خود انھیں کے اعمال ہیں جو ان کے سامنے ظاہر ہوں گے اور ان کے ساتھ ہوں گے۔ گزشتہ آیت کی تعبیر کہ جہنم کی آگ خود انسانوں کے اندر سے شعلہ زن ہوگی وہ اسی معنی کی تائید کرتی ہے۔

یہ نکتہ بھی قابل توجہ ہے کہ وہاں عذر و معذرت کا قبول نہ ہونا اس بنا پر ہے کہ عذرخواہی ایک قسم کی توبہ ہے اور توبہ صرف اس جہان میں ہی امکان پذیر ہے، نہ کہ دوسرے جہان میں اور نہ ہی جہنم میں ورود کے بعد توبہ کی کوئی گنجائش ہے۔

❊ ❊ ❊

بعد والی آیت حقیقت میں جہنم کی آگ سے نجات کا راستہ بتاتی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: "اے ایمان لانے والو! اللہ کی طرف لوٹ آؤ اور توبہ کرلو، خالص توبہ" (یاایھا الذین آمنوا توبوا الی اللہ توبۃ نصوحا)۔

ہاں! نجات کے لیے پہلا قدم گناہ سے توبہ ہے، ایسی توبہ جو ہر لحاظ سے خالص ہو، ایسی توبہ جس کا محرک حکم خدا اور خوفِ گناہ ہو، نہ کہ گناہ کے اجتماعی اور دنیاوی آثار سے وحشت! ایسی توبہ جو انسان کو ہمیشہ کے لیے معصیت اور نافرمانی سے دور کر دے اور پھر اس میں گناہ کی طرف بازگشت رونما نہ ہو۔

ہم جانتے ہیں کہ توبہ کی حقیقت، وہی گناہ سے ندامت و پشیمانی ہے۔ اس کا لازمہ یہ ہے کہ وہ آئندہ کے لئے گناہ نہ کرنے کا پختہ ارادہ کرلے۔ اگر وہ کوئی ایسا کام تھا جس کی تلافی ہوسکتی ہے تو اس کی تلافی کی کوشش کرے۔ استغفار کرنا بھی اسی معنی کو ظاہر کرتا ہے۔ اور اس طرح سے توبہ کے ارکان کا پانچ باتوں میں خلاصہ کیا جا سکتا ہے:

۱: ترکِ گناہ

۲: ندامت

۳: آئندہ گناہ نہ کرنے کا پختہ ارادہ

۴: گزشتہ گناہوں کی تلافی

۵: استغفار

'نصوح' 'نصح' (بروزن صلح) کے مادہ سے اصل میں خالص خیرخواہی کے معنی میں ہے۔ اسی لیے خالص شہد کو 'ناصح' کہا جاتا ہے۔ چونکہ حقیقی و واقعی خیرخواہی کو مضبوطی کے ساتھ توأم ہونا چاہیئے۔ لہٰذا 'نصح' کا لفظ بعض اوقات اس معنی کے لیے بھی آتا ہے۔

اسی بناء پر محکم عمارت کو 'نصاح' (بروزن کتاب) اور درزی کو 'ناصح' کہا جاتا ہے۔ اِس طرح یہ دونوں معنی یعنی 'خالص ہونا' اور 'محکم ہونا' توبۂ 'نصوح' میں جمع ہونے چاہئیں۔[1]

اس بارے میں کہ توبۂ نصوح کیا ہوتی ہے، مفسّرین نے بہت زیادہ تفاسیر بیان کی ہیں۔ یہاں تک کہ بعض نے ان تفاسیر کی تعداد ۲۳ بتائی ہے۔[2] لیکن وہ سب تفاسیر ایک ہی حقیقت کی طرف لوٹتی ہیں یا وہ توبہ کی مختلف قسمیں اور مختلف اوصاف وصفات ہیں۔

منجملہ ان کے یہ ہے کہ 'توبۂ نصوح' وہ ہوتی ہے جس میں چار اوصاف وشرائط ہوں۔

۱ : قلبی پشیمانی

۲ : زبانی استغفار

۳ : ترکِ گناہ

۴ : آئندہ کے لیے ترکِ گناہ کا پختہ ارادہ

بعض نے کہا ہے کہ توبۂ نصوح وہ ہوتی ہے جس میں تین اوصاف وشرائط ہوں :

۱ : اس بات کا خوف کہ شاید قبول نہ ہو

۲ : اس بات کی اُمید کہ قبول ہو جائے گی۔

۳ : خدا کی اطاعت پر قائم رہنا۔

یا توبۂ نصوح یہ ہے کہ اپنے گناہ کو ہمیشہ اپنی نظر کے سامنے رکھے اور اس سے شرمندہ ہوتا رہے۔

یا توبۂ نصوح یہ ہے کہ جو چیزیں ظلم کے ساتھ لی ہیں وہ ان کے مالکوں کو واپس کر دے، مظلوموں سے حلیت طلب کرے اور خدا کی اطاعت کا پابند رہے۔

یا توبۂ نصوح وہ ہوتی ہے جس میں یہ تین شرطیں ہوں :

۱ : کم بولنا۔ ۲ : کم کھانا۔ ۳ : کم سونا۔

یا توبۂ نصوح وہ ہوتی ہے جو رونے والی آنکھ اور گناہ سے بیزار دل سے توأم ہو .... اور دیگر اسی قسم کے

---

[1] بعض کا خیال یہ ہے کہ 'نصوح' ایک خاص شخص کا نام ہے اور اس سلسلہ میں انہوں نے ایک منقل داستان توبۂ نصوح کے عنوان سے نقل کی ہے۔ لیکن اس بات کی طرف توجہ رکھنی چاہیے کہ نصوح کسی کا نام نہیں ہے بلکہ ایک وصفی معنی ہے، اگرچہ ممکن ہے کہ یہ مشہور واقعہ صحیح ہو۔

[2] تفسیر قرطبی جلد ۱۰ ص ۶۷۶۶

امور جو سب ایک ہی واقعیت کے شاخ و برگ ہیں اور یہ خالص و کامل توبہ ہے۔

ایک حدیث میں پیغمبر گرامیؐ سے آیا ہے کہ جب 'معاذ بن جبل' نے توبۂ نصوح کے بارے میں سوال کیا تو آپ نے جواب میں فرمایا:

"ان یتوب التائب ثم لا یرجع فی ذنب کما لا یعود اللبن الی الضرع"۔

"توبہ نصوح" یہ ہے کہ توبہ کرنے والا شخص پھر کسی طرح بھی گناہ کی طرف نہ لوٹے، جیسا کہ دودھ کبھی پستان کی طرف نہیں لوٹتا۔[1]

یہ لطیف تعبیر اس واقعیت کو بیان کرتی ہے کہ توبۂ نصوح انسان میں اس طرح سے انقلاب برپا کر دیتی ہے کہ اس پر پہلی حالت کی طرف بازگشت کی راہ کلی طور پر بند کر دیتی ہے، جیسا کہ دودھ کی پستان کی طرف بازگشت قطعی طور پر ناممکن ہوتی ہے۔

یہ مطلب جو دوسری روایات میں بھی آیا ہے، حقیقت میں توبۂ نصوح کے اعلیٰ ترین درجہ کو بیان کرتا ہے، ورنہ پچھلے مراحل میں تو یہ ممکن ہے کہ گناہ کی طرف بازگشت ہو جائے اور توبہ کی تکرار کے بعد انجام کار دائمی ترک پر جا منتہی ہو۔

اس کے بعد توبۂ نصوح کے آثار کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مزید کہتا ہے: "امید ہے کہ اس کام کی وجہ سے تمہارا پروردگار تمہارے گناہوں کو بخش دے اور ان کی پردہ پوشی کرے۔" (عسی ربکم ان یکفر عنکم سیئاتکم)۔

"اور تمہیں اس جنت کے باغات میں داخل کرے جس کے درختوں کے نیچے نہریں جاری ہیں۔" (و یدخلکم جنات تجری من تحتها الانهار)۔

"یہ کام اس دن ہوگا جس دن خدا پیغمبرؐ اور ان لوگوں کو جو اس کے ساتھ ایمان لائے ہیں ذلیل و خوار نہیں کرے گا۔" (یوم لا یخزی الله النبی والذین آمنوا معه)۔

"یہ اس حال میں ہوگا کہ ان کا (ایمان اور عمل صالح کا) نور ان کے آگے آگے اور ان کی دائیں جانب چل رہا ہوگا، وہ عرصۂ محشر کو روشن کر دے گا اور بہشت کی طرف ان کی راہ کھول دے گا۔" (نورهم یسعی بین ایدیهم وبایمانهم)۔

یہ وہ منزل ہے کہ جہاں وہ خدا کی بارگاہ کی طرف رُخ کر کے کہیں گے: "پروردگارا! ہمارے نور کو مکمل کر دے اور ہمیں بخش دے کیونکہ تو ہر کام پر قدرت رکھتا ہے۔" (یقولون ربنا اتمم لنا نورنا واغفر لنا انک علی کل شئ قدیر)۔

---

[1] مجمع البیان جلد ۱۰ ص ۳۱۸

حقیقت میں اس توبۂ نصوح کے پانچ عظیم ثمر ہیں :

پہلا : سیئات اور گناہوں کی بخشش۔

دوسرا : خدا کی نعمتوں والی جنّت میں داخلہ۔

تیسرا : اس دن رُسوائی اور ذلّت کا نہ ہونا جس دن سب پردے ہٹ جائیں گے اور جھوٹے تباہ و رُسوا اور ذلیل ہو جائیں گے۔ ہاں! اس دن پیغمبرؐ اور مومنین آبرُومند ہوں گے۔ کیونکہ جو کچھ اُنھوں نے کہا تھا، وہ حقیقت بن جائے گا۔

چوتھا : اُن کے ایمان اور عمل کا نور ان کے آگے آگے اور ان کی دائیں جانب چلے گا اور جنّت کی طرف ان کی راہ کو روشن کر دے گا۔ (بعض مفسّرین نے اس نور کو جو ان کے آگے آگے چلے گا "عمل" کا نُور سمجھا ہے۔ اس سلسلہ میں ہم ایک دوسری تفسیر بھی تفسیر نمُونہ کی جلد ۲۲ میں سورہ حدید کی آیت ۱۲ کے ذیل میں پیش کر چکے ہیں۔)

پانچواں : ان کی توجہ خدا کی طرف زیادہ ہو جائے گی۔ لہٰذا وہ بارگاہِ خدا کی طرف رُخ کر کے اس سے نور کی تکمیل اور اپنے گناہوں کی مکمّل بخشش کا تقاضا کریں گے۔

❊ ❊ ❊

چند نکات

۱: اہل خانہ کی تعلیم و تربیت

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا حُکم ایک عام حکم ہے جو تمام مُسلمان ایک دُوسرے کے لیے رکھتے ہیں لیکن اوپر والی آیات اور ان روایات سے جو اسلامی مصادر میں اولاد وغیرہ کے حقوق کے بارے میں وارد ہُوئی ہیں، اچھی طرح معلوم ہو جاتا ہے کہ انسان اپنی بیوی اور اولاد کے لیے بہت ہی بھاری ذمّہ داری رکھتا ہے۔ اس کی ذمّہ داری یہ ہے کہ جہاں تک اس سے ہو سکے ان کی تعلیم و تربیت میں کوشش کرے، انھیں گناہ سے باز رکھے اور نیکیوں کی طرف دعوت دے، نہ یہ کہ صرف ان کے جسم کے لیے غذا وغیرہ مہیا کرنے پر قناعت کرے۔

حقیقت میں ایک عظیم مُعاشرہ چھوٹی چھوٹی اکائیوں سے مل کر بنتا ہے، جس کا نام خاندان (گھرانا) ہے۔ جب ان چھوٹی چھوٹی اکائیوں کی اصلاح ہو جائے، جن کی دیکھ بھال آسان ہے، تو پھر سارے معاشرے کی اصلاح ہو جاتی ہے اور یہ ذمہ داری پہلے درجہ میں ماں باپ کے کاندھوں پر ہے۔

خصوصاً ہمارے زمانہ میں جب کہ فساد کی تباہ کرنے والی موجیں گھروں کے باہر بہت ہی قوی اور خطرناک

ہیں، انھیں بے اثر کرنے کے لیے گھرانے کی تعلیم وتربیت کا زیادہ بنیادی اور زیادہ دقیق لائحۂ عمل مرتب کیا جانا چاہیے۔

نہ صرف قیامت کی آگ بلکہ دنیا کی آگ کا سرچشمہ بھی انسانوں کے وجود کے اندر سے پیدا ہوتا ہے۔ پس ہر شخص کی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنے گھرانے کو اس آگ سے محفوظ رکھے۔

ایک حدیث میں آیا ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو اصحاب پیغمبرؐ میں سے ایک نے آپ سے سوال کیا: "ہم اپنے گھر والوں کو دوزخ کی آگ سے کس طرح محفوظ رکھیں"؟ آنحضرتؐ نے فرمایا:

"تأمرهم بما امرالله، وتنهاهم عما نهاهم الله ان اطاعوك كنت قد وقيتهم، وان عصوك كنت قد قضيت ما عليك"

"انھیں امر بالمعروف اور نہی از منکر کر، اگر تجھ سے انہوں نے قبول کر لیا تو پھر تو نے انھیں جہنم کی آگ سے بچا لیا، اگر انھوں نے قبول نہ کیا تو تُو نے اپنا وظیفہ اور ذمہ داری پوری کر دی"۔[1]

ایک اور جامع اور عمدہ حدیث میں رسولِ خداؐ سے آیا ہے:

"الا كلكم راع، وكلكم مسئول عن رعيته، فالامير على الناس راع، وهو مسئول عن رعيته، والرجل راع على اهل بيته وهو مسئول عنهم فالمرئة راعية على اهل بيت بعلها وولده وهي مسئولة عنهم، الا فكلكم راع وكلكم مسئول عن رعيته۔"

"یاد رکھو کہ تم سب کے سب نگہبان ہو، اور تم سب ہی جوابدہ ہو ان لوگوں کے لیے جن کی نگہبانی پر تم مامور ہو۔ حکومت اسلامی کا رئیس و امیر تمام لوگوں کا نگہبان ہے۔ لہٰذا وہ ان سب کے لیے جوابدہ ہے اور عورت بھی اپنے شوہر کے گھرانے اور اولاد کی نگہبان ہے اور ان کے بارے میں جوابدہ ہے۔ جان لو کہ تم سب ہی نگہبان ہو، اور تم سب ہی جوابدہ ہو۔ ان لوگوں کے لیے جن کی نگہبانی پر تم مامور ہو۔[2]

ہم اس وسیع بحث کو امیرالمؤمنین علیؑ کی ایک حدیث کے ساتھ ختم کرتے ہیں امامؑ نے اوپر والی آیت

---

[1] نور الثقلین جلد ۵ ص ۳۷۲

[2] "مجموعہ ورام" جلد اول ص ۶

کی تفسیر میں فرمایا :

"علموا انفسکم واھلیکم الخیر وادبوھم"

اس سے مُراد یہ ہے کہ تم خود کو اور اپنے گھر والوں کو نیکی کی تعلیم دو ، اور انھیں آداب سکھاؤ۔ [1]

* * *

۲ : توبہ رحمتِ خدا کا ایک دروازہ ہے۔

اکثر ایسا ہوتا ہے کہ انسان سے ، خصوصاً تربیت اور سیر و سلوک الی اللہ کی ابتداء میں بہت سی لغزشیں ہو جاتی ہیں۔ اب اگر اس کے سامنے توبہ اور بازگشت کے دروازے بند کر دیئے جائیں تو وہ مایوس ہو جائے گا اور ہمیشہ کے لیے سیدھے راستے سے بھٹک جائے گا۔ اِس لیے اسلام کے مکتبِ تربیتی میں توبہ کو ایک تربیتی اصل کے عنوان کے طور پر حد سے زیادہ اہمیت کے ساتھ پیش کیا گیا ہے اور وہ تمام گنہگاروں کو دعوت دیتا ہے کہ اپنی اصلاح اور گزشتہ کوتاہیوں کی تلافی کے لیے اس دروازے سے وارد ہوں۔

امام علیؑ بن الحسینؑ بارگاہِ خداوندی میں تائبین کی مناجات میں اِس طرح سے عرض کرتے ہیں :

"الٰھی انت الذی فتحت لعبادک بابا الی عفوک سمیتہ التوبۃ ، فقلت توبوا الی اللہ توبۃ نصوحا ، فما عذر من اغفل دخول الباب بعد فتحہ"

"اے میرے اللہ تو ہی تو ہے کہ جس نے اپنی عفو و بخشش کی طرف اپنے بندوں کے سامنے ایک دروازہ کھولا ہے کہ جس کا نام تو نے توبہ رکھا ہے۔ تو نے فرمایا ہے کہ خدا کی طرف لوٹو ، اور توبہ کر لو ، خالص توبہ ، اب ان لوگوں کا عذر کیا ہے جو اس دروازہ کے کھلنے کے بعد اس دروازے سے داخل ہونے سے غافل ہو جائیں" ؟ [2]

ایک حدیث میں امام باقرؑ سے آیا ہے :

"ان اللہ تعالیٰ اشد فرحا بتوبۃ عبدہ من رجل اضل راحلتہ وزادہ فی لیلۃ ظلماء ، فوجدھا"

"خداوند تعالیٰ اپنے بندے کی توبہ سے اس سے بھی زیادہ خوش ہوتا ہے جتنا کہ وہ شخص خوش

---

[1] درالمنثور جلد ۶ ص ۲۴۴

[2] پندرہ مناجاتوں میں سے پہلی مناجات ۔ بحار الانوار جلد ۹۴ ص ۱۴۲

* * *

ہوتا ہے جس نے ایک رات میں اپنی سواری اور زادِ راہ گم کر دیا ہو، اور پھر اسے پا لیا ہو۔ [1]

عظمت اور بزرگواری رکھنے والی یہ سب تعبیریں زندگی کے اس اہم امر کی حیاتی تشویق کے لیے ہیں۔

لیکن اس بات کی طرف توجہ رکھنا چاہیئے کہ توبہ صرف تعلقہ لسانی اور زبان سے "استغفراللہ" کہنے کا نام نہیں ہے بلکہ اس کی کچھ شرائط اور ارکان ہیں کہ جن کی طرف اوپر والی آیات میں توبۂ نصوح کی تفسیر میں اشارہ ہوا ہے۔ جب توبہ ان شرائط کے ساتھ انجام پاتی ہے تو وہ اس طرح اثر کرتی ہے کہ وہ انسان کی رُوح اور جان سے گناہ اور آثارِ گناہ کو کلی طور پر محو کر دیتی ہے، اسی لیے ایک حدیث میں امام محمد باقرؑ سے آیا ہے:

"التائب من الذنب کمن لا ذنب له. والمقیم علی الذنب وهو مستغفر منه کالمستهزء!"

"جو شخص گناہ سے توبہ کرلے وہ اس شخص کی مانند ہے جس نے بالکل کوئی گناہ نہیں کیا، جو شخص اپنے گناہ پر برقرار رہے اور استغفار بھی کرتا رہے، تو وہ اس شخص کی مانند ہے جو مذاق اُڑاتا اور تمسخر کرتا ہو۔ [2]

ہم توبہ کے بارے میں دُوسرے تفصیلی مباحث (تیسری جلد میں) سورۃ نساء کی آیت ۱۷ کے ذیل میں اور (جلد ۱۹ میں) سورۃ زمر کی آیت ۵۳ کے ذیل میں پیش کر چکے ہیں۔

❖ ❖ ❖

---

[1] اُصول کافی جلد ۲ باب التوبہ حدیث ۸

[2] اصول کافی جلد ۲ باب التوبہ حدیث ۱۰

⑨ يَاأَيُّهَا النَّبِيُّ جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَالْمُنَافِقِينَ وَاغْلُظْ عَلَيْهِمْ ۚ وَمَأْوَاهُمْ جَهَنَّمُ ۖ وَبِئْسَ الْمَصِيرُ ○

⑩ ضَرَبَ اللَّهُ مَثَلًا لِّلَّذِينَ كَفَرُوا امْرَأَتَ نُوحٍ وَامْرَأَتَ لُوطٍ ۖ كَانَتَا تَحْتَ عَبْدَيْنِ مِنْ عِبَادِنَا صَالِحَيْنِ فَخَانَتَاهُمَا فَلَمْ يُغْنِيَا عَنْهُمَا مِنَ اللَّهِ شَيْئًا وَقِيلَ ادْخُلَا النَّارَ مَعَ الدَّاخِلِينَ ○

⑪ وَضَرَبَ اللَّهُ مَثَلًا لِّلَّذِينَ آمَنُوا امْرَأَتَ فِرْعَوْنَ إِذْ قَالَتْ رَبِّ ابْنِ لِي عِندَكَ بَيْتًا فِي الْجَنَّةِ وَنَجِّنِي مِن فِرْعَوْنَ وَعَمَلِهِ وَنَجِّنِي مِنَ الْقَوْمِ الظَّالِمِينَ ○

⑫ وَمَرْيَمَ ابْنَتَ عِمْرَانَ الَّتِي أَحْصَنَتْ فَرْجَهَا فَنَفَخْنَا فِيهِ مِن رُّوحِنَا وَصَدَّقَتْ بِكَلِمَاتِ رَبِّهَا وَكُتُبِهِ وَكَانَتْ مِنَ الْقَانِتِينَ ○

* * *

ترجمہ

⑨ اے پیغمبرؐ! کفار اور منافقین کے ساتھ جہاد کرو اور ان پر سختی کرو۔ ان کا ٹھکانہ جہنم

ہے۔ اور وہ بُری جگہ ہے۔

(۱۰) خدا نے ان لوگوں کے لیے جو کافر ہو گئے ہیں، ایک مثال دی ہے۔ نوحؑ کی بیوی کی مثال اور لوطؑ کی بیوی کی مثال۔ وہ ہمارے دو صالح بندوں کے ماتحت تھیں۔ لیکن ان دونوں سے انھوں نے خیانت کی، اور ان دونوں (پیغمبروں) کے ساتھ ان کا تعلق (عذاب الٰہی کے مقابلہ میں) انھیں کوئی نفع نہ دے سکا اور ان سے کہا گیا کہ تم بھی آگ میں داخل ہونے والے دُوسرے لوگوں کے ساتھ، آگ میں داخل ہو جاؤ۔

(۱۱) اور خدا نے مومنین کے لیے بھی ایک مثال بیان کی ہے وہ فرعون کی بیوی کی مثال ہے، جبکہ اس نے کہا پروردگارا! میرے لیے اپنے ہاں جنّت میں ایک گھر بنا دے اور مجھے فرعون اور اس کے عمل سے نجات دے اور مجھے ظالم قوم سے رہائی بخش دے۔

(۱۲) اور اسی طرح سے مریمؑ بنتِ عمران کی مثال بیان کی ہے جس نے اپنے دامن کو پاک رکھا اور ہم نے اپنی رُوح میں سے اس میں پھونکا، اس نے پروردگار کے کلمات اور اس کی کتابوں کی تصدیق کی اور وہ خدا کے حکم کی اطاعت کرنے والوں میں سے تھی۔

* * *

تفسیر

مؤمن اور کافر عورتوں کے نمونے

چونکہ منافقین پیغمبرؐ کے گھر کے اندر کے رازوں کے فاش ہونے اور آپ کی بیویوں کے درمیان جھگڑے اور اختلافات کے ظاہر ہونے پر جن کی طرف گزشتہ آیات میں اشارہ ہوا تھا، خوش تھے بلکہ انھیں اور ہوا دیتے تھے، شاید اسی مناسبت سے پہلی زیرِ بحث آیت میں ان کے بارے میں شدّتِ عمل کا حکم دیتے ہوئے فرماتا ہے: "اے پیغمبرؐ! کفّار اور منافقین کے ساتھ جہاد کرو اور ان پر سختی کرو، ان کا ٹھکانہ جہنّم ہے اور وہ بُرا ٹھکانہ ہے۔" (یاایھا النبی جاھد الکفار والمنافقین واغلظ علیھم ومأواھم جھنم وبئس المصیر)۔

یہ جہاد کفار کے مقابلہ میں تو ممکن ہے کہ مسلح یا غیر مسلح ہو، لیکن منافقین کے مقابلہ میں شک نہیں کہ یہ مسلح جہاد نہیں ہے۔ کیونکہ کسی بھی تاریخ میں یہ نقل نہیں ہوا کہ پیغمبرؐ نے منافقین کے ساتھ مسلح جنگ کی ہو۔ لہٰذا ایک حدیث میں امام جعفر صادقؑ سے آیا ہے کہ آپ نے فرمایا:

"ان رسول اللہ لم یقاتل منافقًا قط انما کان یتألفھم"

"رسولِ خداؐ نے ہرگز کسی منافق سے جنگ نہیں کی، بلکہ آپ ہمیشہ ان کی تالیفِ قلوب کی کوشش میں لگے رہتے تھے۔"

اس بناء پر ان کے ساتھ جہاد کرنے سے مُراد وہی توبیخ، سرزنش، انذار، ڈرانا اور انھیں رُسوا کرنا ہے، یا بعض موارد میں ان کی تالیفِ قلوب کرنا ہے، کیونکہ 'جہاد' ایک وسیع و عریض معنی رکھتا ہے۔ اور ہر قسم کی جدّوجہد اور سعی و کوشش کو شامل ہے "واغلظ علیھم" (ان پر سختی اور خشونت کرو) کی تعبیر بھی گفتگو میں سختی اور افشاگری تہدید، دھمکی اور اس قسم کی چیزوں میں سختی کی طرف اشارہ ہے۔

منافقین کے ساتھ یہ مخصوص وضع و کیفیت اِس بناء پر تھی کہ وہ ظاہراً اسلام کا دم بھرتے اور مسلمانوں کے ساتھ مکمل طور پر آمیزش رکھتے تھے، لہٰذا یہ ممکن نہیں تھا کہ ان کے ساتھ ایک کافر جیسا سلوک کیا جائے۔

البتہ یہ اس صورت میں تھا کہ وہ ہتھیاروں کی طرف ہاتھ نہ بڑھائیں۔ اگر وہ یہ کام کرتے تو یقیناً ان کے ساتھ مقابلہ بالمثل ہوتا، کیونکہ اس صورت میں وہ "محارب" کا عنوان اپنے لیے لے لیتے۔

اگرچہ یہ مسئلہ پیغمبر کے زمانہ میں واقع نہیں ہُوا، لیکن آنحضرتؐ کے بعد خصوصاً امیرالمومنینؑ کے زمانہ میں رُونما ہوا اور آپ مسلح جنگ کے لیے کھڑے ہُوئے۔

بعض نے کہا ہے کہ اوپر والی آیت میں "منافقین سے جہاد" کرنے سے مُراد ان کے بارے میں حدود شرعی کا اجراء ہے، کیونکہ وہ لوگ جن پر حد جاری ہُوئی اکثر منافقین تھے۔ لیکن اس تفسیر اور اس دعوے کے لیے کہ اس زمانہ میں زیادہ تر حدُود شرعی ان ہی لوگوں پر جاری ہوئی ہیں، ہمارے پاس کوئی دلیل موجُود نہیں ہے۔

قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ اوپر والی آیت بعینہٖ اور بغیر کسی کمی و زیادتی کے سورۂ توبہ آیت ۷۳ میں بھی آئی ہے۔

* * *

اِس کے بعد دوبارہ پیغمبرؐ کی بیویوں کے ماجرے کی طرف لوٹتا ہے۔ اِس بناء پر کہ انھیں عملی اور زندہ سبق دے، دو بے تقویٰ عورتوں کی سرنوشت جو دو بزرگ پیغمبروں کے گھر میں تھیں، اور دو مومن و ایثارگر خواتین کی سرنوشت بیان کرتا ہے جن میں سے ایک تاریخ کے جابر ترین شخص کے گھر میں تھی۔

پہلے فرماتا ہے: "خدا نے کافروں کے لیے ایک مثال بیان کی ہے۔ نوحؑ کی بیوی کی مثال اور لوطؑ کی بیوی کی مثال۔" (ضرب اللہ مثلًا للذین کفروا امرأت نوح و امرأت لوط)۔[1]

---

[1] ضرب کے یہاں دو مفعول ہیں۔ "امرأۃ نوح" مفعول اوّل ہے جو مؤخر ہوگیا ہے اور 'مثلًا' دوسرا مفعول ہے (باقی اگلے صفحہ پر)

"وہ دونوں ہمارے دو صالح بندوں کے ماتحت تھیں لیکن انہوں نے اُن سے خیانت کی"۔ (کانتا تحت عبدین من عبادنا صالحین فخانتاھما)۔

"لیکن ان دو عظیم پیغمبروں سے ان کے ارتباط نے عذابِ الٰہی کے مقابلہ میں انھیں کوئی نفع نہیں دیا اور اُن سے کہا گیا کہ تم بھی آگ میں داخل ہونے والے لوگوں کے ساتھ آگ میں داخل ہو جاؤ"۔ (فلم یغنیا عنھما من اللہ شیئًا وقیل ادخلا النار مع الداخلین)۔

اس طرح سے پیغمبرِ اسلام کی ان دو بیویوں کو جنھوں نے افشاءِ راز کیا اور آنحضرتؐ کو تکلیف و آزار پہنچایا تھا خبردار کرتا ہے کہ وہ یہ گمان نہ کر بیٹھیں کہ صرف پیغمبر کی بیوی ہونا انھیں عذاب سے بچالے گا۔ جس طرح نوحؑ اور لوطؑ کی بیویوں کا رابطہ خیانت کی وجہ سے خاندانِ نبوت و وحی سے منقطع ہوگیا اور وہ دونوں عذابِ الٰہی میں گرفتار ہوگئیں۔

ضمنی طور پر یہ تمام طبقات کے مومنین کو ایک تنبیہ ہے کہ وہ گناہ و عصیان کی صورت میں اولیاء اللہ کے ساتھ اپنے رشتوں اور تعلقات کو عذابِ الٰہی سے مانع نہ سمجھ بیٹھیں۔

مفسرین کے بعض کلمات میں آیا ہے کہ حضرت نوحؑ کی بیوی کا نام "والھۃ" اور حضرت لوطؑ کی بیوی کا نام "والعۃ" تھا۔ [1] اور بعض نے اس کے برعکس لکھا ہے۔ یعنی نوحؑ کی بیوی کا نام 'والعۃ' اور لوطؑ کی بیوی کا نام 'واھلۃ' یا 'والھۃ' کہا ہے۔ [2]

بہرحال ان دونوں عورتوں نے ان دونوں عظیم پیغمبروں کے ساتھ خیانت کی، البتہ ان کی خیانت جادۂ عفت سے انحراف ہرگز نہیں تھا، کیونکہ کسی پیغمبرؑ کی بیوی ہرگز بے عفتی سے آلودہ نہیں ہوتی جیسا کہ پیغمبرِ اسلام سے ایک حدیث میں صراحت کے ساتھ آیا ہے:

"ما بغت امراۃ النبی قط"۔

"کسی بھی پیغمبر کی بیوی ہرگز منافیٔ عفت عمل سے آلودہ نہیں ہوئی"۔ [3]

حضرت لوطؑ کی بیوی کی خیانت یہ تھی کہ وہ اس پیغمبر کے دشمنوں کے ساتھ تعاون کرتی تھی اور آنحضرت کے گھر کے راز انھیں بتاتی تھی، اور حضرت نوحؑ کی بیوی بھی ایسی ہی تھی۔

'راغب' مفردات میں کہتا ہے کہ: "خیانت" اور "نفاق" حقیقت میں ایک ہی چیز ہیں، سوائے اس

(بقیہ صفحہ سابقہ) یہ استعمال بھی دیا گیا ہے کہ 'ضرب' کا ایک ہی مفعول ہو اور وہ مثلاً ہے اور 'امرأۃ نوح' اس کا بدل ہے۔ (التبیان فی غریب اعراب القرآن جلد ۲ ص ۴۲۹)

[1] تفسیر قرطبی جلد ۱۰، ص ۶۶۸۰

[2] روح المعانی جلد ۲۸ ص ۱۴۲ (بعض نے نوحؑ کی بیوی کا نام 'واغلہ' 'والغہ' بھی بیان کیا ہے)۔

[3] 'درالمنثور' جلد ۶ ص ۲۴۵

کے کہ 'خیانت' 'عہد و امانت' کے مقابلہ میں ہوتی ہے، اور نفاق مسائل دینی میں۔

اس داستان کی پیغمبرؐ کے گھر کے افشائے راز کی داستان کے ساتھ مناسبت بھی اسی بات کا تقاضا کرتی ہے کہ خیانت سے مُراد یہی ہو۔

بہرحال اوپر والی آیت ان افراد کی جھوٹی اُمیدوں کو جو یہ گمان کرتے ہیں کہ پیغمبرؐ جیسے عظیم شخص سے تعلق اور رشتہ داری ہی ان کی نجات کا سبب بن جائے گی (چاہے عمل کتنا ہی بُرا کیوں نہ ہو) منقطع کر دیتی ہے، تاکہ کوئی بھی شخص اس لحاظ سے اپنے لیے نجات کا قائل نہ ہو۔ اِس لیے آیت کے آخر میں کہتا ہے: "ان سے کہا جائے گا تم بھی تمام دوزخیوں کے ساتھ جہنّم میں داخل ہو جاؤ" یعنی تمہارے اور دُوسروں کے درمیان اِس لحاظ سے کوئی امتیاز نہیں ہے۔

* * *

اس کے بعد باایمان افراد کے لیے دو مثالیں بیان کرتے ہُوئے کہتا ہے: "خدا نے مومنین کے لیے ایک مثال بیان کی ہے: یہ فرعون کی بیوی کی مثال ہے، جس وقت اس نے بارگاہِ خداوندی میں عرض کیا: میرے پروردگار! میرے لیے اپنے نزدیک جنّت میں ایک گھر بنا دے اور مجھے فرعون اور اس کے کاموں سے نجات دے اور مجھے اس ظالم قوم سے نجات عطا فرما": (وضرب اللہ مثلاً للذین اٰمنوا امرأت فرعون اذ قالت رب ابن لی عندک بیتاً فی الجنۃ و نجنی من فرعون وعملہ و نجنی من القوم الظالمین)۔

مشہور یہ ہے کہ فرعون کی بیوی کا نام آسیہ اور اس کے باپ کا نام مزاحم تھا۔ کہتے ہیں کہ جب اُس نے جادوگروں کے مقابلہ میں موسیٰؑ کے معجزہ کو دیکھا تو اس کے دل کی گہرائیاں نورِ ایمان سے روشن ہوگئیں، وہ اسی وقت مُوسیٰؑ پر ایمان لے آئی۔ وہ ہمیشہ اپنے ایمان کو پوشیدہ رکھتی تھی۔ لیکن ایمان اور خدا کا عشق ایسی چیز نہیں ہے جسے ہمیشہ چھپایا جا سکے۔ جب فرعون کو اس کے ایمان کی خبر ہُوئی تو اس نے اُسے بارہا سمجھایا اور منع کیا اور یہ اصرار کیا کہ موسیٰؑ کے دین سے دستبردار ہو جائے اور اس کے خدا کو چھوڑ دے، لیکن یہ با استقامت خاتون فرعون کی خواہش کے سامنے ہرگز نہ جھکی۔

آخرکار فرعون نے حکم دیا کہ اس کے ہاتھ پاؤں میخوں کے ساتھ باندھ کر اسے سُورج کی جلتی ہُوئی دھوپ میں ڈال دیا جائے اور ایک بہت بڑا پتھر اس کے سینہ پر رکھ دیں۔ جب وہ خاتون اپنی زندگی کے آخری لمحے گزار رہی تھی تو اس کی دُعا یہ تھی:

"پروردگارا! میرے لیے جنّت میں اپنے جوارِ رحمت میں ایک گھر بنا دے۔ مجھے فرعون اور اس کے اعمال سے رہائی بخش اور مجھے اس ظالم قوم سے نجات دے"۔

خدا نے بھی اس پاکباز اور خداکار مومنہ خاتون کی دعا قبول کی اور اسے مریمؑ جیسی دنیا کی بہترین خاتون کے

قرار دیا جیسا کہ وہ ان آیات میں مریمؑ کے ہم ردیف قرار پائی ہے۔

ایک روایت میں رسولِ خداؐ سے آیا ہے :

"افضل نساء اهل الجنة خديجة بنت خويلد وفاطمة بنت محمد (ص) ومريم بنت عمران و آسية بنت مزاحم امرأة فرعون"

" اہلِ جنّت میں افضل ترین اور برترین عورتیں چار ہیں۔ خویلد کی بیٹی 'خدیجہؑ' محمدؐ کی بیٹی 'فاطمہؑ' اور عمران کی بیٹی 'مریمؑ' اور مزاحم کی بیٹی 'آسیہؑ' جو فرعون کی بیوی تھی۔" [1]

قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ فرعون کی بیوی اپنی اس بات سے فرعون کے عظیم قصر کی تحقیر کر رہی ہے، اور اُسے خُدا کے جوارِ رحمت میں گھر کے مقابلہ میں کوئی اہمیّت نہیں دیتی۔ اس گفتگو کے ذریعہ ان لوگوں کو جو اُسے یہ نصیحت کرتے تھے کہ ان تمام نمایاں وسائل و امکانات کو جو ملکۂ مصر ہونے کی وجہ سے تیرے قبضہ و اختیار میں ہیں موسیٰؑ جیسے چرواہے پر ایمان لاکر ہاتھ سے نہ دے۔ جواب دیتی ہے :

اور "نجنی من فرعون وعمله" کے جُملہ کے ساتھ خُود فرعون سے اور اس کے مظالم اور جرائم سے بیزاری کا اعلان کرتی ہے۔

اور "نجنی من القوم الظالمین" کے جُملہ سے اس آلودہ ماحول سے اپنی علیحدگی، اور ان کے جرائم سے اپنی بیگانگی کا اظہار کرتی ہے۔

زندگی کے آخری لمحات میں اس بامعرفت اور ایثار گر عورت کے یہ تینوں جملے کس قدر جچے تلے اور حساب شدہ ہیں، ایسے جملے جو پوری دنیا کی سب عورتوں اور مردوں کے لیے نفع بخش اور باعثِ ہدایت ہو سکتے ہیں۔ ایسے جملے، جو ان تمام افراد کے ہاتھوں سے، جو ماحول یا زوج کے دباؤ کو خدا کی اطاعت اور تقویٰ کو ترک کرنے کا ایک جواز شمار کرتے ہیں فضول بہانوں کو چھین لیتے ہیں۔

مسلّمہ طور پر فرعون کے دربار سے بڑھ کر زرق برق اور جلال و جبروت موجود نہیں تھا۔ اسی طرح فرعون جیسے جابر و ظالم کے شکنجوں سے بڑھ کر فشار اور شکنجے موجود نہیں تھے۔ لیکن نہ تو وہ زرق برق اور نہ ہی وہ فشار اور شکنجے اس مومنہ عورت کے گھٹنے جھکا سکے۔ اس نے رضائے خدا میں اپنا سفر اسی طرح سے جاری رکھا۔ یہاں تک کہ اپنی عزیز جان اپنے حقیقی محبوب کی راہ میں فدا کر دی۔

قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ وہ یہ استدعا کرتی ہے کہ اے خدا جنّت میں اور اپنے جوار میں اس کے لیے

---

[1] درالمنثور جلد ۶ ص ۲۴۶

ایک گھر بنادے جس کا جنت میں ہونا تو جنبۂ جسمانی ہے اور خدا کے جوارِ رحمت میں ہونا جنبۂ روحانی ہے۔ اس نے ان دونوں کو ایک مختصر سی عبارت میں جمع کر دیا ہے۔

❖ ❖ ❖

اس کے بعد دوسری باشخصیت خاتون کی طرف جو صاحب ایمان لوگوں کے لیے نمونہ شمار ہوتی ہے، اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے: "اور خدا نے مریم بنت عمران کی مثال بھی بیان کی ہے جس نے اپنے دامن کو پاک رکھا۔" (ومریم ابنت عمران التی احصنت فرجھا)۔[1]

"اور ہم نے اپنی رُوح میں سے اس میں پھونکا۔" (فنفخنا فیہ من روحنا)۔

اور اس نے خدا کے حکم سے شوہر کے بغیر بچہ جنا جو پروردگار کا اولوالعزم پیغمبر بنا۔

اس کے بعد مزید کہتا ہے: "اس نے پروردگار کے کلمات اور اس کی کتابوں کی تصدیق کی اور ان سب پر ایمان لائی۔" (وصدقت بکلمات ربھا وکتبہ)۔

"اور وہ خُدا کے حکم کی اطاعت کرنے والوں میں سے تھی۔" (وکانت من القانتین)۔

وہ ایمان کے لحاظ سے اعلیٰ مرتبے پر تھی۔ تمام آسمانی کتابوں اور اوامر الٰہی پر ایمان رکھتی تھی اور عمل کے لحاظ سے ہمیشہ احکام الٰہی کی مطیع تھی۔ وہ خدا کی ایک ایسی کنیز تھی جو اپنی جان و دل ہتھیلی پر لیے ہوئے آنکھ اس کے حکم پر اور کان اس کے فرمان پر لگائے رکھتی تھی۔

"کلمات" اور "کتب" میں فرق ممکن ہے اس لحاظ سے ہو کہ کتب کی تعبیر سے تو ان تمام آسمانی کتابوں کی طرف اشارہ ہو جو پیغمبروں پر نازل ہوئی ہیں اور کلمات کی تعبیر سے مراد وہ الہام ہوں جو کتاب آسمانی کی صورت میں نہیں آئے تھے۔

مریمؑ ان کلمات اور کتابوں پر ایسا ایمان رکھتی تھی کہ قرآن نے سورۂ مائدہ کی آیت ۷۵ میں اُسے صدیقہ (بہت زیادہ تصدیق کرنے والی) کے عنوان سے یاد کیا ہے۔

قرآن کی مختلف آیات میں اس باایمان خاتون کی شخصیت اور اس کے مقام والا کے سلسلہ میں بہت زیادہ مطالب نظر آتے ہیں۔ ان کا ایک اہم حصّہ تو اس سورہ میں ہے جو اسی کے نام سے موسوم ہے۔ (ایک گروہ نے صدیقہ کی توصیف زیادہ سچ بولنے والی کے ساتھ کی ہے۔)

بہرحال قرآن ان تعبیروں کے ساتھ مریمؑ کے دامن کو ان ناروا باتوں سے، جو آلودہ اور جنایتکار یہودیوں کی ایک جماعت اس کے بارے میں کہتی تھی اور وہ لوگ اس کی شخصیت اور اس کی پاک دامنی کے خلاف جو بھی

---

[1] اس بارے میں کہ 'فرج' کی تعبیر سے کیا مُراد ہے؟ ہم نے ایک تفصیلی بیان، تفسیر نمونہ کی جلد ۱۳ میں ص ۲۹۴ پر (سورہ انبیاء کی آیت ۹۱ کے ذیل میں) پیش کیا ہے۔

باتیں بناتے تھے، ان سے اس کو پاک و پاکیزہ شمار کرتا ہے اور بدگوئی کرنے والوں کے منہ پر ایک سخت طمانچہ رسید کرتا ہے۔

"فنفخنا فیہ من روحنا" (ہم نے اپنی روح میں سے اس میں پھونکا) کی تعبیر سے، جیسا کہ ہم اس سے پہلے بھی اشارہ کر چکے ہیں۔ ایک باعظمت اور بلند روح مراد ہے، یا دوسرے لفظوں میں 'خدا' کی طرف 'روح' کی اضافت ایک "اضافۂ تشریفیہ" ہے کہ جو کسی چیز کی عظمت کو بیان کرنے کے لیے آتی ہے۔ مثلاً بیت اللہ کی تعبیر میں 'گھر' کی اضافت خدا کی طرف سے ہے، ورنہ خدا کی نہ روح ہے نہ گھر اور نہ بیت۔

تعجب کی بات یہ ہے کہ بعض مفسرین نے خدا کے ہاں باشخصیت اور والامقام عورتوں کے بارے میں ایک حدیث نقل کی ہے جس میں بی بی عائشہ کو ان سب سے برتر و افضل ترین شمار کیا ہے۔ کیا ہی اچھا ہوتا کہ وہ اس حدیث کو سورہ تحریم کی تفسیر میں ذکر نہ کرتے، کیونکہ سورہ تحریم تو اس گھڑی ہوئی حدیث کے برخلاف پکار پکار کر پیغام دے رہی ہے، جیسا کہ ہم نے دیکھ لیا ہے کہ اہل سنت کے بہت سے مفسرین و مؤرخین نے صراحت کے ساتھ بیان کیا ہے کہ وہ دو عورتیں جن کی اس سورہ کی آیات شدت کے ساتھ مذمت کر رہی ہیں اور جو خدا اور اس کے رسولؐ کے غیظ و غضب کا سبب بنی ہیں، وہ حفصہ و عائشہ تھیں، اور یہی بیان صراحت کے ساتھ صحیح بخاری میں بھی آیا ہے۔ [1]

ہم ان تمام لوگوں سے جو آزادانہ اور غیر جانبدارانہ طور پر غور و خوض اور سوچ بچار کرتے ہیں، یہ درخواست کرتے ہیں کہ وہ پھر سے اس سورہ کی آیات کا مطالعہ کریں اور اس کے بعد اس قسم کی حدیثوں کی قدر و قیمت کو واضح اور روشن کریں۔

* * *

خداوندا! ہمیں بے ثبوت اور تعصب آمیز حب و بغض سے محفوظ رکھ اور ایسا کر کہ ہم قرآن مجید کی آیات کے مقابلہ میں اپنے سارے وجود کے ساتھ سر تسلیم خم کر دیں اور خاضع رہیں۔

پروردگارا! وہ دن نہ آئے کہ تیرا عظیم پیغمبرؐ ہمارے اعمال سے ناخوش اور ہماری زندگی کی روش سے ناراض ہو۔

بار الٰہا! ہمیں ایسی استقامت عطا فرما کہ سارے جہان میں زمانے کے فرعونوں کے دباؤ اور شکنجے ہماری روح اور ایمان پر معمولی سے معمولی اثر بھی نہ کریں۔ آمین یا رب العالمین۔

* * *

اختتام ترجمہ ۸ ذی الحجہ ۱۴۰۷ھ مطابق ۴ اگست ۱۹۸۷ء
تقریباً پونے آٹھ بجے صبح ۸۱-ای ماڈل ٹاؤن: لاہور

اختتام سورۂ تحریم
۷ شوال ۱۴۰۶ھ

---

[1] صحیح بخاری جلد ۶ ص ۱۹۵

سُوْرَۂ مُلْک

یہ سُورہ مَکّۃ میں نَازل ہُوا اَور اس کی ۳۰ آیتیں ہَیں

تاریخ آغاز
۷ شوال ۱۴۰۶ھ

سورۂ مُلک کے مضامین

یہ سورہ جو قرآنِ مجید کے پارہ ۲۹ کی ابتداء ہے ان سوروں میں ہے جو مشہور قول کے مطابق سارے کے سارے مکہ میں نازل ہوئے، جیسا کہ اس پارہ کی زیادہ تر سورتیں مکّی ہی ہیں۔ بلکہ بعض مفسّرین کے قول کے مطابق تو اس پارے کی تمام کی تمام سُورتیں مکّی ہیں،[1] گزشتہ پارہ کی سُورتوں کے برعکس کہ جو مدنی تھیں لیکن جیسا کہ ہم بیان کریں گے کہ سورہ دہر (یا سورۃ الانسان) اس قاعدہ سے مستثنیٰ ہے اور وہ مدینہ میں نازل ہوئی ہے۔

سورۃ مُلک جس کا دوسرا نام 'مُنجیہ' (نجات بخشنے والی) اور تیسرا نام 'واقیہ' یا 'مانعہ' ہے (کیونکہ وہ اپنے تلاوت کرنے والے کو عذابِ الٰہی یا عذابِ قبر سے محفوظ رکھتی ہے) قرآن کی بہت ہی بافضیلت سورتوں میں سے ہے۔

اس میں بہت سے مسائل پیش ہوئے ہیں جو زیادہ تر تین محوروں کے گرد گردش کرتے ہیں:

۱: مبدأ، خدا کی صفات، خلقت کا شگفت انگیز نظام خصوصاً آسمانوں اور ستاروں کی خلقت، زمین کی خلقت اور اس کی نعمتیں اور اسی طرح پرندوں کی خلقت، جاری ہونے والے پانی، نیز کان، آنکھ اور آلاتِ شناخت کی خلقت کے بارے میں بحث ہے۔

۲: معاد و قیامت، دوزخ کا عذاب اور دوزخیوں کے ساتھ عذاب کے فرشتوں کی گفتگو اور اسی قسم کے امور سے متعلق مباحث۔

۳: کافروں اور ظالموں کو دُنیا و آخرت کے انواع و اقسام کے عذابوں سے انذار و تہدید، بعض کے قول کے مطابق تمام سورہ کا محور اصلی وہی خدا کی مالکیّت و حاکمیّت ہے جو پہلی آیت میں آئی ہے۔[2]

* * *

---

[1] فی ظلال القرآن جلد ۸ ص ۱۸۰

[2] گزشتہ مدرک ص ۱۸۴

تلاوت کی فضیلت

اس سورہ کی فضیلت میں پیغمبرؐ اور ائمہ اہل بیتؑ سے بہت سی روایات نقل ہوئی ہیں :
منجملہ ان کے ایک حدیث میں پیغمبر اکرمؐ سے آیا ہے :

"من قرأ سورة تبارك فكأنما احيا ليلة القدر"

"جو شخص سورہ تبارک کو پڑھے تو ایسا ہے جیسا کہ اس نے شب قدر بیدار رہ کر عبادت میں بسر کی ہو۔" [1]

ایک اور حدیث میں آنحضرتؐ سے آیا ہے :

"وددت ان تبارك الملك فی قلب كل مؤمن"

"میں دوست رکھتا ہوں کہ سورہ تبارک تمام مومنین کے دل میں ثبت ہو جائے۔" [2]

ایک حدیث میں امام محمد بن علی الباقرؑ سے آیا ہے کہ آپ نے فرمایا :

"سورة الملك هی المانعة تمنع من عذاب القبر وهی مكتوبة فی التوراة سورة الملك ومن قرأها فی ليلة فقد اكثر واطاب، ولم يكتب من الغافلين ..."

"سورہ ملک سورہ مانعہ ہے، یعنی عذاب قبر سے بچاتی ہے اور تورات میں اسی نام کے ساتھ لکھی ہوئی ہے جو شخص اس کو رات کے وقت پڑھے تو اس نے بہت کچھ پڑھا اور خوب پڑھا ـــــ وہ غافلین میں شمار نہیں ہوگا۔" [3]

اس سلسلہ میں احادیث بہت زیادہ ہیں۔
البتہ یہ سب عظیم آثار فکر و عمل کے بغیر پڑھنے سے مربوط نہیں ہیں بلکہ ان کا مقصد ایسا پڑھنا ہے جس میں عمل کے لیے ہدایت ہو۔

* * *

---

[1] [2] [3] "مجمع البیان" ج ۱۰ ص ۳۲۰

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

① تَبٰرَكَ الَّذِیْ بِيَدِهِ الْمُلْكُ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِيْرُ ۙ۝

② الَّذِیْ خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَيٰوةَ لِيَبْلُوَكُمْ اَيُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا ؕ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْغَفُوْرُ ۙ۝

③ الَّذِیْ خَلَقَ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ طِبَاقًا ؕ مَا تَرٰى فِیْ خَلْقِ الرَّحْمٰنِ مِنْ تَفٰوُتٍ ؕ فَارْجِعِ الْبَصَرَ ۙ هَلْ تَرٰى مِنْ فُطُوْرٍ ۝

④ ثُمَّ ارْجِعِ الْبَصَرَ كَرَّتَيْنِ يَنْقَلِبْ اِلَيْكَ الْبَصَرُ خَاسِئًا وَّهُوَ حَسِيْرٌ ۝

⑤ وَلَقَدْ زَيَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنْيَا بِمَصَابِيْحَ وَجَعَلْنٰهَا رُجُوْمًا لِّلشَّيٰطِيْنِ وَاَعْتَدْنَا لَهُمْ عَذَابَ السَّعِيْرِ ۝

* * *

ترجمہ

خدائے رحمن و رحیم کے نام سے۔

① برکتوں والی اور زوال ناپذیر ہے وہ ذات جس کے قبضۂ قدرت میں سارے عالم

ہستی کی حکومت ہے اور وہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔

(۲) وہی ذات ہے جس نے موت وحیات کو پیدا کیا، تاکہ وہ آزمائے کہ تم میں سے بہترین عمل کون کرتا ہے، اور وہ شکست ناپذیر اور بخشنے والا ہے۔

(۳) وہی جس نے سات آسمانوں کو ایک دوسرے کے اوپر پیدا کیا۔ تم خدائے رحمٰن کی مخلوق میں کوئی تضاد اور کسی قسم کا عیب نہیں دیکھو گے۔ پھر نظر دوڑا کر دیکھو۔ کیا تمھیں کوئی شگاف یا خلل نظر آتا ہے؟

(۴) پھر دوبارہ (عالم ہستی کی طرف) نظر اٹھا کر دیکھو، انجام کار تیری نظر (خلل ونقص کی جستجو میں ناکام ہو کر) تیری طرف پلٹ آئے گی اور وہ تھکی ہوئی ہو گی۔

(۵) ہم نے نچلے آسمان کو روشن چراغوں سے زینت دی ہے اور انھیں شیاطین کے لیے (شہب) تیر قرار دیا ہے، اور ہم نے ان کے لیے دوزخ کا عذاب فراہم کیا ہے۔

* * *

تفسیر

تم عالم ہستی میں کسی قسم کا نقص نہیں دیکھو گے۔

یہ سورہ خدا کی مالکیت و حاکمیت اور اس کی ذاتِ پاک کے دوام اور ہمیشگی جیسے اہم مسئلہ سے شروع ہوتا ہے جو حقیقت میں اس سورہ کے تمام مباحث کی کلید ہے۔

فرماتا ہے: "برکتوں والی اور زوال ناپذیر ہے وہ ذات، جس کے قبضۂ قدرت میں عالم ہستی کی حکومت ہے، اور وہ ہر چیز پر قادر ہے۔" (تبارك الذی بیده الملك وهو علی كل شیء قدیر)۔

"تبارك" "برکت" کے مادہ سے اصل میں "برك" (بروزن برگ) ہے جو اونٹ کے سینہ کے معنی میں ہے۔ جب "برك البعیر" کہا جاتا ہے تو اس کا مفہوم یہ ہوتا ہے کہ اونٹ نے اپنا سینہ زمین پر رکھ دیا، اس کے بعد یہ لفظ دوام، بقا، اور زوال ناپذیر کے معنی میں اور ہر اس نعمت کے معنی میں جو پائیداری و دوام رکھتی ہو بولا

جانے لگا۔ پانی کے خزانے کو بھی اس لیے "برکت" کہتے ہیں کیونکہ پانی ایک طویل مدت تک اس میں باقی اور محفوظ رہتا ہے۔

اوپر والی آیت میں حقیقت میں خدا کی ذات پاک کے مبارک ہونے کی دلیل بیان کی گئی ہے۔ اور عالم پر اس کی مالکیت و حاکمیت اور ہر چیز پر اس کی قدرت ہے، اسی بناء پر وہ زوال ناپذیر اور برکت سے پُر وجود ہے۔

❊ ❊ ❊

بعد والی آیت میں انسان کی موت و حیات کی خلقت، جو خدا کی مالکیت و حاکمیت کے شئون میں سے ہے، اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے: "وہی تو ہے کہ جس نے موت و حیات کو پیدا کیا تاکہ تمہیں آزمائے کہ تم میں سے بہترین عمل کون کرتا ہے" (الذی خلق الموت والحیاۃ لیبلوکم ایکم احسن عملاً)۔

"موت" اگر فنا اور نیستی کے معنی میں ہو تو مخلوق نہیں ہے۔ کیونکہ خلقت کا تعلق امور وجودی کے ساتھ ہے، لیکن ہم جانتے ہیں کہ موت کی حقیقت ایک جہان سے دوسرے جہان کی طرف انتقال ہے اور یہ یقیناً ایک وجودی امر ہے جو مخلوق ہو سکتا ہے۔

اگر یہاں موت کا حیات سے پہلے ذکر ہوا ہے تو اس کی وجہ وہ گہری تاثیر ہے جو حسن عمل میں موت کی طرف توجہ سے ہوتی ہے۔ اِس سے قطع نظر کہ موت زندگی سے پہلے بھی تھی۔

خدا کی آزمائش سے مُراد، جیسا کہ ہم پہلے بھی بیان کر چکے ہیں، ایک قسم کی تربیت ہے اس معنی میں کہ وہ انسانوں کو میدانِ عمل کی طرف کھینچتی ہے[1] تاکہ تجربے اور آزمائش میں پاک و پاکیزہ ہو کر قربِ خدا کے لائق ہو سکیں۔

قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ آزمائش کا ہدف "حُسنِ عمل" کو بتایا گیا ہے نہ کہ کثرتِ عمل کو۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ اسلام کیفیت کو اہمیت دیتا ہے کمیت کو نہیں۔ اہم بات یہ ہے کہ عمل خالص ہو، خُدا کے لیے اور سنجیدہ جامع ہو، اگرچہ کمیت و مقدار کے لحاظ سے تھوڑا ہو۔

اِس لیے اس بارے میں کہ "احسن عملاً" سے کیا مُراد ہے؛ بعض اسلامی روایات میں پیغمبر گرامیؐ سے نقل ہوا ہے کہ آپ نے فرمایا:

"اتمکم عقلا. واشدکم للہ خوفًا، و احسنکم فیما امر اللہ بہ و نھی عنہ نظرا، و ان کان اقلکم تطوعا"

"اس سے مُراد یہ ہے کہ تم میں سے کس کی عقل وفور کامل اور خدا ترسی زیادہ ہے اور

---

[1] خدائی آزمائشوں کے بارے میں مزید تشریح کے لیے تفسیر نمونہ جلد ۱ سورہ بقرہ کی آیت ۱۵۵ کے ذیل میں ملاحظہ کریں۔

خدا کے اوامر و نواہی سے کون زیادہ آگاہی رکھتا ہے، چاہے تمہارے مستحبی اعمال کم ہی ہوں۔" [1]

صاف ظاہر ہے کہ کامل عقل، عقل کو پاک تر، نیت کو خالص تر اور اجر و پاداش کو زیادہ سے زیادہ کر دیتی ہے۔

ایک حدیث میں امام جعفر صادقؑ سے آیا ہے:

"لیس یعنی اکثر عملا، ولکن اصوبکم عملا. و انما الاصابة خشیة اللہ و النیة الصادقة، ثم قال الابقاء علی العمل حتی یخلص اشد من العمل، والعمل الخالص الصالح الذی لا تریدان یحمدک علیه احد الا اللہ عزوجل."

"یہ مراد نہیں ہے کہ تم میں سے کون زیادہ عمل کرتا ہے بلکہ مراد یہ ہے کہ تم میں سے زیادہ صحیح عمل کون کرتا ہے۔ عمل صحیح وہ ہے جس میں خدا پرستی اور پاک نیت شامل ہو۔ اس کے بعد فرمایا: عمل کو آلودگی سے محفوظ رکھنا خود عمل سے زیادہ سخت ہے۔ خالص و صالح عمل وہ ہوتا ہے جس میں تو یہ نہ چاہے کہ خدا کے سوا کوئی اور اس عمل پر تیری تعریف کرے۔" [2]

انسان کی خلقت کے ہدف کے بارے میں ہم سورہ ذاریات کی آیت ۵۶ "وما خلقت الجن و الانس الا لیعبدون" کے ذیل میں ایک تفصیلی بحث کر چکے ہیں۔ وہاں ہدف "عبودیتِ خدا" ذکر ہوا ہے، اور یہاں "حسن عمل کی آزمائش"۔ یہ بات واضح ہے کہ آزمائش و امتحان کا مسئلہ عبودیت کے مسئلہ سے الگ نہیں ہے۔ جیسا کہ کمال عقل، خدا ترسی اور نیت خالص، جن کی طرف اوپر والی روایات میں اشارہ ہوا ہے روحِ عبودیت ہیں۔

اس طرح یہ دنیا تمام انسانوں کے لیے ایک عظیم آزمائش کا میدان ہے۔ آزمائش کا ذریعہ موت و حیات ہے اور اس عظیم آزمائش کا ہدف حسن عمل تک پہنچتا ہے۔ جس کا مفہوم تکامل معرفت، اخلاصِ نیت اور ہر کارِ خیر کو انجام دینا ہے۔

اگر ہم یہ دیکھتے ہیں کہ بعض مفسرین نے یہاں 'احسن عملا' کی تفسیر موت کو یاد کرنے یا موت کے لیے آمادہ ہونے اور اسی قسم کے امور سے کی ہے تو وہ حقیقت میں اس معنیٔ کلی کے مصادیق میں سے ہے۔

چونکہ اس عظیم آزمائش کے میدان میں انسان بہت سی لغزشوں میں گرفتار ہو جاتا ہے، یہ لغزشیں اسے مایوس نہ کر دیں اور اس کی سعی و کوشش سے اسے باز نہ رکھیں۔ لہٰذا آیت کے آخر میں بندوں کو مدد اور بخشش کا وعدہ

---

[1] تفسیر مجمع البیان جلد ۱۰ ص ۳۲۲

[2] تفسیر صافی زیر بحث آیات کے ذیل میں۔

دیتے ہوئے کہتا ہے: "اور وہ شکست ناپذیر اور بخشنے والا ہے۔" (وھو العزیز الغفور)۔

ہاں! وہ ہر چیز پر قادر اور ہر توبہ کرنے والے انسان کو بخشنے والا ہے۔

موت وحیات کے نظام کو بیان کرنے کے بعد عالم کے نظام کلی کو پیش کرتے ہوئے انسان کو محبوبہ عالم ہستی کے مطالعہ کی دعوت دیتا ہے تاکہ وہ اس طریقہ سے اپنے آپ کو اس عظیم آزمائش کے لیے آمادہ کرے۔ فرماتا ہے: "وہی خدا جس نے سات آسمانوں کو ایک دوسرے کے اوپر پیدا کیا" (الذی خلق سبع سموات طباقا)۔

سات آسمانوں کے بارے میں تو ہم اس سے پہلے تھوڑی سی بحث سورۃ طلاق کی آیت ۱۲ کی تفسیر میں بھی کر چکے ہیں۔ یہاں 'طباقا' کے بارے میں ہم کچھ اضافہ کرتے ہیں۔ اس تعبیر کی بناء پر ساتوں آسمان ایک دوسرے کے اوپر قرار پاتے ہیں کیونکہ "مطابقۃ" کا معنی اصل میں یہ ہے کہ ایک چیز کو دوسری چیز کے اوپر قرار دیں۔

اب اگر ہم سات آسمانوں کو منظومۂ شمسی کے سات کروں کی طرف اشارہ سمجھیں، جو بغیر کسی آلہ کے دیکھے جا سکتے ہیں، ان میں سے ہر ایک کا سورج کے ساتھ ایک معین فاصلہ ہے، اور ان میں سے ہر ایک دوسرے کے اوپر ہے۔

لیکن اگر ہم ان تمام ثوابت وسیار ستاروں کو جنھیں ہم دیکھتے ہیں پہلے آسمان کی جزء شمار کریں تو اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ بالاتر مراحل میں کچھ دوسرے عوالم ہیں کہ جن میں سے ہر ایک دوسرے کے اوپر قرار پاتا ہے۔

اس کے بعد مزید کہتا ہے: "تم خدائے رحمٰن کی مخلوق میں کوئی تضاد اور کسی قسم کا عیب نہیں دیکھو گے" (ماتری فی خلق الرحمٰن من تفاوت)۔

عالم ہستی اس ساری عظمت کے باوجود جو کچھ بھی ہے وہ نظم ونسق، استحکام وانسجام، چھی تلی اور ٹھیک ٹھیک حساب شدہ ترکیبات اور دقیق قوانین ہیں۔ اگر اس عالم کے کسی گوشہ میں بے نظمی واقع ہو جاتی تو وہ اسے نابود کر کے رکھ دیتی۔

اس عجیب وغریب نظام سے لے کر جو ایک ایٹم کے ذرہ اور الیکٹرون وپروٹون کے ذرات پر حاکم ہے، کل منظومۂ شمس اور دوسرے منظوموں اور کہکشاؤں پر حاکم نظامات تک، سب کے سب دقیق قوانین کے زیر تسلط ہیں جو انھیں ایک خاص راستہ پر چلا رہے ہیں۔ خلاصہ یہ ہے کہ ہر جگہ قانون وحساب ہے اور ہر جگہ ایک نظم اور خاص ترکیب ہے۔

آیت کے آخر میں مزید تاکید کے لیے فرماتا ہے: "پھر نظر دوڑا کر دیکھو اور اس عالم کو غور سے دیکھو، کیا تمھیں اس میں کوئی شگاف یا خلل اور اختلاف نظر آتا ہے؟" (فارجع البصر ھل تری من فطور)۔

"فطور"۔ "فطر" (بروزن سطر) کے مادہ سے، طول میں شگاف کرنے کے معنی میں ہے اور توڑنے کے معنی میں (مثلاً روزہ کا افطار) اور اختلال وفساد کے معنی میں بھی آیا ہے۔ زیر بحث آیت میں اسی معنی میں ہے۔

مُراد یہ ہے کہ اِنسان عالمِ آفرینش میں چاہے جتنا بھی غور کرے، کم سے کم خلل اور ناموزونیت بھی اس میں نہیں دیکھے گا۔

❊ ❊ ❊

اِسی لیے بعد والی آیت میں اس معنی کی تاکید کے لیے مزید کہتا ہے: "پھر دوبارہ عالم ہستی کی طرف آنکھ کھول کر دیکھ، انجام کار تیری نظر خلل و نقص کی جستجو میں ناکام ہو کر اور تھک ہار کر تیری طرف پلٹ آئے گی۔" (ثم ارجع البصر کرتین ینقلب الیک البصر خاسئا و ھو حسیر)۔

"کرتین"۔ "کر" (بروزن شر) کے مادّہ سے کسی چیز کی طرف توجہ کرنے اور بازگشت کرنے کے معنی میں ہے۔ کرۃ کا معنی تکرار بھی ہے اور "کرتین" اس کا تثنیہ ہے۔ لیکن بعض مفسرین نے کہا ہے کہ یہاں کرتین سے تثنیہ کا معنی مُراد نہیں، بلکہ اس سے مکرّر، بار بار، پے در پے اور متعدد مرتبہ توجہ کرنا مُراد ہے۔

اس بناء پر قرآن ان آیات میں لوگوں کو کم از کم تین مرتبہ عالم ہستی کی طرف نظر کرنے اور اسرارِ خلقت و آفرینش کا مطالعہ کرنے کا حکم دیتا ہے کہ وہ ایک چیز میں بار بار غور کریں۔ پھر جب اس عجیب و غریب نظام میں معمولی سے معمولی اور کم سے کم خلل اور نقص نہ دیکھیں تو اس کارخانۂ عالم کے پیدا کرنے والے خالق اور اس کے بے پایاں علم و قدرت سے زیادہ سے زیادہ آشنا ہوں۔

"خاسئ" "خسأ" اور "خسوء" (بروزن مدح و خشوع) کے مادّہ سے۔ جب آنکھ کے لیے استعمال ہو تو خستہ اور ناتواں ہونے کے معنی میں ہے اور جب "کتے" کے بارے میں استعمال ہو تو اسے دُور کرنے کے معنی میں ہے۔

"حسیر"۔ "حسر" (بروزنِ قصر) کے مادّہ سے برہنہ کرنے کے معنی میں ہے، چونکہ اِنسان خستگی اور تکان کے وقت اپنی توانائی کھو بیٹھتا ہے اور گویا وہ اپنی توانائیوں سے برہنہ ہو جاتا ہے، لہٰذا یہ خستگی اور ناتوانی کے معنی میں آیا ہے۔ اِس بناء پر اوپر والی آیت میں "خاسئ" اور "حسیر" دونوں ایک ہی معنی میں ہیں۔ یعنی عالم ہستی کے نظام میں کسی نقص و عیب کے دیکھنے سے آنکھ کی درماندگی اور ناتوانی کے موضوع میں تاکید کے لیے آئے ہیں۔

بعض نے ان دونوں کے درمیان اس طرح فرق کیا ہے کہ "خاسئ" ناکام ہونے کے معنی میں، اور "حسیر" ناتواں کے معنی میں ہے۔

بہرحال ان آیات سے دو اہم نتائج حاصل کیے جا سکتے ہیں۔ پہلا یہ کہ قرآن راہِ حق کے تمام رہروں کو تاکیدی طور پر یہ حکم دیتا ہے کہ ان سے جتنا ہو سکتا ہے اِس عالمِ ہستی کے اسرار اور جہانِ آفرینش کے عجائبات کا مطالعہ کرتے ہوئے ان میں غور و خوض کریں۔ نیز یہ کہ ایک مرتبہ اور دو مرتبہ پر قناعت نہ کریں۔ کیونکہ بہت سے ایسے اسرار ہیں جو پہلی یا دوسری نگاہ میں اپنی نشان دہی نہیں کرتے۔ تیز بین نگاہیں کئی مرتبہ نظر دوڑانے کے بعد ہی اُن

کو دیکھ پانے میں کامیاب ہوتی ہیں۔

دوسرا یہ کہ انسان اس نظام میں جتنا زیادہ غور وخوض کرے گا اتنا ہی اس کے پردوں کو بہتر طور پہ درک کر سکے گا۔ ایسا نظام، ساخت اور ترتیب جو ہر قسم کے نقص، خلل، کجی اور ٹیڑھے پن سے خالی ہے۔

اگر سطحی اور ابتدائی نظر میں اس جہان کے بعض موجودات شرور و آفات اور فساد کے عنوان سے نظر آتے ہیں (مثلاً زلزلے، سیلاب، بیماریاں اور ناگوار حوادث، جو کبھی کبھی انسان کی زندگی میں رونما ہوتے رہتے ہیں) تو زیادہ دقیق مطالعات سے واضح ہو جاتا ہے کہ وہ بھی اپنے اندر بہت سے اہم اسرار و رموز رکھتے ہیں۔[1]

یہ آیاتِ برہان نظم کی طرف ایک واضح اشارہ ہے کہ جو کہتی ہیں: "ہر کارخانہ میں نظم و نسق کا وجود، اس کارخانہ کی پشت پر علم و قدرت کے وجود کی نشانی ہے۔ ورنہ اتفاقی حوادث جو حساب شدہ نہ ہوں اندھے بہرے تصادفات نظام و حساب کا مبدء نہیں ہو سکتے۔ جیسا کہ حدیث مفضل میں امام صادقؑ سے آیا ہے:

"ان الاهمال لا يأتي بالصواب، والتضاد لا يأتي بالنظام"

"مہمل کام کبھی درست نتیجہ نہیں دیتے، اور تضاد کسی نظام کا مبدء نہیں ہو سکتا۔"[2]

❖ ❖ ❖

آخری زیر بحث آیت نے صفحہ آسمان پر نگاہ ڈالی ہے جو خوبصورت اور چمکنے والے ستاروں کا ذکر کرتے ہوئے کہتی ہے: "ہم نے نچلے آسمان کو چمکدار اور روشن ستاروں سے زینت بخشی ہے اور انھیں ہم نے شیطین کے لیے تیر قرار دیا ہے، اور ان کے لیے جہنم کی آگ کا عذاب فراہم کیا ہے۔" (ولقد زينا السماء الدنيا بمصابيح وجعلناها رجومًا للشياطين واعتدنا لهم عذاب السعير)۔

ایک تاریک اور تاروں بھری رات میں آسمانوں کی طرف ایک نگاہ دُور دُور تک دکھائی دینے والے عوالم کی طرف توجہ اور ان نظاموں کا تصور جو ان پر حاکم ہے، اس خوب صورتی نفاست، عمدگی، عظمت ہیبت اور پُراسرار سکوت میں غور کہ جو ان کے اوپر سایہ فگن ہے۔ انسان کو ایک عرفان اور نورِ حق سے پُر جہان میں داخل کر دیتا ہے۔ اسے عشق پروردگار کے ان عوالم میں سیر کراتا ہے جن کی کسی زبان سے تعریف و توصیف نہیں ہو سکتی۔

یہ آیت دوبارہ اس حقیقت کی تائید کرتی ہے کہ وہ تمام ستارے جنھیں ہم دیکھ رہے ہیں، سب

---

[1] ہم نے اس مطلب کی تشریح "اثبات وجود خدا" کے مباحث میں آفات و بلیات کے سلسلہ میں مادیین کے دلائل کے جواب میں کی ہے۔ کتاب "آفریدگار جہان" کی طرف رجوع کریں۔ [2] بحار الانوار جلد ۳ ص ۶۳

پہلے آسمان کا حصہ ہیں۔ وہ آسمان جو سات آسمانوں میں ہم سے زیادہ قریب ہے۔ اسی بناء پر اسے "السماء الدنیا" (نزدیک اور نچلے آسمان) کے عنوان سے تعبیر کیا گیا ہے۔

"رجوم" (تیر) کی تعبیر ان شہابوں کی طرف اشارہ ہے جو تیر کی طرح آسمان کی ایک طرف سے دوسری طرف پھینکے جاتے ہیں۔ ہم جانتے ہیں کہ "شہب" ان ستاروں کے باقی ماندہ اجزاء ہیں جو بعض حوادث میں تباہ ہو گئے ہیں۔ اس بناء پر اگر وہ کواکب (ستاروں) کو شیاطین کے لیے تیر قرار دینے کی بات کہتا ہے، تو وہ انھیں مخصوص سنگریزوں کی طرف اشارہ ہے۔

لیکن شیاطین شہاب کے ان تیروں سے جو آسمانوں میں چھوٹے چھوٹے سرگرداں پتھر ہیں، کس طرح نشانہ بنتے ہیں؟ ہم اس کی تشریح تفسیر نمونہ جلد ۱۱ (سورۂ حجر کی آیت ۱۸ کے ذیل میں) اور جلد ۱۹ (سورۂ صافات کی آیت ۲۰ کے ذیل میں) تفصیل کے ساتھ بیان کر چکے ہیں۔

* * *

ایک نکتہ

عالمِ آفرینش کی عظمت

باوجودیکہ قرآن مجید عرب کے زمانہ جاہلیت کے پسماندہ ماحول میں اترا، لیکن وہ اکثر تاکید کرتا ہے کہ مسلمان عالمِ ہستی کے باعظمت اسرار میں غور و فکر کریں۔ وہ مطلب جس کا زمانۂ جاہلیت میں کوئی مفہوم ہی نہیں تھا، یہ خود اس بات کی ایک واضح دلیل ہے کہ قرآن ایک دوسرے مبدء سے صادر ہوا ہے۔ اب علم و دانش جس قدر آگے بڑھتے جا رہے ہیں، اس سلسلہ میں قرآنی تاکیدوں کی عظمت اسی قدر آشکار تر ہوتی جا رہی ہے۔

ہم جانتے ہیں کہ یہ کرۂ زمین جس میں ہم زندگی گزار رہے ہیں، اتنا بڑا ہونے کے باوجود منظومۂ شمسی کے مرکز یعنی سورج کی ٹکیہ کے مقابلہ میں اس قدر چھوٹی ہے کہ اگر بارہ لاکھ کرۂ زمین کو ایک دوسرے کے اوپر رکھیں تو پھر وہ سورج کی ٹکیہ کے برابر ہو گی۔

دوسری طرف سے ہمارا منظومۂ شمسی ایک عظیم کہکشاں کا ایک جزء ہے، وہی کہکشاں جسے راہ شیری کہتے ہیں۔[1]

---

[1] کہکشائیں ستاروں کے مجموعے ہیں جو ستاروں کے شہروں کے نام سے مشہور ہیں اور ایک دوسرے سے نزدیک ہونے کے باوجود بعض اوقات ان کے درمیان کئی ملین نوری سالوں کا فاصلہ ہوتا ہے۔

* * *

ماہرین علم الافلاک کے حساب کے مطابق صرف ہماری کہکشاں میں ایک کھرب (۱۰۰,۰۰۰,۰۰۰,۰۰۰) سے زیادہ ستارے موجود ہیں، اور ہمارا سورج اپنی تمام عظمت کے باوجود، اس کے متوسط ستاروں میں سے ایک شمار ہوتا ہے۔

تیسری طرف اس عظیم جہان میں اس قدر کہکشائیں موجود ہیں جو حساب و کتاب اور شمار و قطار سے باہر ہیں۔ نیز ستاروں کو دیکھنے والی دوربینیں جتنی عظیم اور آراستہ ہوتی جا رہی ہیں اتنی ہی نئی سے نئی کہکشائیں کشف ہو رہی ہیں۔ کس قدر عظیم و بزرگ ہے وہ خدا جس نے یہ عظیم منصوبہ ایسے دقیق نظام کے ساتھ بنایا ہے۔

العظمة لله الواحد القهار

* * *

⑥ وَ لِلَّذِیْنَ كَفَرُوْا بِرَبِّهِمْ عَذَابُ جَهَنَّمَ ؕ وَ بِئْسَ الْمَصِیْرُ ○

⑦ اِذَاۤ اُلْقُوْا فِیْهَا سَمِعُوْا لَهَا شَهِیْقًا وَّ هِیَ تَفُوْرُ ۙ○

⑧ تَكَادُ تَمَیَّزُ مِنَ الْغَیْظِ ؕ كُلَّمَاۤ اُلْقِیَ فِیْهَا فَوْجٌ سَاَلَهُمْ خَزَنَتُهَاۤ اَلَمْ یَاْتِكُمْ نَذِیْرٌ ○

⑨ قَالُوْا بَلٰی قَدْ جَآءَنَا نَذِیْرٌ ۙ فَكَذَّبْنَا وَ قُلْنَا مَا نَزَّلَ اللّٰهُ مِنْ شَیْءٍ ۖۚ اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا فِیْ ضَلٰلٍ كَبِیْرٍ ○

⑩ وَ قَالُوْا لَوْ كُنَّا نَسْمَعُ اَوْ نَعْقِلُ مَا كُنَّا فِیْۤ اَصْحٰبِ السَّعِیْرِ ○

⑪ فَاعْتَرَفُوْا بِذَنْۢبِهِمْ ۚ فَسُحْقًا لِّاَصْحٰبِ السَّعِیْرِ ○

❊ ❊ ❊

ترجمہ

⑥ اور ان لوگوں کے لیے جنھوں نے اپنے پروردگار کا کفر کیا، جہنم کا عذاب ہے اور وہ بُری جگہ ہے۔

⑦ جس وقت وہ اس میں ڈالے جائیں گے تو اس میں سے ایک وحشتناک آواز سنیں گے۔

اور وہ ہمیشہ جوش مار رہی ہو گی۔

(۸) قریب ہے کہ وہ شدّتِ غضب سے پارہ پارہ ہو جائے۔ جس وقت اس میں کوئی گروہ ڈالا جاتا ہے تو دوزخ کے نگران (فرشتے) ان سے سوال کرتے ہیں کیا تمھارے پاس خدا کی طرف سے کوئی ڈرانے والا نہیں آیا تھا۔

(۹) وہ کہیں گے۔ ہاں! انذار کرنے والا تو ہمارے پاس آیا تھا مگر ہم نے اُسے جھٹلایا اور یہ کہا کہ خُدا نے بالکل کوئی چیز نازل نہیں کی ہے اور تم ایک بہت بڑی گمراہی میں ہو۔

(۱۰) اور (یہ بھی) کہیں گے کہ اگر (ان کی بات) سنتے یا سمجھتے تب تو (آج) دوزخیوں میں نہ ہوتے۔

(۱۱) اِس موقع پر وہ اپنے گناہ کا اعتراف کر لیں گے۔ دوزخی خدا کی رحمت سے دُور ہیں۔

* * *

تفسیر

اگر ہم سننے والا کان اور بیدار فکر رکھتے تو دوزخ میں نہ ہوتے۔

گذشتہ آیات میں خدا کی عظمت و قدرت کی نشانیوں اور عالم آفرینش میں ان کے دلائل کے بارے میں گفتگو تھی۔ لہٰذا قرآن زیرِ بحث آیات میں ایسے لوگوں کے بارے میں گفتگو کر رہا ہے جنھوں نے ان دلائل کی پروا نہیں کی۔ انھوں نے کفر و شرک کی راہ اختیار کر لی اور شیاطین کی طرح عذابِ الٰہی خرید بیٹھے۔

پہلے فرماتا ہے: "ان لوگوں کے لیے جنھوں نے اپنے پروردگار کا کفر کیا عذابِ جہنم ہے اور وہ بری جگہ ہے۔" (وللذین کفروا بربھم عذاب جھنم وبئس المصیر)۔

* * *

اس کے بعد اس وحشتناک عذاب کے ایک گوشہ کی تشریح کرتے ہوئے مزید کہتا ہے: "جس وقت کفار اس میں ڈالے جائیں گے تو وہ اس میں سے ایک وحشتناک صدا سنیں گے اور وہ ہمیشہ جوش مارنے کی حالت میں رہتی ہے۔" (اذا القوا فیھا سمعوا لھا شھیقًا وھی تفور)۔

ہاں! جس وقت انھیں انتہائی ذلّت و حقارت کے ساتھ اس میں پھینکا جائے گا تو جہنم کی وحشتناک اور طولانی صدا بلند ہو گی جو ان کے تمام وجود کو وحشت میں غرق کر دے گی۔

"شھیق" اصل میں قبیح اور بُری آواز کے معنی میں ہے جیسا کہ گدھے کی آواز ہے۔ بعض اہلِ لغت نے یہ

بھی کہا ہے کہ یہ "شھوق" کے مادے سے طولانی ہونے کے معنی سے لیا گیا ہے۔ (اسی لیے اُونچے اور بلند پہاڑ کو جبل شاہق کہتے ہیں) اس بناء پر شہیق طولانی نالہ و فریاد کے معنی میں ہے۔

بعض نے کہا ہے کہ 'زفیر' تو اس آواز کو کہتے ہیں جو گلے میں پیچ کھاتی رہے اور 'شہیق' وہ آواز ہے جو سینہ میں آمدورفت کرتی ہے۔ بہرحال یہ وحشت انگیز اور بے چین کر دینے والی آوازوں کی طرف اشارہ ہے۔

❊ ❊ ❊

اس کے بعد 'دوزخ' کے غیظ وغضب کی شدت کو مجسم کرنے کے لیے مزید کہتا ہے: "قریب ہے کہ وہ شدت غضب سے پارہ پارہ ہو جائے۔" (تکاد تمیز من الغیظ)[1]

ٹھیک اس عظیم برتن کی طرح جسے حد سے زیادہ تیز حرارت والی آگ کے اوپر رکھا ہوا ہو اور وہ اس طرح جوش مارتا ہُوا اوپر نیچے ہو رہا ہو کہ ہر لمحہ اس کے ٹکڑے ٹکڑے ہو جانے کا خوف لگا رہتا ہو۔ یا اس غصہ میں بھرے ہوئے انسان کی طرح جو چیخ چلا رہا ہو اور اس طرح کی آوازیں نکال رہا ہو جیسے ابھی پھٹ پڑے گا۔

ہاں! خدائی غضب کے اس مرکز، جہنم کا منظر ایسا ہی ہے۔

پھر وہی بات جاری ہے۔ "جس وقت کافروں کا کوئی گروہ اس میں پھینکا جائے گا تو دوزخ کے نگہبان تعجب اور سرزنش کے طور پر اس سے سوال کریں گے، کیا تمہارا کوئی رہبر و راہنما نہیں تھا؟ کیا خدا کی طرف سے کوئی ڈرانے والا تمہارے پاس نہیں آیا تھا؟ پھر تم اس بدبختی میں کیوں آن پڑے ہو؟" (کلما القی فیھا فوج سألھم خزنتھا الم یأتکم نذیر)۔

انھیں اس بات کا یقین ہی نہیں آئے گا کہ کوئی انسان جانتے بُوجھتے اور آسمانی رہبر کے ہوتے ہُوئے اِس قسم کی سرنوشت میں گرفتار ہو جائے۔ اور اپنے لیے اس قسم کی جگہ کا انتخاب کرے۔

❊ ❊ ❊

لیکن وہ جواب میں کہیں گے: "ہاں ڈرانے والا تو ہمارے پاس آیا تھا مگر ہم نے اس کی تکذیب کی اور کہا کہ خدا نے ہرگز کوئی چیز نازل نہیں کی۔ اور خدا نے کسی پر وحی نہیں بھیجی ہے تاکہ ہم اپنی خواہش نفس کو جاری رکھیں۔ یہاں تک کہ ہم نے ان سے کہا کہ تم عظیم گمراہی میں مبتلا ہو۔" (قالوا بلیٰ قد جاءنا نذیر فکذبنا وقلنا ما نزل اللہ من شیء ان انتم الا فی ضلال کبیر)۔

نہ صرف یہ کہ ہم نے ان کی تصدیق نہیں کی اور ان کے حیات بخش پیغام پر کان نہیں دھرا، بلکہ ان کی مخالفت کے لیے کھڑے ہو گئے، ان روحانی طبیبوں کو گمراہ کہہ کر اپنے سے دور کر دیا۔

❊ ❊ ❊

---

[1] تمیز تلاشی اور پراگندہ ہونے کے معنی میں ہے اور اصل میں تتمیز تھا۔

اس کے بعد اپنی بدبختی اور گمراہی کی اصل دلیل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہیں گے: "اگر ہم سننے والے کان رکھتے اور اپنی عقل کو کام میں لاتے تو ہرگز دوزخیوں میں سے نہ ہوتے۔" (وقالوا لو کنا نسمع او نعقل ما کنا فی اصحاب السعیر)۔

* * *

ہاں! اس موقع پر وہ اپنے گناہ کا اعتراف کریں گے۔ "دُور ہوں دوزخی خدا کی رحمت سے۔" (فاعترفوا بذنبھم فسحقًا لاصحاب السعیر)۔

ان آیات میں دوزخیوں کی وحشتناک سرنوشت کے بیان کے ضمن میں ان کی بدبختی کی اصل علت کی نشان دہی کرتے ہوئے کہتا ہے: ایک طرف تو خدا نے سننے والے کان اور عقل و ہوش عطا کیا اور دوسری طرف واضح دلائل کے ساتھ اپنے پیغمبر بھیجے۔ اگر یہ دونوں ایک دوسرے کے ساتھ مل کر کام کریں تو انسان کی سعادت کی تکمیل ہو جاتی ہے۔

لیکن اگر انسان کان تو رکھتا ہے مگر ان سے سنتا نہیں، آنکھیں رکھتا ہے مگر ان سے دیکھتا نہیں، اور عقل رکھتا ہے مگر اس سے سوچتا نہیں، تو اب اگر خدا کے تمام کے تمام پیغمبر اور آسمانی کتابیں اس کے پاس آجائیں تو اس پر کچھ اثر نہیں ہوگا۔

ایک روایت میں آیا ہے کہ ایک گروہ نے پیغمبر اکرمؐ کی خدمت میں ایک مسلمان کی مدح و ثنا کی تو رسولؐ خدا نے فرمایا:

"کیف عقل الرجل؟"

"اس کی عقل کیسی ہے؟"

انہوں نے عرض کیا: "یا رسول اللہؐ! ہم تو عبادت اور طرح طرح کے نیک کاموں میں اس کی جدوجہد کی بات کر رہے ہیں اور آپ اس کی عقل کے بارے میں پوچھ رہے ہیں؟" تب آپ نے فرمایا:

"ان الاحمق یصیب بحمقه اعظم من فجور الفاجر. و انما یرتفع العباد غدًا فی الدرجات، وینالون الزلفی من ربھم علی قدر عقولھم"!

"احمق کی حماقت سے جو مصیبت آتی ہے وہ فاجروں کے فجور اور بدکاروں کے گناہ سے بدتر ہوتی ہے۔ کل قیامت کے دن خدا بندوں کو ان کے عقل و خرد کے مطابق درجات عطا فرمائے گا اور وہ اسی بنیاد پر قربِ خداوندی حاصل کریں گے۔"

لہ مجمع البیان جلد ۱۰ ص ۳۲۴

"سحق" (بروزن قفل) اصل میں پیسنے اور نرم کرنے کے معنی میں ہے اور پرانے لباس کو بھی کہا جاتا ہے۔ لیکن یہاں رحمتِ خدا سے دوری کے معنی میں ہے تو اس بناء پر فسحقًا لاصحاب السعیر کا مفہوم یہ ہے کہ دوزخی رحمتِ خدا سے دُور رہیں، کیونکہ خدا کی نفرین تحقّقِ خارجی سے توأم ہوتی ہے۔ تو یہ جملہ اس بات کی دلیل ہے کہ یہ گروہ کلّی طور پر رحمتِ خدا سے دُور ہوگا۔

* * *

ایک نکتہ

عقل وخرد کی اونچی قدر وقیمت

یہ پہلا موقع نہیں ہے کہ قرآنِ مجید عقل وخرد کی حد سے زیادہ قدر وقیمت کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔ نیز دوزخیوں کا بنیادی گناہ اور ان کی بدبختی کا اصلی عامل اس خدائی قوت سے کام نہ لینے کو شمار کرتا ہے۔ بلکہ جو شخص قرآن سے آشنائی رکھتا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ اُس نے مختلف مناسبتوں سے اس موضوع کی اہمیت کو آشکار کیا ہے۔ اس نے ان لوگوں کی دروغ بافیوں کے برخلاف، جو مذہب کو دماغوں کے مست اور سست کرنے کا ذریعہ اور عقل وخرد کی پروا نہ کرنے والا شمار کرتے ہیں، اسلام خدا شناسی اور سعادت ونجات کی اساس وبنیاد عقل وخرد پر رکھتا رکھتا ہے، بلکہ جگہ جگہ اس کا رُوئے سخن "اولوالالباب" (صاحبانِ عقل) اور "اولوالابصار" (صاحبانِ بصیرت) غور وفکر کرنے والے عقلاء کی طرف ہے۔

اسلامی منابع میں اس سلسلہ میں اس قدر روایات وارد ہوئی ہیں جو حساب وشمار سے باہر ہیں۔ قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ مشہور کتاب 'کافی' جو منابع حدیث میں سب سے زیادہ قابلِ اعتبار ہے وہ مختلف کتابوں پر مشتمل ہے اور اس کی پہلی کتاب کا نام کتابِ 'عقل وجہل' ہے۔ جو شخص ان روایات کو ملاحظہ کرے جو اس ضمن میں اس کتاب میں نقل ہوئی ہیں، وہ اس سلسلہ میں اسلام کی نظر کی گہرائی کو پالے گا۔ ہم یہاں صرف دو روایات کے ذکر پر قناعت کریں گے۔

(اسی کتاب میں) امیرالمومنین امام علیؑ سے روایت آئی ہے کہ جبرئیل آدمؑ پر نازل ہوئے اور ان سے کہا "مجھے حکم ہوا ہے کہ میں آپ کو ان تین نعمتوں میں سے کسی ایک کو اپنانے کا اختیار دوں، آپ ان میں سے کسی ایک کا انتخاب کرلیں اور باقی دو کو چھوڑ دیں"۔

آدم نے کہا: "وہ کون سی نعمتیں ہیں؟"

جبرئیل نے جواب دیا: "عقل، حیا اور دین"۔

آدم نے کہا : "میں نے عقل کا انتخاب کیا ہے"۔ جبرئیل نے حیا اور دین سے کہا : "اسے چھوڑ دو، اور اپنا کام کرو"۔

انھوں نے کہا : "ہم مامور ہیں کہ ہر جگہ عقل کے ساتھ رہیں اور اس سے جُدا نہ ہوں"۔

جبرئیل نے کہا : "اب جبکہ یہ بات ہے تو پھر اپنی ماموریت پر عمل کرو"۔ اور اس کے بعد وہ آسمان کی طرف صعود کر گئے۔ [1]

یہ ایک ایسی لطیف ترین تعبیر ہے جو عقل و خرد اور حیا و دین سے اس کی نسبت کے بارے میں کی جاسکتی ہے۔ کیونکہ اگر عقل، دین سے جُدا ہو جائے تو وہ ذرا سی بات میں برباد ہو جانے گا یا انحراف کا شکار ہو جائے گا۔ باقی رہی حیاء کہ جو انسان کو بُرائیوں اور گناہوں کے ارتکاب سے روکتی ہے تو وہ بھی معرفت اور عقل و خرد کا نتیجہ ہوتی ہے۔

یہ چیز اس بات کی نشان دہی کرتی ہے کہ آدمؑ عقل کے ایک قابلِ ملاحظہ حصّہ کے مالک تھے جنھوں نے ان تین چیزوں کے درمیان اختیار کے موقع پر عقل کے بالاتر مرحلہ کو انتخاب کیا اور اس کے سائے میں دین کو بھی ساتھ رکھا اور حیا کو بھی۔

ایک اور حدیث میں امام جعفر صادقؑ سے آیا ہے :

"من کان عاقلاً کان له دین، ومن کان له دین دخل الجنّة"

"جو عقلمند ہوگا وہ دیندار بھی ہوگا، اور جو دیندار ہوگا وہ جنّت میں داخل ہوگا"۔

(اسی بناء پر جنّت عقلمندوں کی جگہ ہے) [2]

البتہ عقل یہاں سچی معرفت کے معنی میں ہے نہ کہ شیاطین کی وہ شیطنت جو دنیا کے جابر اور ظالم سیاستمداروں میں نظر آتی ہے کہ جو امام جعفر صادقؑ کے قول کے مطابق :

"شبیهة بالعقل، ولیست بالعقل"

"عقل کے مشابہ ہے لیکن وہ عقل نہیں ہے"۔ [3]

❖ ❖ ❖

---

[1]، [2]، [3] اصول کافی بمطابق نقل نور الثقلین جلد ۵ ص ۳۸۲

(۱۲) اِنَّ الَّذِیْنَ یَخْشَوْنَ رَبَّھُمْ بِالْغَیْبِ لَھُمْ مَّغْفِرَۃٌ وَّ اَجْرٌ کَبِیْرٌ ○

(۱۳) وَ اَسِرُّوْا قَوْلَکُمْ اَوِ اجْھَرُوْا بِہٖ ؕ اِنَّہٗ عَلِیْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ○

(۱۴) اَلَا یَعْلَمُ مَنْ خَلَقَ ؕ وَ ھُوَ اللَّطِیْفُ الْخَبِیْرُ ○

❊ ❊ ❊

ترجمہ

(۱۲) وہ لوگ جو اپنے پروردگار سے پوشیدہ طور سے ڈرتے ہیں ان کیلیے بخشش اور اجر عظیم ہے۔

(۱۳) اپنی گفتگو کو پوشیدہ رکھو یا آشکار کرو (کچھ فرق نہیں ہے) وہ دلوں کی باتوں سے آگاہ ہے۔

(۱۴) کیا وہ ہستی کہ جس نے تمام موجودات کو پیدا کیا ہے ان کے حالات سے آگاہ نہیں ہے؟ جب کہ وہ دقیق اسرار سے باخبر اور ہر چیز کا عالم ہے۔

❊ ❊ ❊

تفسیر

کیا جہان کا خالق جہان کے اسرار سے آگاہ نہیں ہے؟

ان مباحث کے بعد جو گزشتہ آیات میں قیامت کے روز کفار اور ان کی سرنوشت کے بارے میں بیان ہوئے تھے، زیر بحث آیات میں قرآن مومنین اور ان کی عظیم جزاؤں کو بیان کر رہا ہے۔

پہلے فرماتا ہے: "وہ لوگ جو اپنے پروردگار سے پنہاں طور پر ڈرتے ہیں، ان کے لیے مغفرت اور اجر عظیم

ہے:" (ان الذین یخشون ربھم بالغیب لھم مغفرۃ و اجر کبیر)۔

"غیب" کی تعبیر یہاں ممکن ہے کہ نادیدہ خدا کی معرفت یا نادیدہ معاد و قیامت یا ان تمام چیزوں کی طرف اشارہ رہا ہو۔

آیت کی تفسیر میں یہ احتمال بھی دیا گیا ہے کہ شاید یہ پوشیدہ گناہوں کے بارے میں خدا کے خوف کی طرف اشارہ ہو۔ کیونکہ اگر انسان پوشیدگی میں بھی کوئی گناہ نہ کرے تو وہ بطریقِ اولیٰ آشکار گناہ نہیں کرے گا۔ یا یہ تعبیر گناہوں سے پرہیز کرنے اور اوامرِ الٰہی کے انجام دینے میں خلوص نیت کے مقام کی طرف اشارہ ہو کیونکہ پوشیدہ طور سے کیا ہوا عمل ریا اور دکھاوے سے دور ہوتا ہے۔

ان تفاسیر کے درمیان جمع کرنے میں بھی کوئی مانع نہیں ہے۔

"مغفرۃ" کی تعبیر کا نکرہ کی صورت میں ہونا اور اس طرح 'اجر کبیر' اس کی عظمت و اہمیت کی طرف اشارہ ہے۔ یعنی یہ مغفرت اور اجر و پاداش اتنی عظیم ہوگی جو سب کے لیے انجانی ہوگی۔

❊ ❊ ❊

اس کے بعد تاکید کے لیے مزید کہتا ہے: "اگر تم اپنی گفتگو پنہاں طور پر یا آشکار کرو، خدا دلوں کی باتوں سے آگاہ ہے:" (و اسروا قولکم او اجھروا بہ انہ علیم بذات الصدور)۔

بعض مفسرین نے ابن عباس سے اس آیت کی ایک شانِ نزول نقل کی ہے کہ کفار یا منافقین کی ایک جماعت پیغمبر خدا کے پس پشت ناروا باتیں کرتی تھی۔ جبرئیل آکر پیغمبرؐ کو خبر دے دیا کرتے تھے۔ تب ان میں سے بعض نے ایک دوسرے سے کہا: "اسروا قولکم" "اپنی باتیں پوشیدہ طور پر کیا کرو تاکہ محمدؐ کا خدا نہ سن لے۔" تو اوپر والی آیت نازل ہوئی اور کہا: "چاہے آشکارا باتیں کرو یا پوشیدہ طور پر، خدا اُن سے آگاہ ہے۔"[1]

بعد والی آیت اس چیز کے لیے جو گزشتہ آیت میں بیان ہوئی ہے ایک دلیل کے طور پر آئی ہے۔ فرماتا ہے: "کیا وہ ذات جس نے موجودات کو پیدا کیا ہے ان کے حالات سے آگاہ نہیں ہے؟ جبکہ وہ دقیق ترین اسرار سے باخبر اور ہر چیز کا عالم ہے۔" (الا یعلم من خلق و ھو اللطیف الخبیر)۔

"الا یعلم من خلق" کے جملہ کی تفسیر میں کئی احتمال دیئے گئے ہیں:

بعض نے کہا ہے اس سے مراد یہ ہے کہ کیا وہ خدا جس نے دلوں کو پیدا کیا ہے، وہ ان کے اندر کے اسرار سے آگاہ نہیں ہے؟

یا یہ کہا ہے کہ وہ خدا جس نے بندوں کو پیدا کیا ہے، کیا وہ ان بندوں کے اسرار سے بے خبر ہے؟

یا یہ کہا ہے کہ وہ خدا جس نے تمام عالمِ ہستی کو پیدا کیا ہے وہ تمام جہان کے اسرار سے آگاہ ہے تو کیا وہ

---

[1] "فخر رازی" جلد ۳۰ ص ۶۶، روح البیان جلد ۱۰ ص ۸۶ زیر بحث آیات کے ذیل میں۔

انسان جو اس عظیم خلقت میں سے ایک موجود ہے، اس کے اسرار خدا سے پوشیدہ ہوں گے؟

بہرحال اس حقیقت کو معلوم کرنے کے لیے ہمیشہ اس نکتہ کی طرف توجہ کرنی چاہیے کہ خدا کی خلقت دائمی ہے۔ یعنی اس کی طرف سے فیضِ وجود ہر لحظہ مخلوقات کو پہنچ رہا ہے۔ معاملہ اس طرح نہیں ہے کہ وہ انھیں پیدا کرکے ان کی حالت پر چھوڑ دے۔

اصولی طور پر تمام ممکنات (موجودات) اس کے وجود کے ساتھ وابستہ ہیں۔ اگر ایک لمحہ کے لیے بھی ان کا رشتہ اس کی ذات پاک سے منقطع ہوجائے تو وہ فنا کی راہ اختیار کرلیں۔ اس دائمی تعلق اور خلقت کی طرف مسلسل توجہ، ہر زمانہ اور ہر مکان میں تمام موجودات کے اسرار کے بارے میں علم خدا کی ایک بہترین دلیل ہے۔

'لطیف' کے ساتھ خدا کی توصیف اس لحاظ سے ہے کہ لطیف 'لُطف' کے مادہ سے ہے۔ وہ ہر دقیق و ظریف موضوع اور ہر قسم کی سریع حرکت اور جسم لطیف کے معنی میں ہے۔ اس بناء پر خدا کا لطیف ہونا خلقت کے دقیق و ظریف اسرار کے بارے میں اس کے علم کی طرف اشارہ ہے۔ یہ لفظ بعض اوقات اجسام لطیف خوردبینی ذرات اور ان سے مافوق کے معنی میں بھی آیا ہے۔

یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ تمھاری دلی نیتیں چاہے جتنی پوشیدہ ہوں اور تم اپنی باتوں کو محفلوں میں چاہے جتنا مخفی طور پر کہو یا غلط اعمال خلوت گاہوں میں انجام دو۔ خداوند لطیف وخبیر ان سب سے آگاہ ہے۔

بعض مفسرین نے 'لطیف' کی تفسیر میں کہا ہے: (هو الذی یکلف الیسیر ویعطی الکثیر) "وہ ایسی ہستی ہے جو ذمہ داری تو آسان ڈالتی ہے مگر اجر و پاداش فراواں دیتی ہے۔"

حقیقت میں یہ بھی رحمت میں ایک قسم کی ظرافت و دقت ہے۔

بعض نے یہ بھی کہا ہے کہ لطیف کے ساتھ خدا کی توصیف اس بناء پر ہے کہ وہ تمام چیزوں کے اندر نفوذ رکھتا ہے اور سارے جہان میں کوئی جگہ اس سے خالی نہیں ہے۔

لیکن یہ سب باتیں ایک ہی حقیقت کی طرف لوٹتی ہیں اور خدا کے علم کی گہرائی اور پوشیدہ و آشکار اسرار پر اس کے علم پر ایک تاکید ہے۔

* * *

⑮ هُوَ الَّذِیْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ ذَلُوْلًا فَامْشُوْا فِیْ مَنَاكِبِهَا وَكُلُوْا مِنْ رِّزْقِهٖ ؕ وَ اِلَیْهِ النُّشُوْرُ ○

⑯ ءَاَمِنْتُمْ مَّنْ فِی السَّمَآءِ اَنْ یَّخْسِفَ بِكُمُ الْاَرْضَ فَاِذَا هِیَ تَمُوْرُ ○

⑰ اَمْ اَمِنْتُمْ مَّنْ فِی السَّمَآءِ اَنْ یُّرْسِلَ عَلَیْكُمْ حَاصِبًا ؕ فَسَتَعْلَمُوْنَ كَیْفَ نَذِیْرِ ○

⑱ وَلَقَدْ كَذَّبَ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَكَیْفَ كَانَ نَكِیْرِ ○

❊ ❊ ❊

ترجمہ

⑮ وہی تو ہے کہ جس نے زمین کو تمھارے لیے رام کر دیا۔ اس کے دوش پر چلو پھرو اور خدا کی روزیوں میں سے کھاؤ اور تم سب کی بازگشت اسی کی طرف ہے۔

⑯ جو آسمان پر حاکم ہے کیا تم اس کے عذاب سے خود کو امان میں سمجھتے ہو کہ زمین اس کے حکم سے پھٹ جائے اور تمھیں نگل لے اور مسلسل لرزتی اور کانپتی رہے۔

(۱۷) یا تم خداوندِ آسمان کے عذاب سے اپنے آپ کو امان میں سمجھتے ہو کہ وہ ایسی آندھی تم پر بھیج دے جو سنگریزوں سے بھری ہوئی ہو اور تم جلدی ہی جان لو گے کہ میری دھمکیاں کیسی ہیں۔

(۱۸) وہ لوگ جو ان سے پہلے تھے انھوں نے آیاتِ الٰہی کی تکذیب کی تھی، لیکن (دیکھو) میرا عذاب کیسا تھا؟

* * *

تفسیر

کوئی مجرم اس کے عذاب وسزا سے امان میں نہیں ہے۔

ان مباحث کے بعد جو گزشتہ آیات میں دوزخیوں، جنتیوں، کافروں اور مومنوں کے بارے میں گزرے ہیں، زیرِ بحث آیات میں جنتیوں کی صفوں میں جا ملنے کی ترغیب و تشویق اور دوزخیوں کی راہ و رسم سے بچنے کے لیے چند خدائی نعمتوں کا ذکر اور پھر اس کے عذابوں کے ایک حصّہ کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

فرماتا ہے: "وہی تو ہے کہ جس نے زمین کو تمھارے لیے رام کر دیا ہے" (هو الذی جعل لکم الارض ذلولاً)۔

"پس تم زمین کے دوش پر چلو پھرو، اور پروردگار کی روزیوں میں سے کھاؤ اور جان لو کہ سب کی بازگشت اسی کی طرف ہے" (فامشوا فی مناکبها وکلوا من رزقه والیه النشور)۔

"ذلول" رام ہونے کے معنی میں ایک جامع ترین تعبیر ہے جو زمین کے بارے میں ممکن ہو سکتی ہے۔ کیونکہ یہ تیز رو سواری بہت ہی تیز اور متعدد حرکات رکھنے کے باوجود ایسی پُرسکون نظر آتی ہے گویا کہ مطلقاً ساکن ہے۔ بعض ماہرین کہتے ہیں کہ زمین چودہ قسم کی مختلف حرکتیں رکھتی ہے۔ جن میں سے تین اقسام یعنی اس کی اپنے محور پر حرکت، سورج کے گرد حرکت اور منظومہ شمسی کے ہمراہ کہکشاں کے اندر حرکت ہے۔ یہ حرکات جو بہت ہی زیادہ تیز ہیں ایسی نرم اور ملائم ہیں کہ جب تک زمین کی حرکت پر قطعی دلائل قائم نہیں ہوئے تھے، کوئی شخص باور ہی نہیں کرتا تھا کہ اس میں کوئی حرکت ہے۔

دوسری طرف زمین نہ تو اس طرح کی سخت ہے کہ قابلِ زندگی ہی نہ ہو اور نہ ہی اس طرح کی ڈھیلی اور نرم ہے کہ قرار و آرام نہ پکڑتی ہو۔ بلکہ یہ مکمل طور پر انسانی زندگی کے لیے رام ہے۔ مثلاً اگر زمین زیادہ کیچڑ والی ہوتی جس میں ہر چیز دھنس جاتی، یا نرم ریت ہوتی کہ جس میں انسان کے پاؤں گھٹنوں تک دھنس جاتے

یا تیز اور سخت پتھر ہوتے جو تھوڑا سا چلنے سے انسانی بدن کو زخمی کر دیتے تو اس سے زمین کی بے آرامی کے معنی واضح ہو جاتے۔

تیسری طرف اس کا فاصلہ سورج سے نہ تو اتنا کم ہے کہ تمام چیزیں گرمی کی شدت سے جل جائیں اور نہ ہی اتنا زیادہ ہے کہ ہر چیز سردی سے خشک ہو جائے۔ زمین پر ہوا کا دباؤ اس طرح سے ہے جو انسان کو سکون و آرام مہیا کرتا ہے۔ وہ نہ تو اس قدر زیادہ ہے کہ انسان کا کلا گھونٹ دے اور نہ اس قدر کم ہے کہ وہ پارہ پارہ ہو جائے۔ زمین کی قوت جاذبہ نہ اس قدر زیادہ ہے کہ وہ ہڈیوں کو توڑ دے اور نہ ہی اس قدر کم ہے کہ ایک ہی حرکت سے انسان اپنی جگہ سے اکھڑ جائے اور فضا میں جا پڑے۔

خلاصہ یہ ہے کہ وہ ہر لحاظ سے "ذلول" اور انسان کے حکم کے آگے مسخر اور رام ہے۔ قابل توجہ بات یہ ہے کہ زمین کے ذلول اور مطیع ہونے کی توصیف کے بعد حکم دیتا ہے کہ اس کے کندھوں پر چلو۔ ہم جانتے ہیں کہ "مناکب" جمع "منکب" (بروزن مغرب) کندھے کے معنی میں ہے، گویا انسان زمین کے کندھے پر قدم رکھتا ہے اور زمین ایسی پرسکون ہے کہ وہ اپنے اعتدال کو محفوظ رکھ سکتی ہے۔

اس میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ جب تک تم قدم نہ اٹھاؤ گے اور سعی و کوشش نہ کرو گے، زمین کی روزیوں سے بہرہ مند نہ ہو پاؤ گے۔

"رزق" کی تعبیر بھی ایک بہت ہی جامع تعبیر ہے جو زمین کے تمام مواد غذائی کو چاہے وہ حیوانی ہو یا نباتی یا معدنی، سب کو شامل ہے۔

لیکن جان لو کہ یہ تمہاری خلقت کا مقصد اصلی نہیں ہے۔ یہ سب کے سب تو تمہارے "نشور" قیامت اور حیات ابدی کی راہ کے لیے وسائل و ذرائع ہیں۔

* * *

اس تشویق اور بشارت کے بعد تہدید و انذار کی بات کرتا ہے۔ مزید کہتا ہے: "جو آسمان پر حاکم ہے، کیا تم اس کے عذاب سے اپنے آپ کو امان میں سمجھتے ہو کہ زمین اس کے حکم سے پھٹ جائے، وہ تمہیں اپنے اندر نگل لے اور ہمیشہ لرزتی اور کانپتی رہے۔" (ء امنتم من فی السماء ان یخسف بکم الارض فاذا ھی تمور)۔

ہاں! اگر وہ حکم دے تو یہ مطیع و ساکن زمین سرکش ہو جائے اور وحشی جانور کی صورت اختیار کر لے، زلزلے آنے شروع ہو جائیں، زمین میں شگاف پڑ جائیں اور وہ تمہیں، تمہارے گھروں اور شہروں کو نگل جائے اور پھر بھی لرزتی اور کانپتی رہے۔

"فاذا ھی تمور" (وہ ہمیشہ لرزتی رہے اور بے سکون رہے) کا جملہ ممکن ہے اس بات کی طرف اشارہ ہو کہ خدا یہ حکم دے سکتا ہے کہ زمین تمہیں نگل جائے اور تمہیں مسلسل ایک جگہ سے دوسری جگہ اپنے اندر

ہی اندر منتقل کرتی رہے۔ یہاں تک کہ تمھاری قبر بھی ساکن اور بغیر حرکت کے نہ ہو۔

یا یہ ہے کہ زمین اپنے سکون و آرام کو ہمیشہ کے لیے کھو بیٹھے اور اس میں ہمیشہ زلزلے آتے رہیں۔ اس معنی کا ادراک ان لوگوں کے لیے آسان ہے جنھوں نے بعض زلزلہ خیز علاقوں میں زندگی بسر کی ہے۔ انہوں نے دیکھا ہوگا کہ بعض اوقات زمین کئی کئی دن اور راتیں بالکل بے سکون و بے آرام رہتی ہے۔ تب ان سب کا کھانا پینا، سونا اور آرام کرنا ختم ہو جاتا ہے لیکن ہم لوگوں کے لیے جنھوں نے عادتاً زمین کے آرام و سکون ہی کو دیکھا ہے اس کا سمجھنا مشکل ہے۔

"من فی السماء (وہ جو آسمان میں ہے) کی تعبیر خدا کی ذاتِ پاک کی طرف اشارہ ہے کہ جس کی حاکمیت زمین تو کیا آسمانوں پر بھی مسلّم ہے۔ بعض نے یہ بھی کہا ہے کہ یہ خدا کے فرشتوں کی طرف اشارہ ہے جو آسمانوں میں ہیں اور اس کے فرمان کے اجرا پر مامور ہیں۔

❖ ❖ ❖

اس کے بعد مزید کہتا ہے: "ضروری نہیں ہے کہ حتمی طور پر زلزلے ہی تمھاری طرف آئیں، بلکہ وہ یہ فرمان تند آندھیوں کو دے سکتا ہے۔ کیا تم اپنے آپ کو امان میں سمجھتے ہو کہ آسمانوں کا حاکم خدا ایسی تیز آندھی جو سنگریزوں سے پُر ہو تم پر بھیج دے اور تمھیں اس پہاڑ کے نیچے دفن کر دے؟" (ام امنتم من فی السماء ان یرسل علیکم حاصبا)۔

"اور تم جلدی ہی جان لو گے کہ میری تہدیدیں (اور دھمکیاں) کیسی ہیں" (فستعلمون کیف نذیر)۔

اس معنی کا ادراک ان لوگوں کے لیے بہت آسان ہے جنھوں نے چلتی ہوئی ریت اور "حاصب" ہوائیں دیکھی ہیں۔ (یہ ہوائیں ریت کے جو تودے اپنے ساتھ لے جاتی ہیں انھیں ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کرتی رہتی ہیں) وہ جانتے ہیں کہ چند ہی لمحوں کے اندر گھر اور آبادیاں رواں دواں ریت کے تودوں کے نیچے دفن ہو سکتی ہیں یا وہ قافلے جو بیابان کے وسط میں چل رہے ہوتے ہیں اس کے نیچے دفن ہو سکتے ہیں۔

❖ ❖ ❖

حقیقت میں اوپر والی آیات اس معنی کی طرف اشارہ کرتی ہیں کہ یہ عذاب قیامت کے عذاب میں منحصر نہیں ہے۔ اس دنیا میں خدا زمین کی مختصر سی حرکت یا آندھیوں کے چلنے سے ان کی زندگی کو ختم کر سکتا ہے۔ اس امکان کی بہترین دلیل گزشتہ امتوں میں ان امور کا واقع ہونا ہے۔

لہٰذا آخری زیر بحث آیت میں کہتا ہے:

"وہ لوگ جو ان سے پہلے تھے انہوں نے خدا کی آیات اور اس کے رسولوں کی تکذیب کی تھی لیکن دیکھو میری دی ہوئی سزا اور عذاب ان کے حق میں کیسا تھا؟" (ولقد کذب الذین من قبلھم فکیف کان نکیر)۔ [1]

(حاشیہ [1] اگلے صفحہ پر دیکھیں)

ایک گروہ کو تباہ کرنے والے زلزلوں سے، کچھ قوموں کو بجلیوں سے اور ایک جماعت کو طوفان یا تیز آندھیوں کے ذریعہ سزا دی، اور ان کے تباہ شدہ خاموش شہروں کو ہم نے درس عبرت کے طور باقی رہنے دیا۔

(حاشیہ سابقہ صفحہ) لے نکیر انکار کے معنی میں ہے اور یہاں عذاب و سزا سے کنایہ ہے کیونکہ خدا کا انکار ان قوموں کے افعال کے مقابلہ میں ان کی سزا کے طریقہ سے صورت پذیر ہوا، اس بات پر توجہ رہے کہ یہ لفظ نکیری تھا۔ جیسا کہ گزشتہ آیت میں لفظ نذیر نذیری تھا (میرا انکار اور میرا ڈرانا) "یا" متکلم حذف ہوگئی اور زیر جو اس پر دلالت کرتی ہے باقی رہ گئی۔

(۱۹) اَوَلَمْ یَرَوْا اِلَی الطَّیْرِ فَوْقَهُمْ صٰٓفّٰتٍ وَّیَقْبِضْنَ مَا یُمْسِکُهُنَّ اِلَّا الرَّحْمٰنُ ط اِنَّهٗ بِکُلِّ شَیْءٍۢ بَصِیْرٌ ○

(۲۰) اَمَّنْ هٰذَا الَّذِیْ هُوَ جُنْدٌ لَّکُمْ یَنْصُرُکُمْ مِّنْ دُوْنِ الرَّحْمٰنِ ط اِنِ الْکٰفِرُوْنَ اِلَّا فِیْ غُرُوْرٍ ○

(۲۱) اَمَّنْ هٰذَا الَّذِیْ یَرْزُقُکُمْ اِنْ اَمْسَکَ رِزْقَهٗ ج بَلْ لَّجُّوْا فِیْ عُتُوٍّ وَّنُفُوْرٍ ○

❖ ❖ ❖

ترجمہ

(۱۹) کیا انھوں نے ان پرندوں کی طرف نہیں دیکھا. جو ان کے سروں کے اوپر کبھی اپنے پروں کو پھیلائے ہوئے ہوتے ہیں اور کبھی سمیٹے ہوئے ہوتے ہیں؟ خدائے رحمٰن کے سوا کوئی انھیں آسمان کی بلندی پر روکے ہوئے نہیں ہوتا. کیونکہ وہ ہر چیز کو دیکھتا ہے۔

(۲۰) کیا وہ جو تمھارا لشکر ہے وہ خدا کے مقابلہ میں تمھاری مدد کرسکتا ہے؟ لیکن کافر تو صرف دھوکہ میں ہیں۔

(۲۱) کیا وہ جو تمھیں روزی دیتا ہے اگر وہ اپنی روزی روک لے (تو تمھاری ضروریات کو کون پورا کرسکتا ہے) لیکن وہ تو سرکشی اور حقیقت سے فرار کرتے ہوئے ہٹ دھرمی سے کام لیتے ہیں۔

تفسیر

اپنے سر کے اوپر ان پرندوں کی طرف دیکھو

اس سورۃ کی ابتدائی آیات میں جب خدا کی قدرت اور مالکیت کے بارے میں بحث تھی تو ساتوں آسمانوں، ان کے ستاروں اور کواکب کے بارے میں گفتگو تھی۔ لیکن یہاں پہلی زیر بحث آیت میں اسی مسئلۂ قدرت کو عالم ہستی کے بظاہر ایک چھوٹے سے موجود کے ذکر کے ذریعہ بیان کیا جا رہا ہے۔ فرماتا ہے:

"کیا انہوں نے ان پرندوں کی طرف نہیں دیکھا جو ان کے سروں کے اوپر کبھی اپنے پروں کو پھیلائے ہوئے ہوتے ہیں اور کبھی سمیٹے ہوئے ہوتے ہیں؟" (اولم یروا الی الطیر فوقھم صافات و یقبضن)۔ [1]

یہ سنگین جسم قانون جاذبہ کے برخلاف زمین سے اُٹھتے ہیں اور آرام کے ساتھ آسمان کی بلندی پر گھنٹوں تک اور بعض اوقات ہفتوں اور مہینوں تک مسلسل اپنی سریع اور نرم حرکت کو جاری رکھتے ہیں، اور انھیں اس میں کوئی مشکل پیش نہیں آتی۔

پرواز کرتے وقت اکثر پرندے اپنے پروں کو کھولے ہوئے ہوتے ہیں۔ صافات" گویا ایک پُراسرار قوت انھیں چلا رہی ہوتی ہے۔

جبکہ بعض ہمیشہ پر مارتے رہتے ہیں۔ (ممکن ہے یقبضن اسی معنی کی طرف اشارہ ہو)

بعض دوسرے کبھی پر مارتے ہیں اور کبھی پروں کو پھیلا لیتے ہیں۔

چوتھا گروہ ایک مدت تک پَر مارتا ہے اور جب تیزی پکڑ لیتا ہے تو اپنے پروں کو کلی طور پر سمیٹ لیتا ہے اور فضا کے سمندر میں غوطہ لگا لیتا ہے (مثلاً چڑیا) خلاصہ یہ ہے کہ باوجودیکہ وہ سب پرواز کرتے ہیں لیکن ان میں سے ہر ایک کا اپنا ایک مخصوص انداز ہے۔

ان کے جسم کو کس نے اس طرح سے پیدا کیا ہے کہ وہ آرام و سکون کے ساتھ فضا میں سیر کرتے ہیں؟ ان کے پروں کو یہ قدرت کس نے عطا کی اور انھیں پرواز کا علم سکھایا ہے؟ خصوصاً مہاجر پرندوں کی پیچیدہ قسم کی اجتماعی پرواز جو بعض اوقات کئی کئی ماہ تک طول کھینچتی ہے اور ہزاروں کلومیٹر کا راستہ طے کر کے بہت سے ملکوں، پہاڑوں، دروں، جنگلوں اور سمندروں کے اُوپر سے گزر کر اپنے مقصد تک پہنچتے ہیں۔ واقعتاً ایسی قوت

---

[1] "الطیر" طائر کی جمع ہے۔ اسی لیے اس کا فعل اور صفت جمع کی صورت میں آیا ہے۔ بعض نے جو یہ تصور کیا ہے کہ طیر مفرد ہے تو یہ ارباب لغت کی تصریح کے خلاف ہے۔

اور آگاہی انھیں کس نے عطا کی ہے ؟

لہٰذا آیت کے آخر میں مزید کہتا ہے: "خدائے رحمٰن کے سوا کوئی انھیں آسمان کی بلندی پر روکے ہوئے نہیں ہوتا، کیونکہ وہ ہر چیز کو دیکھتا ہے اور ہر مخلوق کی نیاز اور حاجت کو جانتا ہے۔" (مایمسکھن الا الرحمٰن انہ بکل شیء بصیر)۔

وہی تو ہے کہ جس نے انھیں پرواز کے لیے مختلف وسائل اور استعدادیں عطا کی ہیں۔ ہاں! خدائے رحمٰن جس کی رحمتِ عامّہ نے تمام موجودات کو گھیرا ہوا ہے، اسی نے پرندوں کو بھی ان کی ضرورت کی چیزیں بخشی ہیں۔ جو ہستی آسمان اور فضا میں پرندوں کو روکے ہوئے ہے، وہی زمین اور دوسری موجودات کی بھی نگہدار ہے۔ جب وہ ارادہ کرلے تو نہ پرندہ پرواز کر سکتا ہے اور نہ ہی زمین اپنے سکون کو محفوظ رکھ سکتی ہے۔

"صافات" و "یقبضن" (پروں کو پھیلاتے اور سمیٹتے ہیں) کی تعبیر، ممکن ہے مختلف پرندوں کی طرف یا ایک ہی پرندہ کے مختلف حالات کی طرف اشارہ ہو۔[1]

ہم نے پرندوں کی دنیا اور ان کی پرواز کے عجائبات کے بارے میں تفسیرِ نمونہ جلد ۱۱ (سورۂ نحل کی آیت ۷۹ کے ذیل میں) تفصیل کے ساتھ بحث کی ہے۔

بعد والی آیت میں اس معنی کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ کفار خدا کی قدرت کے مقابلہ میں کسی قسم کا کوئی یار و مددگار نہیں رکھتے، فرماتا ہے: "کیا وہ جو تمھارا لشکر ہے، وہ خدا کے مقابلہ میں تمھاری مدد کر سکتا ہے؟" (امن ھٰذا الذی ھو جند لکم ینصرکم من دون الرحمٰن)۔[2]

نہ صرف یہ کہ وہ مصیبتوں میں تمھاری کوئی مدد نہیں کر سکتے بلکہ اگر وہ چاہے تو انھیں کو تمھارے عذاب اور نابودی پر مقرر کر دے۔ کیا پانی، ہوا، مٹی اور آگ تمھارے خدمت گزار اور تمھاری زندگی کے ارکان نہیں ہیں؟ لیکن خدا نے انھیں کو سرکش اقوام کی نابودی پر مامور کر دیا۔ نیز تاریخ میں بہت سے ایسے واقعات محفوظ ہیں کہ بادشاہوں فراعنہ اور سرکش حکمرانوں کے نزدیک ترین افراد ہی ان کی موت کا سبب بن گئے۔ موجودہ زمانہ کی تاریخ میں بھی یہ ماجرا دیکھنے میں آیا ہے کہ حکومتوں کی وفادار ترین طاقتوں نے ہی ان کے خلاف بغاوت کر دی، اور ان کی موت کا فرمان جاری کیا۔

---

[1] اس بارے میں کہ "صافات" وصفی صورت میں اور یقبضن فعل مضارع کی صورت میں آیا ہے، ممکن ہے یہ اس وجہ سے ہو کہ پروں کا پھیلانا ایک خاص انداز ہے جبکہ کھولنا اور بند کرنا پروں کی تکرار ہے۔

[2] "ام" اس جملہ میں حرفِ علت ہے۔ "من" مبتدا، "ھٰذا" دوسرا مبتدا اور "الذی" اس کی خبر ہے۔ "ھو جند لکم" اس کا صلہ ہے اور "ینصرکم" "جند" کی صفت اور جملہ کے پہلے مبتدا کی خبر ہے (التبیان فی غریب اعراب القرآن جلد ۲ ص ۴۵۹) لیکن مناسب یہ ہے کہ الذی علت بیان ہو اور "ینصرکم" خبر ہو۔ کیونکہ اس کے بغیر جملہ ناقص ہے۔ (غور کیجیے)

لیکن کافر صرف دھوکہ، فریب اور غفلت میں گرفتار ہیں۔" (ان الکافرون الا فی غرور)۔

دھوکہ، فریب اور جہالت کے پردے ان کی عقلوں پر پڑے ہوئے ہیں۔ وہ انھیں اس بات کی اجازت نہیں دیتے کہ تاریخ کے صفحات پر یا اپنی زندگی کے گوشہ و کنار میں یہ درس عبرت دیکھیں۔

'جند' اصل میں ناہموار اور ایسی سخت زمین کے معنی میں ہے جس میں بہت زیادہ پتھر جمع ہو گئے ہوں۔ اسی مناسبت سے بہت زیادہ لشکر کو بھی 'جند' کہتے ہیں۔

بعض مفسرین زیر بحث آیت میں جند کو بتوں کی طرف اشارہ سمجھتے ہیں کہ وہ قیامت میں مشرکین کی مدد پر ہرگز قدرت نہیں رکھتے۔ لیکن ظاہر یہ ہے کہ آیت ایک وسیع مفہوم رکھتی ہے اور وہ بت بھی اس کا ایک مصداق ہو سکتے ہیں۔

❖ ❖ ❖

پھر مزید تاکید کے لیے کہتا ہے: "کیا وہ ہستی جو تمھیں روزی دیتی ہے، اگر وہ اپنی روزی تم سے روک لے تو تمھیں کون بے نیاز کر سکتا ہے"؟ (امن ھذا الذی یرزقکم ان امسک رزقہ)[1]

اگر وہ آسمان کو حکم دے دے کہ وہ بارش نہ برسائے اور زمین سبزہ نہ اُگائے یا مختلف قسم کی نباتی آفات پھلوں کو نابود کر دیں تو کس میں یہ طاقت ہے کہ تمھارے لیے کوئی غذا مہیا کر دے؟ نیز اگر وہ معنوی روزیاں اور آسمانی وحی تم سے منقطع کر لے تو کس میں یہ طاقت ہے کہ تمھاری راہنمائی کرے۔؟

یہ واضح حقائق ہیں، لیکن ہٹ دھرمی اور گستاخی انسان کے ادراک اور شعور کے آگے ایک حجاب بن جاتی ہے۔ اس لیے آیت کے آخر میں فرماتا ہے:

"لیکن وہ تو سرکشی اور حقیقت سے فرار کرتے ہوئے ہٹ دھرمی سے کام لیتے ہیں"۔ (بل لجوا فی عتو ونفور)۔

اِس موجودہ زمانہ میں بھی جبکہ انسان کی زندگی کے مختلف جہات ہیں، خصوصاً غذائی مصنوعات میں بہت ہی ترقی ہو چکی ہے، اگر صرف ایک ہی سال کے لیے مطلقاً بارش نہ ہو تو ساری دُنیا میں کیسی مصیبت کھڑی ہو جائے گی، یا ٹڈی دل کا لشکر اور آفاتِ نباتی ہر جگہ کو گھیر لیں تو کیسی مصیبت واقع ہو جائے گی۔

❖ ❖ ❖

---

[1] آیت میں جزاء کی شرط محذوف ہے اور تقدیر میں اس طرح ہے: "ان امسک رزقہ من یرزقکم غیرہ"۔ (اگر وہ اپنا رزق روک لے تو اس کے علاوہ کون تمھیں رزق دے گا۔)

ایک نکتہ

انسانوں کی ناکامی کے چار عوامل

گذشتہ آیات میں بیان ہوا تھا کہ سننے والا کان اور بیدار عقل کا نہ ہونا، وہ اہم ترین عامل ہے جو دوزخیوں کو دوزخ کی طرف کھینچ کر لے جائے گا۔ زیر بحث آیات میں یہ بیان ہوا ہے کہ دوسرے چار عوامل یعنی "دھوکہ و فریب"، "ہٹ دھرمی"، "سرکشی" (عتو) اور "حق سے دوری اختیار کرنا" (نفور) انسان کی بدبختی اور گمراہی کا سبب ہیں۔

اگر ہم صحیح طور پر غور کریں تو ہم دیکھ لیں گے کہ یہ عوامل گزشتہ عوامل کے ساتھ مربوط ہیں۔ کیونکہ یہ بُری صفات انسان کے کان اور آنکھ پر پردہ ڈال دیتی ہیں اور اس کے لیے حقائق کے ادراک سے مانع ہو جاتی ہیں۔

(۲۲) اَفَمَنْ یَّمْشِیْ مُکِبًّا عَلٰی وَجْهِهٖۤ اَهْدٰۤی اَمَّنْ یَّمْشِیْ سَوِیًّا عَلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ ○

(۲۳) قُلْ هُوَ الَّذِیْۤ اَنْشَاَكُمْ وَجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْـِٕدَةَ ؕ قَلِیْلًا مَّا تَشْكُرُوْنَ ○

(۲۴) قُلْ هُوَ الَّذِیْ ذَرَاَكُمْ فِی الْاَرْضِ وَاِلَیْهِ تُحْشَرُوْنَ ○

(۲۵) وَیَقُوْلُوْنَ مَتٰی هٰذَا الْوَعْدُ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ ○

(۲۶) قُلْ اِنَّمَا الْعِلْمُ عِنْدَ اللّٰهِ ۫ وَاِنَّمَاۤ اَنَا نَذِیْرٌ مُّبِیْنٌ ○

(۲۷) فَلَمَّا رَاَوْهُ زُلْفَةً سِیْٓـَٔتْ وُجُوْهُ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا وَقِیْلَ هٰذَا الَّذِیْ كُنْتُمْ بِهٖ تَدَّعُوْنَ ○

❊ ❊ ❊

ترجمہ

(۲۲) کیا وہ شخص جو منہ کے بل گرا ہوا چل رہا ہو ہدایت کے زیادہ نزدیک ہے یا وہ شخص جو راست قامت صراط مستقیم پر گامزن ہے؟

(۲۳) کہہ دیجئے وہی تو ہے کہ جس نے تمھیں پیدا کیا ہے ، اور تمھارے لیے کان ، آنکھیں اور دل قرار دیئے ، لیکن تم بہت ہی کم شکر کرتے ہو۔

(۲۴) کہہ دیجئے کہ وہی تو ہے کہ جس نے تمھیں زمین میں پیدا کیا ، اور اسی کی طرف تم لوٹ جاؤ گے۔

(۲۵) وہ کہتے یہ ہیں کہ اگر تم سچ کہتے ہو تو یہ قیامت کا وعدہ کب پورا ہو گا۔

(۲۶) کہہ دیجئے کہ اس کا علم تو خدا ہی کے ساتھ مخصوص ہے ، اور میں تو صرف واضح و آشکار ڈرانے والا ہوں۔

(۲۷) جس وقت اس وعدۂ الٰہی کو قریب سے دیکھیں گے تو کافروں کے چہرے قبیح اور سیاہ ہو جائیں گے اور انھیں کہا جائے گا ، یہ وہی چیز ہے جس کا تم تقاضا کیا کرتے تھے۔

* * *

تفسیر

شاہراہِ توحید کے راست قامت افراد

گذشتہ آیات کے بعد پہلی زیرِ بحث آیت میں کفار و مومنین کے ان دونوں گروہوں کی حالت کی کیفیت ایک عمدہ مثال کے ضمن میں منعکس کرتے ہوئے فرماتا ہے : " کیا وہ شخص جو منہ کے بل گرا ہوا چل رہا ہے ، ہدایت کے زیادہ نزدیک ہے یا وہ شخص جو راست قامت صراطِ مستقیم پر قدم رکھتے ہوئے آگے بڑھ رہا ہے۔" (افمن یمشی مکبًّا علیٰ وجھہ اھدیٰ امّن یمشی سویًّا علیٰ صراط مستقیم)۔

یہاں بے ایمان ، ظالم ، ہٹ دھرم اور فریبی لوگوں کو ایسے شخص کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے جو ناہموار اور پیچ و خم سے پُر راہ سے گزر رہا ہو ، وہ منہ کے بل گرا ہوا ہو ، اور ہاتھ پاؤں سے یا سینہ کے بل چل رہا ہو ، نہ ٹھیک طرح سے راستہ دیکھ سکتا ہو اور نہ ہی اپنے اوپر نظر کر سکتا ہو ، نہ رکاوٹوں سے باخبر ہو اور نہ ہی سرعت اور تیزی سے چل سکتا ہو ، تھوڑا سا رستہ چلتا ہو اور پھر تھک جاتا ہو۔

لیکن مومنین کو ایسے راست قامت افراد سے تشبیہ دیتا ہے جو ہموار، صاف اور سیدھے راستے پر سرعت، قدرت اور پوری آگاہی کے ساتھ آگے بڑھ رہے ہوں۔

کتنی عمدہ اور دقیق تشبیہ ہے، جس کے آثار ان دونوں گروہوں میں مکمل طور پر نمایاں ہیں اور ہم اپنی آنکھ سے دیکھ رہے ہیں۔

بعض نے ان دو گروہوں کا مظہر پیغمبر اسلامؐ اور ابوجہل کو شمار کیا ہے۔ یقیناً یہ دونوں اوپر والی آیت کے روشن اور واضح مصداق ہیں، لیکن آیت کے مفہوم کی عمومیت کو محدود نہیں کرتے۔

"مکبًّا علیٰ وجھہ" میں کئی ایک احتمال دیئے گئے ہیں:

جو تفسیر اس کے لغوی مفہوم کے ساتھ زیادہ سازگار ہے وہ وہی ہے جو ہم نے اوپر بیان کی ہے، یعنی وہ ایسا شخص ہے جو منہ کے بل گرا ہوا ہاتھ پاؤں مارتے ہوئے سینہ کے بل چل رہا ہو۔

لیکن بعض نے کہا ہے اس سے مراد یہ ہے کہ وہ سیدھا چل رہا ہے لیکن سر نیچے کیے ہوئے ہے اور اپنے راستے کو کسی طرح سے نہیں دیکھتا۔

جبکہ بعض یہ کہتے ہیں کہ اس سے مُراد ایسا شخص ہے جو اپنے اعتدال کو محفوظ نہیں رکھتا، چند قدم چلتا ہے اور زمین پر گر پڑتا ہے، پھر کھڑا ہو جاتا ہے اور مسلسل اسی کیفیت کی تکرار کرتا رہتا ہے۔

راغب کے مفردات میں بعض کلمات سے بھی یہی مفہوم نکلتا ہے۔ اس سے مراد ایسا شخص ہے جس کی پوری توجہ اپنی ہی وضع و کیفیت کی طرف ہے اور وہ اپنے غیر سے غافل ہے لیکن پہلا معنی مومنین کی وضع کے مقابلہ کے قرینہ سے زیادہ مناسب نظر آتا ہے کہ اس کی "سویا" سے تعبیر ہوئی ہے۔

بہرحال کیا کافر و مومن کی یہ وضع و کیفیت آخرت میں ہوگی؟ یا دونوں جہانوں میں؟ آیت کے معنی کے محدود ہونے پر کوئی دلیل ہمارے پاس نہیں ہے۔ وہ دنیاوی زندگی میں بھی اسی طرح ہوں گے اور آخرت میں بھی۔

ہاں! بے ایمان افراد چونکہ خودخواہ، خودپرست اور ہٹ دھرم ہوتے ہیں اور اپنے مادی اور جلد گزر جانے والے منافع کے علاوہ اور کچھ نہیں دیکھتے۔ چونکہ ان کی راہ ایک ہوا پرست کی راہ ہے، لہٰذا وہ اس شخص کی مانند ہیں جو سنگلاخ زمین سے گزرتے ہیں اور سینہ کے بل ہاتھ پاؤں مارتے ہوئے رینگتے ہیں، لیکن وہ لوگ جو ایمان کے سائے میں ہوائے نفس کی قید سے چھوٹ چکے ہیں وہ ایک گہری بصیرت اور صاف و واضح راستہ رکھتے ہیں۔

* * *

بعد والی آیت میں پیغمبرؐ کو مخاطب کر کے مزید کہتا ہے: "کہہ دیجئے، وہی تو ہے کہ جس نے تمہیں پیدا کیا ہے، اور تمہارے لیے کان آنکھیں اور دل قرار دیئے ہیں لیکن تم بہت ہی کم شکر کرتے ہو" (قل ھو

الذی انشأکم وجعل لکم السمع والابصار والافئدة قلیلاً ما تشکرون)۔

خدا نے مشاہدے اور تجربے کا ذریعہ اور وسیلہ (آنکھ) بھی تمھارے اختیار میں قرار دی۔ دوسروں کے افکار سے آگاہی کا ذریعہ (کان) اور علوم عقلیہ میں غور و فکر کرنے کا ذریعہ (قلب) بھی دیا۔ خلاصہ یہ کہ سب قسم کے عقلی و نقلی علوم سے آگاہی کے لیے تمام ضروری آلات تمھارے اختیار میں دے دیئے ہیں۔ لیکن ان تمام عظیم نعمتوں کا بہت کم لوگ شکریہ ادا کرتے ہیں۔ کیونکہ شکرِ نعمت یہ ہے کہ ہر نعمت کو اسی مقصد کے لیے استعمال کیا جائے جس کے لیے وہ پیدا کی گئی ہے۔ کیا واقعاً سب لوگ کان، آنکھ اور عقل سے اسی طریقہ سے استفادہ کرتے ہیں۔؟

❊ ❊ ❊

پھر دوبارہ پیغمبرؐ کو مخاطب کرتے ہوئے فرماتا ہے: "کہہ دیجئے وہی تو ہے جس نے تمھیں زمین میں پیدا کیا ہے اور اسی کی طرف تم لوٹ کر جاؤ گے اور اسی کے پاس تم جمع ہو گے۔" (قل ھو الذی ذرأکم فی الارض والیہ تحشرون)۔

حقیقت میں پہلی آیت راستے کو مشخص کرتی ہے اور دوسری آیت کام کے آلات و وسائل کو اور یہ آیۃ ہدف و مقصد کو کہ اسلام و ایمان کے سیدھے راستہ اور صراط مستقیم میں قدم آگے بڑھاؤ، معرفت اور شناخت کے تمام آلات سے فائدہ اٹھاؤ اور جاودانی زندگی کی طرف چل پڑو۔

قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ گزشتہ آیت میں انشأکم کی تعبیر ہوئی ہے اور اس آیت میں "ذرأکم" آیا، ممکن ہے ان دونوں تعبیروں کا فرق اس بات میں ہو کہ پہلا جملہ تو انسان کو عدم سے وجود میں لانے کی طرف اشارہ ہو (یعنی تم نہیں تھے اور خدا نے تمھیں پیدا کیا ہے) نیز دوسرا جملہ مادۂ خاکی سے انسان کی پیدائش کی طرف اشارہ ہو۔ یعنی ہم نے تمھیں خاک سے پیدا کیا ہے۔

❊ ❊ ❊

اس کے بعد اسی رابطہ میں منکرینِ معاد کی گفتگو اور ان کا مطالبہ پیش کرتے ہوئے فرماتا ہے: "وہ استہزاء کے طور پر کہتے ہیں: اگر تم سچ کہتے ہو تو یہ قیامت کا وعدہ کس وقت پورا ہو گا۔" (ویقولون متٰی ھٰذا الوعد ان کنتم صادقین)۔

تم اس کی کوئی یقینی تاریخ معین کیوں نہیں کرتے؟ اور اس لحاظ سے تم سب کی ذمہ داری واضح کیوں نہیں کرتے۔؟

ھٰذا الوعد سے کیا مراد ہے۔ اس کے دو احتمال بیان کیے گئے ہیں۔ پہلا قیامت کا وعدہ، دوسرا دنیا کی گناہگاروں کی سزاؤں کا وعدہ، مثلاً زلزلے، صاعقے، بجلیاں اور طوفان۔ لیکن گزشتہ آیت کی طرف توجہ کرتے ہوئے پہلا معنی زیادہ مناسب نظر آتا ہے اگرچہ دونوں معانی کے درمیان جمع بھی ممکن ہے۔

بعد والی آیت میں انھیں اِس طرح جواب دیتا ہے: "کہہ دیجئے اس موضوع کا علم و آگہی تو خدا ہی کے ساتھ مخصوص ہے اور میں تو صرف واضح و آشکار انذار کرنے والا اور ڈرانے والا ہوں۔" (قل انما العلم عند اللہ و انما انا نذیر مبین)۔

یہ تعبیر ٹھیک اسی چیز کے مشابہ ہے جو قرآن کی متعدد آیات میں آئی ہے۔ منجملہ سورۂ اعراف کی آیت ۱۸۷ میں آیا ہے: "قل انما علمھا عند ربی"۔ کہہ دیجئے کہ قیامت کے وقوع کے زمانہ کا علم صرف میرے پروردگار کے پاس ہے۔

❖ ❖ ❖

اور ایسا ہی ہونا چاہیے، کیونکہ اگر قیامت کی تاریخ معلوم ہوتی اور اس کا عرصہ اور فاصلہ زیادہ ہوتا تو لوگ غفلت میں پڑ جاتے اگر وہ عرصہ کم ہوتا تو اضطرار جیسی حالت پیدا کر لیتے اور دونوں حالتوں میں تربیتی اہداف نامکمل رہ جاتے۔

❖ ❖ ❖

آخری زیر بحث آیت میں مزید کہتا ہے: "جس وقت اس وعدۂ الٰہی اور عذاب کو قریب سے مشاہدہ کریں گے تو کافروں کے چہرے قبیح اور سیاہ ہو جائیں گے۔" جیسا کہ غم و اندوہ کے آثار اُن سے برس رہے ہیں۔ (فلما رأوہ زلفۃ سیئت وجوہ الذین کفروا)۔

اور ان سے کہا جائے گا: "یہ وہی چیز ہے جس کا تم تقاضا کیا کرتے تھے۔" (و قیل ھذا الذی کنتم بہ تدعون)۔

"تدعون" دُعا کے مادہ سے ہے۔ یعنی تم ہمیشہ اصرار اور تقاضا کیا کرتے تھے کہ قیامت واقع ہو، اب وہ واقع ہو گئی ہے۔ اور اس سے راہِ فرار ممکن نہیں ہے۔[1]

یہ مضمون حقیقت میں اسی چیز کے مشابہ ہے جو سورہ ذاریات کی آیت ۱۴ میں کفار کو مخاطب کرتے ہوئے آیا ہے کہ قیامت کے دن ان سے کہا جائے گا:

"ھذا الذی کنتم بہ تستعجلون" "یہ وہی چیز ہے جس کے لیے تم جلدی کیا کرتے تھے۔"

بہرحال یہ عذابِ قیامت کے بارے میں ہی بیان کر رہی ہے جیسا کہ اکثر مفسرین نے کہا اور یہ اس بات کی دلیل ہے کہ متی ھذا الوعد کا جملہ بھی قیامت کے وعدہ کی طرف اشارہ ہے۔

❖ ❖ ❖

---

[1] تدعون "باب افتعال" سے اور "دعاء" کے مادہ سے تقاضا کرنے کے معنی میں ہے یا دعوا کے مادہ سے تقاضا یا کسی چیز سے انکار کرنے کے معنی میں ہے۔

حاکم ابو القاسم حسکانی کہتا ہے :

"جب کافروں نے خدا کے ہاں امام علیؑ کے مقامات کو مشاہدہ کیا
تو ان کے چہرے (غیظ وغضب کی شدت سے) سیاہ ہو گئے۔ [1]

ایک حدیث میں امام محمد باقرؑ سے بھی یہی مطلب نقل ہوا ہے کہ یہ آیت امیر المومنین علیؑ اور آپ کے یارو انصار کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ [2]

البتہ یہ تفسیر جو شیعہ اور اہلِ سنّت کے طرق سے نقل ہوئی ہے ایک قسم کی تطبیق کے قبیل سے ہے، ورنہ آیت کا محلِ وقوع معاد و قیامت کے ساتھ مربوط ہے اور اس قسم کی تطبیقیں روایات میں کچھ کم نہیں۔

* * *

---

[1] مجمع البیان جلد ۱۰ ص ۳۳۰

[2] نور الثقلین جلد ۵ ص ۳۸۵

(۲۸) قُلْ اَرَءَيْتُمْ اِنْ اَهْلَكَنِىَ اللّٰهُ وَمَنْ مَّعِىَ اَوْ رَحِمَنَا ۙ فَمَنْ يُّجِيْرُ الْكٰفِرِيْنَ مِنْ عَذَابٍ اَلِيْمٍ ○

(۲۹) قُلْ هُوَ الرَّحْمٰنُ اٰمَنَّا بِهٖ وَعَلَيْهِ تَوَكَّلْنَا ۚ فَسَتَعْلَمُوْنَ مَنْ هُوَ فِىْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ○

(۳۰) قُلْ اَرَءَيْتُمْ اِنْ اَصْبَحَ مَآؤُكُمْ غَوْرًا فَمَنْ يَّاْتِيْكُمْ بِمَآءٍ مَّعِيْنٍ ۢ ○

❊ ❊ ❊

ترجمہ

(۲۸) کہہ دیجئے : اگر خدا مجھے اور ان تمام لوگوں کو جو میرے ساتھ ہیں ہلاک کر دے یا ہم پر رحم کر دے تو بھی کافروں کو دردناک عذاب سے کون پناہ دے گا ؟

(۲۹) کہہ دیجئے : وہ خدا رحمٰن ہے ، ہم اس پر ایمان لائے ہیں اور اسی پر ہم نے توکل کیا ہے ، اور عنقریب تم جان لو گے کہ کون شخص واضح گمراہی میں ہے۔

(۳۰) کہہ دیجئے : مجھے بتاؤ اگر تمہاری (سرزمین کے) پانی زمین کے اندر چلے جائیں تو کون تمہارے لیے جاری پانی لا سکتا ہے ؟

❊ ❊ ❊

تفسیر

جاری پانی تمہارے اختیار میں کون دیتا ہے؟

اوپر والی آیات جو سورۃ ملک کی آخری آیات ہیں اور وہ سب لفظ "قل" سے، جو پیغمبرؐ کو خطاب ہے شروع ہوتی ہیں، انھیں باتوں کو جاری رکھے ہوئے ہیں جو گزشتہ آیات میں کفار کے ساتھ ہوئی ہیں اور ان کے دوسرے پہلو ان آیات میں بیان ہوئے ہیں۔

سب سے پہلے ان لوگوں کے بارے میں کہ جو غالباً پیغمبرؐ اور ان کے اصحاب کی موت کے انتظار میں تھے۔ وہ یہ گمان کرتے تھے کہ آپ کی وفات سے آپ کا دین ختم ہو جائے گا اور باقی کچھ نہ رہے گا۔ (عام طور پر شکست خوردہ دشمن بچے رہبروں کے بارے میں ہمیشہ یہی توقع رکھتے ہیں) فرماتا ہے: "کہہ دیجیے اگر خدا مجھے اور ان تمام کو جو میرے ساتھ ہیں ختم کر دے یا ہم پر رحم کرے تو بھی کفار کو دردناک عذاب سے کون پناہ دے گا؟" (قل ارأیتم ان اھلکنی اللہ ومن معی او رحمنا فمن یجیر الکافرین من عذاب الیم)۔

بعض روایات میں آیا ہے کہ کفار مکہ پیغمبرؐ اسلام اور مسلمانوں کے لیے بد دعا (نفرین) کیا کرتے اور ان کی موت کی دعائیں مانگا کرتے تھے، ان کا گمان یہ تھا کہ اگر آنحضرتؐ دنیا سے چلے جائیں تو آپ کی دعوت بھی ختم ہو جائے گی، تب اوپر والی آیت نازل ہوئی اور انھیں جواب دیا۔

اسی معنی کے مشابہ سورۃ طور کی آیت ۳۰ میں بھی آیا ہے، جہاں کہتا ہے: ام یقولون شاعر نتربص بہ ریب المنون "وہ کہتے ہیں کہ محمدؐ ایک شاعر ہے جس کی موت کا ہم انتظار کر رہے ہیں"۔

وہ اس بات سے غافل ہیں کہ محمد مصطفیٰؐ سے الطاف حق تعالیٰ کا وعدہ ہے کہ اگر وہ مر بھی جائیں تو اس سے حق کا پیغام نہیں مرے گا۔ ہاں! اس دین کی کامیابی اور تمام جہان پر اس کے غلبہ کا انھیں وعدہ دیا گیا ہے، اور پیغمبر اکرمؐ کی حیات اور موت کسی چیز کو نہیں بدلے گی۔

بعض نے اس آیت کی ایک اور تفسیر بیان کی ہے کہ خدا پیغمبرؐ سے یہ فرما رہا ہے: "کہہ دیجئے، ہم خدا پر ایمان رکھنے کی بنا پر خوف و رجاء کے درمیان ہیں، تم اپنے بارے میں کیا سوچتے ہو۔؟

لیکن پہلی تفسیر زیادہ صحیح نظر آتی ہے۔

* * *

اسی بات کو جاری رکھتے ہوئے مزید کہتا ہے: "ان سے کہہ دیجئے کہ وہ خداوند رحمٰن ہے ہم اس پر ایمان لائے ہیں اور اسی پر ہم نے توکل کیا ہے، اور عنقریب تم جان لو گے کہ واضح گمراہی میں کون ہے۔" (قل ھو

الرحمٰن اٰمنا به و علیه توکلنا فستعلمون من هو فی ضلال مبین)۔

یعنی اگر ہم خدا پہ ایمان لے آئے ہیں اور اسے اپنا ولی، وکیل اور سرپرست سمجھا ہے تو اس کی دلیل واضح ہے، وہ خدائے رحمٰن ہے۔ اس کی رحمتِ عمومی ہر جگہ پہنچی ہوئی ہے اور اس کے انعام کے فیض نے دوست اور دشمن سب کو گھیر رکھا ہے کہ عالم ہستی اور صفحۂ زندگی پہ مختصر سی نگاہ اس مدّعا کی شاہد ہے۔ لیکن تمھارے معبودوں نے کون سا کام کیا ہے؟ اگرچہ تمھاری ضلالت و گمراہی اسی سے واضح ہے لیکن آخرت میں اور زیادہ واضح ہو جائے گی، یا اس دنیا میں جب اسلام خدائی امدادوں سے لشکرِ کفر پر کامیاب ہو جائے گا تو اس معجزانہ کامیابی سے حقیقت اور زیادہ واضح ہو جائے گی۔

یہ آیت حقیقت میں پیغمبر اسلام اور مومنین کے لیے ایک قسم کی تسلی ہے کہ وہ یہ خیال نہ کریں کہ وہ حق و باطل کے اس مبارزہ میں تنہا ہیں، بلکہ بخشنے والا اور مہربان خدا ان کا یار و مددگار ہے۔

❊ ❊ ❊

آخری آیت میں خدا کی رحمتِ عامّہ کے ایک مصداق کے ذکر کے عنوان سے کہ جس سے لوگ غافل ہیں، کہتا ہے: "کہہ دیجئے: مجھے بتاؤ وہ پانی جس سے تم استفادہ کر رہے ہو، اگر وہ زمین کے اندر دور تہ میں چلا جائے تو کون تمھارے لیے جاری پانی لا سکتا ہے" (قل ارء یتم ان اصبح ماؤکم غورًا فمن یأتیکم بماء معین)۔

ہم جانتے ہیں کہ زمین دو قسم کے مختلف تشروں سے بنی ہے۔ "نفوذ پذیر قشر" جو پانی کو اپنے اندر لے جاتا ہے اور اس کے نیچے "نفوذ ناپذیر" تشر ہے جو پانی کو وہیں محفوظ رکھتا ہے۔ تمام چشمے، کنوئیں، ندی، نالے اسی خاص ترکیب کی برکت سے وجود میں آئے ہیں۔ کیونکہ اگر تمام روئے زمین زیادہ گہرائیوں تک نفوذ پذیر قشر ہوتی تو پانی اتنا نیچے چلا جاتا کہ ہرگز اس تک کسی کی رسائی نہ ہوتی۔ اگر وہ ساری کی ساری نفوذ ناپذیر ہوتی تو روئے زمین کے تمام پانی اس کے اوپر ہی کھڑے رہتے اور دلدل اور کیچڑ میں تبدیل ہو جاتے یا جلدی سمندروں میں جا پڑتے اور اس طرح سے پانی کے زیر زمین ذخیرے ہاتھ سے نکل جاتے۔

خدا کی رحمت کا یہ ایک چھوٹا سا نمونہ ہے کہ جس سے انسان کی موت و حیات شدّت کے ساتھ وابستہ ہے

"معین"۔ "معن" (بروزن "طعن") کے مادہ سے پانی کے جاری ہونے کے معنی میں ہے اور بعض یہ کہتے ہیں کہ یہ 'عین' سے لیا گیا اور اس کی میم زائدہ ہے۔ اسی لیے بعض مفسرین نے معین کو اس پانی کے معنی میں لیا ہے جو آنکھ سے دیکھا جا سکے اگرچہ وہ جاری نہ ہو۔

لیکن اکثر نے اس کی جاری پانی کے معنی میں ہی تفسیر کی ہے۔

اگرچہ وہ پانی جو پیا جاتا ہے وہ جاری پانی میں منحصر نہیں ہے لیکن اس میں شک نہیں کہ جاری پانی ان کی بہترین قسم شمار ہوتا ہے، چاہے وہ دریا، نہروں، ندی، نالوں اور ابلنے والے کنوؤں کی صورت میں ہو۔

بعض مفسرین نے نقل کیا ہے کہ جب ایک کافر نے یہ آیت سُنی جو یہ کہتی ہے: "اگر تمھارے استعمال میں آنے والا پانی زمین کی تہ میں چلا جائے تو کون تمھارے لیے آبِ جاری لا دے گا؟" تو اس نے کہا "رجال شداد ومعاول حداد!" (طاقتور مرد اور تیز کدال) پانی کو زمین کی گہرائیوں میں سے نکال لائیں گے۔ لیکن رات کو جب وہ سویا تو اس کی آنکھ میں آبِ سیاہ (کالا موتیا) اتر آیا۔ اس حال میں اس نے ایک آواز سُنی جو کہہ رہی تھی: "ان قوی پنجہ مردوں اور تیز کدالوں کو لے آؤ تاکہ وہ اس پانی کو تیری آنکھ سے باہر نکالیں۔"

لیکن موجودہ زمانہ میں ہم جانتے ہیں کہ اگر زمین کا "نفوذ ناپذیر" قشر ختم ہو جائے تو کوئی قوی پنجہ انسان اور تیز کدال پانی کو نہیں نکال سکتا۔ [1]

* * *

ایک نکتہ

جو روایات کہ ائمہ اہلِ بیتؑ سے ہم تک پہنچی ہیں، ان میں اس آخری آیت کی حضرت مہدیؑ کے ظہور اور ان کے وسیع عالمی عدل کے ساتھ تفسیر ہوئی ہے، منجملہ ایک حدیث میں امام محمد باقرؑ سے اس آیت کی تفسیر میں آیا ہے:

"نزلت فی الامام القائم (ع) یقول ان اصبح امامکم غائبا عنکم لا تدرون این هو؟ فمن یأتیکم بامام ظاهر یأتیکم باخبار السماوات والارض وحلال الله وحرامه، ثم قال والله ماجاء تأویل هذه الأیة ولابد ان یجیء تأویلها۔

"یہ آیت اس امامؑ کے بارے میں نازل ہوئی ہے جو عدلِ الٰہی کے ساتھ قیام کرے گا (حضرت مہدیؑ) وہ کہتا ہے کہ اگر تمھارا امام غائب ہو جائے اور تمھیں معلوم نہ ہو کہ وہاں کہاں ہے تو کون تمھارے لیے امام کو بھیجے گا جو آسمانوں اور زمین کی خبریں اور خدا کے حلال و حرام کو تمھارے لیے بیان کرے۔" اس کے بعد فرمایا "خدا کی قسم اس آیت کی تاویل ابھی تک نہیں آئی اور بالآخر یہ آکر رہے گی۔" [2]

اِس سلسلہ میں روایات بہت زیادہ ہیں لیکن اس بات پر توجہ رکھنی چاہیے کہ یہ سب تطبیق کے طور پر ہیں دوسرے لفظوں میں آیت کا ظاہر تو جاری پانی کے ساتھ ہی مربوط ہے جو زندہ موجودات کی حیات و زندگی کا باعث ہے مگر آیت کا باطن امام کے وجود اور ان کے وسیع علم و عدالت کے ساتھ مربوط ہے کیونکہ وہ بھی انسانی معاشرے

---

[1] ابوالفتوح رازی جلد ۱۱ ص ۲۱۹

[2] نور الثقلین جلد ۵ ص ۲۸۷

کی حیات کا سبب ہے۔

ہم نے بارہا کہا ہے کہ آیاتِ قرآنی کے متعدد معانی اور ان کا ظاہر و باطن ہوتا ہے لیکن ہم اس نکتہ کا بھی تاکید کے ساتھ تکرار کرتے ہیں کہ بطونِ آیات کی تہ تک پہنچنا اور انھیں معلوم کرنا سوائے پیغمبرؐ اور امام معصوم کے ممکن نہیں اور کسی شخص کو یہ حق نہیں ہے کہ کسی چیز کو آیت کے باطن کے عنوان سے اپنی طرف سے پیش کرے۔ ہم جو کچھ کہتے ہیں وہ آیات کے ظواہر کے ساتھ مربوط ہے اور جو چیز بطون آیات کے ساتھ مربوط ہے وہ ہمیں صرف معصومینؑ ہی سے سننا چاہیے۔

٭ ٭ ٭

"سورہ ملک" خدا کی حاکمیت و مالکیت سے شروع ہوئی اور اس کی رحمانیت پر کہ جو اس کی حاکمیت اور مالکیت کی ایک شاخ ہے ختم ہو رہی ہے۔ اس طرح سے اس کا آغاز و انجام مکمل طور پر ہم آہنگ ہے۔

خداوندا! ہمیں اپنی عام اور خاص رحمت کا مشمول قرار دے اور اپنے اولیاء کی ولایت کے آبِ حیات سے سیراب فرما۔

پروردگارا! حضرت مہدیؑ کا ظہور جلد فرما کہ جو آبِ حیات کا سرچشمہ ہے۔ ہاں ان کے جمال کے متوالوں کو ان کے ظہور سے سیراب کر دے۔

بارالٰہا! تو نے ہمیں دیکھنے والی آنکھ، سننے والے کان اور سمجھنے والی عقل مرحمت فرمائی ہے۔ پس خود خواہی اور غرور کے پردوں کو ان کے سامنے سے ہٹا دے تاکہ ہم حقیقت کے چہرے کو جس طرح کا وہ ہے اسی طرح سے دیکھ سکیں اور تیری ہدایت کے صراط مستقیم میں راست قامت ہو کر قدم بڑھائیں۔ آمین یا رب العالمین۔

٭ ٭ ٭

سورۂ ملک کا اختتام
۱۲ر شوال ۱۴۰۶ھ
۳ / ۳ / ۱۳۶۵ ش

ترجمہ کا اختتام
بروز جمعرات ۱۰ ذی الحجہ۔ عید قربان ۱۴۰۷ھ مطابق ۱۶ر اگست ۱۹۸۷ء بوقت ½۱۰ بجے شب
۸۱ ای، ماڈل ٹاؤن۔ لاہور

سورۂ القلم

یہ سورۃ مکہ میں نازل ہُوا اور اس کی ۵۲ آیات ہیں۔

تاریخ آغاز ، ۲۰ شوال المکرم ۱۴۰۶ھ

تلاوت کی فضیلت

اس سورہ کی تلاوت کی فضیلت میں پیغمبر گرامیؐ سے نقل ہوا ہے کہ آپ نے فرمایا:

"من قرأ سورة 'ن والقلم' اعطاه الله ثواب الذين حسن اخلاقهم"۔

"جو شخص سورۂ ن والقلم کی تلاوت کرے گا، خدا اس کو ان لوگوں کا ثواب دے گا جو حسنِ اخلاق کے حامل ہیں"۔ [1]

ایک اور حدیث میں امام صادقؑ سے آیا ہے:

"من قرأ سورة "ن والقلم" فی فريضة او نافلة امنه الله ان يصيبه فی حياته فقر ابدًا، و اعاذه اذا مات من ضمة القبر ان شاء الله"۔

"جو شخص سورۂ ن والقلم کو واجب یا مستحب نماز میں پڑھے گا خدا اسے ہمیشہ کے لیے فقر و فاقہ سے امان میں رکھے گا اور جب وہ مرے گا تو انشاء اللہ اسے فشارِ قبر سے امان دے گا"۔ [2]

ان ثوابوں کا سورہ کے مضامین کے ساتھ خاص تناسب ہے۔ اور یہ اس بات کی نشان دہی کرتے ہیں کہ یہاں مقصد وہ تلاوت ہے جو علم و آگہی کے ساتھ ہو اور اس کے بعد اس پر عمل بھی ہو۔

* * *

---

[1] تفسیر نور الثقلین جلد ۵ ص ۴۸۰

[2] مجمع البیان جلد ۱۰ ص ۳۳۰

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

① نٓ وَالْقَلَمِ وَمَا يَسْطُرُوْنَ ۙ

② مَآ اَنْتَ بِنِعْمَةِ رَبِّكَ بِمَجْنُوْنٍ ۚ

③ وَاِنَّ لَكَ لَاَجْرًا غَيْرَ مَمْنُوْنٍ ۚ

④ وَاِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ ۝

⑤ فَسَتُبْصِرُ وَيُبْصِرُوْنَ ۙ

⑥ بِاَيِّكُمُ الْمَفْتُوْنُ ۝

⑦ اِنَّ رَبَّكَ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنْ ضَلَّ عَنْ سَبِيْلِهٖ ۖ وَهُوَ اَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِيْنَ ۝

* * *

ترجمہ

خدائے رحمٰن ورحیم کے نام سے۔

① ن، قسم ہے قلم کی اور اس کی جو کہ وہ قلم سے لکھتے ہیں۔

② اپنے پروردگار کی نعمت سے تو مجنون نہیں ہے۔

③ اور تیرے لیے عظیم اور ہمیشہ رہنے والا اجر و ثواب ہے۔

④ اور تیرے اخلاق بہت ہی عمدہ اور عظیم ہیں۔

⑤ اور عنقریب تو بھی دیکھ لے گا اور وہ بھی دیکھ لیں گے۔

⑥ کہ تم میں سے کون مجنون ہے۔

⑦ تیرا پروردگار ہر شخص سے بہتر جانتا ہے کہ اس کی راہ سے کون شخص گمراہ ہوا ہے، اور وہ ہدایت پانے والوں کو بھی بہتر طور پر جانتا ہے۔

❖ ❖ ❖

تفسیر

تیرے اخلاق کتنے عمدہ ہیں!

یہ واحد سورہ ہے جو حرف مقطع ن سے شروع ہوا ہے۔ فرماتا ہے: (ن)۔

ہم نے حروف مقطعات کے بارے میں بارہا اور خصوصاً سورۂ بقرہ و "آلِ عمران" اور "اعراف" (تفسیر نمونہ جلد ۱، ۲، ۶) میں اس سے متعلق بحث کی ہے۔ جو چیز اب یہاں بیان کرنا ہے وہ یہ ہے کہ بعض نے یہاں ن کو لفظ 'رحمٰن' کا مخففت اور اس کی طرف اشارہ سمجھا ہے۔ بعض نے اس کی 'لوح' کے معنی میں یا 'دوات' کے معنی میں یا جنت کی ایک نہر کے معنی میں تفسیر کی ہے۔ لیکن ان تفسیروں میں سے کوئی بھی واضح قرینہ اور شاہد نہیں رکھتی۔

اس بناء پر اس حرف مقطع کی تفسیر ان تمام حروفِ مقطع سے الگ نہیں جن کی طرف ہم نے اوپر اشارہ کیا ہے۔

اس کے بعد انسانی زندگی کے مسائل میں سے دو اہم موضوعات کی قسم کھاتے ہوئے مزید کہتا ہے: "قسم ہے قلم کی اور اس کی جسے وہ قلم کے ساتھ لکھتے ہیں" (والقلم وما یسطرون)۔

کیسی عجیب و غریب قسم ہے؟ حقیقت میں وہ چیز جس کی یہاں قسم کھائی گئی ہے، ظاہراً ایک چھوٹا سا موضوع ہے۔ سرکنڈے کا ایک ٹکڑا یا اس کے مشابہ کوئی چیز اور کچھ سیاہ رنگ کا مادہ اور اس کے بعد وہ سطریں جو معمولی کاغذ کے صفحہ پر لکھی جاتی ہیں۔

لیکن حقیقت میں یہ وہی چیز ہے جو تمام انسانی تمدنوں کی پیدائش، علوم کی پیش رفت، افکار کی بیداری، مذاہب کے تشکیل پانے کا سرچشمہ اور نوعِ بشر کی آگاہی اور ہدایت کا ذریعہ ہے۔ یہاں تک کہ انسانی زندگی کو دو ادوار میں تقسیم کر دیتا ہے۔ "تاریخی دور" اور "تاریخ سے پہلے کا دَور"۔ تاریخ بشر کا دور اس وقت سے شروع ہوتا ہے جب سے خط اور تحریر ایجاد ہوئے اور انسان اپنی زندگی کے واقعات کو صفحات پر نقش کرنے کے

قابل ہوا ہے۔ دوسرے لفظوں میں وہ دور جس میں انسان نے قلم کو ہاتھ میں لیا ہے اور اس سے "مایسطرون" یادگار کے طور پر رہ گیا ہے۔

اس قسم کی عظمت اس وقت زیادہ آشکار ہوتی ہے جب ہم اس بات کی طرف توجہ کریں کہ جس دن یہ آیات نازل ہوئیں، اس وقت لکھنے والے اور اہلِ قلم اس ماحول میں موجود نہ تھے۔ اگر کچھ تھوڑے بہت لوگ لکھنے پڑھنے کی کچھ آگاہی اور علم رکھتے بھی تھے تو ان کی تعداد سرزمینِ مکہ میں، جو حجاز کا عبادتی، سیاسی اور اقتصادی مرکز تھا، بیس افراد تک بھی نہیں پہنچتی تھی۔ ہاں ایسے ماحول میں قلم کی قسم کھانا ایک خاص عظمت رکھتا ہے۔

قابلِ توجہ بات یہ ہے: ان پہلی آیات میں بھی جو جبل النور اور غارِ حرا میں پیغمبرؐ کے پاک دل پر نازل ہوئی تھیں، قلم کے بلند مقام کی طرف اشارہ ہوا ہے، جہاں فرماتا ہے:

"اقرأ باسم ربك الذی خلق۔ خلق الانسان من علق۔ اقرأ وربك الاکرم۔ الذی علم بالقلم۔ علم الانسان مالم یعلم"

"اپنے پروردگار کے نام سے پڑھیے، جس نے مخلوقات کو پیدا کیا ہے، اور انسان کو بستہ اور جمے ہوئے خون سے پیدا کیا، اپنے عظیم پروردگار کے نام سے پڑھیے جس نے انسان کو قلم کے ذریعہ تعلیم دی اور جو کچھ وہ نہیں جانتا تھا اُسے وہ سکھایا۔ (علق ۱: ۵)

سب سے عمدہ بات یہ ہے کہ یہ سب باتیں اس شخص کی زبان سے ادا ہو رہی تھیں جس نے خود (عالم ظاہر میں) کسی سے تعلیم حاصل نہیں کی تھی، کبھی مدرسہ نہیں گیا تھا اور کوئی تحریر نہیں لکھی تھی۔ یہ بھی اس بات کی دلیل ہے کہ یہ وحی آسمانی کے علاوہ اور کوئی چیز نہیں ہے۔

بعض مفسرین نے یہاں "قلم" کی اس قلم سے تفسیر کی ہے جس سے خدا کے عظیم فرشتے وحی آسمانی کو لکھتے ہیں یا جس سے انسانوں کے اعمال نامے رقم کرتے ہیں۔ لیکن مسلّمہ طور پر یہ آیت ایک وسیع مفہوم رکھتی ہے اور یہ تفسیر اس کے ایک مصداق کو بیان کرتی ہے، جیسا کہ "مایسطرون" بھی ایک وسیع مفہوم رکھتا ہے، اور انسان کی عملی، اخلاقی اور فکری ہدایت اور تکامل و ارتقاء کے لیے جو کچھ بھی لکھتے ہیں ان سب کو شامل ہے۔ فقط وحی آسمانی یا انسانوں کے اعمال میں منحصر نہیں ہے۔[1]

❖ ❖ ❖

اس کے بعد اس چیز کو، جس کے لیے قسم کھائی گئی ہے، پیش کرتے ہوئے فرماتا ہے: "اپنے پروردگار کی نعمت سے تو مجنون نہیں ہے" (ما انت بنعمة ربك بمجنون)۔

وہ لوگ جو یہ ناروا نسبت تیری طرف دیتے ہیں دل کے ایسے اندھے ہیں جو تیرے بارے میں خدا کی ان تمام نعمتوں کو نہیں دیکھتے، نعمت عقل و درایت، نعمت امانت و صدق و راستی، نعمت علم و دانش اور مقامِ نبوت

(حاشیہ [1] اگلے صفحہ پر دیکھیں)

اور مقامِ عصمت۔

دیوانے تو وہ ہیں جو عقلِ کل کے مظہر کو جنون کے ساتھ متہم کرتے ہیں اور انسانوں کے رہبر و رہنما کو اس ناروا نسبت کے ذریعہ اپنے سے دُور کر رہے ہیں۔

❊ ❊ ❊

اِس کے بعد مزید کہتا ہے: "تیرے لیے عظیم اور ہمیشہ رہنے والا اجر و ثواب ہے۔" (و ان لک لاجرًا غیر ممنون)۔

تیرے لیے ایسا اجر و ثواب کیوں نہ ہو؟ جبکہ تو ایسی قبیح اور ناروا تہمتوں کے مقابلہ میں استقامت ظاہر کرتا ہے۔ ان کے لیے ہدایت و نجات کی آرزو رکھتا ہے اور اس راستے میں سعی و کوشش کرنے سے تھکتا نہیں ہے۔

"ممنون"، "من" کے مادہ سے "منقطع" ہونے کے معنی میں ہے۔ یعنی ایسا اجر و پاداش جو ہرگز منقطع نہیں ہوگا اور ہمیشہ باقی رہے گا۔ بعض نے کہا ہے کہ اس معنی کی اصل اور ریشہ منت سے لیا گیا ہے۔ کیونکہ منت، نعمت کے قطع ہونے کا باعث ہوتی ہے۔

بعض نے یہ بھی کہا ہے کہ غیر ممنون سے مراد یہ ہے کہ خدا اس اجرِ عظیم کے مقابلہ میں تجھ پر ہرگز منت نہیں رکھتا لیکن پہلی تفسیر زیادہ مناسب ہے۔

❊ ❊ ❊

بعد والی آیت پیغمبرؐ کی ایک اور صفت کے بارے میں کہتی ہے: "تو عظیم اور عمدہ اخلاق کا حامل ہے۔" (و انک لعلیٰ خلق عظیم)۔

ایسے اخلاق جن کے مقابل عقل حیران ہے، بے نظیر لطف و محبت، بے مثل صفا و صمیمیت اور توصیف سے باہر صبر و استقامت اور تحمل و حوصلہ۔

اگر تو لوگوں کو خدا کی بندگی کی دعوت دیتا ہے تو سب سے زیادہ عبادت بھی کرتا ہے۔ اگر بُرے کام سے روکتا ہے تو سب سے پہلے خود اس کام سے رکتا ہے، وہ تجھے تکلیف پہنچاتے ہیں اور تو پند و نصیحت کرتا ہے۔ وہ تجھے بُرا بھلا کہتے ہیں اور تو ان کے لیے دعا کرتا ہے، وہ تیرے جسم پر پتھر مارتے ہیں اور گرم مٹی تیرے سر پر پھینکتے ہیں لیکن تو ان کی ہدایت کے لیے بارگاہِ خدا میں ہاتھ اٹھاتا ہے۔

ہاں! تو محبت اور مہربانیوں کا مرکز اور رحمت کا سرچشمہ ہے۔

(حاشیہ لے صفحہ سابقہ) 'مایسطرون' کے 'ما' کو بعض تو ما مصدریہ سمجھتے ہیں اور بعض ما موصولہ لیکن دوسرا معنی زیادہ مناسب ہے۔ یہ تقدیر میں اس طرح ہے "ومایسطرونہ" بعض اس کو لوح یا کاغذ کے معنی میں سمجھتے ہیں کہ جس پر کتابت کی جاتی ہے اور تقدیر میں مایسطرون فیہ ہے۔ بعض نے ما کو یہاں ذوی العقول اور ان افراد کی طرف اشارہ سمجھا ہے جو ان سطور کو لکھتے ہیں لیکن وہی معنی زیادہ مناسب ہے جو ہم نے متن میں ذکر کیا ہے۔

"خلق" "خلقت" کے مادہ سے ایسی صفات کے معنی میں ہے جو انسان سے جُدا نہیں ہوتے اور وہ انسان کی خلقت و آفرینش کے مانند ہوتے ہیں۔

بعض مفسرین نے پیغمبرؐ کے خلقِ عظیم کی راہِ حق میں صبر و استقامت، سخاوت و بخشش میں وسعت، تدبیر امور، رفق و مدارا، خدا کی طرف دعوت کی راہ میں سختیوں کا برداشت کرنا، عفو و درگزر، پروردگار کی راہ میں جہاد اور حسد و حرص کو ترک کرنے کے ساتھ" تفسیر کی ہے۔ اگرچہ یہ سب کی سب صفات پیغمبرؐ میں موجود تھیں لیکن آپ کا خلق عظیم صرف انھیں میں منحصر نہیں تھا۔

بعض تفاسیر میں "خلق عظیم" کی قرآن یا دین اسلام کے ساتھ بھی تفسیر کی گئی ہے جو اوپر والے وسیع مفہوم کا ایک مصداق ہوسکتی ہے۔ بہرحال پیغمبرؐ میں اس 'خلقِ عظیم' کا ہونا آنحضرتؐ کی عقل و درایت اور دشمنوں کی طرف سے دی گئی نسبتوں کی نفی پر ایک واضح دلیل ہے۔

❊ ❊ ❊

اس کے بعد مزید کہتا ہے: "عنقریب تو بھی دیکھ لے گا اور وہ بھی دیکھ لیں گے۔" (فستبصر و یبصرون)۔

❊ ❊ ❊

"کہ تم میں سے کون مجنون ہے۔" (بایّکم المفتون)[1]

"مفتون" "فتنہ" سے اسم مفعول ہے جو ابتلاء کے معنی میں ہے اور یہاں جنون میں مبتلا ہونے کے معنی میں ہے۔

ہاں! وہ آج یہ نارو انسبت تیری طرف دیتے ہیں تاکہ بندگانِ خدا کو تجھ سے دُور کر دیں، لیکن لوگ عقل و شعور رکھتے ہیں۔ آہستہ آہستہ تیری تعلیمات اور ارشادات سے آگاہی حاصل کریں گے۔ اس وقت یہ مسئلہ واضح ہو جائے گا کہ یہ عمدہ تعلیمات خدائے عظیم کی طرف سے تیرے پاک اور نورانی دل پر نازل ہوئی ہیں اور خدا نے عقل و علم کا ایک عظیم حصّہ تجھے بخشا ہے۔

مستقبل میں تیری تحریکیں اور طریق کار اور ان کے سایہ میں اسلام کی پیش رفت اور سریع نفوذ بھی اس بات کی نشان دہی کر دے گا کہ تو عقل و درایت کا ایک عظیم منبع ہے۔ دیوانے تو وہ چمگادڑ ہیں جو اس آفتاب کے نور سے جنگ کے لیے اُٹھ کھڑے ہوئے ہیں۔

پھر قیامت میں تو یہ حقایق یقینی طور پر اور بھی زیادہ روشن اور زیادہ واضح و آشکار ہو جائیں گے۔

❊ ❊ ❊

---

[1] "بایّکم" میں 'با' زائدہ ہے اور ایّکم قبل کے دو افعال کا مفعول ہے۔

نیز مزید تاکید کے لیے فرماتا ہے: "تیرا پروردگار سب سے بہتر جانتا ہے کہ اس کی راہ سے کون شخص گمراہ ہوا ہے اور ہدایت پانے والوں کو بھی بہتر طور پر جانتا ہے" (ان ربك هو اعلم بمن ضل عن سبيله و هو اعلم بالمهتدين)۔

کیونکہ یہ راستہ اسی کا راستہ ہے اور وہ اپنی راہ کو ہر شخص سے بہتر پہچانتا ہے۔ گویا اس طرح پیغمبر اسلامؐ کو زیادہ سے زیادہ اطمینان دلاتا ہے کہ وہ ہدایت کے راستہ پر ہیں اور ان کے دشمن ضلالت و گمراہی کی راہ پر ہیں۔

ایک مستند حدیث میں آیا ہے کہ جس وقت قریش نے دیکھا کہ پیغمبر علیؑ کو دوسروں پر ترجیح دیتے اور ان کی تعظیم اور احترام کرتے ہیں تو انھوں نے امام علیؑ کی مذمت شروع کر دی اور کہا کہ محمدؐ اس کا مفتون اور اس پر فریفتہ ہو گیا ہے۔ اس موقع پر خدا نے ن والقلم نازل فرمایا اور قسم کھا کر کہا کہ اے محمدؐ! تو مفتون و مجنون نہیں ہے۔ یہاں تک فرمایا: خدا ان لوگوں کو بھی جانتا ہے جو گمراہ ہو گئے ہیں، (یہ قریش کے اس گروہ کی طرف اشارہ ہے جو یہ باتیں کرتے تھے) اور خدا ہدایت یافتہ لوگوں کو بھی بہتر طور سے جانتا ہے۔ (یہ امام علیؑ کی طرف اشارہ ہے)۔[1]

* * *

چند نکات

۱: انسانی زندگی میں قلم کا نقش و اثر

نوع بشر کی زندگی کا اہم ترین مرحلہ، جیسا کہ ہم نے پہلے بھی اشارہ کیا ہے، خط کا پیدا ہونا اور قلم کاغذ یا پتھر پر چلنا تھا۔ یہ وہی وقت تھا کہ جس نے تاریخ کے دور کو ماقبل تاریخ سے جدا کر دیا۔

کاغذ کے صفحہ پر نوک قلم کی گردش بشر کی سرنوشت کو رقم کرتی ہے۔ لہٰذا انسانی معاشروں کی کامیابی اور شکست نوک قلم سے وابستہ ہے۔

قلم علوم و معارف کا محافظ، مفکرین کے افکار کا پاسدار، علماء کے فکری اتصال کی کڑی اور نوع بشر کے ماضی و حال کے ارتباط کے لیے ایک پل ہے۔ یہاں تک کہ آسمان و زمین کا ارتباط بھی لوح و قلم کے ذریعہ ہی ہوا ہے۔

قلم ان انسانوں کو جو زمان و مکان کے لحاظ سے ایک دوسرے سے الگ زندگی بسر کرتے ہیں، ایک دوسرے سے جوڑ دیتا ہے۔ گویا تمام طول تاریخ اور تمام روئے زمین کے سب مفکرین نوع بشر کو

---

[1] مجمع البیان جلد ۱۰ ص ۳۳۴ (طبرسی نے اس حدیث کو اپنی سند کے ساتھ اہل سنت سے نقل کیا ہے۔)

ایک کتابخانۂ عظیم میں دیکھ لیں گے۔

قلم رازدارِ بشر ہے۔ خزانہ دارِ علوم ہے۔ قرون و اعصار کے تجربات کو جمع کرنے والا ہے۔ اگر قرآن اس کی قسم کھاتا ہے تو اس کی وجہ یہی ہے۔ کیونکہ قسم ہمیشہ ایک بہت ہی عظیم اور قدر و قیمت رکھنے والی چیز کی کھائی جاتی ہے۔

البتہ "قلم" "ما یسطرون" (تحریروں) کے لیے ایک وسیلہ ہے اور قرآن نے دونوں کی قسم کھائی ہے۔ یعنی آلہ کی بھی اور آلہ کے محصول کی بھی۔

بعض روایات میں آیا ہے:

ان اول ما خلق اللہ القلم

پہلی چیز جو خدا نے خلق کی وہ قلم تھا۔

اس حدیث کو شیعہ محدثین نے امام صادقؑ سے نقل کیا ہے۔ [1] نیز یہ اہلِ سنت کی کتابوں میں بھی ایک مشہور خبر کے عنوان سے آئی ہے۔ [2]

ایک دوسری حدیث میں آیا ہے:

"اول ما خلق اللہ تعالیٰ جوھرۃ"

پہلی چیز جس کو خدا نے خلق کیا وہ ایک گوہر تھا۔ [3]

بعض اخبار میں یہ بھی آیا ہے:

"ان اول ما خلق اللہ العقل"

پہلی چیز جسے خدا نے خلق فرمایا وہ عقل تھی۔ [4]

اس وصف کے تعلق کی طرف توجہ جو "گوہر" "قلم" اور "عقل" کے درمیان ہے، ان سب کے اوّل ہونے کے مفہوم کو واضح کر دیتی ہے۔

جو حدیث ہم نے اوپر امام صادقؑ سے نقل کی اس میں آیا ہے کہ خدا نے قلم کو پیدا کرنے کے بعد اس سے فرمایا: "لکھ!" اور اس نے جو کچھ تھا اور جو قیامت کے دن تک ہوگا، سب کچھ لکھ دیا۔

اگرچہ اِس روایت میں قلم سے قلم تقدیر اور قضا و قدر کی طرف اشارہ ہے، لیکن چاہے جو کچھ بھی ہے بشر کی سرنوشت اور اس کے مقدرات میں قلم کے نقش و اثر کو واضح کرتی ہے۔

---

[1] نور الثقلین جلد ۵ ص ۳۷۹ حدیث ۹

[2] [3] تفسیر فخر رازی جلد ۳۰ ص ۷۸

[4] تفسیر فخر رازی جلد ۳۰ ص ۷۸

پیشوایان اسلام متعدد احادیث میں اپنے اصحاب کو تاکید کیا کرتے تھے کہ وہ اپنے حافظے پر قناعت نہ کریں اور احادیث اسلامی اور علوم الٰہی کو رشتۂ تحریر میں لاکر آنے والے لوگوں کے لیے یادگار کے طور پر چھوڑ جائیں۔ [1]

بعض علماء نے کہا ہے :

"البیان بیانان : بیان اللسان ، وبیان البنان ، وبیان اللسان تدرسه الاعوام ، وبیان الاقلام باق علی مر الایام"

"بیان دو قسم کے ہوتے ہیں۔ زبان کا بیان اور قلم کا بیان۔ زبان کا بیان تو زمانہ اور سالوں کے گزرنے سے کہنہ اور پرانا ہو جاتا اور ختم ہو جاتا ہے لیکن قلموں کا بیان ابد تک باقی رہتا ہے : [2]

یہ بھی کہا گیا ہے :

"ان قوام امور الدین والدنیا بشیئین القلم والسیف والسیف تحت القلم"

"دین و دنیا کے امور کی بنیاد دو چیزوں پر ہے۔ قلم و شمشیر، اور شمشیر قلم کے زیر سایہ قرار پاتی ہے۔ [3]

اس معنی کو بعض شعرائے عرب نے اس طرح نظم کیا ہے :

کذا قضی اللہ للاقلام مذ بریت
ان السیوف لها مذ ارهفت خدم

خدا نے قلم کے لیے اسی روز سے جب سے وہ بنایا گیا ہے
اسی طرح مقدر کیا ہے۔
کہ تیز دھار تلواریں اس کی خدمت گزار ہوں۔

(یہ تعبیر قلم کے چاقو کے ذریعہ تراشے جانے کی طرف نیز تلواروں کا ابتداء کار سے قلم کی خدمت میں ہونے کی طرف ایک لطیف اشارہ ہے)۔ [4]

ایک دوسرا شاعر، زیر بحث آیات کے استناد کے ساتھ اس سلسلہ میں کہتا ہے :

اذا اقسم الابطال یوما بسیفهم
وعدوه مما یجلب المجد والکرم

---

[1] وسائل الشیعہ جلد ۱۸ ص ۵۶ (حدیث ۱۴، ۱۶، ۱۷، ۱۸، ۱۹، ۲۰)

[2] [3] [4] تفسیر مجمع البیان جلد ۱۰ ص ۳۳۲

کفی قلم الکتاب فخرًا ورفعة

مدی الدھر ان اللہ اقسم بالقلم

"جس دن بہادر جنگجو لوگ اپنی تلواروں کی قسم کھائیں اور انھیں بزرگی اور افتخار کے اسباب میں سے شمار کریں تو لکھنے والوں کے قلم کے لیے عالم کے تمام زمانوں میں یہی اعزاز اور سربلندی کافی ہے کہ خدا نے قلم کی قسم کھائی ہے۔ نہ کہ تلوار کی"۔ [1]

واقعاً یہی بات ہے۔ کیونکہ فوجی کامیابیوں کی اگر قومی تمدن کے ذریعہ ضمانت نہ ہو تو وہ ہرگز پائیدار نہ ہوں گی۔ مغلوں نے ایران کی تاریخ میں بہت بڑی کامیابی حاصل کی لیکن چونکہ وہ ایک ایسی قوم تھی جس کا کوئی تمدن نہیں تھا، لہٰذا وہ جلدی ہی اسلام اور ایران کے تمدن میں تحلیل ہو گئے اور انھوں نے اپنا راستہ بدل لیا۔

اگرچہ یہ بحث بڑی وسیع ہے لیکن اس بناء پر کہ ہم تفسیر کے راستہ سے باہر نہ ہو جائیں اس بحث کو پیغمبر اسلامؐ کی ایک بہت ہی پُرمعنی حدیث پر ختم کرتے ہیں:

"ثلاث تخرق الحجب، وتنتھی الی ما بین یدی اللہ: صریر اقلام العلماء، و وطی اقدام المجاھدین وصوت مغازل المحصنات"۔

"تین آوازیں ایسی ہیں جو حجابوں کو توڑ کر خدا کی باعظمت بارگاہ میں پہنچ جاتی ہیں۔ لکھتے وقت علماء کے قلموں کے چلنے کی آواز، میدان جہاد میں مجاہدین کے قدموں کی چاپ، اور پاک دامن عورتوں کے چرخوں کی آواز"۔ [2]

البتہ جو کچھ بیان ہوا ہے یہ سب ان قلموں کے بارے میں ہے جو حق و عدالت کی راہ اور صراط مستقیم میں چلتی ہیں ـــــ لیکن مسموم، زہریلے اور گمراہ کرنے والے تو انسانی معاشروں کے لیے عظیم ترین بلا اور بہت بڑا خطرہ ہوتے ہیں۔

❖ ❖ ❖

---

[1] روح البیان جلد ۱۰ ص ۱۰۲

[2] الشہاب فی الحکم والآداب ص ۲۰

۲ : پیغمبرؐ کے اخلاق کا ایک نمونہ

پیغمبر اسلامؐ کی کامیابی اگرچہ خدائی تائید و امداد کے ساتھ ہوئی تھی، لیکن آپ ظاہری لحاظ سے بھی اس کے لیے کئی عوامل رکھتے تھے جن میں سے اہم ترین پیغمبرؐ کا جاذبۂ اخلاقی تھا۔ اعلیٰ انسانی صفات اور مکارم اخلاق آپ میں اس طرح سے جمع تھے جو سخت ترین دشمنوں کو بھی متاثر کر دیتے، انھیں سرِ تسلیم خم کرنے پر ابھارتے اور دوستوں میں شدید جذب و محبت پیدا کر دیتے تھے۔

بلکہ اگر ہم اسے پیغمبرؐ کا اخلاقی معجزہ کہیں تو کوئی مبالغہ نہیں ہوگا۔ چنانچہ اس اخلاقی معجزہ کا ایک نمونہ فتح مکہ میں نمایاں ہوا جب وہ خونخوار اور جرائم پیشہ مشرکین مکہ جنھوں نے سالہا سال تک اسلام اور پیغمبرؐ کے خلاف اپنی پوری قوت صرف کی تھی، مسلمانوں کے چنگل میں گرفتار ہوئے تو پیغمبر اسلامؐ نے دوستوں اور دشمنوں کے تمام اندازوں کے برخلاف ان کے لیے عام معافی کا فرمان جاری کر دیا، اور ان کے تمام جرائم کو معاف کر دیا۔ یہی چیز اس بات کا سبب بنی کہ وہ یدخلون فی دین اللہ افواجا کے مصداق بن کر فوج در فوج مسلمان ہو جائیں۔

پیغمبرؐ کے حسن خلق، عفو و درگزر، عطوفت و مہربانی، ایثار و فداکاری اور تقویٰ و پرہیزگاری کے بارے میں تفسیر اور تاریخ کی کتابوں میں بہت زیادہ واقعات لکھے ہوئے ہیں۔ ان سب کا بیان ہمیں تفسیری بحث سے خارج کر دے گا۔ لیکن ہمارے لیے اتنا لکھنا ہی کافی ہے۔ کہ ایک حدیث میں حضرت امام حسینؑ ابن علیؑ سے آیا ہے، کہ آپ نے فرمایا:

"میں نے اپنے پدر بزرگوار امیرالمومنین علیؑ سے پیغمبرؐ کی زندگی کی خصوصیات اور آپ کے اخلاق کے بارے میں سوال کیا تو میرے والد نے تفصیل کے ساتھ مجھے جواب دیا۔ اس حدیث کے ایک حصہ میں آیا ہے:

"آپنے پاس بیٹھنے والوں کے ساتھ پیغمبرؐ کی رفتار اس طرح تھی کہ آپ خوشرو، خنداں، خلیق اور نرم رہتے تھے، اور کبھی بھی سخت مزاج، سنگدل، پُرخاش رکھنے والے، سخت زبان، عیب جُو اور تعریف پسند نہ تھے۔ کوئی شخص آپ سے مایوس نہ ہوتا تھا، جو شخص بھی آپ کے گھر کے دروازے پر آتا مایوس و ناامید نہ لوٹتا تھا۔ تین چیزوں کو آپ نے اپنے سے الگ کر رکھا تھا، گفتگو میں جھگڑنا، زیادہ باتیں کرنا، اور ایسے کام میں دخل دینا جو آپ سے مربوط نہ ہو۔ اسی طرح تین چیزوں کو لوگوں کے بارے میں چھوڑ رکھا تھا، کسی کی مذمت نہیں کرتے تھے، کسی کو سرزنش نہیں کرتے تھے اور لوگوں کے پوشیدہ عیوب اور لغزشوں کی جستجو نہیں کرتے تھے۔ آپ

ہرگز کوئی گفتگو نہیں کرتے تھے سوائے ان امور کے بارے میں جن میں حصولِ ثواب کی اُمید رکھتے تھے۔ گفتگو ایسی موثر ہوتی تھی کہ تمام سننے والے لوگ سکوت اختیار کر لیتے تھے اور اپنی جگہ سے ہلتے تک نہیں تھے۔ جب آپ خاموش ہو جاتے تو پھر وہ لوگ بولتے۔ لیکن وہ آپ کے پاس نزاع اور جھگڑا نہیں کرتے تھے۔ جب کوئی اجنبی اور ناواقف آدمی سختی سے بات کرتا اور درخواست کرتا تو آپ تحمل سے کام لیتے اور اپنے اصحاب سے فرماتے: جب کسی کو دیکھو کہ وہ کوئی حاجت رکھتا ہے تو اس کی حاجت پُوری کرو۔ آپ ہرگز کسی کی بات کو نہیں کاٹتے ۔ جب تک کہ اس کی بات ختم نہ ہو جاتی۔"[1]

ہاں! اگر یہ اخلاقِ کریمہ اور یہ ملکاتِ فاضلہ نہ ہوتے تو وہ پسماندہ اور جاہل قوم اور وہ سخت اور اثر ناپذیر گروہ آغوشِ اسلام میں ہرگز نہ آتا، اور لانفضوا من حولك کا مصداق بن کر سب پراگندہ ہو جاتے۔

کیا ہی اچھا ہو کہ یہ اسلامی اخلاق آج زندہ ہوں اور ہر مسلمان میں پیغمبر اسلامؐ کے اخلاق و عادات کا عکس نظر آئے۔

اس سلسلہ میں اسلامی روایات بھی، چاہے وہ خود پیغمبرؐ کے بارے میں ہوں یا سب مسلمانوں کی ذمہ داری کے بارے میں، بہت زیادہ ہیں جن میں سے چند روایات کی طرف ہم یہاں اشارہ کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔

ایک حدیث میں آیا ہے کہ پیغمبرؐ نے فرمایا:

۱: "انما بعثت لاتمم مکارم الاخلاق"

"میں اس لیے مبعوث ہُوا ہوں کہ اخلاقی فضائل کی تکمیل کروں۔"[2]

اسی طرح پیغمبرؐ کی بعثت کا ایک اصلی ہدف یہی اخلاق فاضلہ کی تکمیل ہے۔

ایک حدیث میں آنحضرتؐ سے آیا ہے:

۲: "انما المؤمن لیدرك بحسن خلقه درجة قائم اللیل و صائم النهار"[3]

"مومن اپنے حسنِ خلق کی وجہ سے اس شخص کے درجہ تک پہنچ جاتا ہے جو راتوں کو عبادت کے لیے کھڑا ہوتا ہے اور دنوں میں روزے رکھتا ہے۔"

---

[1] معانی الاخبار، ص ۸۲ (تھوڑی سی تلخیص کے ساتھ)
[2] مجمع البیان جلد ۱۰ ص ۳۲۳

۳ : آنحضرتؐ ہی سے یہ بھی آیا ہے کہ آپ نے فرمایا :

"ما من شیء اثقل فی المیزان من خلق حسن"۔

"کوئی چیز میزان عمل میں قیامت کے دن اچھے اخلاق سے زیادہ وزنی نہیں ہوگی"۔ [1]

۴ : آنحضرتؐ سے یہ بھی نقل ہوا ہے کہ آپ نے فرمایا :

"احبکم الی اللہ احسنکم اخلاقا الموطؤن اکنافًا، الذین یألفون و یؤلفون ، و ابغضکم الی اللہ المشاؤن بالنمیمة المفرقون بین الاخوان ، الملتمسون للبراء العثرات"۔

"تم سب میں سے خدا کے ہاں زیادہ محبوب وہ شخص ہے جس کے اخلاق سب سے بہتر ہوں، وہی لوگ جو متواضع ہیں، دوسروں سے جوشِ محبت کے ساتھ ملتے ہیں۔ تم میں سے خدا کے نزدیک سب سے زیادہ مبغوض وہ لوگ ہیں جو چغلیاں کرتے ہیں کہ بھائیوں کے درمیان جدائی ڈال دیں اور بے گناہ لوگوں کے لیے لغزش کی جستجو میں لگے رہتے ہیں"۔ [2]

۵ : ایک اور حدیث میں پیغمبر اکرمؐ سے آیا ہے :

"اکثر ما یدخل الناس الجنة تقوی اللہ و حسن الخلق"۔

"وہ چیز جو سب سے زیادہ لوگوں کو جنت میں داخل کرے گی، تقویٰ اور حسنِ خلق ہے"۔ [3]

۶ : ایک حدیث میں امام باقرؑ سے آیا ہے :

"ان اکمل المؤمنین ایمانًا احسنھم خلقًا"

"مومنین میں سے اس کا ایمان سب سے بہتر ہے جس کے اخلاق

---

[1] مجمع البیان جلد ۱۰ ص ۳۳۳

[2] مجمع البیان جلد ۱۰ ص ۴۱۰

[3] سفینۃ البحار جلد ۱ ص ۴۱۰ (یہی مضمون وسائل الشیعہ جلد ۸ ص ۵۰۴ میں بھی آیا ہے۔ اسی طرح تفسیر قرطبی جلد ۱۰ ص ۶۴۰۷ میں بھی ہے۔)

زیادہ کامل ہیں۔[1]

۷ : ایک حدیث میں امام علی بن موسیٰ رضا سے آیا ہے کہ پیغمبرؐ نے فرمایا :

"علیکم بحسن الخلق ، فان حسن الخلق فی الجنة لا محالة و ایاکم و سوء الخلق ۔ فان سوء الخلق فی النار لا محالة۔"

"تمہارے لیے لازم ہے کہ حُسنِ خلق اختیار کرو ، کیونکہ حُسنِ خلق والا انجام کار جنت میں ہے ۔سوء خلق سے بچو ، کیونکہ سُوءِ خلق والا انجام کار جہنم میں ہے۔[2]

اوپر والی روایات سے اچھی طرح معلوم ہو جاتا ہے کہ حسن خلق جنت کی کلید اور رضائے خدا کے حاصل کرنے کا ایک وسیلہ ہے ، قُدرتِ ایمانی کی نشانی ہے ، دن رات کی عبادتوں کے ہم پلّہ ہے اور اس سلسلہ میں احادیث بہت زیادہ ہیں۔

❖ ❖ ❖

---

[1] روح البیان جلد ۱۰ ص ۱۰۸

[2] وسائل الشیعہ جلد ۸ ص ۵۰۶ حدیث ۲۱

(۸) فَلَا تُطِعِ الْمُكَذِّبِيْنَ ○
(۹) وَدُّوْا لَوْ تُدْهِنُ فَيُدْهِنُوْنَ ○
(۱۰) وَلَا تُطِعْ كُلَّ حَلَّافٍ مَّهِيْنٍ ○
(۱۱) هَمَّازٍ مَّشَّآءٍۭ بِنَمِيْمٍ ○
(۱۲) مَّنَّاعٍ لِّلْخَيْرِ مُعْتَدٍ اَثِيْمٍ ○
(۱۳) عُتُلٍّۭ بَعْدَ ذٰلِكَ زَنِيْمٍ ○
(۱۴) اَنْ كَانَ ذَا مَالٍ وَّبَنِيْنَ ○
(۱۵) اِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِ اٰيٰتُنَا قَالَ اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ ○
(۱۶) سَنَسِمُهٗ عَلَى الْخُرْطُوْمِ ○

❖ ❖ ❖

ترجمہ

(۸) اب جب کہ یہ بات ہے تو تکذیب کرنے والوں کی اطاعت نہ کرو۔
(۹) وہ تو یہ چاہتے ہیں کہ تم کچھ نرمی اختیار کرو تاکہ وہ بھی کچھ نرمی کریں (ایسی نرمی جو راہِ حق سے انحراف کے ساتھ ملی ہوئی ہو۔)
(۱۰) اور ایسے پست اور بہت زیادہ قسمیں کھانے والے آدمی کی اطاعت نہ کرو۔
(۱۱) جو بہت ہی زیادہ عیب جُو اور چغلخور ہے۔

(۱۲) نیک کاموں میں بہت زیادہ رُکاوٹیں ڈالنے والا، تجاوز گر اور گنہگار ہے۔

(۱۳) اور ان سب باتوں کے علاوہ کینہ پرور، پُرخور، سخت مزاج اور بدنام ہے۔

(۱۴) کہیں ایسا نہ ہو کہ صاحبِ مال اور زیادہ اولاد ہونے کی وجہ سے اس کی پیروی کرنے لگو۔

(۱۵) جب ہماری آیات اس کے سامنے پڑھی جاتی ہیں تو کہتا ہے کہ یہ تو گزرے ہوئے لوگوں کے بے فائدہ افسانے ہیں۔

(۱۶) ہم عنقریب اس کی ناک پر ننگ و عار کا داغ اور نشانی لگا دیں گے۔

* * *

تفسیر

ایسی صفات والوں کی پیروی نہ کرو

پیغمبرؐ کے عظیم اخلاق کا ذکر کرنے کے بعد کہ جو گزشتہ آیات میں بیان ہوئے تھے، ان آیات میں ان کے دشمنوں کے اخلاق کو بیان کر رہا ہے تاکہ ان میں موازنہ کرنے سے ان دونوں کا فرق کامل طور سے آشکار ہو جائے۔

پہلے فرماتا ہے: "ان تکذیب کرنے والوں کی، جو خدا، پیغمبرؐ، قیامت کے دن اور خدا کے دین کی تکذیب کرتے ہیں، اطاعت اور پیروی نہ کرو" (فلا تطع المکذّبین)۔

وہ خود گمراہ اور دوسروں کو گمراہ کرنے والے لوگ ہیں اور انھوں نے حق کے تمام اصول اپنے پاؤں تلے روند ڈالے ہیں۔ ایسے لوگوں کی صرف ایک بات میں اطاعت بھی گمراہی اور بدبختی کے علاوہ اور کوئی نتیجہ نہیں رکھتی۔

* * *

اِس کے بعد پیغمبر کو اپنے ساتھ ملانے اور اپنی طرف مائل کرنے کی سازباز میں ان کی کوششوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مزید کہتا ہے: "وہ تو یہ چاہتے ہیں کہ تم کچھ نرمی اختیار کر لو تاکہ وہ بھی کچھ نرمی کریں" (ودّوا لو تدھن فیدھنون)۔

نرمی اور جھکاؤ کا معنی یہ ہے کہ ان کی خدا کے فرامین کے ایک حصّہ سے صرفِ نظر کرے۔

مفسّرین نے نقل کیا ہے کہ یہ آیات اس وقت نازل ہوئیں جب رؤساءِ مکہ نے پیغمبرؐ کو اپنے بزرگوں کے دین، شرک اور بُت پرستی کی دعوت دی تو خدا نے آپ کو ان کی اطاعت سے منع کیا۔[1] (حاشیہ اگلے صفحہ پر)

بعض دوسروں نے یہ نقل کیا ہے کہ ولید بن مغیرہ، جو شرک کے بہت بڑے سرغنوں میں سے تھا، اس نے بہت زیادہ مال پیغمبرؐ کی خدمت میں پیش کیا اور قسم کھائی کہ اگر آپ اپنے دین سے پھر جائیں تو یہ سارا مال آپ کو دے دے گا۔[1]

آیات کے لب و لہجہ اور تاریخوں میں درج واقعات سے اچھی طرح معلوم ہو جاتا ہے کہ جب دل کے اندھے مشرکین نے دین اسلام کی پیش رفت کی سرعت کا مشاہدہ کیا تو وہ اس فکر میں پڑ گئے کہ پیغمبرؐ کو کچھ امتیازات دے کر ان سے کچھ امتیازات لے لیں اور انھیں سازش کے ذریعہ اپنی طرف کھینچ لیں۔ جیسا کہ طول تاریخ میں سب ہی طرفدارانِ باطل کا طریقہ رہا ہے۔ لہٰذا کبھی تو بہت زیادہ مال کی، کبھی خوبصورت عورتوں کی اور کبھی اعلیٰ عہدے اور مقام کی پیش کش کرتے۔ حقیقت میں وہ روحِ پیغمبرؐ کو بھی اپنے وجود کے ترازو میں تول رہے تھے۔

لیکن قرآن پیغمبرؐ کو بار بار خبردار کرتا ہے کہ ان انحرافی پیشکشوں کے مقابلہ میں اپنی طرف سے معمولی سے جھکاؤ کا بھی اظہار نہ کریں اور اہلِ باطل کی خاطر ہرگز نرمی نہ کریں۔ جیسا کہ سورۂ مائدہ کی آیت ۴۹ میں آیا ہے: "و ان احکم بینھم بما انزل اللہ ولا تتبع اھواء ھم و احذرھم ان یفتنوک عن بعض ما انزل اللہ الیک۔" ان (اہلِ کتاب) کے درمیان خدا کے نازل کردہ فرمان کے مطابق حکم کرو اور ان کی ہوا و ہوس کی پیروی نہ کرو اور اس بات سے ڈرتے رہو کہ وہ تمھیں ان تعلیمات سے جو خدا نے تم پر نازل کی ہیں منحرف نہ کر دیں۔

"یدھنون"۔ "مداھنہ" کے مادہ سے اصل میں 'دھن' بمعنی روغن لیا گیا ہے اور اس قسم کے موارد میں نرمی کرنے اور جھکاؤ کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ عام طور پر یہ تعبیر مذموم اور منافقانہ جھکاؤ کے موارد میں استعمال ہوتی ہے۔

* * *

اس کے بعد دوبارہ ان کی اطاعت سے منع کرتے ہوئے نو مذموم صفات کو جن میں سے ہر ایک اکیلی ہی اطاعت اور پیروی کرنے سے مانع ہو سکتی ہے، ان کو شمار کرتا اور فرماتا ہے: "اور ایسے لوگوں کی جو پست اور بہت زیادہ قسمیں کھانے والے ہوں اطاعت نہ کرو۔" (ولا تطع کل حلاّف مھین)۔

'حلاّف' اس شخص کو کہتے ہیں جو بہت زیادہ قسمیں کھاتا ہو اور ہر چھوٹے بڑے کام کے لیے قسم کھانے لگے۔ عام طور پر اس قسم کے لوگ اپنی قسموں میں سچے نہیں ہوتے۔

"مھین"۔ "مہانت" سے حقارت و پستی کے معنی میں ہے۔ بعض نے اس کی کم عقل یا جھوٹے یا بہت

(حاشیہ صفحہ سابقہ) [1] فخر رازی جلد ۳۰ ص ۸۵ و مراغی جلد ۲۹ ص ۲۱

[2] تفسیر قرطبی جلد ۱۰ ص ۶۷۱۰

زیادہ شریر افراد کے ساتھ تفسیر کی ہے۔

❊ ❊ ❊

اس کے بعد مزید کہتا ہے: "وہ شخص جو بہت ہی زیادہ عیب جُو اور چغلخور ہے۔" (ھمّاز مشّاء بنمیم)۔

"ھمّاز"۔ "ھمز" (بروزن طنز) کے مادہ سے غیبت اور عیب جُوئی کرنے کے معنی میں ہے۔

"مشّاء بنمیم" ایسا شخص جو تعلقات خراب کرنے، فساد پھیلانے اور لوگوں میں دشمنی پیدا کرنے کے لیے آمدورفت رکھتا ہو۔ (اس بات پر توجہ رکھنی چاہیے کہ یہ دونوں اوصاف صیغۂ مبالغہ کی صورت میں آئے ہیں جو اس قسم کے قبیح کاموں میں ان کے انتہائی اصرار کی ترجمانی کرتے ہیں)

پانچویں چھٹی اور ساتویں صفت میں کہتا ہے: "وہ شخص جو نیک کاموں میں بہت زیادہ رکاوٹیں ڈالنے والا، تجاوز گر اور گنہگار ہے۔" (مناع للخیر معتد اثیم)۔

نہ صرف خود کوئی اچھا کام نہیں کرتا اور اچھائی کا راستہ نہیں دکھاتا، بلکہ دوسروں کی خیر و برکت کے مقابلہ میں بھی ایک رکاوٹ بنا ہُوا ہے۔ علاوہ ازیں وہ ایک ایسا انسان ہے جو حدودِ الٰہی اور ان حقوق سے جو خدا نے ہر انسان کے لیے معیّن کر دیئے ہیں، تجاوز کرنے والا ہے۔ ان صفات کے علاوہ ہر قسم کے گناہ میں بھی آلودہ ہے۔ اس طرح کہ گناہ اس کی طبیعت اور مزاج کا جُزء بن چکا ہے۔

❊ ❊ ❊

آخرکار ان کی آٹھویں اور نویں صفت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے: "وہ ان سب باتوں کے علاوہ پرخور و بدنام ہے۔" (عتل بعد ذالک زنیم)۔

"عتل" جیسا کہ "راغب" نے "مفردات" میں کہا ہے، ایسے شخص کو کہتے ہیں جو غذا بہت زیادہ کھاتا ہو، ہر چیز کو اپنی طرف کھینچتا ہو اور دوسروں کو اس سے محروم کر دیتا ہو۔

بعض دوسروں نے "عتل" کو ایک بدخُو، کینہ پرور، سخت مزاج انسان یا بے حیا اور بدخلق انسان کے معنی میں تفسیر کیا ہے۔

"زنیم" ایسے شخص کو کہتے ہیں جس کا حسب و نسب واضح نہ ہو اور اسے کسی قوم کی طرف نسبت دیتے ہیں، حالانکہ وہ ان میں سے نہیں ہوتا۔ اصل میں "زنمہ" (بروزن قلہ) گوسفند کے کان کے اس حصّہ کو کہتے ہیں جو لٹکا ہوا ہوتا ہے۔ گویا وہ کان کا جزء نہیں ہے بلکہ اس کے ساتھ وابستہ کر دیا گیا ہے۔

"بعد ذالک" کی تعبیر اس معنی کی طرف اشارہ ہے کہ یہ دونوں صفات سابقہ صفات سے زیادہ قبیح اور مذموم ہیں جیسا کہ مفسّرین کی ایک جماعت نے اس کا تذکرہ کیا ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ یہاں خدا نے جھٹلانے والوں۔ ان کی قبیح صفات اور اخلاقِ رذیلہ کی ایسی تصویر کشی کی ہے،

کہ شاید سارے قرآن میں اس کی مثل و نظیر نہ ہو۔ وہ اس طرح سے یہ واضح کرنا چاہتا ہے کہ اسلام و قرآن کے مخالفین اور پیغمبرؐ کی ذات کے مخالفین خود کس قسم کے لوگ تھے۔ جھوٹے، پست، عیب جُو، چُغلخور، حد سے تجاوز کرنے والے، گنہگار اور بے اصل و نسب افراد اور واقعاً اِس قسم کے افراد کے علاوہ اور کسی سے اِس قسم کے عظیم مصلح کی مخالفت کی توقع نہیں کی جا سکتی۔

* * *

بعد والی آیت میں خبردار کرتا ہے: "کہیں ایسا نہ ہو کہ جب وہ زیادہ مال اور اولاد رکھتے ہیں، اس بناء پر تم ان کے مقابلہ میں نرم پڑ جاؤ اور سرِ تسلیم خم کر کے ان کی اطاعت کرنے لگو۔" (ان کان ذا مال و بنین)۔

اس میں شک نہیں کہ پیغمبرؐ ہرگز ان کی اطاعت و پیروی نہ کرتے، لیکن یہ آیات حقیقت میں اس امر پر ایک تاکید ہیں تاکہ آپ کے مکتب کی راہ اور عملی روش سب پر آشکار ہو جائے اور دوست و دشمن میں سے کوئی بھی شخص اِس قسم کی توقع نہ رکھے۔

اِس بناء پر اوپر والا جُملہ آیت ولا تطع کل حلاف مھین کا تتمہ ہے، لیکن بعض نے کہا ہے کہ یہ آیت حقیقت میں ان صفات کی پیدائش کی علت کا بیان ہے۔ یعنی دولت و ثروت اور افرادی قوت سے پیدا ہونے والا غرور و تکبر انھیں ان اخلاقی رذائل کی طرف کھینچ لے جاتا ہے۔ چنانچہ بہت سے بے ایمان دولت مندوں اور قدرت رکھنے والوں میں یہ صفات نظر آتی ہیں۔ لیکن آیات کا لب و لہجہ پہلی تفسیر کے ساتھ زیادہ مناسب ہے، اور اسی وجہ سے اکثر مفسرین نے بھی اس کو انتخاب کیا ہے۔

* * *

بعد والی آیت میں اس قسم کی پست صفات کے حامل افراد کا آیاتِ الٰہی کے مقابلہ میں عکس العمل دکھاتے ہوئے کہتا ہے: "جب ہماری آیات اس کے سامنے پڑھی جاتی ہیں تو وہ کہتا ہے کہ یہ تو گذرے ہوئے لوگوں کے بے فائدہ افسانے ہیں۔" (اذا تتلٰی علیہ اٰیاتنا قال اساطیر الاولین)۔

وہ اس بہانے سے اور اس قبیح نسبت کی وجہ سے آیات خدا سے دور ہو جاتا ہے اور انھیں فراموش کر دیتا ہے۔ نیز دوسروں کو بھی گمراہ کرتا ہے۔ اسی بناء پر اس قسم کے افراد کی اطاعت و پیروی نہیں کرنا چاہیئے اور یہ اس قسم کے افراد کی اطاعت سے نہی میں ایک تکمیل ہے۔

آخری زیرِ بحث آیت، اس گروہ کی ایک سزا سے پردہ اٹھاتے ہوئے مزید کہتی ہے: "ہم عنقریب اس کی ناک پر ننگ و عار کا داغ اور نشانی لگا دیں گے۔" (سنسمہ علی الخرطوم)۔

یہ ان کو انتہائی ذلیل کرنے کے لیے ایک منہ بولتی تعبیر ہے۔ کیونکہ اول تو ناک کی خرطوم سے تعبیر جو صرف سؤر اور ہاتھی کے لیے بولی جاتی ہے، ان کے لیے ایک واضح تحقیر و تذلیل ہے۔ دُوسرے لغت عرب میں

ناک عام طور پر بزرگی اور عزت سے کنایہ ہوتا ہے۔ جیسا کہ فارسی میں بھی جس وقت ہم یہ کہتے ہیں کہ اس کی ناک کو مٹی میں رگڑ دو۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ اس کی عزت کو برباد کر دو۔ (اردو میں ناک کا کٹنا بے عزتی کے معنی میں آتا ہے۔) تیسرے نشان و علامت لگانا جانوروں کے ساتھ مخصوص ہے۔ لیکن جانوروں میں بھی ان کے چہروں خصوصاً ان کے ناک پر علامت نہیں لگائی جاتی۔ اور اسلام میں بھی اس کام سے روکا گیا ہے۔ یہ سب چیزیں واضح بیان کے ساتھ کہتی ہیں کہ خدا اس قسم کے طغیان گر، خود خواہ، متجاوز اور سرکش افراد کو اس طرح سے ذلیل کرتا ہے اور ہر جگہ ان کی رسوائی کا ڈھنڈورا پٹوا دیتا ہے تاکہ سب کے لیے عبرت ہو۔

تاریخ اسلام بھی اس معنی پر گواہ ہے کہ ہٹ دھرم مخالفین کا یہ گروہ اسلام کی پیش رفت سے اس طرح ذلیل و رسوا ہوا کہ جس کی کوئی مثال اور نظیر نہیں ملتی۔ آخرت کی رسوائی اس سے بھی زیادہ ہے۔

بعض مفسرین نے کہا ہے کہ اس سورہ کی زیادہ تر آیات شرک کے ایک مشہور سرغنہ "ولید بن مغیرہ" کے بارے میں آئی ہیں۔ لیکن یہ بات آیات کی عمومیت، وسعت اور اس کی تعبیرات کے شمول سے مانع نہیں ہے[1]

* * *

چند نکات

۱: اخلاقی رذائل

اوپر والی آیات اگرچہ پیغمبر اسلامؐ کے سخت مخالفین کی صفاتِ رذیلہ کی تفصیلات کے بارے میں ہیں، لیکن اس کے باوجود ان صفات کی تشخیص کے لیے ایک نمونہ ہمارے ہاتھ میں دیتی ہیں۔ وہ ایسی بری صفات ہیں جو انسان کو خدا سے دور کر دیتی ہیں اور شقاوت و بدبختی کے گڑھے میں گرا دیتی ہیں۔ وہ ایسی صفات ہیں کہ جن سے سچے مومنین کو بچتے رہنا چاہیے اور ان سے آلودہ نہیں ہونا چاہیے۔ اسی لیے اسلامی روایات میں بھی اس سلسلہ میں بہت زیادہ تاکید آئی ہے۔ منجملہ:

---

[1] بعض نے کہا ہے کہ ناک پر علامت لگانا جنگ بدر میں عملی طور پر صورت پذیر ہو گیا کہ کفر کے بعض سرغنوں کی ناک پر اس طرح سے ضرب لگی کہ اس کی علامت باقی رہی۔ اگر یہاں ولید بن مغیرہ ہی مراد ہو تو تاریخ یہ کہتی ہے کہ وہ جنگ بدر سے پہلے ہی ذلت و خواری کے ساتھ دنیا سے رخصت ہو گیا تھا۔ لیکن اس کے علاوہ کوئی اور شخص مراد ہو تو پھر وہ بات ممکن ہے جو امام علیؑ بن الحسینؑ کے شام کے مشہور خطبہ میں بھی آئی ہے انا ابن من ضرب خراطیم الخلق حتی قالوا لا الٰہ الا اللہ! میں اس کا بیٹا ہوں جس نے مشرکین کی ناکوں پر ضرب لگائی، یہاں تک کہ انہوں نے لا الٰہ الا اللہ پڑھ لیا (اس سے مراد امیر المومنین علیؑ ہیں۔ بحار الانوار جلد ۴۵ ص ۱۳۸) زیر بحث آیت کی طرف توجہ کرتے ہوئے خدا کہتا ہے ہم اس کی خرطوم پر علامت لگائیں گے یہ تعبیر ایک عمدہ معنی رکھتی اور بتاتی ہے کہ خدا کا یہ ارادہ اس کے مخصوص بندہ علیؑ کے ہاتھ سے پورا ہوا۔

۱ : ایک حدیث میں رسول خداؐ سے آیا ہے :

"الا انبئکم بشراركم قالوا بلیٰ یا رسول الله(ص) قال : المشاؤن بالنمیمة المفرقون بین الاحبة الباغون للبرء اء المعایب"۔

"کیا میں تمھیں تمھارے شریرترین افراد کے بارے میں خبر دوں؟ انہوں نے کہا جی ہاں! اے رسول خداؐ! فرمایا : وہ لوگ جو بہت زیادہ چغلخور ہیں، دوستوں کے درمیان جدائی ڈالتے ہیں اور پاکیزہ اور بے گناہ افراد میں عیوب کی جستجو میں لگے رہتے ہیں"۔ [1]

۲ : پیغمبرؐ اس سلسلے میں خصوصیت کے ساتھ وصیت کیا کرتے اور فرماتے تھے :

لا یبلغنی احد عن احد من اصحابی شیئًا فانی احب ان اخرج الیکم و انا سلیم الصدر"۔

"تم میں سے کوئی بھی شخص میرے اصحاب میں سے کسی ایک کے بارے میں بھی ایسی بات نہ کرے جو مجھے اس کی نسبت بدظن کر دے، کیونکہ میں دوست رکھتا ہوں کہ پاک و پاکیزہ دل کے ساتھ تم سے ملاکروں"۔ [2]

۳ : نیز ایک اور حدیث میں پیغمبر اکرمؐ سے مروی ہے کہ آپ نے فرمایا :

"لا یدخل الجنة جواظ ، ولا جعظری ، ولا عتل زنیم"۔

"تین گروہ جنت میں داخل نہیں ہوں گے۔ "جواظ"، "جعظری" اور "عتل زنیم"۔ راوی کہتا ہے کہ میں نے پوچھا "جواظ" کون ہے؟ فرمایا: "کل جماع مناع"۔ ہر وہ شخص جو زیادہ مال جمع کرتا ہے، اور دوسروں سے بخل کرتا ہے۔ میں نے پوچھا : جعظری کون ہے؟ فرمایا : سخت مزاج اور تندخو۔ میں نے پوچھا : 'عتل زنیم' کون ہے؟ فرمایا : شکم پرور اور بد اخلاق لوگ جو زیادہ کھاتے زیادہ پیتے اور بیداد گر اور ظالم ہیں"۔ [3]

۲ : مداہنہ اور سازگاری

وہ واضح اختلافات جو راہ حق کے راہروؤں اور سیاسی بازی گروں کے درمیان موجود ہیں، ان میں سے ایک یہ ہے کہ دوسرا گروہ کسی خاص اصول پر ثابت قدم نہیں رہتا۔ بلکہ وہ ہمیشہ اس بات کے لیے تیار رہتے ہیں کہ ان امتیازات کے مقابلہ میں جو ان کو حاصل ہیں کچھ اور امتیازات حاصل کریں اور اپنے اصول

---

[1] اصول کافی جلد ۲ باب النمیمہ حدیث ۱

[2] سنن ابوداؤد و صحیح ترمذی (مطابق نقل فی ظلال القرآن جلد ۸ ص ۲۳۰)

[3] نور الثقلین جلد ۵ ص ۳۹۴

سے کچھ منافع کی خاطر، صرفِ نظر کرلیں. ان کے اہداف وعقاید ان کیلئے کوئی مقدس چیز نہیں ہیں، اور وہ ہمیشہ ان کی قیمت پر معاملہ کرتے رہتے ہیں۔ یہ ٹھیک اوپر والی آیت کا مضمون ہے جو کہتی ہے: (ودّوا لو تدھن فیدھنون) وہ دوست رکھتے ہیں کہ تجھے بھی اپنے جیسے میں کھینچ لیں اور جس طرح وہ مداہنت اور معاملہ کرتے ہیں، تو بھی کرے۔"

لیکن پہلا گروہ ہرگز معاملہ گر نہیں ہوتا، وہ اپنے مقدس اہداف کو کسی بھی قیمت پر اپنے ہاتھ سے نہیں دیتے اور اس پر معاملہ نہیں کرتے۔ مداہنت و موافقت اور اس قسم کے سیاسی لین دین ان میں نہیں ہوتے۔ یہ ایک بہترین نشانی ہے جس سے پیشہ ور سیاست بازوں کو پہچانا جا سکتا ہے اور انھیں مردانِ خدا سے الگ کیا جا سکتا ہے۔

٭ ٭ ٭

(۱۷) اِنَّا بَلَوْنٰهُمْ كَمَا بَلَوْنَآ اَصْحٰبَ الْجَنَّةِ ۚ اِذْ اَقْسَمُوْا
لَيَصْرِمُنَّهَا مُصْبِحِيْنَ ۙ○

(۱۸) وَلَا يَسْتَثْنُوْنَ ○

(۱۹) فَطَافَ عَلَيْهَا طَآئِفٌ مِّنْ رَّبِّكَ وَهُمْ نَآئِمُوْنَ ○

(۲۰) فَاَصْبَحَتْ كَالصَّرِيْمِ ۙ○

(۲۱) فَتَنَادَوْا مُصْبِحِيْنَ ۙ○

(۲۲) اَنِ اغْدُوْا عَلٰى حَرْثِكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰرِمِيْنَ ○

(۲۳) فَانْطَلَقُوْا وَهُمْ يَتَخَافَتُوْنَ ۙ○

(۲۴) اَنْ لَّا يَدْخُلَنَّهَا الْيَوْمَ عَلَيْكُمْ مِّسْكِيْنٌ ۙ○

(۲۵) وَّغَدَوْا عَلٰى حَرْدٍ قٰدِرِيْنَ ○

❊ ❊ ❊

ترجمہ

(۱۷) ہم نے انھیں آزمایا جیسا کہ ہم نے باغ والوں کی آزمائش کی تھی جب انھوں نے یہ قسم کھائی کہ باغ کے پھلوں کو صبح کے وقت (حاجتمندوں کی نگاہوں سے بچاکر) چُنیں گے۔

(۱۸) اور اس میں کسی چیز کا استثناء نہ کریں گے۔

(۱۹) لیکن ان کے سارے باغ پر (راتوں رات) ایک گھیر لینے والا عذاب نازل ہو گیا، جبکہ وہ سو رہے تھے۔

(۲۰) اور وہ ہرا بھرا باغ تاریک رات کی مانند ہو گیا۔

(۲۱) صبح کے وقت انھوں نے ایک دُوسرے کو صدا دی۔

(۲۲) اگر تمھارا ارادہ پھلوں کو توڑنے کا ہو تو اپنے کھیت اور باغ کی طرف چلو۔

(۲۳) وہ چل پڑے اور ایک دُوسرے سے آہستہ آہستہ کہتے جاتے تھے۔

(۲۴) اس بات کا خیال رکھو کہ ایک بھی فقیر تمھارے پاس نہ آنے پائے۔

(۲۵) انھوں نے صبح کے وقت یہ مصمم ارادہ کر لیا کہ وہ پوری قوت کے ساتھ حاجت مندوں کو روکیں گے۔

* * *

تفسیر

باغ والوں کی عبرت انگیز داستان

اِس بحث کی مناسبت سے جو گزشتہ آیات میں مغرور و خود خواہ دولت مندوں کے بارے میں تھی اور وہ مال اور اولاد کی زیادتی کی وجہ سے ہر چیز کو ٹھکرا دیتے تھے۔ ان آیات میں پہلے زمانہ کے کچھ دولتمندوں کے بارے میں جو ایک سرسبز و شاداب باغ کے مالک تھے اور آخرکار وہ خودسری کی بناء پر نابُود ہو گئے تھے، ایک داستان بیان کرتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ داستان اس زمانہ کے لوگوں میں مشہور و معروف تھی، اور اسی بناء پر اس کو گواہی کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔

پہلے فرماتا ہے: "ہم نے انھیں آزمایا، جیسا کہ ہم نے باغ والوں کی آزمائش کی تھی۔" (انّا بلوناھم کما بلونا اصحاب الجنۃ)۔

یہ باغ کہاں تھا، عظیم شہر صنعاء کے قریب سرزمین یمن میں؟ یا سرزمین حبشہ میں؟ یا بنی اسرائیل کی سرزمین شام میں؟ یا طائف میں؟ اس بارے میں اختلاف ہے۔ لیکن مشہور یمن ہی ہے۔

اس کا قصہ یہ ہے کہ یہ باغ ایک بوڑھے مرد مومن کی ملکیت تھا۔ وہ اپنی ضرورت کے مطابق اس میں سے لے

لیا کرتا اور باقی مستحقین اور حاجت مندوں کو دے دیتا تھا۔ لیکن جب اس نے دُنیا سے آنکھ بند کر لی (اور مرگیا) تو اس کے بیٹوں نے کہا ہم اس باغ کی پیداوار کے زیادہ مستحق ہیں، چونکہ ہمارے عیال و اطفال زیادہ ہیں۔ لہٰذا ہم اپنے باپ کی طرح عمل نہیں کر سکتے۔ اس طرح انھوں نے یہ ارادہ کر لیا کہ ان تمام حاجت مندوں کو جو ہر سال اس سے فائدہ اُٹھاتے تھے محرُوم کر دیں۔ لہٰذا ان کی سرنوشت وُہی ہوئی جو اِن آیات میں بیان ہوئی۔

کہتا ہے: "ہم نے انھیں آزمایا، جب انھوں نے یہ قسم کھائی کہ باغ کے پھلوں کو صبح کے وقت حاجت مندوں کی نظریں بچا کر چنیں گے۔" (اذ اقسموا لیصرمنّها مصبحین)[1]

"اور اس میں کسی قسم کا استثناء نہ کرینگے اور حاجت مندوں کے لیے کوئی چیز بھی نہ رہنے دیں"۔ (و لا یستثنون)۔

ان کا یہ ارادہ اس بات کی نشان دہی کرتا ہے کہ یہ کام ضرورت کی بناء پر نہیں تھا، بلکہ یہ ان کے بخل اور ضعفِ ایمان کی وجہ سے تھا۔ کیونکہ انسان چاہے کتنا ہی ضرورت مند کیوں نہ ہو، اگر وہ چاہے تو کثیر پیداوار والے باغ میں سے کچھ نہ کچھ حصّہ حاجت مندوں کے لیے مخصوص کر سکتا ہے۔

بعض نے کہا ہے کہ عدم استثناء سے مُراد یہ ہے کہ انھوں نے "الا ان یشاء اللہ" نہیں کہا تھا۔ یعنی وہ اس قدر مغرور تھے کہ انھوں نے کہا ہم جائیں گے اور یہ کام ضرور کریں گے۔ یہاں تک کہ انھوں نے اپنے آپ کو انشاء اللہ کہنے سے بھی بے نیاز سمجھا۔ لیکن پہلی تفسیر زیادہ صحیح ہے۔[2]

اس کے بعد اسی بات کو جاری رکھتے ہوئے مزید کہتا ہے: "رات کے وقت جبکہ وہ سوئے ہوئے تھے، تیرے پروردگار کا ایک گھیر لینے والا عذاب ان کے سارے باغ پر نازل ہوگیا۔" (فطاف علیها طائف من ربك و هم نائمون)۔

ایک جلانے والی آگ اور مرگ بار بجلی اس طرح سے اس کے اوپر مُسلّط ہُوئی کہ وہ سرسبز و شاداب باغ رات کی مانند سیاہ اور تاریک ہوگیا اور مٹھی بھر راکھ کے سوا کچھ بھی باقی نہ بچا۔" (فاصبحت کالصریم)۔

"طائف" "طواف" کے مادہ سے اصل میں اس شخص کے معنی میں ہے جو کسی چیز کے گرد گھومے لیکن بعض اوقات اس بلا و مصیبت سے کنایہ ہوتا ہے جو رات کو نمودار ہو اور اس جگہ یہی مُراد ہے۔

"صریم" "صرم" کے مادہ سے قطع کرنے کے معنی میں ہے اور یہاں "تاریک رات" یا "پھل کے بغیر درخت" یا "سیاہ راکھ" کے معنی میں ہے۔ کیونکہ رات دن کے آجانے سے منقطع ہو جاتی ہے، جیسا کہ دن

---

[1] "لیصرمنّ" "صرم" (بروزن شرم) کے مادہ سے پھل توڑنے کے معنی میں ہے اور مطلق طور پر قطع کرنے کے معنی میں بھی ہے۔ اسی طرح کام کو محکم کرنے کے معنی میں بھی آیا ہے۔

[2] کیونکہ خاص مناسبت کے علاوہ، جو پہلا معنی اصل قصّہ کے ساتھ رکھتا ہے۔ اگر دوسرا معنی مراد ہوتا تو لا یستثنون کے بجائے "ولم تستثنوا" کہا جاتا۔ (غور کیجیے)

رات کے آجانے سے منقطع ہو جاتا ہے۔ اسی لیے بعض اوقات رات اور دن کو 'صریمان' کہتے ہیں۔ بہرحال مُراد یہ ہے کہ یہ آسمانی بلا جو ظاہراً ایک عظیم 'صاعقہ' (بجلی) تھی، اس طرح سے اس باغ پر نازل ہوئی کہ جس نے سارے باغ کو ایک ساتھ آگ لگا دی اور مٹھی بھر کوئلوں اور سیاہ راکھ کے سوا کچھ بھی باقی نہ بچا، کیونکہ صاعقے اور بجلیاں جب بھی کسی چیز پر پڑتی ہیں تو ان کا حال اِسی طرح کا ہو جاتا ہے۔

❊ ❊ ❊

بہرحال باغ کے مالکوں نے اس گمان سے کہ یہ لدے پھندے درخت اب تیار ہیں کہ ان کے پھل توڑ لیے جائیں: "صبح ہوتے ہی ایک دُوسرے کو پکارا۔" (فتنادوا مُصبحین)[1]

❊ ❊ ❊

اُنھوں نے کہا: "اگر تم اپنے باغ کے پھلوں کو توڑنا چاہتے ہو تو اپنے کھیت اور باغ کی طرف چلو۔" (ان اغدوا علیٰ حرثکم ان کنتم صارمین)۔

"اغدوا"۔ "غدوۃ" کے مادّہ سے دن کے اوّل حصّہ کے معنی میں ہے۔ اسی لیے اس غذا کو جو صبح سویرے کھائی جاتی ہے۔ غداء (ناشتہ) کہتے ہیں۔ (اگرچہ عربی کے موجودہ روزمرہ کی تعبیرات میں غداء دن کے کھانے کو کہا جاتا ہے۔)

❊ ❊ ❊

"اِسی طرح سے وہ اپنے باغ کی طرف چل پڑے اور وہ آہستہ آہستہ ایک دوسرے سے باتیں کر رہے تھے۔" (فانطلقوا وھم یتخافتون)۔

"کہ اس بات کا خیال رکھو کہ ایک بھی فقیر تمھارے پاس نہ آنے پائے۔" (ان لا یدخلنھا الیوم علیکم مسکین)۔

اور وہ اس طرح آہستہ آہستہ باتیں کر رہے تھے کہ ان کی آواز کسی دوسرے کے کانوں تک نہ پہنچ جائے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ کوئی فقیر خبردار ہو جائے اور بچے کھچے پھل چننے کے لیے یا اپنا پیٹ بھرنے کے لیے تھوڑا سا پھل لینے ان کے پاس آجائے۔

ایسا دکھائی دیتا ہے کہ ان کے باپ کے سابقہ نیک اعمال کی بنا پر فقراء کا ایک گروہ ایسے دنوں کے اِنتظار میں رہتا تھا کہ باغ کے پھل توڑنے کا وقت شروع ہو تو اس میں سے کچھ حصّہ انھیں بھی ملے۔ اسی لیے یہ بخیل اور ناخلف بیٹے اس طرح سے مخفی طور پر چلے کہ کسی کو یہ احتمال نہ ہو کہ اس قسم کا دن آپہنچا ہے، اور

---

[1] "تنادوا" راغب مفردات میں کہتا ہے کہ "نداء" (بروزن عنا) اصل میں "ندی" سے لیا گیا ہے جو رطوبت کے معنی میں ہے۔ کیونکہ مشہور ہے کہ جن لوگوں کے منہ میں کافی رطوبت ہوتی ہے وہ آرام اور سکون سے گفتگو کر سکتے ہیں اور ان کا کلام فصیح اور آواز صاف ہوتی ہے۔

جب فقراء کو اس کی خبر ہو تو معاملہ ختم ہو چکا ہو۔

❊ ❊ ❊

"اس طرح سے وہ صبح سویرے اپنے باغ اور کھیت میں جانے کے ارادے سے حاجت مندوں اور فقراء کو روکنے کے لیے پوری قوت اور پختہ ارادے کے ساتھ چل پڑے۔" (وغدوا علیٰ حرد قادرین)۔

"حرد" (بروزن سرد) شدت وغضب سے توأم ممانعت کے معنی میں ہے۔ ہاں! وہ فقراء و مساکین کی تمنا اور انتظار سے یخ پا تھے اور پختہ ارادہ کیے ہوئے تھے کہ پوری قوت کے ساتھ انھیں منع کریں گے۔ (اسی لیے یہ تعبیر ان سالوں کے لیے کہ جن میں بارش نہ ہو یا اس اونٹنی کے لیے جس کا دودھ ختم ہو جانے استعمال ہوتی ہے)۔

اب دیکھتے ہیں کہ ان کا انجام کیا ہوا۔

❊ ❊ ❊

(۲۶) فَلَمَّا رَاَوْهَا قَالُوْٓا اِنَّا لَضَآلُّوْنَ ۙ
(۲۷) بَلْ نَحْنُ مَحْرُوْمُوْنَ ۝
(۲۸) قَالَ اَوْسَطُهُمْ اَلَمْ اَقُلْ لَّكُمْ لَوْلَا تُسَبِّحُوْنَ ۝
(۲۹) قَالُوْا سُبْحٰنَ رَبِّنَآ اِنَّا كُنَّا ظٰلِمِيْنَ ۝
(۳۰) فَاَقْبَلَ بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ يَّتَلَاوَمُوْنَ ۝
(۳۱) قَالُوْا يٰوَيْلَنَآ اِنَّا كُنَّا طٰغِيْنَ ۝
(۳۲) عَسٰى رَبُّنَآ اَنْ يُّبْدِلَنَا خَيْرًا مِّنْهَآ اِنَّآ اِلٰى رَبِّنَا رٰغِبُوْنَ ۝
(۳۳) كَذٰلِكَ الْعَذَابُ ۭ وَلَعَذَابُ الْاٰخِرَةِ اَكْبَرُ ۘ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ۧ

* * *

ترجمہ

(۲۶) (جب باغ میں وارد ہوتے اور) اسے دیکھا تو کہنے لگے کہ ہم تو راستہ بھول گئے ہیں۔

(۲۷) (ہاں ہر چیز مکمل طور پر ہمارے ہاتھ سے نکل گئی ہے) بلکہ ہم محروم ہیں۔

(۲۸) اُن میں سے ایک (جو سب سے زیادہ عقلمند تھا) اس نے کہا: کیا میں نے تم سے یہ نہیں کہا تھا کہ تم خدا کی تسبیح کیوں نہیں کرتے؟

(۲۹) انھوں نے کہا: ہمارا پروردگار پاک و پاکیزہ اور منزّہ ہے، یقیناً ہم ہی ظالم تھے۔

(۳۰) پھر انھوں نے ایک دُوسرے کی طرف رُخ کیا اور ایک دوسرے کو ملامت کرنے لگے۔

(۳۱) (اور ان کی فریاد بلند ہوئی) اور کہا: وائے ہو ہم پر ہم ہی طغیانگر اور سرکش تھے۔

(۳۲) ہم اُمید رکھتے ہیں کہ ہمارا پروردگار ہمیں بخش دے اور اِس کے بجائے اس سے بہتر ہمیں دے دے، کیونکہ اب ہم نے اس سے دل لگا لیا ہے۔

(۳۳) خدا کا عذاب (دنیا میں) اسی طرح سے ہوتا ہے۔ اور اگر وہ جانتے تو آخرت کا عذاب اس سے بھی بڑا ہے۔

* * *

تفسیر

سرسبز باغ کے مالکوں کا دردناک انجام

یہ آیات انھیں باغ والوں کی داستان کو جاری رکھے ہُوئے ہیں، جو گزشتہ آیات میں گزر چکی ہے۔ وہ باغ والے اس اُمید پر کہ باغ کی فراواں پیداوار کو چُنیں اور مساکین کی نظریں بچا کر اسے جمع کر لیں اور یہ سب کچھ اپنے لیے خاص کر لیں، یہاں تک کہ خدا کی نعمت کے اس وسیع دسترخوان پر ایک بھی فقیر نہ بیٹھے۔ یوں صبح سویرے چل پڑے لیکن وہ اس بات سے بے خبر تھے کہ رات کے وقت جب کہ وہ پڑے سو رہے تھے ایک مرگبار صاعقہ نے باغ کو ایک مٹھی بھر خاکستر میں تبدیل کر دیا ہے۔

قرآن کہتا ہے: "جب انھوں نے اپنے باغ کو دیکھا تو اس کا حال اس طرح سے بگڑا ہُوا تھا کہ انھوں نے کہا یہ ہمارا باغ نہیں ہے۔ ہم تو راستہ بھول گئے ہیں۔" (فلما رأوها قالوا انّا لضالّون)۔

'ضالون' سے مُراد ممکن ہے باغ کا راستہ بھول جانا ہو جیسا کہ ہم نے اوپر بیان کیا ہے، یا راہِ حق کو بھول جانا اور گمراہ ہو جانا ہو جیسا کہ بعض نے احتمال دیا ہے۔ لیکن پہلا معنی زیادہ مناسب نظر آتا ہے۔

پھر انھوں نے مزید کہا: "بلکہ ہم تو حقیقت میں محروم ہیں۔" (بل نحن محرومون)۔

ہم چاہتے تھے کہ مساکین اور ضرورت مندوں کو محروم کریں لیکن ہم تو خود سب سے زیادہ محروم ہو گئے ہیں، مادی منافع سے بھی محروم ہو گئے ہیں اور معنوی برکات سے بھی کہ جو راہِ خدا میں خرچ کرنے اور حاجت مندوں کو دینے سے ہمارے ہاتھ آتیں۔

* * *

"اس اثنا میں ان میں سے ایک جو سب سے زیادہ عقلمند تھا، اس نے کہا: کیا میں نے تم سے نہیں کہا تھا کہ تم خدا کی تسبیح کیوں نہیں کرتے۔" (قال اوسطھم الم اقل لکم لولا تسبحون)۔

کیا میں نے نہیں کہا تھا کہ خدا کو عظمت کے ساتھ یاد کرو اور اس کی مخالفت سے بچو، اس کی نعمت کا شکر بجا لاؤ اور حاجت مندوں کو اپنے اموال سے بہرہ مند کرو! لیکن تم نے میری بات کو توجہ سے نہ سُنا اور بدبختی کے گڑھے میں جا گرے۔

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ ان میں ایک مردِ مومن تھا جو انھیں بخل اور حرص سے منع کیا کرتا تھا۔ چونکہ وہ اقلیت میں تھا لہٰذا کوئی بھی اس کی بات پر کان نہیں دھرتا تھا۔ لیکن اس دردناک حادثہ کے بعد اس کی زبان کھل گئی۔ اس کی منطق زیادہ تیز اور زیادہ کاٹ کرنے والی ہو گئی۔ اور وہ انھیں مسلسل ملامت اور سرزنش کرتا رہا۔

* * *

وہ بھی ایک لمحہ کے لیے بیدار ہو گئے اور انھوں نے اپنے گناہ کا اعتراف کر لیا: انھوں نے کہا: ہمارا پروردگار پاک اور منزہ ہے۔ یقیناً ہم ہی ظالم و ستمگر تھے۔ ہم نے اپنے اوپر بھی ظلم کیا اور دوسروں پر بھی۔" (قالوا سبحان ربنا انا کنا ظالمین)۔

"اوسط" کی تعبیر جو گزشتہ آیت میں آئی ہے۔ اس شخص کے معنی میں ہے جو عقل و خرد اور علم و دانش کے اعتبار سے سرحدِ اعتدال میں ہو، بعض نے اسے سن و سال میں حدِ وسط کے معنی میں لیا ہے۔ لیکن یہ معنی بہت بعید نظر آتا ہے۔ کیونکہ سن و سال اور اس قسم کی بے معنی گفتگو کے درمیان کوئی ربط نہیں ہے۔ البتہ عقل و خرد اور اس قسم کی باتوں کے درمیان ارتباط ہے۔

"لولا تسبحون" (تم خدا کی تسبیح کیوں نہیں کرتے) کی تعبیر اس بناء پر ہے کہ تمام نیک اعمال کا ریشہ اور اصل، ایمان، معرفتِ خدا اور تسبیح و تنزیہ خدا ہے۔

بعض نے تسبیح خدا کا معنی شکرِ نعمت کیا ہے، جس کا لازمہ محروموں کو بہرہ مند کرنا اور فائدہ پہنچانا ہے۔

لیکن یہ دونوں تفاسیر ایک دوسرے کے ساتھ منافات نہیں رکھتیں اور آیت کے مفہوم میں جمع ہیں۔

لیکن گناہ کے اعتراف سے پہلے ان کی تسبیح ممکن ہے اس بناء پر ہو کہ وہ یہ چاہتے ہوں کہ یہ بلائے عظیم

جو ان کے باغ پر نازل ہوئی اور جس نے اسے نابود کر دیا ہے خدا کو اس میں ہر قسم کے ظلم و ستم سے منزہ سمجھیں اور یہ کہیں کہ خداوندا یہ ہم ہی تھے جنہوں نے خود اپنے اوپر اور دوسروں پر ظلم کیا، اور اس قسم کے دردناک عذاب کے مستحق ہوئے ہیں، لیکن تیرا کام عین عدالت و حکمت ہے۔

قرآن کی بعض دیگر آیات میں بھی اپنے ظلم کا اقرار کرنے سے پہلے یہی تسبیح نظر آتی ہے جیسا کہ حضرت یونسؑ کی داستان میں آیا ہے۔ جب وہ اس عظیم مچھلی کے پیٹ میں پہنچے تو کہا: لا الٰہ الا انت سبحانک انی کنت من الظالمین: تیرے علاوہ اور کوئی معبود نہیں ہے۔ تو منزہ ہے میں ہی ظالموں اور ستمگروں میں سے تھا۔" (انبیاء، ۸۷)

البتہ اس عظیم پیغمبرؑ کے بارے میں ظلم ترک اولیٰ کے معنی میں ہے۔ جیسا کہ تفسیر نمونہ جلد ۱۲ میں ہم اس آیت کی تفسیر میں بیان کر چکے ہیں۔

* * *

لیکن مطلب یہیں پر ختم نہیں ہو گیا: "انھوں نے ایک دوسرے کی طرف رُخ کیا اور ایک دوسرے کو ملامت و سرزنش کرنے لگے۔ (فاقبل بعضھم علیٰ بعض یتلاومون)۔

احتمال یہ ہے کہ ان میں سے ہر ایک اپنی خطا کے اعتراف کے باوجود اصلی گناہ کو دوسرے کے کندھے پر ڈالتا اور شدت کے ساتھ اس کو سرزنش کرتا تھا کہ ہماری بربادی کا اصل عامل تو ہے! ورنہ ہم خدا اور عدالت سے اس قدر بیگانہ نہیں تھے۔

ہاں! تمام ظالموں کی سرنوشت کہ جو عذاب الٰہی کے چنگل میں گرفتار ہوتے ہیں، اسی طرح ہے کہ گناہ کا اعتراف کرنے کے باوجود ہر ایک کی کوشش یہی ہوتی ہے کہ وہ اپنی بدبختی کا عامل دوسرے کو شمار کرے، شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ اس قسم کے مواقع پر ایک آدمی تجویز پیش کرتا ہے، دوسرا تائید کرتا ہے، تیسرا اس کا اجراء اپنے ذمہ لیتا ہے اور چوتھا اپنے سکوت اور خاموشی کے ذریعے اپنی رضامندی کا اظہار کرتا ہے۔ لیکن یہ بات واضح ہے کہ یہ سب کے سب شریکِ جرم اور گناہ میں پورا پورا دخل رکھتے ہیں۔

اس کے بعد مزید کہتا ہے کہ جب وہ اپنی بدبختی کی انتہا سے آگاہ ہونے تو ان کی فریاد بلند ہوئی اور انھوں نے کہا: "وائے ہو ہم پر کہ ہم ہی سرکشی اور طغیان کرنے والے تھے۔" (قالوا یاویلنا انا کنا طاغین)۔

انھوں نے پہلے مرحلہ میں تو ظلم و ستم کا اعتراف کیا اور یہاں طغیان و سرکشی کا اعتراف ہے۔ حقیقت میں طغیان ظلم سے بالاتر ایک مرحلہ ہے، کیونکہ ظالم ممکن ہے اصل قانون کو قبول کرے لیکن ہوائے نفس کے زیر اثر ہو کر ظلم و ستم کرے۔ لیکن طغیان کرنے والا تو اصلاً قانون کے زیر بار ہی نہیں ہوتا اور اسے قانون کی حیثیت سے تسلیم ہی نہیں کرتا۔

یہ احتمال بھی ہے کہ ظلم تو "اپنے اوپر ظلم کرنے" کی طرف اشارہ ہو اور طغیان "دوسروں کے حق میں تجاوز کرنے" کی طرف اشارہ ہو۔

یہ نکتہ بھی قابلِ توجہ ہے کہ عرب جب کسی مصیبت میں گرفتار ہوتے یا کسی چیز سے نفرت کا اظہار کرنا چاہتے تھے تو کبھی "ویس" کہتے تھے اور کبھی 'ویح' اور کبھی 'ویل' جن میں سے پہلا مصیبت میں خفیف، دوسرا زیادہ شدید اور تیسرا سب سے زیادہ شدید ہے اور یہ اس بات کی نشان دہی کرتا ہے کہ باغ والے اپنے آپ کو شدید ترین سرزنش کا مستحق سمجھتے تھے۔

❖ ❖ ❖

انجام کار انھوں نے اس بیداری، گناہ کے اعتراف اور خدا کی طرف بازگشت کے بعد اس کی بارگاہ کی طرف مراجعہ کیا اور کہا۔ "امید ہے کہ ہمارا پروردگار ہمارے گناہوں کو بخش دے گا اور ہمیں اس سے بہتر باغ عطا فرمائے گا۔" (عسیٰ ربنا ان یبدلنا خیرا منھا)۔

"کیونکہ ہم نے اس کی طرف رُخ کر لیا ہے اور اس کی پاک ذات کے ساتھ لو لگا لی ہے۔ لہٰذا اس مشکل کا حل بھی اسی کی بے پایاں قدرت سے طلب کرتے ہیں۔" (انا الیٰ ربنا راغبون)۔[1]

کیا یہ گروہ واقعاً اپنے فعل پر پشیمان ہو گیا تھا، اس نے اپنے طرزِ عمل میں تجدید نظر کر لی تھی اور قطعی اور پختہ ارادہ کر لیا تھا کہ اگر خدا نے ہمیں آئندہ اپنی نعمتوں سے نوازا تو ہم اس کے شکر کا حق ادا کریں گے؟ یا وہ بھی بہت سے ظالموں کی طرح کہ جب وہ عذاب میں گرفتار ہوتے ہیں تو وقتی طور پر بیدار ہو جاتے ہیں، لیکن جب عذاب ختم ہو جاتا ہے تو وہ دوبارہ انھیں کاموں کی تکرار کرنے لگتے ہیں۔

اس بارے میں مفسرین کے درمیان اختلاف ہے۔ بعد والی آیت کے لب و لہجہ سے احتمالی طور پر جو کچھ معلوم ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ ان کی توبہ شرائط کے جمع نہ ہونے کی بناء پر قبول نہیں ہوئی۔ لیکن بعض روایات میں آیا ہے کہ انھوں نے خلوصِ نیت کے ساتھ توبہ کی، خدا نے ان کی توبہ کو قبول کر لیا اور انھیں اس سے بہتر باغ عنایت کیا جس میں خاص طور پر بڑے بڑے خوشوں والے انگور کے پُرمیوہ درخت تھے۔

❖ ❖ ❖

آخری زیرِ بحث آیت میں کلی طور پر نتیجہ نکالتے ہوئے سب کے لیے ایک درس کے عنوان سے فرماتا ہے: "خدا کا عذاب اس طرح کا ہوتا ہے اور اگر وہ جانیں تو آخرت کا عذاب تو بہت ہی بڑا ہے۔" (کذالک العذاب ولعذاب الآخرۃ اکبر لو کانوا یعلمون)۔

اگر تم بھی مال و ثروت اور مادی وسائل کی بناء پر مست و مغرور ہو گئے، ذخیرہ طلبی کی رُوح نے تم پر غلبہ کر لیا، ہر چیز کو اپنے لیے ہی طلب کرنے لگو اور حاجت مندوں کو محروم کر دو تو تمھاری سرنوشت بھی ان سے بہتر نہیں؛

---

[1] "راغبون"۔ "رغبت" کے مادہ سے ہے۔ یہ مادہ جب 'الیٰ' یا 'فی' کے ساتھ متعدی ہوتا ہے تو کسی چیز کی طرف تمایل کے معنی دیتا ہے۔ جب 'عن' کے ساتھ متعدی ہوتا ہے کسی چیز سے انصراف اور بے اعتنائی کے معنی میں ہوتا ہے

ہوگی۔ البتہ وہ ایک روز تھا کہ 'صاعقہ' (بجلی) آئی اور اس نے اس باغ کو آگ لگا دی۔ آج ممکن ہے کچھ اور آفتیں ہوں یا گھروں اور آبادیوں کو جلا دینے والی علاقائی یا عالمی جنگیں ان نعمتوں کو تباہ و برباد کر دیں۔

* * *

چند نکات

۱: انحصار طلبی: ثروت مندوں کی بہت بڑی مصیبت

انسان خواہ نخواہ مالِ دُنیا سے لگاؤ رکھتا ہے، کیونکہ اس کی زندگی کا گزارہ اسی کے ذریعہ ہوتا ہے۔ ہاں یہ لگاؤ اعتدال کی حد میں مذموم نہیں ہے۔ اہم بات یہ ہے کہ ضرورت مندوں کو بھی اپنے اموال میں شریک کرے۔ نہ صرف الٰہی حقوقِ واجبہ کو ادا کرے بلکہ مستحب انفاق سے بھی ہاتھ نہ روکے۔

خصوصاً باغ اور زراعت کے بارے میں اسلامی روایات میں یہ حکم دیا گیا ہے کہ حاضر آنے والے ضرورتمندوں کو ایک حصہ دیں، جو آیۂ شریفہ (و آتوا حقہ یوم حصادہ) اس کا حق فصل کاٹنے کے وقت دے دو، (انعام ۱۴۱) سے اقتباس کرتے ہوئے حق الحصاد کے عنوان سے مشہور ہوا ہے۔ وہ ایک ایسا حق ہے جو زکوٰۃِ معروف کے حق سے الگ ہے اس سے مراد وہ چیز ہے جو پھل توڑنے یا زراعت کاٹنے کے موقع پر حاضر آنے والے ضرورتمندوں کو دی جاتی ہے اور اس کی کوئی حد معیّن نہیں ہے۔ [1]

لیکن جب مال و ثروت سے لگاؤ افراط اور انحراف کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے تو انحصار طلبی کی صورت اختیار کر لیتا ہے، یہاں تک کہ بعض اوقات اپنے لیے کسی چیز کی ضرورت نہ ہونے کے باوجود وہ یہ چاہتا ہے کہ دُوسرے اِس سے محروم رہیں۔ یہ وہ عظیم مصیبت ہے خصوصیت کے ساتھ جس کے آج بھی انسانی معاشروں میں بہت سے نمونے موجود ہیں اور اس کو ایک قسم کی خطرناک بیماری شمار کیا جا سکتا ہے۔

باغ والوں کی داستان جو اوپر والی آیات میں بیان کی گئی ہے ثروت مندوں کے ایک گروہ کے انحصار طلبی کے جذبہ کی واضح طور پر تصویر کشی کرتی ہے۔ یعنی وہ کس طرح سے ایک دوسرے کے ہاتھ میں ہاتھ دیتے ہیں۔ ضرورت مندوں کے محروم کرنے کے لیے منصوبہ بناتے ہیں۔ اور ان کی نظریں بچا کر عظیم منافع اور بڑے بڑے فوائد حاصل کرتے ہیں۔ لیکن اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ان محرومیوں کی آہ جلانے والی بجلیوں میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ اور ان انحصار طلب ثروت مندوں کے خرمنِ زندگی کو آگ لگا دیتی ہے۔ اکثر دیکھا گیا ہے کہ یہ بجلیاں انقلابوں کی صورت میں ظاہر ہوتی ہیں اور جس چیز کو وہ باور نہیں کرتے تھے اسے اپنی آنکھ سے دیکھ لیتے ہیں۔ ان کی آہ و فریاد آسمان

---

[1] اس موضوع سے مربوط روایات کا وسائل الشیعہ کی جلد ۶ ابواب زکوٰۃ الغلات باب ۱۳ میں اور سنن بیہقی جلد ۴ ص ۱۳۳ میں مطالعہ فرمائیں۔

تک بلند ہوتی ہے اور وہ گزشتہ خطاؤں اور گناہوں سے توبہ اور تلافی کا دم بھرتے ہیں لیکن مُعاملہ ہاتھ سے نکل چکا ہوتا ہے۔

٭ ٭ ٭

۲ : گناہ اور قطع رزق کے درمیان رابطہ

اوپر والی آیات سے ضمنی طور پر معلوم ہوتا ہے کہ گناہ اور قطع رزق کے درمیان قریبی رابطہ ہے۔ اسی لیے ایک حدیث میں امام محمد باقرؑ سے آیا ہے :

"ان الرجل لیذنب الذنب فیدرأ عنه الرزق و تلا هٰذه الأیة : اذاقسموا لیصرمنها مصبحین ولا یستثنون فطاف علیها طائف من ربك وهم نائمون.

"بعض اوقات انسان گناہ کرتا ہے تو اس کی روزی منقطع ہو جاتی ہے۔ اس کے بعد امام نے اوپر والی آیات کی تلاوت کی۔"

"جب انھوں نے یہ قسم کھائی کہ ہم صبح سویرے پھلوں کو توڑ لیں گے اور اپنے سوا کسی کو بھی اِس سے فائدہ نہیں اٹھانے دیں گے، لیکن اس وقت کہ جب وہ سوئے ہُوئے تھے تیرے پروردگار کی طرف سے ایک بلا اس باغ پر مُسلط ہوگئی اور اسے نابود کر دیا۔"[1]

ابن عباس سے بھی یہ نقل ہُوا ہے کہ گناہ اور روزی کے منقطع ہونے کا ربط سورج سے بھی زیادہ واضح ہے جیسا کہ خدا نے اسے سورۂ ن والقلم کی زیر بحث آیت میں بیان فرمایا ہے۔[2]

٭ ٭ ٭

---

[1] تفسیر نور الثقلین جلد ۵ ص ۳۹۵ (حدیث ۴۴)

[2] تفسیر المیزان جلد ۲۰ ص ۳۷

(۳۴) اِنَّ لِلْمُتَّقِيْنَ عِنْدَ رَبِّهِمْ جَنّٰتِ النَّعِيْمِ ○
(۳۵) اَفَنَجْعَلُ الْمُسْلِمِيْنَ كَالْمُجْرِمِيْنَ ○
(۳۶) مَالَكُمْ ۫ كَيْفَ تَحْكُمُوْنَ ○
(۳۷) اَمْ لَكُمْ كِتٰبٌ فِيْهِ تَدْرُسُوْنَ ○
(۳۸) اِنَّ لَكُمْ فِيْهِ لَمَا تَخَيَّرُوْنَ ○
(۳۹) اَمْ لَكُمْ اَيْمَانٌ عَلَيْنَا بَالِغَةٌ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ ۙ اِنَّ لَكُمْ لَمَا تَحْكُمُوْنَ ○
(۴۰) سَلْهُمْ اَيُّهُمْ بِذٰلِكَ زَعِيْمٌ ○
(۴۱) اَمْ لَهُمْ شُرَكَآءُ ۚ فَلْيَاْتُوْا بِشُرَكَآئِهِمْ اِنْ كَانُوْا صٰدِقِيْنَ ○

* * *

ترجمہ

(۳۴) پرہیزگاروں کے لیے ان کے پروردگار کے پاس جنّت کے پُرنعمت باغات ہیں۔
(۳۵) کیا ہم مومنین کو مجرمین کی طرح قرار دے دیں ؟
(۳۶) تمھیں کیا ہو گیا ہے تم کس قسم کے فیصلے کرتے ہو؟

۳۷ کیا تمھارے پاس کوئی کتاب ہے کہ جس سے تم درس پڑھتے ہو؟

۳۸ کیا جسے تم انتخاب کرتے ہو وہ تمھارے لیے مخصوص ہے؟

۳۹ یا تم نے قیامت کے دن تک کے لیے کوئی تاکیدی عہدو پیمان لے لیا ہے کہ جو کچھ تم اپنے نفع کے لیے اختیار کرو گے وہ اسے تمھارے لیے قرار دے دے گا؟

۴۰ ان سے پوچھ لیجئے ان میں سے کون اس قسم کی چیز کی ضمانت لیتا ہے؟

۴۱ یا ان کے ایسے معبود ہیں (جنھیں انھوں نے خدا کا شریک قرار دیا ہے) اور وہ ان کے لیے شفاعت کرتے ہیں۔ اگر وہ سچ کہتے ہیں تو اپنے معبودوں کو سامنے لائیں۔

❖ ❖ ❖

تفسیر

مکمل باز پرس

ہم جانتے ہیں کہ قرآن کی روش اور طریقہ یہ ہے کہ بڑوں اور اچھوں کے حالاتِ زندگی کو ایک دوسرے کے مقابل لاتا ہے تاکہ ایک دوسرے کے ساتھ موازنہ میں بہتر طور پر پہچانے جائیں۔ یہ طریقہ تربیتی لحاظ سے بہت ہی مؤثر ہے۔

اسی روش کے مطابق "اصحاب الجنۃ" (سرسبز و شاداب باغ والوں) دردناک سرنوشت کے ذکر کے بعد، جو گزشتہ آیات میں گزری ہے، پرہیزگاروں کا حال بیان کرتے ہوئے کہتا ہے: "پرہیزگاروں کے لیے ان کے پروردگار کے پاس جنت کے پُرنعمت باغ ہیں" (ان للمتقین عند ربھم جنات النعیم)۔

جنت کے ایسے باغات جن میں ہر وہ نعمت جس کا تصور کیا جائے، اس کی کامل ترین نوع موجود ہے۔ اس کے علاوہ وہ نعمتیں بھی ہوں گی جو کسی انسان کے خواب و خیال میں بھی نہ آئی ہوں گی۔

چونکہ مشرکین اور ثروت مندوں کی ایک جماعت خود خواہ تھی، جن کا دعویٰ یہ تھا کہ جس طرح دنیا میں ہماری حالت بہتر اور اعلیٰ ہے اسی طرح قیامت میں بھی بہت اچھی ہوگی۔ خدا نے بعد والی آیت میں ان کا شدت کے ساتھ مواخذہ کیا ہے کہ فرماتا ہے: "کیا ہم مومنین کو جو حق و عدالت کے آگے سرِ تسلیم خم کرتے ہیں،

مشرکین اور مجرمین کی مانند قرار دیں گے۔" (افنجعل المسلمین کالمجرمین)۔

❊ ❊ ❊

تمھیں کیا ہو گیا ہے؟ یہ تم کس طرح کے فیصلے کرتے ہو"؟ (مالکم کیف تحکمون)۔

کیا کوئی عقلمند انسان یہ باور کرلے گا کہ عادل و ظالم، مطیع و مجرم، ایثارگر اور انحصار طلب کی سرنوشت ایک جیسی ہو گی؟ وہ بھی اس خدا کی بارگاہ میں جس کے سارے کام بچھے تلے اور حکیمانہ نظام کے ماتحت ہوتے ہیں۔

سورہ حٰم سجدہ کی (آیت ۵۰) میں بھی اسی قسم کے افراد کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے: (و لئن اذقناہ رحمۃ منا من بعد ضراء مسته لیقولن ھذا لی وما اظن الساعۃ قائمۃ ولئن رجعت الی ربی ان لی عندہ للحسنٰی)۔

جب ہم اسے اپنی طرف سے تکلیف و پریشانی کے بعد رحمت کا مزہ چکھاتے ہیں تو وہ کہتا ہے: یہ میری شائستگی اور استحقاق کی بناء پر تھا اور میں گمان نہیں کرتا کہ کوئی قیامت برپا ہو گی۔ اگر بالفرض قیامت ہوئی بھی تو جس وقت میں اپنے پروردگار کے پاس لوٹوں گا تو میرے لیے اس کے پاس اچھے اجر اور اچھے بدلے ہی ہوں گے۔ ہاں یہ خودپسند اور مغرور گروہ دنیا و آخرت کو اپنے لیے ہی مخصوص سمجھتا ہے۔

❊ ❊ ❊

اس کے بعد مزید کہتا ہے: "اگر عقل و خرد نے اس قسم کے حکم میں تمھاری رہنمائی نہیں کی ہے تو کیا اس پر کوئی "نقلی دلیل تمھارے پاس ہے؟ کیا تمھارے پاس کوئی کتاب ہے کہ جس سے تم درس لیتے ہو؟" (ام لکم کتاب فیہ تدرسون)۔

"کہ جسے تم انتخاب کرتے ہو اور اس کی طرف میلان رکھتے ہو وہ تمھارے لیے مخصوص ہے۔" (ان لکم فیہ لما تخیرون)[1]

تم یہ توقع رکھتے ہو کہ تم جیسے مجرم بھی مسلمانوں کے ہم پلہ ہو جائیں گے۔ یہ تو ایک ایسی بات ہے کہ جس کا نہ عقل حکم کرتی ہے اور نہ ہی کسی معتبر کتاب میں آئی ہے۔

❊ ❊ ❊

بعد والی آیت میں بات کو اس طرح جاری رکھے ہوئے ہے:

"اگر تمھارے پاس عقل و نقل سے کوئی مدرک اپنے دعوے کے لیے نہیں ہے تو کیا تم نے کوئی تاکید ی

---

[1] "ان لکم"... کا جملہ "تدرسون" کا مفعول ہے۔ قاعدہ کی رو سے ان کو ہمزہ کی زبر کے ساتھ پڑھا جانا چاہیے لیکن لام کی مناسبت سے جو "انّ" کے اسم کے اوپر آئی ہے "انّ" زیر کے ساتھ پڑھا جاتا ہے کیونکہ فعل عمل کرنے سے معلق ہو جاتا ہے۔

عہد و پیمان ہم سے لے لیا ہے جو قیامت تک برقرار رہے گا کہ تم جو کچھ بھی اپنے نفع میں فیصلہ کرلو، اسے وہ تمہارے لیے قرار دے دے گا۔" (ام لکم ایمان علینا بالغۃ الی یوم القیامۃ ان لکم لما تحکمون)۔

کون شخص یہ دعوٰی کرسکتا ہے کہ اس نے خدا سے یہ عہد و پیمان لے لیا ہے کہ وہ جو چاہیں گے خدا اسے تسلیم کرلے گا، جو مقام و منصب وہ چاہیں گے وہ بے چون وچرا ان کو دے دے گا؟ یہاں تک کہ مجرمین مسلمانوں کے ہم پلہ ہو جائیں۔[1]

* * *

پھر انھیں سوالات کو جاری رکھتے ہوئے، جو ہر طرف سے ان پر راستوں کو بند کر رہے ہیں مزید کہتا ہے: "ان سے پوچھ لیجئے کہ ان میں سے کون اس بات کا ضامن ہے کہ مجرمین اور مومنین برابر ہیں یا جو کچھ وہ چاہتے ہیں خدا ان کے اختیار میں دے دے گا۔" (سلھم ایھم بذالک زعیم)۔

* * *

آخری مرحلہ میں ان سے ایک عجیب سوال کرتے ہوئے فرماتا ہے: "یا ان کے ایسے معبود ہیں جو خدا کے ہاں ان کی شفاعت و حمایت کریں گے۔ اگر وہ سچ کہتے ہیں تو ان کو سامنے لائیں اور ان کا تعارف کرائیں:" (ام لھم شرکاء فلیأتوا بشرکائھم ان کانوا صادقین)۔

کیا ان کے پاس کوئی معمولی سے معمولی دلیل ہے کہ یہ بے قدر و قیمت اور بے شعور جمادات خدا کے شریک ہیں اور اس کی بارگاہ میں شفاعت کرنے والے ہیں۔

بعض مفسرین نے یہاں شرکاء کو شہداء (گواہوں) کے معنی میں لیا ہے۔

اس طرح اوپر والی آیات کے مجموعہ سے نیچائی طور پر یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ انھیں اپنے مدعا کو ثابت کرنے کے لیے، کہ وہ مومنین کے ہم پلہ بلکہ ان سے افضل و برتر ہیں، چار میں سے کسی ایک وسیلہ کے ساتھ متمسک ہونا پڑے گا۔ یا عقل سے کوئی دلیل یا آسمانی کتابوں میں سے کوئی کتاب، یا خدا کی طرف سے کوئی عہد و پیمان، یا شفاعت کرنے والوں کی شفاعت اور گواہوں کی گواہی۔ چونکہ ان تمام سوالات کا جواب نفی میں ہے اس بناء پر مذکورہ دعوٰی کلی طور پر بے بنیاد اور بے قدر و قیمت ہے۔

* * *

---

[1] "بالغۃ" کے لفظ کی تفسیر مؤکد کے معنی میں اور بعض نے جاری و مسلسل کے معنی میں کی ہے۔ لیکن دوسرا معنی زیادہ مناسب ہے۔ اس بناء پر (الی یوم القیامۃ) کا جار و مجرور اس کے متعلق ہے۔

(۴۲) يَوْمَ يُكْشَفُ عَنْ سَاقٍ وَّيُدْعَوْنَ اِلَى السُّجُوْدِ فَلَا يَسْتَطِيْعُوْنَ ۙ

(۴۳) خَاشِعَةً اَبْصَارُهُمْ تَرْهَقُهُمْ ذِلَّةٌ ؕ وَقَدْ كَانُوْا يُدْعَوْنَ اِلَى السُّجُوْدِ وَهُمْ سٰلِمُوْنَ ۝

(۴۴) فَذَرْنِيْ وَمَنْ يُّكَذِّبُ بِهٰذَا الْحَدِيْثِ ؕ سَنَسْتَدْرِجُهُمْ مِّنْ حَيْثُ لَا يَعْلَمُوْنَ ۙ

(۴۵) وَاُمْلِيْ لَهُمْ ؕ اِنَّ كَيْدِيْ مَتِيْنٌ ۝

* * *

ترجمہ

(۴۲) اس دن کو یاد کرو جس میں پاؤں کی پنڈلی وحشت سے برہنہ ہو جائے گی اور انھیں سجدے کی دعوت دی جائے گی لیکن وہ اس پر قادر نہیں ہوں گے۔

(۴۳) حالت یہ ہوگی کہ ان کی آنکھیں (ندامت اور شرمساری کی شدت سے) نیچے ہوں گی اور ذلت و خواری نے ان کے وجود کو گھیر رکھا ہوگا۔ انھیں اس سے پہلے بھی جبکہ وہ صحیح و سالم تھے سجدے کی دعوت دی جایا کرتی تھی۔ (لیکن آج تو ان میں اس کی توانائی ہی نہ ہوگی۔)

(۴۴) جو لوگ اس بات کی تکذیب کرتے ہیں، مجھے ان کے لیے رہنے دے۔ ہم انھیں ایسی جگہ سے جسے وہ نہیں جانتے تدریجاً عذاب کی طرف لے جائیں گے۔

(۴۵) اور میں انھیں ڈھیل دیتا رہوں گا، کیونکہ میرے منصوبے محکم اور دقیق ہیں۔

❖ ❖ ❖

تفسیر

اس دن سجدہ کرنا چاہیں گے لیکن قادر نہ ہوسکیں گے۔

گزشتہ آیات کے بعد جن میں مشرکوں اور مجرموں سے سخت بازپرس کی گئی تھی، زیر بحث آیات میں قیامت میں ان کی سرنوشت کے ایک گوشہ کی نشان دہی کررہا ہے، تاکہ واضح ہو جائے کہ یہ خودخواہ اور بڑے بڑے دعوے کرنے والا گروہ، کس قدر ذلیل وخوار ہوگا۔

فرماتا ہے: "اس دن کو یاد کرو جس دن پنڈلیاں خوف ووحشت سے برہنہ ہو جائیں گی اور انھیں سجدہ کی دعوۃ دی جائے گی لیکن وہ اس پر قادر نہیں ہوں گے۔" (یوم یکشف عن ساق ویدعون الی السجود فلا یستطیعون)[1]

"یکشف عن ساق" (پنڈلیاں برہنہ ہو جائیں گی) کا جملہ مفسرین کی ایک جماعت کے قول کے مطابق ہول ووحشت کی شدت اور معاملہ کی سنگینی سے کنایہ ہے۔ کیونکہ عربوں کے درمیان یہ معمول تھا کہ جب کوئی کسی مشکل کام سے دوچار ہوتا تھا تو وہ اپنا دامن کمر پر ڈال دیتا اور پنڈلیاں برہنہ کر دیتا تھا۔ اسی لیے جب مشہور مفسر ابن عباس سے اس آیت کی تفسیر کے بارے میں پوچھا گیا تو انہوں نے اس کے جواب میں کہا: جب تمھیں قرآن میں سے کوئی بات مخفی دکھائی دے تو اشعار میں عربوں کی تعبیرات کی طرف رجوع کرو۔ کیا تم نے سنا نہیں کہ ایک شاعر کہتا ہے:

"وقامت الحرب بنا علی ساق"
"جنگ نے ہمیں پاؤں کی پنڈلی پر لا کھڑا کیا"

جو جنگ کے بحران کی شدت سے کنایہ ہے۔

بعض نے یہ بھی کہا ہے کہ "ساق" کسی چیز کی اصل اور بنیاد کے معنی میں ہے جیسے درخت کا تنا۔ اس بناء پر یکشف عن ساق" یعنی اس دن ہر چیز کی جڑیں اور ریشے آشکار ہو جائیں گے لیکن پہلا معنی زیادہ مناسب

---

[1] "یوم" ظرف ہے اور ایک مظروف سے متعلق ہے اور تقدیر میں اذکروا یوم... ہے۔ بعض نے یہ احتمال بھی دیا ہے کہ یہ فلیأتوا سے متعلق ہے جو گزشتہ آیت میں آیا ہے، لیکن یہ معنی بعید نظر آتا ہے۔

اور صحیح ہے۔

ہاں! اس دن سب کو پروردگار کے سامنے سجدہ اور خضوع کی دعوت دی جائے گی۔ مومنین تو سجدے میں گر پڑیں گے لیکن مجرموں میں سجدہ کی قدرت نہ ہوگی۔ کیونکہ وہ غلط جذبات و نظریات جو دنیا میں ان کے وجود میں راسخ ہو چکے ہوں گے وہ اس دن ظاہر ہو جائیں گے اور اس بات سے مانع ہوں گے کہ وہ خدا کی پاک ذات کے سامنے کمر کو خم کریں۔

یہاں ایک سوال سامنے آتا ہے کہ قیامت کا دن تکلیف اور ذمہ داریوں کا دن نہیں ہے تو پھر سجدہ کی دعوت کس بناء پر ہوگی؟

اس سوال کا جواب اس تعبیر سے حاصل کیا جا سکتا ہے جو احادیث میں آئی ہے۔ ایک حدیث میں آیا ہے:

"قیامت میں نور الٰہی سے حجاب اٹھا دیا جائے گا اور مومنین اس کی عظمت کی بناء پر سجدہ میں گر پڑیں گے۔ لیکن منافقین کی پشت ایسی سخت ہو جائے گی کہ ان میں سجدہ کرنے کی قدرت نہ رہے گی۔ [1]

دوسرے لفظوں میں اس دن خدا کی عظمت آشکار ہو جائے گی۔ یہ عظمت مومنین کو سجدہ کی دعوت دے گی اور وہ سجدہ میں گر پڑیں گے۔ لیکن کفار اس سعادت سے محروم رہ جائیں گے۔

❖ ❖ ❖

بعد والی آیت کہتی ہے: "حالت یہ ہوگی کہ ان کی آنکھیں شدتِ ندامت و شرمساری سے نیچے کی طرف جھکی ہوئی ہوں گی اور ذلت و خواری نے ان کے تمام وجود کو گھیر رکھا ہوگا۔" (خاشعة ابصارهم ترهقهم ذلة)۔ [2]

مجرم افراد کے خلاف جب کبھی عدالت میں فیصلہ ہو جاتا ہے تو عام طور پر وہ اپنا سر نیچے کر لیتے ہیں اور ذلت و خواری ان کے سارے وجود کو گھیر لیتی ہے۔

اس کے بعد مزید کہتا ہے: "انھیں اس سے پہلے دار دنیا میں جبکہ وہ صحیح و سالم تھے سجدہ کی دعوت دی جاتی تھی۔" (وقد كانوا يدعون الى السجود وهم سالمون)۔

لیکن انہوں نے بالکل سجدہ نہ کیا اور استکبار، سرکشی اور روگردانی کی روح کو اپنے ساتھ ہی میدان قیامت تک لے آئے۔ اس حالت میں ان میں سجدہ کرنے کی قدرت کیسے ہوگی۔

واضح ہے کہ دنیا میں سجدہ کی دعوت نماز کے موقع پر اذان دینے والوں کے پیام کے ذریعہ اور نماز جماعت

---

[1] نور الثقلین جلد ۵ ص ۳۹۵ حدیث ۴۹

[2] "ترهقهم"، "رہق" (بروزن شفق) کے مادہ سے چھپانے اور گھیر لینے کے معنی میں ہے۔

کے اجتماعات میں اور قرآن کی آیات، پیغمبرؐ اور آئمہ معصومینؑ کی احادیث کے ذریعہ بھی صورت پذیر ہوتی تھی۔ لہٰذا یہ دعوۃ ایک وسیع و عریض مفہوم رکھتی ہے جو ان سب کو شامل ہے۔

❊ ❊ ❊

اس کے بعد روئے سخن پیغمبرؐ کی طرف کرتے ہوئے کہتا ہے: "مجھے اس بات (یعنی قرآن) کی تکذیب کرنے والوں کے لیے رہنے دے۔ میں ان سب کا حساب کتاب چکالوں گا۔" (فذرنی ومن یکذب بھذا الحدیث)۔

یہ خداوند قادر و قہار کی طرف سے ایک شدید اور سخت تہدید ہے کہ پیغمبرؐ سے کہتا ہے تمھیں دخل دینے کی ضرورت نہیں ہے، ان ہٹ دھرم، سرکش اور جھٹلانے والوں کے لیے مجھے ہی رہنے دے تاکہ وہ جس چیز کے مستحق ہیں میں وہ انھیں دے دوں۔

ہمیں یہ بات نہیں بھولنی چاہیئے کہ یہ بات وہ خدا کہہ رہا ہے جو ہر چیز پہ قادر ہے۔

یہ تعبیر ضمنی طور پر دشمنوں کی کارشکنیوں اور سازشوں کے مقابلہ میں پیغمبرؐ اور مومنین کی دلداری اور قوت قلب کا سبب ہے۔

اس کے بعد مزید کہتا ہے: "ہم عنقریب انھیں ایسی جگہ سے جسے وہ نہیں جانتے تدریجاً عذاب کی طرف لے جائیں گے۔" (سنستدرجھم من حیث لا یعلمون)۔

❊ ❊ ❊

"اور میں انھیں مہلت دیتا رہوں گا اور ان کے عذاب میں جلدی نہ کروں گا۔ کیونکہ میرے منصوبے مستحکم اور دقیق ہیں اور میرا عذاب شدید ہے۔" (واملی لھم ان کیدی متین)۔

ایک حدیث میں امام جعفر صادقؑ سے آیا ہے:

"اذا احدث العبد ذنبا جدد لہ نعمۃ، فیدع الاستغفار فھو الاستدراج"۔

"بعض اوقات جب سرکش بندے گناہ کرتے ہیں تو خدا انھیں نعمت دیتا ہے اور وہ اپنے گناہ سے غافل ہوجاتے اور توبہ کو بھول جاتے ہیں۔ یہی استدراج اور تدریجی بلا و عذاب ہے۔"[1]

یہ حدیث اور بعض دوسری احادیث جو اس سلسلہ میں وارد ہوئی ہیں، ان سے معلوم ہوتا ہے کہ خدا بعض اوقات معاند اور ہٹ دھرم بندوں کی سزا اور عذاب کے لیے ان گناہوں کے مقابلہ میں جنھیں وہ انجام دیتے ہیں انھیں نعمت عطا کرتا ہے تو وہ یہ خیال کرنے لگتے ہیں کہ یہ لطف الٰہی ہے جو ان کی شائستگی اور لیاقت کی بناء پر ان کے شامل حال ہوا ہے۔ لہٰذا وہ غرور اور غفلت میں غرق ہو جاتے ہیں لیکن پھر اچانک خدا ان کی گرفت کر لیتا ہے اور ناز و نعمت سے نکال کر انھیں عذاب و بلا کے منہ میں دھکیل دیتا ہے۔ یہ عذاب کی دردناک ترین

---

[1] مجمع البیان جلد ۱۰ ص ۳۴۰

شکل ہے۔

البتہ یہ ان لوگوں کے بارے میں ہے جو طغیان و سرکشی کو اس کی آخری حد تک پہنچا دیتے ہیں لیکن وہ افراد جو ابھی اس حد تک نہیں پہنچے، خدا ان کے گناہوں کے مقابلہ میں ان کی گوشمالی اور تنبیہ کرتا ہے۔ پھر یہی چیز ان کی بیداری اور توبہ کا سبب بن جاتی ہے اور یہ ان کے حق میں لطفِ خدا ہے۔

دوسرے لفظوں میں جب انسان گناہ کرتا ہے تو وہ تین حالتوں سے باہر نہیں ہوتا، یا تو وہ خود ہی متوجہ ہو جاتا ہے اور واپس پلٹ آتا ہے، یا خدا اسے ابتلاء کا تازیانہ لگاتا ہے تاکہ وہ بیدار ہو جائے، یا وہ اس میں ان دونوں کے لیے کسی میں بھی شائستگی نہیں ہوتی اور خدا بلاء و مصیبت کی بجائے اسے نعمت بخشتا ہے۔ پس یہ وہی "عذابِ استدراج" ہے جس کی طرف آیاتِ قرآنی میں اس تعبیر کے ساتھ یا دوسری تعبیروں کے ساتھ اشارہ ہوا ہے۔

لہٰذا انسان کو چاہیے کہ خدائی نعمتوں کی فراوانی کے موقع پر یہ دیکھے کہ کہیں امر جو ظاہر میں نعمت ہے، "عذاب استدراج" ہی نہ ہو۔ اسی وجہ سے بیدار مغز مسلمان ایسے موقعوں پر سوچ میں پڑ جاتے ہیں اور اپنے اعمال کی دیکھ بھال کرتے ہیں، جیسا کہ ایک حدیث میں آیا ہے کہ امام صادق کے اصحاب میں سے ایک نے عرض کیا: میں نے خدا سے مال طلب کیا تو اس نے مجھے مال عطا کیا۔ میں نے اس سے اولاد طلب کی تو اس نے مجھے اولاد بخشی میں نے اس سے گھر طلب کیا تو اس نے مجھے گھر مرحمت فرمایا۔ میں اس سے ڈرتا ہوں کہ کہیں یہ استدراج ہو۔ امام نے فرمایا:

"اگر یہ سب کچھ حمد و شکرِ الٰہی کے ساتھ ہو تو پھر یہ استدراج نہیں ہے۔ (نعمت ہے)۔"[1]

املی لھم (میں انھیں مہلت دیتا رہوں گا) کی تعبیر اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ خدا ظالموں کی سزا میں عجلت اور جلد بازی سے کام نہیں لے گا۔ کیونکہ جلد بازی تو وہ کرتا ہے جسے فرصت کے ہاتھ سے نکل جانے کا خوف ہو لیکن خداوند قادر متعال جس وقت اور جو بھی ارادہ کرے وہ صورت پذیر ہو جاتا ہے۔ اس کے ہاتھ سے فرصت کے نکل جانے کا کوئی سوال ہی نہیں ہے۔ بہرحال یہ تمام ظالموں اور سرکشوں کو ایک تنبیہ ہے کہ سلامتی نعمت اور امن و امان ہرگز انھیں مغرور نہ کرنے پائے اور وہ ہر گھڑی و ہر لمحہ خدا کے شدید عذاب کے منتظر رہیں۔[2]

* * *

---

[1] اصول کافی بہ نقل نور الثقلین جلد ۵ ص ۳۹۷

[2] عذابِ استدراج کے سلسلہ میں ہم نے تفسیر نمونہ جلد ۸ (سورۂ اعراف کی آیت ۱۸۲ کے ذیل میں اور سورۂ آل عمران کی آیہ ۱۷۸ کے ذیل میں، بالتفصیل بیان کیا ہے۔

(۴۶) اَمْ تَسْـَٔلُهُمْ اَجْرًا فَهُمْ مِّنْ مَّغْرَمٍ مُّثْقَلُوْنَ ۝
(۴۷) اَمْ عِنْدَهُمُ الْغَيْبُ فَهُمْ يَكْتُبُوْنَ ۝
(۴۸) فَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ وَلَا تَكُنْ كَصَاحِبِ الْحُوْتِ اِذْ نَادٰى وَهُوَ مَكْظُوْمٌ ۝
(۴۹) لَوْلَآ اَنْ تَدٰرَكَهٗ نِعْمَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ لَنُبِذَ بِالْعَرَآءِ وَهُوَ مَذْمُوْمٌ ۝
(۵۰) فَاجْتَبٰهُ رَبُّهٗ فَجَعَلَهٗ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ ۝

❖ ❖ ❖

ترجمہ

(۴۶) یا تُو ان سے کچھ اُجرت مانگتا ہے کہ جس کا ادا کرنا ان کے لیے سنگین ہے ؟
(۴۷) یا ان کے پاس غیب کے اسرار ہیں کہ جنہیں وہ لکھتے ۔جتے ہیں (اور ایک دوسرے کو دیتے ہیں ؟)
(۴۸) اب جبکہ ایسا ہے تو تم صبر کرو اور اپنے پروردگار کے حکم کے منتظر رہو اور مچھلی والے (یونس) کی طرح نہ بنو (جس نے اپنی قوم پر عذاب کے لیے تقاضا کرنے میں جلد بازی کی اور ترک اولیٰ کی سزا میں گرفتار ہوا) جب کہ اس نے خدا کو پکارا اور وہ غم واندوہ کی حالت میں تھا۔
(۴۹) اگر خدا کی رحمت اس کی مدد کے لیے نہ آئی ہوتی تو (مچھلی کے پیٹ سے) اس حال میں باہر

پھینکا جاتا کہ وہ مذموم ہوتا۔

(۵۰) لیکن اس کے پروردگار نے اس کو برگزیدہ کر لیا اور صالحین میں سے قرار دیا۔

❖ ❖ ❖

تفسیر

عذاب کا تقاضا کرنے میں جلدی نہ کرو

وہی باز پرس جو گزشتہ آیات میں مشرکین اور مجرموں سے ہوئی تھی اسے جاری رکھتے ہوئے ان آیات میں دو اور سوالوں کا اضافہ کرتا ہے۔ پہلے کہتا ہے: "یا تو ان سے کچھ اجرت مانگتا ہے کہ جس کا ادا کرنا ان کے لیے سنگین ہے؟" (ام تسئلھم اجرا فھم من مغرم مثقلون)۔

اگر ان کا بہانہ یہ ہے کہ تیری دعوت کو سننے کے لیے مال کی ضرورت ہے۔ انھیں اس کے مقابلہ میں بہت اجرت دینا پڑے گی اور ان میں اتنی طاقت نہیں ہے، تو یہ بات بالکل جھوٹ ہے اور تو ان سے بالکل کسی اجرت کا مطالبہ نہیں کرتا اور نہ ہی خدا کے پیغمبروں میں سے کسی اور پیغمبر نے کسی اجرت کا مطالبہ کیا ہے۔

"مغرم"۔ 'غرامت' کے مادہ سے اس ضرر کے معنی میں ہے جو انسان کو کسی جرم یا خیانت کے بغیر پہنچتا ہے۔ اور "مثقل" "ثقل" کے مادہ سے سنگینی اور بوجھ کے معنی میں ہے۔ اس طرح سے بہانہ جوئی کرنے والے لوگوں کے ہاتھ سے ایک اور بہانہ چھین لیتا ہے۔

اوپر والی اور اس کے بعد والی آیت بعینہٖ سورۂ طور (کی آیہ ۴۰-۴۱) میں آئی ہے۔

❖ ❖ ❖

اس کے بعد اسی گفتگو کو جاری رکھتے ہوئے مزید کہتا ہے: "یا ان کے پاس غیب کے اسرار ہیں کہ جنھیں وہ لکھتے رہتے ہیں اور ایک دوسرے کی طرف منتقل کرتے رہتے ہیں۔ گویا ان اسرار میں آیا ہے کہ وہ مسلمانوں کے ساتھ یکساں ہیں" (ام عندھم الغیب فھم یکتبون)۔

یہ حقیقت میں بہت بعید احتمالات میں سے ایک احتمال ہے اور ممکن ہے کہ کفار اس بات سے متمسک ہوں۔ لہٰذا قرآن نے اسے بھی فروگزاشت نہیں کیا۔ یعنی کفار یہ دعویٰ کرنے لگیں کہ وہ کاہنوں کے ذریعہ عالم غیب کے ساتھ مربوط ہیں، اس ذریعہ سے اسرارِ غیب معلوم کرتے ہیں اور انھیں لکھ لیتے ہیں، پھر وہ ایک دوسرے کو دیتے رہتے ہیں۔ یعنی اس طریقہ سے انھوں نے مسلمانوں پر اپنی برتری یا کم از کم ان کے ساتھ اپنی مساوات اور برابری کو معلوم کر لیا ہے۔

یقیناً ان کے پاس اس قسم کے دعوے پر بھی کوئی دلیل نہیں تھی اور یہ جملہ استفہام انکاری کے معنی دیتا ہے۔ بعض نے جو یہ احتمال دیا ہے کہ غیب سے مُراد لوح محفوظ ہے اور لکھنے سے مُراد تقدیر و قضا ہے تو یہ بہت بعید نظر آتا ہے کیونکہ ان کا ہرگز یہ دعویٰ نہیں تھا کہ قضاء و قدر اور لوحِ محفوظ کا معاملہ ان کے ہاتھ میں ہے۔

* * *

چونکہ مشرکین اور دشمنان اسلام کی سختی اور بے عقلی بعض اوقات پیغمبرؐ کے دل کو ایسا دکھ پہنچاتی تھی کہ ممکن تھا آپ ان کے لیے بد دعا اور نفرین کر دیں۔ لہٰذا خدا نے بعد والی آیت میں اپنے پیغمبرؐ کو تسلی دی اور انھیں صبر و شکیبائی کا حکم دیا ہے۔ جیسے فرماتا ہے: "صبر کرو اور اپنے پروردگار کے حکم کے منتظر رہو"۔ (فاصبر لحکم ربک)۔

منتظر رہو یہاں تک کہ خدا تیری اور تیرے اصحاب کی کامیابی اور تیرے دشمنوں کی شکست کے اسباب فراہم کر دے۔ تم ان کے عذاب کے لیے ہرگز جلدی نہ کرنا۔ جان لو کہ یہ مہلت جو انھیں دی جا رہی ہے ایک قسم کا عذاب استدراج ہے۔

اس بناء پر "حکم ربک" سے مراد مسلمانوں کی کامیابی کے بارے میں خدا کا آخری فرمان ہے۔ لیکن بعض نے کہا ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ تم پروردگار کے احکام کی تبلیغ کی راہ میں صبر و استقامت سے کام لو۔

یہ احتمال بھی موجود ہے کہ اس سے مراد یہ ہو کہ تمھارے پروردگار نے حکم دیا ہے لہٰذا تم صبر کرو۔[1] لیکن پہلی تفسیر سب سے مُناسب ہے۔

اس کے بعد مزید کہتا ہے: "اور مچھلی والے (یونسؑ) کی طرح نہ ہو جاؤ کہ جس نے اپنی قوم کے عذاب کے لیے جلدی کی اور ترکِ اولیٰ کی سزا میں گرفتار ہو گیا تھا" (ولا تکن کصاحب الموت)۔

"جب اس نے مچھلی کے پیٹ کے اندر سے خدا کو پکارا اور وہ محبوس تھا اور اس کا سینہ غم و اندوہ سے بھرا ہوا تھا" (اذ نادیٰ وھو مکظوم)۔

ندا سے مراد وہی ہے جو سورۂ انبیاء کی آیت ۸۷ میں آیا ہے: فنادیٰ فی الظلمات ان لا الٰہ الّا انت سبحانک انی کنت من الظالمین: "اس نے تاریکیوں کے درمیان سے پکارا کہ تیرے سوا اور کوئی معبود نہیں ہے۔ تو منزّہ ہے۔ بیشک میں گنہگاروں میں سے تھا"۔ اس طرح اپنے ترکِ اولیٰ کا اعتراف کیا اور خدا سے عفو و بخشش کا تقاضا کیا۔

یہ احتمال بھی ہے کہ ندا سے مُراد وہی نفرین و بد دعا ہو جو اپنی قوم کے لیے کی تھی جبکہ وہ غیظ و غضب میں بھرے ہوئے تھے۔ لیکن مفسرین نے پہلی تفسیر کو اختیار کیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس آیت میں "نادیٰ"

---

[1] اس صورت میں لحکم ربک" کا لام تعلیل کا لام ہے۔

کی تعبیر اس تعبیر کے ساتھ ہم آہنگ ہے جو سورہ انبیاء کی آیت ۸۷ میں آئی ہے۔ وہ یقیناً اس زمانہ کے ساتھ مربوط ہے جب یونسؑ شکمِ ماہی میں محبوس تھے۔

بہرحال "مکظوم" "کظم" (بروزن ہضم) کے مادہ سے حلق کے معنی میں ہے اور "کظم سقاء" مشک کے بھر جانے پر اس کے منہ کو باندھنے کے معنی میں ہے۔ اسی مناسبت سے وہ لوگ جو بہت خشمگین یا غمناک ہوتے ہیں اور خود کو قابو میں رکھتے ہیں "کاظم" کہا جاتا ہے۔ پھر اسی مناسبت سے یہ لفظ حبس کے معنی میں بھی استعمال ہوا ہے۔ اس بناء پر اوپر والی آیت میں مکظوم کے دو معنی ہو سکتے ہیں، غصے اور غم و اندوہ میں بھرے ہوئے ہونا، یا شکمِ ماہی میں محبوس ہونا، لیکن پہلا معنی جیسا کہ ہم نے بیان کیا ہے، زیادہ مناسب ہے۔

❊ ❊ ❊

بعد والی آیت میں مزید کہتا ہے: "اگر اس کے پروردگار کی نعمت اور رحمت اس کی مدد کے لیے آگے نہ بڑھتی تو وہ مچھلی کے پیٹ سے اس حال میں باہر پھینکا جاتا کہ وہ قابلِ مذمت ہوتا" (لولا ان تداركه نعمة من ربه لنبذ بالعراء وهو مذموم)[1]

جیسا کہ ہم جانتے ہیں کہ آخرکار یونسؑ مچھلی کے پیٹ سے ایک خشک بیاباں میں ڈالے گئے جسے قرآن "عراء" سے تعبیر کرتا ہے لیکن یہ اس حالت میں ہوا کہ خدا نے ان کی توبہ کو قبول کر لیا اور اپنی رحمت کا مشمول قرار دے دیا تھا۔ وہ ہرگز لائقِ مذمت نہیں تھے۔

سورۂ صافات کی آیت ۱۴۵، ۱۴۶ میں بھی یہ آیا ہے: فنبذناه بالعراء وهو سقيم وانبتنا عليه شجرة من يقطين: ہم نے اسے خشک اور خالی سرزمین میں پھینک دیا جبکہ وہ بیمار تھا اور کدو کی بیل اس کے اوپر اگا دی (تاکہ وہ اس کے لمبے اور مرطوب پتوں کے سائے میں آرام کرے) اور ظاہراً اوپر والی آیت میں نعمت سے مراد وہی توبہ کی توفیق اور رحمت الٰہی کا مشمول ہونا ہے۔

یہاں دو سوال سامنے آتے ہیں: پہلا یہ کہ سورۂ صافات کی آیت ۱۴۳، ۱۴۴ میں آیا ہے: فلولا انه كان من المسبحين للبث في بطنه الى يوم يبعثون۔ "اگر وہ تسبیح کرنے والوں میں سے نہ ہوتا تو قیامت کے دن تک مچھلی کے پیٹ میں ہی رہتا" یہ بیان اس چیز کے ساتھ منافات رکھتا ہے جو زیرِ بحث آیت میں آئی ہے۔

اس سوال کے جواب میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ دو مختلف سزائیں، ایک زیادہ شدید اور دوسری زیادہ خفیف، یونسؑ کے انتظار میں تھیں۔ پہلی یہ کہ وہ دنیا کے ختم ہونے تک مچھلی کے پیٹ میں رہیں لیکن یہ تسبیح اور حمد الٰہی کی برکت سے برطرف ہو گئی۔ دوسری یہ کہ جب وہ شکمِ ماہی سے باہر آتے تو مذموم اور لطفِ خدا سے دور ہوتے۔ تو وہ سزا بھی

---

[1] نعمت کے مؤنث ہونے کے باوجود اس کا فعل (تداركه) مذکر کی صورت میں آیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ فاعل مؤنث لفظی ہے اور فعل و فاعل کے درمیان ضمیرِ مفعولی میں فاصلہ ہو گیا ہے۔ (غور کیجئے)

پروردگار کی نعمت اور اس کی رحمتِ خاص کی برکت سے برطرف ہوگئی۔

دوسرا سوال یہ کہ سورۂ صافات کی آیت ۱۴۲ میں آیا ہے: فالتقمه الحوت وهو مليم: "ایک بہت بڑی مچھلی نے اُسے نگل لیا جبکہ وہ قابلِ ملامت تھا، لیکن زیرِ بحث آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ اس پر کوئی مذمت اور ملامت نہیں تھی۔

اس سوال کا جواب بھی ایک نکتہ کی طرف توجہ کرنے سے واضح ہوجاتا ہے کہ یہ ملامت اس زمانہ کے ساتھ مربوط ہے جبکہ وہ نئے نئے مچھلی کے پیٹ میں پہنچے تھے۔ لیکن مذمت کی برطرفی اس زمانہ کے ساتھ مربوط ہے جب انہوں نے توبہ کرلی اور خدا نے ان کی توبہ کو قبول کرلیا اور انھوں نے مچھلی کے پیٹ سے نجات پائی۔

❊ ❊ ❊

اسی لیے بعد والی آیت میں فرماتا ہے: "اس کے پروردگار نے اُسے چُن لیا اور اُسے صالحین میں سے قرار دیا۔" (فاجتباه ربه فجعله من الصالحين)۔

اس کے بعد انھیں نئے سرے سے اپنی قوم کی ہدایت کے لیے مامور کیا۔ وہ ان کی طرف آئے وہ سب ایمان لے آئے اور خدا نے بہت زیادہ مدت تک انھیں زندگی کی نعمتوں سے بہرہ مند کیا۔

ہم نے یُونس اور ان کی قوم کے قصے اور اسی طرح ان کے ترکِ اولیٰ سے مربوط دوسرے مسائل یعنی ان کا مچھلی کے پیٹ میں جانا اور مختلف سوالات جو اس سلسلہ میں درپیش ہیں تفصیل کے ساتھ تفسیر نمونہ جلد ۱۹ (سورۂ صافات کی آیت ۱۳۹ تا ۱۴۸ کے ذیل میں) اور اسی طرح تفسیر نمونہ جلد ۱۳ (سورۂ انبیاء کی آیت ۸۷، ۸۸ کے ذیل میں بیان کیے ہیں ❊

❊ ❊ ❊

(۵۱) وَاِنْ يَّكَادُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَيُزْلِقُوْنَكَ بِاَبْصَارِهِمْ لَمَّا سَمِعُوا الذِّكْرَ وَيَقُوْلُوْنَ اِنَّهٗ لَمَجْنُوْنٌ ۘ

(۵۲) وَمَا هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ لِّلْعٰلَمِيْنَ ۝

* * *

ترجمہ

(۵۱) قریب ہے کہ کفار آیات قرآن کو سُن کر تجھے اپنی آنکھوں سے ہلاک کر دیں اور وہ کہتے ہیں کہ یہ تو دیوانہ ہے۔

(۵۲) درآنحالیکہ یہ (قرآن) عالمین کے لیے پیام بیداری کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے۔

* * *

تفسیر

وہ تجھے نابود کرنا چاہتے ہیں لیکن نہیں کر سکتے۔

اوپر والی دونوں آیات جو سورۂ قلم کی آخری آیات ہیں حقیقت میں اسی چیز کو بیان کر رہی ہیں جو اس سورہ کے آغاز میں دشمنوں کی طرف سے پیغمبرؐ کے لیے جنون کی نسبت کے سلسلہ میں آئی تھی۔

پہلے فرماتا ہے: "قریب ہے کہ کفار آیاتِ قرآن کو سُن کر تجھے اپنی آنکھوں سے ہلاک کر دیں اور کہتے ہیں کہ وہ تو دیوانہ ہے" (وان یکاد الذین کفروا لیزلقونك بابصارهم لما سمعوا الذکر ویقولون انه لمجنون)۔

"لیزلقونك" 'زلق' کے مادہ سے پھسلنے اور زمین پر گرنے کے معنی میں ہے اور ہلاکت و نابودی سے کنایہ ہے۔ اس آیت کی تفسیر میں گوناگوں نظریات پیش کیے گئے ہیں:

۱ : بہت سے مفسرین نے کہا ہے ۔ اس سے مراد یہ ہے کہ جب دشمن قرآن کی باعظمت آیات کو تجھ سے سنتے ہیں تو وہ خشمگیں اور پریشاں ہو جاتے ہیں اور دشمنی کے ساتھ تیری طرف دیکھتے ہیں گویا چاہتے ہیں کہ تجھے اپنی آنکھوں سے زمین پر گرائیں اور نابود کر دیں۔

اس معنی کی وضاحت میں ایک گروہ نے یہ اضافہ کیا ہے کہ وہ یہ چاہتے ہیں کہ تجھے نظر بد کے ذریعہ، جس کا بہت سے لوگ عقیدہ رکھتے ہیں اور وہ کہتے ہیں کہ بعض آنکھوں میں ایک مرموز اثر چھپا ہوا ہوتا ہے' وہ ایک مخصوص نگاہ کے ساتھ طرف مقابل کو بیمار یا ہلاک کر سکتے ہیں' ہلاک و نابود کر دیں۔

۲ : بعض نے کہا ہے یہ بہت زیادہ غضب آلود نگاہوں سے کنایہ ہے ، جیسا کہ ہم کہتے ہیں کہ فلاں شخص نے اس طرح بُری نگاہ سے میری طرف دیکھا کہ گویا چاہتا تھا کہ مجھے اپنی نگاہ سے کھا جائے یا مار ڈالے۔

۳ : اس آیت کی ایک اور تفسیر نظر آتی ہے جو شاید اوپر والی تفاسیر سے زیادہ نزدیک ہو۔ وہ یہ ہے کہ قرآن چاہتا ہے اِس عجیب و غریب تضاد کو جو دشمنانِ اسلام کی باتوں میں پایا جاتا ہے' اس بیان کے ذریعہ ظاہر کر دے اور وہ یہ ہے : وہ جس وقت قرآنی آیات کو سنتے ہیں تو اس قدر مجذوب ہو جاتے ہیں اور اس پر تعجب کرتے ہیں کہ چاہتے ہیں تجھے نظر لگائیں (کیونکہ نظر لگانا عام طور پر ایسے امور کے بارے میں ہوتا ہے جو بہت زیادہ تعجب میں ڈالنے والے ہوتے ہیں) لیکن اس کے باوجود کہتے ہیں کہ تُو دیوانہ ہے ۔ یہ واقعاً بڑی تعجب خیز بات ہے ۔ دیوانہ اور پراگندہ باتیں کہاں اور یہ حیرت انگیز، جاذب اور پُراثر آیات کہاں ؟

یہ دماغ کے ہلکے نہیں جانتے کہ کیا کہہ رہے ہیں اور کیسی کیسی متضاد و نقیض نسبتیں تیری طرف دے رہے ہیں۔

بہرحال اس بارے میں کہ اسلامی نظریہ کے مطابق اور موجودہ زمانہ کے علوم کے لحاظ سے نظر بد میں کچھ حقیقت ہے یا نہیں ؟ انشاء اللہ نکات کی بحث میں گفتگو کریں گے۔

* * *

انجام کار آخری آیت میں مزید کہتا ہے : "یہ قرآن عالمین کے لیے بیداری کا ذریعہ ہونے کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے" (وما ھو الا ذکر للعالمین)۔

اس کے معارف روشنی بخشنے والے ، اس کے انذار آگاہ کرنے والے ، اس کی مثالیں پُرمعنی ، اس کی تشویقیں اور بشارتیں رُوح پرور ، سوئے ہُوئے لوگوں کے لیے بیداری کا سبب اور غافلوں کے لیے یاد آوری کا مُوجب' ان حالات میں اس کے لانے والے کی طرف جنون کی نسبت کیسے دی جا سکتی ہے ۔؟

اس تفسیر کے مُطابق یہاں 'ذکر' (بروزن فکر) یاد آوری کے معنی میں ہے ۔ لیکن بعض مفسرین نے اس کی تفسیر "شرف" کے معنی کے ساتھ کی اور کہا ہے کہ یہ قرآن تمام عالمین کے لیے ایک شرافت و بزرگی ہے ، جیسا کہ سورۃ زخرف کی آیۃ ۴۴ میں فرماتا ہے :

و انه لذکر لك ولقومك : "قرآن تیرے اور تیری قوم کے لیے شرف اور آبرو کا موجب ہے"۔
لیکن جیسا کہ ہم نے مذکورہ آیت کے ذیل میں بھی کہا ہے کہ 'ذکر' وہاں بھی یاد آوری اور آگاہی بخشنے کے معنی میں ہے۔ نیز اصولی طور پر قرآن مجید کے ناموں میں سے ایک نام 'ذکر' ہے۔ اس بنا پر پہلی تفسیر زیادہ صحیح نظر آتی ہے۔

❖ ❖ ❖

ایک نکتہ

کیا نظر بد کی کوئی حقیقت ہے ؟

بہت سے لوگوں کا عقیدہ ہے کہ بعض آنکھوں میں ایک خاص قسم کا اثر ہوتا ہے۔ جب وہ کسی چیز کی طرف توجہ کی نگاہ سے دیکھتے ہیں تو ممکن ہے کہ اُسے نابود کر دیں یا درہم برہم کر دیں اور اگر کوئی انسان ہے، تو اسے بیمار یا دیوانہ کر دیں۔

یہ مسئلہ عقلی لحاظ سے کوئی امر محال نہیں ہے، کیونکہ موجودہ زمانہ کے بہت سے ماہرین کا نظریہ ہے کہ بعض آنکھوں میں ایک خاص قسم کی مقناطیسی قوت چھپی ہوئی ہوتی ہے جو بہت سارے کام کرتی ہے۔ یہاں تک کہ مشق کے ذریعے اس کی پرورش ہو سکتی ہے۔ آنکھوں کی اسی مقناطیسی قوت کے ذریعہ دوسرے آدمی پر مقناطیسی نیند طاری کی جاتی ہے۔

جس دنیا میں "لیزر شعاعیں" جو غیر مرئی ہیں، ایسا کام کر سکتی ہیں جو کسی انتہائی خطرناک اور تباہ کن ہتھیار سے بھی نہیں نہیں ہو سکتا، تو بعض آنکھوں میں ایسی قوت کے وجود کو تسلیم کر لینا جو مخصوص لہروں کے ذریعے طرف مقابل میں اثر انداز ہو سکے، کوئی عجیب چیز نہیں ہو گی۔

بہت سے لوگ نقل کرتے ہیں کہ انھوں نے خود اپنی آنکھوں سے ایسے افراد دیکھے ہیں جو آنکھ کی اس مرموز توانائی کے حامل تھے، اور انھوں نے کچھ لوگوں، جانوروں یا پھر دوسری چیزوں کو اپنی آنکھوں کی اس خفیہ طاقت سے بیکار کر دیا تھا۔

لہٰذا نہ صرف یہ کہ ان امور کے انکار پر اصرار نہیں کرنا چاہیے بلکہ ان کے وجود کے امکان کو عقل اور علم کے لحاظ سے قبول کر لینا چاہیے۔

اسلامی روایات میں بھی ایسی بہت سی مختلف تعبیریں نظر آتی ہیں جو اس امر کی اجمالاً تائید کرتی ہیں۔

ایک حدیث میں آیا ہے کہ اسماء بنت عمیس نے پیغمبرؐ کی خدمت میں عرض کیا: "بعض اوقات جعفر کے بیٹوں کو نظر لگ جاتی ہے، کیا میں ان کے لیے "رقیہ" لے لوں۔ (رقیہ سے مراد وہ لکھی ہوئی دعائیں ہیں، جنھیں کچھ لوگ بری نظر سے بچنے کے لیے اپنے پاس رکھتے ہیں اور اسے تعویز بھی کہتے ہیں)

پیغمبرؐ نے فرمایا:

"نعم، فلو کان شیء یسبق القدر لسبقة العین"

"ہاں! کوئی حرج نہیں ہے، اگر کوئی چیز قضاء و قدر پر سبقت لے سکتی ہے تو وہ نظر بد کا لگنا ہے۔"[1]

ایک اور حدیث میں آیا ہے کہ امیر المومنینؑ نے فرمایا:

"پیغمبرؐ نے امام حسنؑ اور امام حسینؑ کے لیے ایک تعویذ بنایا اور آپ نے یہ دعا پڑھی:

"اعیذکما بکلمات التامة و اسماء الله الحسنیٰ کلها عامة، من شر السامة والهامة و من شر کل عین لامة، و من شر حاسد اذا حسد"

"میں تمھیں تمام کلمات اور خدا کے اسمائے حسنیٰ کے، موت، موذی جانوروں کے شر اور ہر بُری آنکھ اور حسد کرنے والے کے شر سے جبکہ وہ حسد کرے، سپرد کرتا ہوں"

اس کے بعد پیغمبرؐ نے ہماری طرف دیکھا اور فرمایا: حضرت ابراہیمؑ نے اسمٰعیلؑ و اسحٰقؑ کے لیے اسی طرح سے تعویذ بنایا تھا۔"[2]

نہج البلاغہ میں بھی آیا ہے: "العین حق والرقی حق" نظر بد بھی حق ہے اور اس کے دفع کرنے کے لیے دعا و تعویذ سے متوسل ہونا بھی حق ہے۔"[3]

اس نکتہ کا ذکر کرنا ضروری ہے۔ اس میں کوئی امر مانع نہیں ہے کہ یہ دعائیں اور وسیلے حکم خدا سے آنکھوں کی مرموز مقناطیسی قوت و توانائی کی تاثیر کو روک دیں، جیسا کہ دعائیں بہت سے دوسرے مخرب عوامل پر اثر انداز ہوتی ہیں اور انھیں خدا کے حکم سے بے اثر کر دیتی ہیں۔

* * *

یہ بات بھی یاد دلانی ضروری ہے کہ اجمالی طور سے نظر بد کی تاثیر کو قبول کرنے کا یہ معنی نہیں ہے کہ اس قسم کے موارد میں بیہودہ کاموں اور عامیانہ اعمال کی پناہ لی جائے جو احکام شریعت کے برخلاف ہیں اور اصل موضوع میں بے خبر لوگوں کے شک و تردد کا باعث بھی ہیں۔ جیسا کہ بہت سے حقائق کے ان خرافات کے ساتھ آلودہ

---

[1] مجمع البیان جلد ۱۰ ص ۳۴۱

[2] نور الثقلین جلد ۵ ص ۴۰۰

[3] نہج البلاغہ کلمات قصار جملہ ۴۰۰ (یہ حدیث صحیح بخاری جلد ۷، ص ۱۷۰، باب العین حق میں بھی اس صورت میں نقل ہوئی ہے العین حق) "المعجم المفہرس لالفاظ الحدیث النبوی" میں یہی معنی مختلف منابع سے نقل ہوا ہے۔ (جلد ۴ ص ۴۵۱)

ہونے سے یہ غیر مطلوب تاثیر ذہنوں میں بیٹھ گئی ہے۔

❖ ❖ ❖

خداوندا! ہمیں شر اشرار اور دشمنوں کے مکروں سے اپنی پناہ میں محفوظ رکھ!

پروردگارا! ہمیں وہ صبر و استقامت مرحمت فرما جس کے سائے میں ہم تیری رضا کو حاصل کرسکیں۔

بارالٰہا! ہمیں اپنی بے پایاں نعمتوں سے فائدہ اٹھانے کی توفیق مرحمت فرما، اس سے پہلے کہ ناشکریاں اسے ہم سے سلب کرلیں۔ آمین یا رب العالمین۔

❖ ❖ ❖

سورۂ قلم کا اختتام

۲۸ شوال المکرم ۱۴۰۶ھ

ترجمہ کا اختتام

۱۵ ذی الحجہ ۱۴۰۷ھ مطابق ۱۱ اگست ۱۹۸۷ء

بروز منگل بوقت صبح ساڑھے پانچ بجے

۸۱، ای، ماڈل ٹاؤن

لاہور

سورۂ

حاقّہ

یہ سورہ مکّہ میں نازل ہُوا اور اس کی ۵۲ آیات ہیں۔

تاریخ آغاز

۲۸ شوال المکرم ۱۴۰۶ھ

سورۂ حاقہ کے مضامین

اس سورہ کے مباحث تین محوروں پر گردش کرتے ہیں :

پہلا محور : جو اس سورہ کی بحث کا اہم ترین موضوع ہے وہ قیامت سے مربوط مسائل اور اس کی بہت سی خصوصیات ہیں۔ اسی لیے قیامت کے تین نام 'حاقہ'، 'قارعہ' اور 'واقعہ' اس سورہ میں آئے ہیں۔

دوسرا محور : وہ مباحث ہیں جو گزشتہ کافر اقوام خصوصاً قوم عاد، ثمود اور قوم فرعون کی سرنوشت کے بارے میں ہیں۔ جو تمام کفار اور منکرینِ قیامت کے لیے قوی اور مؤکد انذاروں پر مشتمل ہیں۔

تیسرا محور : وہ مباحث ہیں جو قرآن کی عظمت، پیغمبرؐ کے مقام نیز تکذیب کرنے والوں کی سزا اور عذاب کے بارے میں ہیں۔

* * *

تلاوت کی فضیلت

ایک حدیث میں پیغمبر گرامیؐ سے آیا ہے :

"من قرأ سورة الحاقة حاسبه الله حسابًا يسيرًا"

جو شخص سورہ حاقہ کی تلاوت کرے گا خدا قیامت میں اس کے حساب کو آسان کر دے گا۔"[1]

ایک اور حدیث میں امام محمد باقرؑ سے آیا ہے :

"اكثروا من قراءة الحاقة، فان قراءتها في الفرائض والنوافل من الايمان بالله ورسوله ولم يسلب قارئها دينه حتى يلقى الله"

سورہ حاقہ کی بہت زیادہ تلاوت کیا کرو، کیونکہ فرائض و نوافل میں اس کی قرأت خدا اور اس کے رسولؐ پر ایمان کی نشانی ہے، اور جو شخص اسے پڑھے گا اس کا دین محفوظ رہے گا یہاں تک کہ لقاء اللہ پر پہنچ جائے۔[2]

---

[1] مجمع البیان، جلد ۱۰ ص ۳۴۲

[2] مجمع البیان جلد ۱۰ ص ۳۴۲

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

۱ اَلۡحَآقَّۃُ ۙ﴿۱﴾

۲ مَا الۡحَآقَّۃُ ۚ﴿۲﴾

۳ وَمَاۤ اَدۡرٰىکَ مَا الۡحَآقَّۃُ ؕ﴿۳﴾

۴ کَذَّبَتۡ ثَمُوۡدُ وَعَادٌۢ بِالۡقَارِعَۃِ ﴿۴﴾

۵ فَاَمَّا ثَمُوۡدُ فَاُہۡلِکُوۡا بِالطَّاغِیَۃِ ﴿۵﴾

۶ وَاَمَّا عَادٌ فَاُہۡلِکُوۡا بِرِیۡحٍ صَرۡصَرٍ عَاتِیَۃٍ ۙ﴿۶﴾

۷ سَخَّرَہَا عَلَیۡہِمۡ سَبۡعَ لَیَالٍ وَّثَمٰنِیَۃَ اَیَّامٍ ۙ حُسُوۡمًا ۙ فَتَرَی الۡقَوۡمَ فِیۡہَا صَرۡعٰی ۙ کَاَنَّہُمۡ اَعۡجَازُ نَخۡلٍ خَاوِیَۃٍ ۚ﴿۷﴾

۸ فَہَلۡ تَرٰی لَہُمۡ مِّنۡۢ بَاقِیَۃٍ ﴿۸﴾

❖ ❖ ❖

ترجمہ

رحمن و رحیم خدا کے نام سے

۱ وہ دن جو یقیناً واقع ہو گا۔

۲ اور یہ واقع ہونے والا دن کیا ہے؟

(۳) اور تجھے کیا معلوم کہ وہ واقع ہونے والا دن کیا ہے ؟

(۴) قوم ثمود و عاد نے خدا کے سرکوبی کرنے والے عذاب کا انکار کیا۔

(۵) تو قوم ثمود تو سرکش عذاب سے ہلاک ہوئی۔

(۶) اور قوم عاد طغیانی کرنے والی ٹھنڈی اور زور دار اور تیز آندھی سے ہلاک ہوئی۔

(۷) خدا نے بنیادوں کو اکھاڑنے والی اس تیز آندھی کو سات راتیں اور آٹھ دنوں تک پے در پے ان پر مسلط رکھا (اور اگر تو وہاں ہوتا) تو دیکھتا کہ وہ قوم بوسیدہ تنوں اور کھجور کے کھوکھلے درختوں کی مانند اس تیز آندھی کے درمیان زمین پر پڑی ہے اور ہلاک ہو گئی ہے۔

(۸) کیا ان میں سے تو کسی کو باقی دیکھتا ہے۔

❖ ❖ ❖

تفسیر

سرکشی کرنے والی قوم کے لیے سرکش عذاب

یہ سورۃ مسئلہ قیامت سے اور وہ بھی ایک نئے عنوان کے ساتھ شروع ہوتا ہے، فرماتا ہے :

"وہ تحقق پانے والا دن" (الحاقة)۔

❖ ❖ ❖

"وہ تحقق پانے والا دن کیا ہے۔" (ما الحاقة)۔[1]

❖ ❖ ❖

"اور تجھے کیا معلوم کہ وہ تحقق پانے والا دن کیا ہے ؟" (وما ادرٰك ما الحاقة)۔

تقریباً تمام مفسرین نے "حاقة" کی قیامت کے دن کے معنی میں تفسیر کی ہے۔ کیونکہ وہ ایک ایسا دن ہے جو قطعی اور یقینی طور پر واقع ہو گا، جیسا کہ سورہ "واقعہ" میں "الواقعۃ" کی تعبیر ہے۔ یہی تعبیر اسی سورہ کی آیت ۱۶ میں بھی آئی ہے اور یہ سب اس عظیم دن کے یقینی ہونے کی حکایت بیان کرتی ہیں۔

---

[1] اس جملہ کی ترکیب میں کئی احتمال دیئے گئے ہیں جن میں سب سے زیادہ مناسب یہ ہے کہ یہ کہا جائے۔ "الحاقۃ" مبتداء ہے (باقی اگلے صفحہ پر)

"ما الحاقۃ" کی تعبیر، اس دن کی عظمت کے بیان کے لیے ہے، ٹھیک اسی طرح جیسا کہ ہم روزمرہ کی تعبیروں میں کہتے ہیں: فلاں شخص انسان ہے، کیا ہی انسان ہے؟ یعنی اس کی انسانیت کی تعریف و توصیف کے لیے کوئی حد نہیں ہے۔ (یعنی بہت اچھا انسان ہے)

❊ ❊ ❊

"ما ادراک ما الحاقۃ" کی تعبیر دوبارہ اس عظیم دن کے حوادث کی عظمت پر مزید تاکید ہے۔ یہاں تک کہ پیغمبرؐ سے خطاب ہوتا ہے کہ تو نہیں جانتا وہ دن کس قسم کا ہے؟ اور حقیقت بھی یہی ہے کہ قیامت کے حقائق کو درک کرنا ہم دنیاوی زنداں کے قیدیوں کے لیے امکان پذیر نہیں ہے، جیسا کہ دنیا سے مربوط مسائل کا درک کرنا شکم مادر کے جنین کے لیے کسی بھی بیان سے میسر نہیں ہے۔[1]

ایک اور احتمال جو ان آیات کی تفسیر میں ہے، اگرچہ بہت کم مفسرین نے اسے قبول کیا ہے یہ ہے کہ "الحاقۃ" ان عذابوں کی طرف اشارہ ہے جو سرکش، طاغی، خودخواہ و خودپسند مجرموں کو اچانک اور ناگہانی طور پر اس دنیا میں دامن گیر ہو جاتے ہیں جیسا کہ بعد والی آیت میں "القارعۃ" بعض مفسرین کے کلام میں اسی معنی میں استعمال ہوا ہے۔ اتفاق کی بات یہ ہے کہ یہی تفسیر آئندہ والی آیات کے ساتھ جو قوم عاد، قوم ثمود، قوم فرعون اور قوم لوط کی سرکوبی کرنے والے عذابوں کے بارے میں گفتگو کر رہی ہیں، زیادہ مناسب نظر آتی ہیں۔

تفسیر علی بن ابراہیم میں بھی آیا ہے۔ "الحاقۃ، الحذر بنزول العذاب"۔ جیسا کہ (سورۂ مؤمن کی آیت ۴۵ میں) آل فرعون کے بارے میں فرماتا ہے: وحاق بآل فرعون سوء العذاب۔ بُرا عذاب آل فرعون پر نازل ہوا (اور اس نے انھیں گھیر لیا)۔[2]

❊ ❊ ❊

اس کے بعد ان قوموں کی سرنوشت کو بیان کرتا ہے جنھوں نے قیامت کے دن (یا دنیا میں عذاب الٰہی کے نزول) کا انکار کیا۔ لہٰذا مزید کہتا ہے: "قوم عاد و ثمود نے خدا کے سرکوبی کرنے والے عذاب کا انکار کیا"۔ (کذبت ثمود و عاد بالقارعۃ)۔

❊ ❊ ❊

(بقیہ صفحہ سابقہ) اور ما استفہامیہ دوسرا مبتدا ہے۔ اس کے بعد والا "الحاقۃ" خبر ہے دوسرے مبتدا کی اور ان کا مجموعہ خبر ہے پہلے مبتدا کی۔

[1] بعض مفسرین کا کہنا ہے کہ "ما ادراک" کا جملہ قرآن میں اس جگہ کہا گیا ہے جہاں مطلب معلوم اور مسلّم ہے۔ لیکن "وما یدریک" ان موارد میں آیا ہے جہاں مطلب نامعلوم ہے۔ (مجمع البیان جلد ۱۰ ص ۳۴۲) بعض دوسرے مفسرین مثلاً قرطبی نے بھی اسی معنی کو نقل کیا ہے۔

[2] تفسیر علی بن ابراہیم جلد ۲ ص ۳۸۳۔

(توجہ رکھیں کہ "حاقۃ" اور "حاق" کا مادہ ایک ہی ہے۔)

"پس قوم ثمود تو سرکش عذاب کے ذریعہ ہلاک ہوئی" (فاما ثمود فاھلکوا بالطاغیۃ)۔

ثمود وہ قوم تھی جو حجاز وشام کے درمیان کوہستانی علاقہ میں آباد تھی۔ حضرت صالحؑ ان کی طرف مبعوث ہوئے لیکن وہ ہرگز ایمان نہ لائے اور ان سے مبارزہ کے لیے تیار ہو گئے۔ یہاں تک کہ انھوں نے حضرت صالحؑ سے کہا کہ اگر تو سچ کہتا ہے تو وہ عذاب جس کا تو ہمیں وعدہ دیتا ہے اسے نازل کر دے۔ اس وقت ایک تباہ کرنے والی بجلی ان پر مسلط ہوگئی جس نے چند لمحوں کے اندر ان کے مضبوط گھروں اور مستحکم محلوں میں لرزہ پیدا کر دیا۔ ان سب کو تہس نہس کر دیا اور ان کے بے جان جسم زمین پر پڑے رہ گئے۔

قابل توجہ بات یہ ہے کہ قرآن اس نافرمان قوم کی نابودی کے عامل کو سرکش عذاب شمار کرتا ہے۔ "الطاغیۃ" اور یہ سرکش عذاب سورہ اعراف کی آیت ۷۸ میں "رجفۃ" (زلزلہ) کے عنوان سے ذکر ہوا۔ سورہ حٰم سجدہ کی آیت ۱۳ میں "صاعقۃ" اور سورہ ہود کی آیت ۶۷ میں "صیحۃ" کے نام سے مذکور ہے۔ یہ سب الفاظ حقیقت میں ایک ہی معنی کی طرف لوٹتے ہیں، کیونکہ صاعقہ (بجلی) ہمیشہ ایک مہیب آواز کے ساتھ ہوتی ہے (کڑکتی ہے)، جس جگہ آکر گرتی ہے اس میں لرزہ پیدا کر دیتی ہے اور وہ سرکش عذاب بھی ہے۔[1]

اس کے بعد قوم عاد کی سرنوشت بیان کرتا ہے: وہ قوم جو سرزمین احقاف (جزیرہ نمائے عرب یا یمن) میں آباد تھے۔ ان کے قد وقامت طویل، بدن قوی، شہر آباد، زمینیں سرسبز وشاداب اور ہرے بھرے باغات تھے۔ ان کے پیغمبر حضرت ہودؑ تھے۔ ان لوگوں نے بھی اپنے طغیان وسرکشی کو اس حد تک پہنچا دیا تھا کہ خدا نے ایسے دردناک عذاب کے ساتھ جس کی تشریح انھیں آیات میں آئی ہے، ان کی زندگی کے دفتر کو لپیٹ دیا۔ پہلے فرماتا ہے: "باقی رہی قوم عاد تو وہ ایک تیز سرکش، زناٹے دار، اونچی آواز والی سرد اور زہریلی آندھی کے ذریعہ ہلاک ہوگئی" (واما عاد فاھلکوا بریح صرصر عاتیۃ)۔

"صرصر" (بروزن دفتر) سرد یا زناٹے دار آواز والی یا زہریلی ہواؤں کو کہا جاتا ہے۔ مفسرین نے اس کی تفسیر میں یہ تینوں معانی ذکر کیے ہیں، اور ان کے درمیان جمع بھی ممکن ہے۔

"عاتیۃ" "عتو" (بروزن غلو) کے مادہ سے سرکش کے معنی میں ہے۔ البتہ فرمان خدا سے سرکش نہیں بلکہ معمولی اور سبک رفتار ہواؤں کے معیار سے سرکش۔

* * *

اس کے بعد اس تیز سرکوبی کرنے والی آندھی کی ایک دوسری توصیف کو بیان کرتے ہوئے مزید کہتا ہے: "خدا نے اس کو اس قوم پر مسلسل سات راتیں اور آٹھ دن ان کی بنیادیں اکھاڑنے کے لیے مسلط کیے رکھا": (سخرھا علیھم سبع لیال وثمانیۃ ایام حسوما)۔

---

[1] قوم ثمود کی سرگزشت تفسیر نمونہ کی جلد ۶ میں تفصیل کے ساتھ آئی ہے۔

"حُسوماً" "حسم" (بروزن اسم) کے مادہ سے کسی چیز کے آثار ختم کرنے کے معنی میں ہے۔ اگر تلوار کو حسام (بروزن غلام) کہا جاتا ہے تو وہ اسی مناسبت سے ہے۔ بعض اوقات زخم کی جڑ کو جلانے کے لیے اس پر داغ لگانے کو بھی حسم کہا جاتا ہے۔ یہاں مراد یہ ہے کہ سخت آندھی نے سات راتوں اور آٹھ دنوں میں اس عظیم قوم کی وسیع اور بارونق زندگی کو یکسر تباہ و برباد کیا، اور ان کو جڑ سے اکھاڑ کر پراگندہ کر دیا۔[1]

نتیجہ وہ ہوا کہ قرآن کہتا ہے: "اگر تو وہاں ہوتا تو مشاہدہ کرتا کہ وہ ساری کی ساری قوم منہ کے بل گری پڑی ہے۔" (فترى القوم فيها صرعى كانهم اعجاز نخل خاوية)۔

کتنی عمدہ تشبیہ ہے، جو ان کے طویل قد و قامت کو بھی مشخص کرتی ہے، ان کے جڑ سے اکھڑ جانے کو بھی ظاہر کرتی ہے اور خدا کے عذاب کے مقابلہ میں ان کے اندر سے خالی ہونے کو بھی بیان کرتی ہے۔ اس طرح کہ وہ تیز آندھی جدھر چاہتی ہے انھیں آسانی کے ساتھ لے جاتی ہے۔

"خاویة" "خواء" (بروزن ہوا) کے مادہ سے اصل میں خالی ہونے کے معنی میں ہے۔ یہ تعبیر بھوکے شکموں (زمانۂ جاہلیت کے عربوں کے عقیدے کے مطابق) بارش سے خالی ستاروں اور بے مغز اخروٹ کے لیے بھی استعمال ہوتی ہے۔

آخری آیت میں مزید کہتا ہے: "کیا تم ان میں سے کسی کو باقی دیکھتے ہو؟" (فهل ترى لهم من باقية)۔[2]

ہاں! آج نہ صرف قوم عاد کا کوئی نام و نشان باقی نہیں بلکہ ان کے آباد شہروں اور پُرشکوہ عمارتوں کے کھنڈرات اور ان کے سرسبز کھیتوں میں سے کوئی چیز باقی نہیں ہے۔

قوم عاد کی سرگزشت کے بارے میں ہم تفسیر نمونہ جلد ۹ (سورۂ ہود کی آیت ۵۸ تا ۶۰ اور اسی طرح جلد ۲۰ میں بھی تفصیل کے ساتھ بحث کر چکے ہیں۔)

* * *

---

[1] ترجمہ رہے کہ حسوما۔ سبع لیال وثمانیۃ ایام (سات راتیں اور آٹھ دن) کی صفت ہے اور بعض نے اسے یتع سے حال یا مفعول لہ سمجھا ہے۔

[2] باقیۃ ایک مقدر موصوف کی صفت ہے اور اصل میں "نفس باقیۃ" ہے۔

(۹) وَجَآءَ فِرْعَوْنُ وَ مَنْ قَبْلَهٗ وَ الْمُؤْتَفِكٰتُ بِالْخَاطِئَةِ ۚ

(۱۰) فَعَصَوْا رَسُوْلَ رَبِّهِمْ فَاَخَذَهُمْ اَخْذَةً رَّابِيَةً ۝

(۱۱) اِنَّا لَمَّا طَغَا الْمَآءُ حَمَلْنٰكُمْ فِي الْجَارِيَةِ ۝

(۱۲) لِنَجْعَلَهَا لَكُمْ تَذْكِرَةً وَّ تَعِيَهَاۤ اُذُنٌ وَّاعِيَةٌ ۝

❊ ❊ ❊

ترجمہ

(۹) اور فرعون اور وہ لوگ جو اس سے پہلے تھے اور تہ و بالا ہونے والے شہروں کے لوگ (قوم لوط) بہت بڑے گناہوں کے مرتکب ہوئے۔

(۱۰) انھوں نے اپنے پروردگار کے بھیجے ہوئے رسول کی مخالفت کی اور خدا نے بھی انھیں شدید عذاب میں گرفتار کیا۔

(۱۱) ہم نے اس وقت، جب پانی میں طغیانی آئی، تو تمھیں کشتی میں سوار کر دیا۔

(۱۲) تاکہ ہم اسے تمھارے لیے تو تذکّر کا وسیلہ قرار دیں اور سننے والے کان اسے یاد رکھتے ہیں۔

❊ ❊ ❊

تفسیر

سننے والے کان کہاں ہیں؟

قوم عاد و ثمود کی سرگزشت کے ایک گوشہ کو بیان کرنے کے بعد دوسری اقوام جیسے قوم نوح اور قوم لوط کی طرف

توجہ کرتا ہے تاکہ ان کی زندگی سے بیدار دل افراد کو ایک اور درس عبرت دے، فرماتا ہے : فرعون اور وہ لوگ جو اس سے پہلے تھے اور تہ و بالا ہونے والے شہروں کے لوگ (قوم لوط) بہت بڑے گناہوں کے مرتکب ہوئے۔" (وجاء فرعون ومن قبله والمؤتفكات بالخاطئة)۔

"خاطئة" خطا کے معنی میں ہے (دونوں مصدری معنی رکھتے ہیں۔) اور یہاں خطا سے مراد شرک و کفر، ظلم و فساد اور انواع و اقسام کے گناہ ہیں۔

"مؤتفكات"، "مؤتفكة" کی جمع ہے۔ "ائتفاك" کے مادہ سے الٹ پلٹ اور تہ و بالا ہونے کے معنی میں ہے اور یہاں قوم لوط کے شہروں کی طرف اشارہ ہے جو ایک شدید زلزلے کی وجہ سے تہ و بالا ہو گئے۔

"من قبله" سے مراد وہ قومیں ہیں جو فرعون سے پہلے تھیں۔ مثلاً قوم شعیب اور قوم نمرود جیسے سرکش لوگ۔

* * *

اس کے بعد مزید کہتا ہے : "وہ اپنے پروردگار کے بھیجے ہوئے رسول کی مخالفت کے لیے کھڑے ہو گئے اور خدا نے انھیں شدید عذاب میں گرفتار کر لیا۔" (فعصوا رسول ربهم فاخذهم اخذة رابية)۔

فرعونی، موسیٰ اور ہارون کی مخالفت کے لیے کھڑے ہو گئے۔ سدوم کے شہروں میں رہنے والوں نے لوط ؑ کی مخالفت کی اور دوسری اقوام نے بھی اپنے پیغمبروں کے فرمان سے روگردانی کی۔ ان سرکشوں میں سے ہر گروہ ایک خاص قسم کے عذاب میں گرفتار ہوا۔ فرعونی نیل کی موجوں میں، جو ان کی حیات و آبادی اور ملک کی برکت کا سبب تھا، غرق ہو گئے، اور قوم لوطؑ کے لوگ شدید زلزلہ اور اس کے بعد پتھروں کی بارش سے تباہ و برباد اور نابود ہو گئے۔

"رابية" اور "ربا" ایک ہی مادہ سے ہیں اور آزمائش اور اضافہ کے معنی میں ہیں۔ یہاں وہ عذاب مراد ہے، جو بہت ہی سخت اور شدید تھا۔

قوم فرعون کی داستان کی تفصیل قرآن کی بہت سی سورتوں میں آئی ہے۔ سب سے زیادہ تفصیل تفسیر نمونہ جلد ۱۵ سورہ شعراء کی آیت (۱۰ تا ۶۸) میں، تفسیر نمونہ جلد ۶ (سورہ اعراف آیت ۱۰۳ تا ۱۳۷) میں اور تفسیر نمونہ جلد ۱۳ (سورہ طٰہٰ آیت ۲۴ سے ۷۹) میں آئی ہے۔

قوم لوطؑ کی داستان بھی قرآن کی بہت سی سورتوں میں ہے، چنانچہ تفسیر نمونہ جلد ۱۱ (سورہ حجر آیت ۶۱ تا ۷۷) اور تفسیر نمونہ جلد ۹ (سورہ ہود آیت ۷۷ تا ۸۳) میں آیا ہے۔

آخر میں قوم نوح کی سرنوشت اور ان کے دردناک عذاب کی طرف ایک ہلکا سا اشارہ کرتے ہوئے کہتا ہے : "ہم نے اس وقت جب پانی میں طغیانی آئی تو تمھیں کشتی میں سوار کر دیا۔" (انا لما طغا الماء حملناكم في الجارية)۔

پانی کی طغیانی اِس طرح تھی کہ تیرہ و تاریک بادلوں نے آسمان کو ڈھانپ لیا تھا۔ اس کے ساتھ ایسی بارش ہوئی کہ گویا آسمان کی طرف سے سیلاب گر رہا ہے اور زمین سے بھی چشمے اُبلنے لگے۔ پھر یہ دونوں طرف کے پانی ایک دُوسرے کے ساتھ مل گئے اور ہر چیز پانی میں ڈوب گئی۔ پس باغات، کھیتیاں اور سرکش قوم کے محلّات اور مکانات سب غرقاب ہو گئے۔ جن لوگوں نے نجات پائی ان میں صرف وہ مومنین تھے جو نوح کے ہمراہ کشتی میں سوار ہو گئے تھے۔

"حملناکم" (تمھیں کشتی میں سوار کیا) کی تعبیر ہمارے اسلاف اور بڑوں سے کنایہ ہے، کیونکہ اگر انھوں نے نجات حاصل نہ کی ہوتی تو آج ہم موجود نہ ہوتے۔[1]

* * *

اس کے بعد ان سزاؤں کے ہدف اصلی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مزید کہتا ہے: "مقصد یہ تھا کہ اسے تمھاری یاد آوری اور تذکر کے لیے وسیلہ قرار دیں" (لنجعلها لکم تذکرة)۔

"اور سننے والے کان اس کی حفاظت کریں" (وتعیها اذن واعیة)۔

ہم ہرگز ان سے انتقام لینا نہیں چاہتے تھے، بلکہ ہدف انسانوں کی تربیت اور راہِ کمال میں ان کی ہدایت، راستہ دکھانا اور مطلوب تک پہنچانا تھا۔

"تعیها"، 'وعی' (بروزنِ سعی) کے مادہ سے ہے جس طرح 'راغب' نے 'مفردات' میں اور 'ابن منظور' نے 'لسان العرب' میں کہا ہے۔ اصل میں کسی چیز کو دل میں محفوظ رکھنے کے معنی میں ہے۔ اس کے بعد ہر برتن کو 'وعاء' کہا گیا، کیونکہ وہ اپنے اندر کسی چیز کو محفوظ رکھتا ہے۔

زیرِ بحث آیت میں یہ صفت کانوں کے لیے بیان ہوئی ہے۔ وہ کان جو حقائق کو سنتے ہیں اور اپنے اندر محفوظ رکھتے ہیں۔

یا دوسرے لفظوں میں بعض اوقات انسان ایک بات کو سنتا ہے اور فوراً اُسے کان سے باہر نکال دیتا ہے، جیسا کہ عام لوگوں کی تعبیروں میں کہا جاتا ہے: "ایک کان سے سُنی اور دوسرے کان سے نکال دی"۔ لیکن بعض اوقات وہ اس بات میں غور و فکر کرتا ہے، اسے اپنے دل میں جگہ دیتا ہے اور اس کو اپنی زندگی کی راہ کا چراغ شمار کرتا ہے۔ یہی وہ چیز ہے جسے 'وعی' سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

* * *

---

[1] اس طرح بعض نے یہ کہا ہے کہ آیت میں ایک محذوف ہے اور تقدیر میں حملنا آبائکم تھا۔

چند نکات

۱: علیؑ کے فضائل میں سے ایک اور فضیلت

بہت سی مشہور اسلامی کتابوں میں، چاہے وہ تفسیر کی ہوں یا حدیث کی، یہ آیا ہے کہ پیغمبر گرامیؐ نے اوپر والی آیہ (وتعیھا اذن واعیۃ) کے نزول کے وقت فرمایا:

"سألت ربی ان یجعلھا اذن علیؑ"

"میں نے خدا سے سوال کیا ہے کہ علیؑ کے کان کو ان سننے والے حقائق کو محفوظ رکھنے والے کانوں میں سے قرار دے۔"

اس کے بعد امام علیؑ فرماتے تھے:

"ما سمعت من رسول اللہؐ شیئًا قط فنسیتہ الا وحفظتہ"

"میں نے رسولِ خداؐ سے کوئی چیز نہیں سنی جسے بھول گیا ہوں، بلکہ وہ ہمیشہ میرے حافظہ میں رہی ہے۔"[1]

"غایۃ المرام" میں اس سلسلہ میں سولہ احادیث شیعہ اور اہلِ سنّت کے طرق سے نقل ہوئی ہیں، اور محدث بحرانی نے تفسیر 'البرہان' میں محمد بن عباس سے نقل کیا ہے کہ اس سلسلہ میں تیس احادیث عامہ اور خاصہ کے طرق سے نقل ہوئی ہیں۔

ہاں! یہ اسلام کے عظیم پیشوا اور امام علیؑ کی ایک عظیم فضیلت ہے کہ وہ اسرارِ پیغمبرؐ کے خزینہ اور رسولِ خداؐ کے تمام علوم کے وارث ہیں۔ اسی بناء پر آنحضرتؐ کے بعد ان مشکلات میں جو اسلامی معاشرے کو پیش آتی تھیں، موافق و مخالف سبھی لوگ آپ کی پناہ لیتے، اور آپ سے ہی مشکل کا حل چاہتے تھے۔ یہ واقعات کتبِ تواریخ میں تفصیل کے ساتھ آئے ہیں۔

❖ ❖ ❖

۲: گناہ اور سزا میں تناسب

جو تعبیریں اوپر والی آیات میں آئی ہیں قابلِ توجہ ہیں۔ قومِ ثمود کے عذاب کے بارے میں "طاغیۃ"، قومِ عاد

---

[1] تفسیر قرطبی جلد ۱۰ ص ۶۷۴۳۔ مجمع البیان، روح البیان، روح المعانی، ابو الفتوح رازی، المیزان میں زیرِ بحث آیات کے ذیل میں، نیز یہ حدیث "مناقب ابن مغازلی شافعی" ص ۲۶۵ (طبع اسلامیہ) میں بھی آئی ہے۔

کے بارے میں "عاتیۃ" قوم فرعون اور قوم لوط کے بارے میں دابیۃ اور قوم نوح کے بارے میں "طغا الماء" کی تعبیر لاتا ہے، ان سب میں طغیان اور سرکشی کا مفہوم پوشیدہ ہے۔ اس طرح سے اس سرکشی کرنے والی قوم کے عذاب میں زندگی کی بعض نعمتوں کے سرکش ہونے کو شمار کیا گیا ہے، چاہے وہ پانی، ہوا یا مٹی اور آگ ہو۔

یہ تعبیریں اس حقیقت پر ایک تاکید ہیں کہ دنیا و آخرت کے عذاب خود ہمارے اعمال ہی کا تجسم ہیں اور یہ خود انسانوں کا کردار ہی ہے جو انھیں کی طرف لوٹایا جائے گا۔

* * *

(۱۳) فَاِذَا نُفِخَ فِی الصُّوْرِ نَفْخَةٌ وَّاحِدَةٌ ۙ
(۱۴) وَّحُمِلَتِ الْاَرْضُ وَالْجِبَالُ فَدُكَّتَا دَكَّةً وَّاحِدَةً ۙ
(۱۵) فَیَوْمَىِٕذٍ وَّقَعَتِ الْوَاقِعَةُ ۙ
(۱۶) وَانْشَقَّتِ السَّمَآءُ فَهِیَ یَوْمَىِٕذٍ وَّاهِیَةٌ ۙ
(۱۷) وَّالْمَلَكُ عَلٰۤی اَرْجَآىِٕهَا ؕ وَیَحْمِلُ عَرْشَ رَبِّكَ فَوْقَهُمْ یَوْمَىِٕذٍ ثَمٰنِیَةٌ ؕ

* * *

ترجمہ

(۱۳) جونہی کہ ایک مرتبہ صور میں پھونکا جائے گا۔
(۱۴) اور زمین اور پہاڑ اپنی جگہ سے اُٹھا لیے جائیں گے، اور وہ یکایک ٹکرا کر پارہ پارہ ہو جائیں گے۔
(۱۵) اس دن (یہ عظیم واقعہ) واقع ہوگا۔
(۱۶) آسمان پھٹ جائیں گے اور کمزور ہو کر گر پڑیں گے۔
(۱۷) فرشتے آسمانوں کی طرفوں اور کناروں پہ ہوں گے۔ (اور مامور سینوں کی انجام دہی کے لیے تیار ہوں گے) اور اس دن تیرے پروردگار کے عرش کو آٹھ فرشتے اپنے اوپر اٹھائیں گے۔

* * *

تفسیر

وہ دن جس میں وہ عظیم واقعہ رونما ہوگا۔

اس سورۃ کی ابتدائی آیات کو جاری رکھتے ہوئے جو معاد اور قیامت کے مسئلہ کو بیان کرتی تھیں۔ زیر بحث آیات اس عظیم قیامت کے حوادث کے مباحث کو پیش کرتی ہیں۔ ایسی ہلا دینے والی اور بیدار کرنے والی تعبیروں کے ساتھ جو انسان کو ان وقائع کی عظمت سے آشنا کرتی ہیں جو اسے درپیش ہوں گے۔

پہلے فرماتا ہے: "جب ایک دفعہ صور میں پھونکا جائے گا" (فاذا نفخ فی الصور نفخة واحدة)۔

جیسا کہ ہم نے پہلے بھی اشارہ کیا ہے، قرآن مجید سے معلوم ہوتا ہے کہ اس جہان کے اختتام اور دوسرے جہان کے آغاز میں، ناگہاں اور اچانک ایک عظیم صدا پیدا ہوگی۔ جسے نفخۂ صور (ناقوس میں پھونکنے سے) تعبیر کیا گیا ہے۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ گزشتہ زمانہ میں اور آج بھی لشکر کو اکٹھا اور تیار کرنے کے لیے یا اُسے آرام گاہ یا چھاؤنی کی طرف بھیجنے کے لیے بگل سے فائدہ اُٹھایا جاتا ہے۔ جب آرام کرنے اور سونے کا بگل بجایا جاتا ہے تو سب سپاہی آرامگاہ میں چلے جاتے ہیں اور جب جمع کرنے اور تیاری کرنے کے لیے بجایا جاتا ہے تو تمام سپاہی اپنی جگہ سے چل پڑتے ہیں اور اپنی صفوں کو منظم کرتے ہیں۔ گویا خدا یہ کہنا چاہتا ہے کہ اس جہان کے ختم کرنے اور دوسرے جہان کے آغاز کا مسئلہ میری قدرت کے مقابلہ میں ایک بگل میں پھونکنے جتنا آسان ہے۔ ایک ہی فرمان سے ایک لمحہ کے اندر اندر تمام اہلِ آسمان اور سب اہلِ زمین مرجائیں گے۔ پھر ایک دوسرے فرمان کے ساتھ سب کے سب زندہ ہو جائیں گے اور حساب کے لیے تیار ہو جائیں گے۔

"صُور" کی خصوصیات اور اس میں "نفخ" کی کیفیت، پھونکنے کی مقدار اور ان کے درمیان فاصلہ کے بارے میں بہت سے مطالب ہیں۔ وہ ہم نے تفسیر نمونہ جلد ۱۹ سورہ زمر کی آیت ۶۸ کی تفسیر میں بیان کر دیئے ہیں۔ یہاں ان کے تکرار کی ضرورت نہیں ہے۔

ایک چیز کا ذکر کرنا ضروری ہے کہ نفخۂ صور، جیسا کہ اوپر بھی اشارہ ہوا ہے دو نفخے ہیں، "موت کا نفخہ" اور "حیاتِ جدید کا نفخہ"۔ اِس بارے میں کہ زیر بحث آیت میں جو نفخہ آیا ہے پہلا نفخہ ہے یا دوسرا، مفسرین کا اس سلسلہ میں کوئی ایک نظریہ نہیں ہے کیونکہ جو آیات بعد میں آئی ہیں ان میں سے بعض موت کے نفخہ سے اور بعض حیات و معاد اور قبروں کے اُٹھنے کے نفخہ سے مناسبت رکھتی ہیں، لیکن مجموعی طور پر یہ آیات پہلے نفخہ کے ساتھ زیادہ مناسبت رکھتی ہیں اور وہ اختتامِ جہاں کا نفخہ ہے۔

❖ ❖ ❖

اس کے بعد مزید کہتا ہے: "اور جب زمین اور پہاڑ اپنی جگہ سے اٹھا لیے جائیں گے اور ایک ہی ضرب

کے ساتھ درہم برہم اور ریزہ ریزہ ہو جائیں گے۔" (وحملت الارض والجبال فدکتا دکة واحدة)۔

"دک" جیسا کہ راغب، مفردات میں کہتا ہے: اصل میں صاف اور نرم زمین کے معنی میں ہے چونکہ ایک ناہموار زمین کو صاف کرنے کے لیے اسے کوٹنا پیٹنا پڑتا ہے۔ لہٰذا بہت سے موارد میں یہ لفظ شدت سے کوٹنے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔

لیکن بعض منابع لغت سے معلوم ہوتا ہے کہ "دک" کا اصل معنی کوٹنا اور ویران کرنا ہے۔ چونکہ کوٹنے اور ویران کرنے کا لازمہ صاف اور ہموار کرنا ہے لہٰذا یہ لفظ اس معنیٰ میں بھی استعمال ہوتا ہے۔[1]

بہرحال زیرِبحث آیت میں یہ لفظ پہاڑوں اور ناہموار زمینوں کے ایک دوسرے سے ٹکرانے اور کوٹے جانے کے معنی میں ہے، اِس طرح کہ ایک ہی دفعہ میں ریزہ ریزہ ہو کر ہموار ہو جائیں۔

❊ ❊ ❊

اس کے بعد مزید کہتا ہے: "اس دن جہان میں واقعۂ عظیم رُونما ہوگا اور قیامت برپا ہوگی۔" (فیومئذ وقعت الواقعة)۔

❊ ❊ ❊

نہ صرف زمین اور پہاڑ بکھر کر پراگندہ ہو جائیں گے بلکہ "آسمانوں اور زمینوں میں بھی شگاف پڑ جائیں گے اور وہ کمزور اور غیرمحکم ہو جائیں گے۔" (وانشقت السماء فھی یومئذ واھیة)۔

عظیم آسمانی کرّے بھی اس ہولناک اور وحشتناک حادثہ سے بچ کر نہیں رہ سکتے، وہ بھی شگافتہ اور پراگندہ ہو کر بکھر جائیں گے اور اپنی مضبوطی اور استحکام کے باوجود وہ اس قدر کمزور ہو جائیں گے کہ سورہ الرحمٰن کی آیت ۳۷ میں قرآن کے قول کے مطابق، "آسمان پھٹ کر پگھلے ہوئے روغن کی طرح سُرخ ہو جائیں گے۔" فاذا انشقت السماء فکانت وردة کالدھان۔"

یا دوسرے لفظوں میں موجودہ زمین و آسمان ویران ہو جائیں گے اور ان کے ویرانوں اور کھنڈرات پر ایک نیا جہان برپا ہوگا جو موجودہ جہاں سے برتر، بالاتر اور کامل تر ہوگا۔

❊ ❊ ❊

"اور فرشتے آسمانوں کی طرفوں اور کناروں پر ہوں گے۔" (والملک علیٰ ارجائھا)۔

"ارجاء" "رجا" کی جمع ہے جو کسی چیز کے اطراف وجوانب کے معنی میں ہے۔ "ملک" اگرچہ یہاں صیغۂ مفرد میں آیا ہے۔ لیکن اِس سے مراد جنس و جمع ہے۔

گویا فرشتے اس دن مامورین کی طرح، جو کسی میدان کے اطراف میں کھڑے ہوں اور کام انجام دینے کے لیے

---

[1] اقرب الموارد، مادہ "دک"

فرمان کے منتظر ہوں، آسمان کے گرداگرد صف باندھے ہوئے ہوں گے اور حق تعالےٰ کے فرمان کے منتظر ہوں گے۔

❊ ❊ ❊

اس کے بعد فرماتا ہے: "اور اس دن آٹھ فرشتے اپنے پروردگار کا عرش اٹھائے ہوئے ہوں گے۔" (ویحمل عرش ربك فوقهم یومئذ ثمانیة)۔

یہ حاملین عرش اگرچہ صراحت کے ساتھ اس آیت میں معین نہیں ہوئے ہیں کہ وہ فرشتوں میں سے ہوں گے یا ان کے علاوہ کوئی اور ہوں گے لیکن پوری آیت کی تعبیریں اس بات کی نشاندہی کرتی ہیں کہ وہ فرشتوں میں سے ہوں گے۔ لیکن یہ مشخص نہیں ہے کہ وہ آٹھ فرشتے ہوں گے یا وہ فرشتوں کے آٹھ چھوٹے یا بڑے گروہ ہوں گے۔

البتہ اسلامی روایات میں آیا ہے کہ اس وقت بھی حاملینِ عرش چار نفر ہیں۔ لیکن قیامت میں وہ دوگنے ہو جائیں گے۔ جیسا کہ پیغمبر گرامیؐ سے ایک حدیث میں آیا ہے:

"انهم الیوم اربعة فاذا کان یوم القیامة ایدهم باربعة اخرین، فیکونون ثمانیة"۔

"وہ اس وقت چار افراد ہیں اور قیامت کے دن دوسرے چار افراد سے ان کو تقویت دے گا اور وہ آٹھ ہو جائیں گے۔" [1]

لیکن عرش کیا ہے؟ اور یہ فرشتے کون ہیں؟ مسلّمہ طور پر عرش سے مراد ایک جسمانی تختِ سلطنت نہیں ہے۔ بلکہ جیسا کہ ہم نے پہلے بھی لفظ عرش کی تفسیر میں بیان کیا ہے وہ جہانِ ہستی کے مجموعہ کے معنی میں ہے جو خدا کی حکومت کا عرش ہے۔ پس ان فرشتوں کے ذریعہ، جو خدا کے حکم و فرمان کو جاری کرتے ہیں، اس کا ارادہ و تدبیر کی جاتی ہے۔

قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ ایک روایت میں آیا ہے قیامت میں عرش خدا کے اٹھانے والے چار افراد اوّلین میں سے اور چار آخرین میں سے ہوں گے۔ اوّلین میں سے تو نوحؑ، ابراہیمؑ، موسیٰؑ و عیسیٰؑ ہوں گے اور آخرین میں سے محمدؐ، علیؑ، حسنؑ اور حسینؑ ہوں گے۔ [2]

یہ تعبیر ممکن ہے ان حضرات کے اوّلین و آخرین میں مقامِ شفاعت کی طرف اشارہ ہو۔ لیکن یہ شفاعت ایسے افراد کے بارے میں ہوگی جو شفاعت کے لائق ہوں گے۔ بہرحال یہ تعبیر 'عرش' کے مفہوم کی وسعت کو بتاتی ہے۔

البتہ اگر عرش کے اٹھانے والے آٹھ گروہ ہوں تو پھر ممکن ہے کہ کچھ گروہ تو فرشتوں کے ہوں اور کچھ گروہ انبیاء اور اولیاء کے ہوں کہ جو اس اہم مقام کے عہدہ دار ہوں گے۔ گویا اس طرح اس دن کے نظام کی تدبیر کے ایک حصّہ کو تو فرشتے چلا رہے ہوں گے اور ایک حصّہ کے عہدہ دار انبیاء و اولیاء ہوں گے۔ لیکن یہ سب حکمِ خدا کے ساتھ ہوگا۔

---

[1] تفسیر علی بن ابراہیم جلد ۲ ص ۴۸۳

[2] مجمع البیان جلد ۱۰ ص ۴۴۶

اس بارے میں کہ فوقھم (ان کے اوپر) میں ھم کی ضمیر انسانوں کی طرف لوٹتی ہے یا فرشتوں کی طرف، کئی احتمال دیئے گئے ہیں. چونکہ اس سے قبل کے جملہ میں گفتگو فرشتوں کے بارے میں ہے لہٰذا ظاہر یہ ہے کہ یہ ضمیر انھیں کی طرف لوٹتی ہے. اس طرح سے فرشتے سارے جہان کو ہر طرف سے گھیر لیں گے. اور (مقام کے لحاظ سے) ان کے اوپر آٹھ فرشتے خدا کے عرش کو اٹھانے والے ہوں گے.

یہ احتمال بھی ہے کہ خدا کے عرش کو اٹھانے والے ایسے افراد ہیں جو فرشتوں سے برتر و بالاتر ہیں۔ اس صورت میں یہ بیان گذشتہ حدیث جو خدا کے عرش کو اٹھانے والے انبیاء و اولیاء میں سے آٹھ افراد کو شمار کرتی ہے کے مطابق ہو گا.

اس میں شک نہیں کہ اس دن عرش کو اٹھانے والوں کا تو کہنا ہی کیا قیامت سے مربوط حوادث بھی اس قسم کی چیز نہیں ہیں جو ہم اس محدود و تاریک جہان کے رہنے والوں کے لیے دقیق طور پر واضح و روشن ہوں، جو کچھ ہم کہتے ہیں وہ ایک شبح (سایہ یا ہیولا سا) ہے جسے ہم آیاتِ الٰہی کے سائے میں بہت دور سے دیکھتے ہیں، ورنہ ان کی حقیقت تو ہمیں وہاں جانے کے بعد ہی نظر آئے گی.[1]

اس نکتہ کی یاد دہانی بھی ضروری ہے کہ پہلے "نفخۂ صور" میں آسمانوں اور زمین کے تمام ذی روح مر جائیں گے۔ اس بناء پر عرش کے اٹھانے والوں کے بارے میں جو بحث ہے وہ نفخۂ دوم کے ساتھ مربوط ہے جس میں سب زندہ ہو جائیں گے، اگرچہ آیت میں دوسرے نفخہ کے بارے میں گفتگو نہیں ہے. لیکن قرائن سے واضح ہوتا ہے کہ جن مطالب کو ہم بعد والی آیات میں پڑھتے ہیں وہ بھی اسی نفخۂ دوم کے ساتھ ہی مربوط ہیں۔[2]

* * *

---

[1] 'نعت' اور 'قرآن مجید' کے لحاظ سے عرش کے معانی کے بارے میں ہم نے تفسیر نمونہ میں کئی مرتبہ بحث کی ہے. منجملہ ان کے جلد ۶ سورۂ اعراف آیت ۵۴ کے ذیل میں گفتگو کی گئی ہے۔

[2] حقیقت میں آیت میں ایک محذوف ہے اور تقدیر میں اس طرح ہے "ثم نفخ فیہ اخری" (پھر اس میں دوبارہ پھونکا جائے گا)

(۱۸) يَوْمَئِذٍ تُعْرَضُونَ لَا تَخْفَىٰ مِنكُمْ خَافِيَةٌ ۝

(۱۹) فَأَمَّا مَنْ أُوتِيَ كِتَابَهُ بِيَمِينِهِ فَيَقُولُ هَاؤُمُ اقْرَءُوا كِتَابِيَهْ ۝

(۲۰) إِنِّي ظَنَنتُ أَنِّي مُلَاقٍ حِسَابِيَهْ ۝

(۲۱) فَهُوَ فِي عِيشَةٍ رَّاضِيَةٍ ۝

(۲۲) فِي جَنَّةٍ عَالِيَةٍ ۝

(۲۳) قُطُوفُهَا دَانِيَةٌ ۝

(۲۴) كُلُوا وَاشْرَبُوا هَنِيئًا بِمَا أَسْلَفْتُمْ فِي الْأَيَّامِ الْخَالِيَةِ ۝

* * *

ترجمہ

(۱۸) اس دن تم سب کے سب بارگاہِ خداوندی میں پیش کیے جاؤ گے اور تمھارے کاموں میں سے کوئی چیز مخفی نہیں رہے گی۔

(۱۹) لیکن وہ شخص جس کا نامۂ اعمال اس کے دائیں ہاتھ میں ہوگا، (وہ فرطِ مسرت اور فخر کے ساتھ) پکار اُٹھے گا کہ (اے اہلِ محشر) لو میرا نامۂ اعمال پڑھو۔

(۲۰) مجھے یقین تھا کہ (قیامت آکے رہے گی اور) میرے اعمال کا حساب ہوگا۔

(۲۱) وہ ایک کامل پسندیدہ زندگی میں قرار پائے گا۔

(۲۲) ایک عالی جنّت

(۲۳) جس کے پھل دسترس میں ہوں گے۔

(۲۴) (اور ان سے کہا جائے گا) مزے مزے سے کھاؤ اور پیو، یہ ان اعمال کا بدلہ ہے جنھیں تم نے گذشتہ ایّام میں انجام دیا تھا۔

❊ ❊ ❊

تفسیر

اے اہل محشر میرا نامۂ اعمال پڑھو

گذشتہ آیات کی تفسیر میں بیان کیا جا چکا ہے کہ "نفخِ صور" دو مرتبہ رُونما ہوگا۔ پہلی دفعہ سب ذی رُوح مرجائیں گے اور نظامِ زندگی بکھر کر رہ جائے گا۔ دوسری مرتبہ ایک نیا جہان اور ایک نیا عالم برپا ہوگا، انسان اور فرشتے ایک نئی زندگی حاصل کریں گے، جیسا کہ ہم نے بیان کیا ہے ان آیات کا آغاز تو پہلے نفخہ کی اور ان کا آخر دوسرے نفخہ کی خبر دیتا ہے۔

اسی مطلب کو جاری رکھتے ہوئے زیرِبحث آیات میں فرماتا ہے: "اس دن تم سب کے سب بارگاہِ خداوندی میں پیش کیے جاؤ گے اور تمھارے اعمال میں سے کوئی چیز پوشیدہ نہیں رہے گی" (یومئذ تعرضون لا تخفٰی منکم خافیۃ)۔

تعرضون، عرض کے مادّہ سے کسی چیز کو دکھانے اور پیش کرنے کے معنی میں ہے۔ چاہے معاملہ کے وقت مال اور جنس ہو یا اس کے علاوہ کوئی اور چیز ہو۔ البتہ انسان اور ان کے علاوہ جو کچھ بھی ہے اس دنیا میں بھی ہمیشہ اس کے سامنے ہیں۔ لیکن یہ بات قیامت میں زیادہ سے زیادہ نمایاں اور ظاہر ہوگی جیسا کہ خدا کی حاکمیت عالمِ ہستی پر دائمی ہے لیکن یہ حاکمیت اس دن ہر زمانہ اور وقت سے زیادہ واضح اور آشکار ہوگی۔

"لا تخفٰی منکم خافیۃ" کا جملہ ممکن ہے اس بات کی طرف اشارہ ہو کہ اس دن غیب اور لوگوں کے اسرار، شہود و ظہور میں بدل جائیں گے، جیسا کہ قرآن قیامت کے بارے میں کہتا ہے: یوم تبلی السرائر: وہ ایسا دن ہوگا جس میں سارے پوشیدہ صفات ظاہر ہو جائیں گے۔ (طارق۔ ۹)

نہ صرف انسانوں کے مخفی اعمال، بلکہ ان کے صفات، جذبات، اخلاق اور نیتیں، سب کھل کر سامنے آجائیں گی۔

یہ ایک عظیم حادثہ ہے اور بعض مفسرین کے مطابق پہاڑوں کے ریزہ ریزہ ہو کر بکھرنے اور آسمانوں کے کرّوں کے پھٹ جانے سے زیادہ عظیم، بدکاروں کی عظیم رسوائی اور مومنین کی بے مثال سربلندی کا دن ہے۔ وہ ایسا دن ہوگا جس میں انسان اس میدان میں، اعمال اور اندرونی اسرار کے لحاظ سے عُریاں ظاہر ہوگا۔ ہاں! اس دن ہمارے وجود کی کوئی چیز پنہاں اور مخفی نہیں رہے گی۔

ممکن ہے کہ یہ اس دن خُدا کے ہر چیز پر احاطۂ علمی کی طرف اشارہ ہو۔ لیکن پہلی تفسیر زیادہ مناسب ہے۔

❖ ❖ ❖

لہٰذا اس کے بعد کہتا ہے: "لیکن وہ شخص جس کا نامۂ اعمال اس کے دائیں ہاتھ میں ہوگا وہ فرطِ مسرت میں پکار اُٹھے گا، لو آؤ اور میرا نامۂ اعمال پڑھو" (فاما من اوتی کتابہ بیمینہ فیقول ھاؤم اقرءوا کتابیہ)[1]۔

گویا خوشی سے پھولا نہیں سماتا اور ان سب نعمتوں، توفیقات اور ہدایت کی وجہ سے جو خُدا نے اُسے دی ہیں اس کے وجود کا ہر ہر ذرہ شکر گزار ہے اور وہ بے ساختہ "الحمدللہ" پکار رہا ہے۔

❖ ❖ ❖

اِس کے بعد اپنے عظیم ترین افتخار کو اس کلمہ میں خلاصہ کرتے ہوئے کہتا ہے: "مجھے یقین تھا کہ قیامت آکے رہے گی اور مجھے اپنے اعمال کا حساب دینا پڑے گا" (انی ظننت انی ملاق حسابیہ)[2]۔

'ظن' اِس قسم کے موارد میں 'یقین' کے معنی دیتا ہے۔ وہ یہ کہنا چاہتا ہے کہ مجھے جو کچھ نصیب ہوا ہے، وہ اس دن پر ایمان کی وجہ سے ہے۔ واقعاً بات یہی ہے کہ حساب و کتاب پر ایمان، انسان کو تقویٰ اور پرہیزگاری کی رُوح عطا کرتا ہے، تعہد اور مسئولیت کا احساس پیدا کرتا ہے اور انسان کی تربیت کا اہم ترین عامل ہے۔

❖ ❖ ❖

بعد والی آیت میں اس قسم کے افراد کے اجر و ثواب کے ایک گوشہ کو بیان کرتے ہوئے فرماتا ہے: "وہ ایک کامل اور پسندیدہ زندگی میں قرار پائے گا" (فھو فی عیشۃ راضیۃ)[3]۔

❖ ❖ ❖

---

[1] 'ھاؤم' اربابِ لغت کے قول کے مطابق، لے لو کے معنی میں ہے۔ اگر مخاطب مردوں کی جماعت ہو تو 'ھاؤم' کہا جاتا ہے۔ عورتوں کی جماعت ہو تو ھاؤنّ اور اگر مفرد مذکر ہو تو 'ھا' (زبر کے ساتھ) اور مفرد مونث ہو تو "ھاؤ" (زیر کے ساتھ) اور تثنیہ کے لیے "ھاؤما" کہا جاتا ہے راغب مفردات میں کہتا ہے۔ "ھا" لینے کے معنی میں اور 'ھات' دینے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔

[2] "حسابیہ" میں ھا، استراحت کی یاسکتہ کی ہے اور اس کا کوئی خاص معنی نہیں ہے، جیسا کہ کتابیہ میں بھی ایسا ہی ہے۔

[3] اگرچہ "رضایت اور خوشی" اس زندگی والوں کی ایک صفت ہے لیکن اوپر والی آیت میں اسے خود زندگی کی صفت قرار دیا ہے۔ یہ چیز انتہائی تاکید کا فائدہ دیتی ہے۔ یعنی وہ ایک ایسی زندگی ہے جو ساری کی ساری رضایت و خوشی ہے۔

اگرچہ اس نے اسی ایک جملہ کے ساتھ تمام کہنے کی باتیں کہہ دی ہیں لیکن مزید وضاحت کے لیے کہتا ہے :
"وہ عالی مرتبہ بہشت میں ہوگا" (فی جنۃ عالیۃ)۔
وہ بہشت جو اتنی بلند و بالا اور رفیع و والا قدر ہے کہ نہ کسی شخص نے دیکھی ہے نہ سنی ہے اور نہ ہی کبھی اس کا تصور کیا ہے۔

❊ ❊ ❊

ایسی بہشت جس کے پھل دسترس میں ہوں گے" (قطوفھا دانیۃ)۔
نہ پھلوں کو توڑنے کی زحمت اٹھانا پڑے گی، نہ ہی اس کے لدے پھندے درختوں کے قریب ہونے میں کوئی مشکل ہوگی اور اصولی طور پر اس کی تمام نعمتیں بغیر کسی استثناء کے دسترس میں ہوں گی۔[1]

❊ ❊ ❊

آخری زیر بحث آیت میں، ان بہشتیوں کے لیے خدا کے محبت آمیز خطاب کو اس طرح بیان کیا ہے:
"مزے مزے سے کھاؤ اور پیو، یہ ان اعمال کا بدلہ ہے جنھیں تم نے گذشتہ ایام میں انجام دیا تھا" (کلوا واشربوا ھنیئًا بما اسلفتم فی الایام الخالیۃ)۔
ہاں! یہ عظیم نعمتیں بے حساب نہیں ملیں گی۔ یہ تمھارے اعمال کا بدلہ ہے جنھیں تم نے دنیا میں آج کے لیے ذخیرہ کیا اور آگے بھیجا ہے، لیکن یہ ناچیز اعمال جب فضل و رحمتِ الٰہی کے افق میں قرار پائے ہیں تو اس قسم کے ثمرات و نتائج تک منتہی ہوئے ہیں۔

❊ ❊ ❊

چند نکات

۱: لفظِ عرش کی ایک اور تفسیر

ایک حدیث میں امام جعفر صادق سے آیا ہے کہ آپ نے فرمایا:
حملۃ العرش۔ والعرش العلم۔ ثمانیۃ اربعۃ منا،
و اربعۃ ممن شاء اللہ۔
حاملین عرش۔ عرش سے مراد علمِ خدا ہے۔ آٹھ افراد میں چار تو ہم میں سے ہیں اور چار ان میں سے جنھیں خدا نے چاہا ہے۔[2]

---

[1] قطوف، قطف (بروزن حرف) کی جمع ہے جو چنے ہوئے پھلوں کے معنی میں ہے اور کبھی چننے کے لیے تیار پھلوں کے لیے بھی آیا ہے۔
[2] نور الثقلین جلد ۵ ص ۴۰۶ حدیث ۲۸

ایک اور حدیث میں امیر المومنین علیؑ سے آیا ہے :

"فالذین یحملون العرش ، هم العلماء ، الذین جعلهم الله علمه ۔"

"حاملینِ عرش وہ علماء اور دانش مند ہیں جنھیں خدا نے اپنے علم کی تعلیم دی ہے۔"[1]

ایک اور حدیث میں امام علی بن موسیٰ رضاؑ سے آیا ہے :

"العرش لیس هو الله والعرش اسم علم وقدرة ۔"

"عرش خدا نہیں ہے، بلکہ اس کے علم و قدرت کا نام ہے۔"[2]

ان احادیث سے اچھی طرح معلوم ہو جاتا ہے کہ عرش کی اس تفسیر کے علاوہ، جو ہم نے پہلے بیان کی تھی، ایک اور تفسیر بھی ہے۔ یعنی وہ خدا کے "علم و قدرت" جیسی صفات ہیں۔ اس بناء پر عرش الٰہی کے حامل اس کے علم کے حامل ہیں۔ پس انسان یا فرشتے جتنا زیادہ علم رکھتے ہوں گے، اتنا ہی زیادہ حصہ اس عظیم عرش کا اٹھائے ہوئے ہوں گے۔

اس طرح یہ حقیقت اور زیادہ واضح ہو جاتی ہے، کہ عرش تختِ سلطنت کے مشابہ کسی جسمانی تخت کے معنی میں نہیں ہے بلکہ یہ جب خدا کے بارے میں استعمال ہوتا ہے تو مختلف کنائی معانی رکھتا ہے۔

۲ : علیؑ اور ان کے شیعوں کا مقام

کئی روایات میں آیا ہے آیت فاما من اوتی کتابہ بیمینہ ... علیؑ کے بارے میں ہے، یا علیؑ اور ان کے شیعوں کے بارے میں ہے۔[3]

حقیقت میں یہ واضح مصادیق کے بیان کے قبیل سے ہے۔ اس سے آیت کے مفہوم کو محدود نہیں کیا جا سکتا۔

* * *

۳ : ایک سوال کا جواب

ممکن ہے یہاں ایک سوال کیا جائے کہ کیا وہ مومنین جو اوپر والی آیات کے مطابق پکاریں گے۔ " اے

---

[1] نور الثقلین جلد ۵ ص ۴۰۵ حدیث ۲۶

[2] نور الثقلین جلد ۵ ص ۴۰۵ حدیث ۲۷

[3] تفسیر المیزان جلد ۲۰ ص ۶۶

اہل محشر آؤ اور ہمارے نامۂ اعمال کو پڑھو، تو کیا ان کے نامۂ اعمال میں کوئی گناہ نہیں ہوگا۔

اس سوال کا جواب بعض احادیث سے معلوم کیا جا سکتا ہے۔ منجملہ ان کے پیغمبر گرامیؐ سے منقول ہے:

"خدا قیامت میں پہلے اپنے بندوں سے ان کے گناہوں کا اقرار لے لے گا پھر فرمائے گا، "میں نے تمہارے یہ گناہ دنیا میں بھی مستور اور پوشیدہ رکھے ہیں اور آج بھی میں انھیں بخشتا ہوں"۔ اس کے بعد (صرف) ان کے حسنات اور نیکیوں کا دفتر ان کے دائیں ہاتھ میں دے دے گا۔ [1]

بعض نے یہ بھی کہا ہے کہ اس دن خدا مومنین کے سیئات اور برائیوں کو حسنات اور نیکیوں میں بدل دے گا۔ اسی وجہ سے ان کے سارے نامۂ اعمال میں کوئی ضعیف نقطہ نہیں ہوگا۔

* * *

---

[1] فی ظلال القرآن جلد ۸ ص ۲۵۶

(۲۵) وَاَمَّا مَنْ اُوْتِیَ كِتٰبَهٗ بِشِمَالِهٖ ۙ فَیَقُوْلُ یٰلَیْتَنِیْ لَمْ اُوْتَ كِتٰبِیَهْ ۚ

(۲۶) وَلَمْ اَدْرِ مَا حِسَابِیَهْ ۚ

(۲۷) یٰلَیْتَهَا كَانَتِ الْقَاضِیَةَ ۚ

(۲۸) مَاۤ اَغْنٰی عَنِّیْ مَالِیَهْ ۚ

(۲۹) هَلَكَ عَنِّیْ سُلْطٰنِیَهْ ۚ

❊ ❊ ❊

ترجمہ

(۲۵) لیکن وہ شخص جس کا نامہ اعمال اس کے بائیں ہاتھ میں دیا جائے گا وہ کہے گا: اے کاش! میرا نامۂ اعمال مجھے ہرگز نہ دیا جاتا۔

(۲۶) اور میں یہ نہ ہی جانتا کہ میرا حساب کیا ہے؟

(۲۷) اے کاش! مجھے تو موت ہی آ جاتی۔

(۲۸) میرے مال و دولت نے مجھے ہرگز بے نیاز نہیں کیا۔

(۲۹) میری قدرت بھی ہاتھ سے نکل گئی۔

❊ ❊ ❊

تفسیر

اے کاش مجھے موت آجاتی۔

گذشتہ آیات میں گفتگو 'اصحابُ الیمین' اور ان مومنین کے بارے میں تھی کہ جن کا نامۂ اعمال ان کے دائیں ہاتھ میں دیا جائے گا۔ وہ فخریہ اہلِ محشر کو پکاریں گے اور انھیں اپنے اعمال کو پڑھنے کی دعوت دیں گے۔ اس کے بعد بہشتِ جاوداں میں پہنچ جائیں گے۔

لیکن زیرِ بحث آیات ٹھیک ان کے نقطۂ مقابل یعنی 'اصحابِ شمال' کو پیش کرتی ہیں اور ایک موازنہ میں ان دونوں کی کیفیت کو کامل طور پر واضح کر دیتی ہیں۔ پہلے فرماتا ہے: "لیکن جس کا نامۂ اعمال اس کے بائیں ہاتھ میں دیا جائے گا، وہ کہے گا: اے کاش میرا نامۂ اعمال کبھی بھی مجھے نہ دیا جاتا۔" (و اما من اوتی کتابہ بشمالہ فیقول یالیتنی لم اوت کتابیہ)[1]

* * *

"اور اے کاش! میں اپنے حساب کتاب سے ہرگز خبردار نہ ہوا ہوتا۔" (ولم ادر ما حسابیہ)۔

* * *

"اور اے کاش مجھے موت آجاتی جو میری اس حسرت ناک زندگی کو ختم کر دیتی۔" (یالیتھا کانت القاضیۃ)۔[2]

ہاں! اس عظیم عدالت میں، اس 'یوم البروز' اور 'یوم الظہور' میں جب اپنے تمام قبیح اعمال کو برملا دیکھے گا تو اس کی فریاد بلند ہوگی۔ وہ دل سے پے در پے آہِ سوزاں کھینچے گا۔ ایسی آہ جو حسرت بار ہوگی اور ایسا نالہ جو شرر بار ہوگا۔ وہ یہ آرزو کرے گا کہ اس کا اپنے ماضی سے کلی طور پر رابطہ ختم ہو جائے، وہ خدا سے موت و نابودی اور اس عظیم رسوائی سے نجات کی آرزو کرے گا، جیسا کہ سورۂ 'نبا' کی آیت ۴۰ میں بھی آیا ہے: "ویقول الکافر یالیتنی کنت ترابا:" "کافر اس دن یہ کہے گا، اے کاش! میں مٹی ہوتا اور ہرگز انسان نہ بنتا۔"

"یالیتھا کانت القاضیۃ" کے جملہ کی اور تفاسیر بھی بیان کی گئی ہیں۔ منجملہ ان کے یہ ہے کہ 'قاضیۃ' سے

---

[1] کتابیہ میں اور اسی طرح حسابیہ و مالیہ و سلطانیہ میں 'ھا' جو بعد میں آیات میں آئے گا ھاء سکت یا ھاء استراحت ہے۔ نیز جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں اس کا کوئی خاص معنی نہیں ہے بلکہ یہ اس قسم کے کلمات میں ایک خوبصورت وقف شمار ہوتا ہے۔ یہ ان اشخاص کے حالات اور نفس کی کیفیت کے ساتھ ایک قسم کی مناسبت رکھتا ہے، جو یہ بات کریں گے۔

[2] "کانت القاضیۃ" کے جملہ میں ایک محذوف ہے اور تقدیر میں اس طرح ہے۔ (کانت ھذہ الحالۃ القاضیۃ)

مراد پہلی موت ہے۔ یعنی اے کاش! جب ہم دنیا میں مر ہی گئے تھے تو پھر دوبارہ زندہ نہ ہوتے۔ یہ اس حالت میں ہے کہ دنیا میں کوئی چیز اس کی نظر میں موت سے زیادہ ناخوش آئند نہیں تھی۔ لیکن قیامت میں آرزو کرے گا، اے کاش وہ موت ہی برقرار رہتی۔

بعض نے اسے صور کے پہلے نفخہ کے بارے میں سمجھا ہے، جسے قارعۃ سے بھی تعبیر کیا گیا۔ یعنی اے کاش! دوسرا نفخہ واقع ہی نہ ہوتا۔

لیکن وہ تفسیر جو ہم نے ابتداء میں بیان کی ہے سب سے زیادہ مناسب ہے۔

❖ ❖ ❖

اس کے بعد مزید کہتا ہے: "یہ گنہگار مجرم اعتراف کرتے ہوئے کہے گا: "میرے مال و دولت نے مجھے ہرگز بے نیاز نہیں کیا، اور آج کی مصیبت میں جو میری بیچارگی کا دن ہے، میرے کچھ کام نہ آیا" (ما اغنیٰ عنی مالیہ)۔

❖ ❖ ❖

نہ صرف میرے مال و دولت نے مجھے بے نیاز نہیں کیا اور میری کسی مشکل کو حل نہیں کیا، "بلکہ میری قدرت و سلطنت بھی نابود ہو گئی اور ہاتھ سے چلی گئی" (ھلک عنی سلطانیہ)۔

خلاصہ یہ ہے کہ نہ تو مال ہی کام آیا اور نہ ہی مقام و منصب، آج خالی ہاتھ، انتہائی ذلت و شرمساری کے ساتھ دادگاہِ عدلِ الٰہی میں حاضر ہوں، نجات کے تمام اسباب منقطع ہو گئے ہیں، میری طاقت و قدرت برباد ہو گئی ہے اور میری اُمید ہر جگہ سے ختم ہو چکی ہے۔

بعض نے یہاں سلطان کو دلیل و برہان کے معنی میں سمجھا ہے جو انسان کی کامیابی کا سبب ہوتا ہے۔ یعنی آج میرے پاس کوئی ایسی دلیل اور حجت نہیں ہے جس کے ذریعے میں بارگاہِ خدا میں اپنے اعمال کی توجیہ کر سکوں۔

بعض مفسرین نے یہ بھی کہا ہے کہ یہاں "سلطان" سے مراد سلط و حکومت نہیں ہے، کیونکہ وہ سب لوگ جو دوزخ میں وارد ہوں گے کسی ملک کے بادشاہ یا کچھ شہروں کے امیر تو نہیں تھے بلکہ اس سے مراد انسان کا اپنے نفس اور اپنی زندگی پر تسلط ہے۔ لیکن اس بات کی طرف توجہ کرتے ہوئے کہ بہت سے دوزخی اس جہان میں تسلط و نفوذ رکھتے تھے یا وہ سردار اور امیر کبیر لوگ تھے، لہٰذا یہ صحیح نظر آتا ہے۔

❖ ❖ ❖

ایک نکتہ

چند عبرت انگیز داستانیں

یہاں بہت سے واقعات نقل ہوئے ہیں جو سب کے سب اوپر والی آیات کے مضمون پر ایک تاکید، اور

ان لوگوں کے لیے ایک درسِ عبرت ہیں جنہوں نے مال و مقام اور منصب پر تکیہ کیا اور سرتا پا غرور و غفلت اور گناہ میں آلودہ ہیں، منجملہ :

۱ : "سفینۃ البحار" میں کتاب نصائح سے اس طرح سے نقل ہوا ہے۔ "خراسان میں جب ہارون الرشید کی بیماری شدید ہوگئی تو اس نے طوس سے کسی طبیب کو بلانے کا حکم دیا۔ پھر اس نے کہا کہ اس کا پیشاب دوسرے چند بیماروں اور کچھ صحیح و سالم افراد کے پیشاب کے ساتھ طبیب کے سامنے پیش کیا جائے۔ طبیب ان شیشیوں کو یکے بعد دیگرے دیکھتا جا رہا تھا یہاں تک کہ وہ ہارون الرشید کے پیشاب والی شیشی تک پہنچ گیا۔ چنانچہ یہ جانے بغیر کہ یہ شیشی کس کی ہے اُس نے کہا : اس شیشی والے سے کہہ دیں کہ وہ اپنی وصیت کر دے۔ کیونکہ اس کی طاقت و قوت مضمحل ہو چکی ہیں اور اس کی بنیادیں کھوکھلی ہو چکی ہیں۔ ہارون الرشید طبیب کی اس بات کو سُن کر اپنی زندگی سے مایوس ہوگیا، اور یہ اشعار پڑھنا شروع کر دیئے۔

ان الطبیب بطبہ و دوائہ
لا یستطیع دفاع غب قد اُتی
ما للطبیب یموت بالداء الذی
قد کان یبرء مثلہ فیما مضی

"طبیب اپنی طبابت اور دواؤں کے ذریعے اس موت کا دفاع
کرنے کی قدرت نہیں رکھتا جو آپہنچی ہے۔"
"اگر وہ یہ قدرت رکھتا ہوتا تو پھر وہ خود اُسی بیماری سے کیوں مرتا
کہ جس کا وہ پہلے علاج کیا کرتا تھا۔"

اسی اثناء میں اُسے خبر ملی کہ لوگوں نے اس کی موت کی خبر پھیلا دی ہے۔ اس شہرت کو ختم کرنے کے لیے اس نے ایک سواری لانے کا حکم دیا اور کہا کہ مجھے اس پر سوار کر دو۔ لیکن اچانک اس جانور کا زانو کمزور ہوگیا۔ تب اس نے کہا : "مجھے سواری سے اُتار دو کیونکہ اس خبر کو اُڑانے والے سچ کہتے ہیں۔" اس کے بعد اس نے وصیت کی کہ اس کے لیے کئی کفن لائے جائیں۔ ان میں سے اس نے ایک کو پسند کر کے رکھ لیا اور کہا "میرے بستر کے قریب ہی میری قبر تیار کرو"۔ پھر اس نے قبر کی طرف دیکھا اور ان آیات کی تلاوت کی : ما اغنیٰ عنی مالیہ۔ ھلک عنی سلطانیہ اور اسی دن دنیا سے رخصت ہوگیا۔ [1]

---

[1] سفینۃ البحار جلد اول ص ۵۲۳ مادہ رشد

۲ : اسی کتاب میں عالم بزرگوار شیخ بہائی سے بھی اسی طرح نقل ہوا ہے :

"ایک شخص جس کا نام 'توبہ' تھا اور غالباً وہ اپنے نفس کا محاسبہ کرتا رہتا تھا، ایک دن اس نے اپنی گزری ہوئی عمر کا حساب لگایا تو وہ ۲۱۵۰۰ دن تھے۔ تب اس نے کہا : وائے ہو مجھ پر! اگر میں نے ہر دن کے مقابلہ میں صرف ایک ہی گناہ کیا ہو تو وہ بھی اکیس ہزار سے زیادہ بنتے ہیں۔ تو کیا میں خدا سے اکیس ہزار گناہوں کے ساتھ ملاقات کروں گا۔ اسی وقت اس نے ایک چیخ ماری، زمین پر گر پڑا اور جان جانِ آفریں کے سپرد کر دی۔ [1]

۳ : 'ثعالبی' کی کتاب 'یتیمہ' میں اس طرح آیا ہے :

"جب عضد الدولہ کی موت کا وقت آن پہنچا تو اس کی زبان سے سوائے اس آیت کی تلاوت کے کچھ نہ نکلتا تھا : ما اغنیٰ عنی مالیہ ھلک عنی سلطانیہ۔ "میرا مال بھی میرے کچھ کام نہ نہ آیا اور میری سلطنت بھی برباد ہو گئی"۔

* * *

---

[1] سفینۃ البحار جلد اول ص ۴۸۸ مادہ ذنب (اقتباس کے ساتھ)

(۳۰) خُذُوْهُ فَغُلُّوْهُ ۝
(۳۱) ثُمَّ الْجَحِيْمَ صَلُّوْهُ ۝
(۳۲) ثُمَّ فِيْ سِلْسِلَةٍ ذَرْعُهَا سَبْعُوْنَ ذِرَاعًا فَاسْلُكُوْهُ ۝
(۳۳) اِنَّهٗ كَانَ لَا يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ الْعَظِيْمِ ۝
(۳۴) وَلَا يَحُضُّ عَلٰى طَعَامِ الْمِسْكِيْنِ ۝
(۳۵) فَلَيْسَ لَهُ الْيَوْمَ هٰهُنَا حَمِيْمٌ ۝
(۳۶) وَّلَا طَعَامٌ اِلَّا مِنْ غِسْلِيْنٍ ۝
(۳۷) لَّا يَاْكُلُهٗٓ اِلَّا الْخَاطِئُوْنَ ۝

❊ ❊ ❊

ترجمہ

(۳۰) اسے پکڑو اور طوق وزنجیر میں جکڑ دو۔
(۳۱) پھر اسے جہنم میں پھینک دو۔
(۳۲) اس کے بعد اسے ایسی زنجیر میں باندھ دو جو ستر ہاتھ ہے۔
(۳۳) کیونکہ وہ ہرگز خداوند عظیم پر ایمان نہیں لاتا تھا۔
(۳۴) اور مساکین کو کھانا کھلانے کی لوگوں کو تشویق نہیں کرتا تھا۔

(۳۵) لہٰذا آج یہاں اس کا کوئی مہربان اور یار و یاور نہیں ہے۔

(۳۶) اور نہ ہی پیپ اور خون کے علاوہ کوئی اور کھانا ہے۔

(۳۷) ایسی غذا جسے خطاکاروں کے علاوہ اور کوئی نہیں کھاتا۔

❊ ❊ ❊

تفسیر

اسے پکڑ کر زنجیروں میں جکڑ دو۔

گذشتہ آیات کو جاری رکھتے ہوئے جو اصحابِ شمال کے بارے میں گفتگو کر رہی تھیں کہ ان کا نامۂ اعمال ان کے بائیں ہاتھ میں دیا جائے گا، ان کے آہ و نالہ کی فریاد بلند ہوگی اور وہ موت کی آرزو کریں گے۔ زیرِ بحث آیات میں ان کے عذاب کے ایک گوشہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے: "اس وقت عذاب کے فرشتوں کو حکم دیا جائے گا: "اسے پکڑ لو اور طوق و زنجیر میں جکڑ دو" (خذوہ فغلوہ)۔

غلّوہ، غل کے مادہ سے جیسا کہ ہم نے پہلے بھی کہا ہے، ایسی زنجیر کو کہتے ہیں جس کے ذریعہ بعض اوقات مجرموں کے ہاتھ پاؤں ان کی گردن کے ساتھ باندھ دیئے جاتے ہیں اور وہ بہت ہی تکلیف دہ ہوتی ہے۔

❊ ❊ ❊

اس کے بعد کہا جائے گا: "اس کو جہنم کی آگ میں داخل کر دو" (ثم الجحیم صلّوہ)۔

❊ ❊ ❊

"پھر اسے اتنی لمبی زنجیر میں جکڑ دو جو ستر ہاتھ ہے۔" (ثم فی سلسلۃ ذرعھا سبعون ذراعا فاسلکوہ)۔

"سلسلہ" زنجیر کے معنی میں ہے اور اصل میں تسلسل کے مادہ سے لیا گیا ہے جو ہلنے اور لرزنے کے معنی میں ہے کیونکہ زنجیر کے حلقے اور کڑیاں لرزتی اور ہلتی رہتی ہیں۔

"ستر ہاتھ" کی تعبیر ممکن ہے "تکثیر" کے عنوان سے ہو، کیونکہ ستر کا عدد ایسے اعداد میں سے ہے، جو عام طور پر کثرت کے لیے استعمال ہوتا ہے، یہ بھی ممکن ہے کہ ستر کا عدد ہی مُراد ہو۔ بہرحال اس قسم کی زنجیر کو مجرموں کے گرد اس طرح سے لپیٹ دیں گے کہ وہ انھیں سر سے لے کر پاؤں تک گھیر لے گی۔

بعض مفسرین نے کہا ہے کہ یہ طولانی زنجیریں ایک ہی شخص کے لیے نہیں ہوں گی، بلکہ ہر گروہ کو ایک

زنجیر میں باندھیں گے۔ گذشتہ آیات میں غل و زنجیر کے ذکر کے بعد اس سزا کا ذکر اسی معنی کے ساتھ زیادہ مناسبت رکھتا ہے۔

ذراع کہنی سے لے کر انگلیوں کی نوک تک کے فاصلہ کے معنی میں ہے (جو تقریباً آدھا میٹر ہوتا ہے) اور یہ عربوں کے نزدیک ایک ہی طول تھا جو ایک طبیعی پیمانہ ہے لیکن بعض نے کہا ہے کہ یہ عام ذراع سے مختلف ہے۔ اس طرح کہ اس کی ایک ذراع بہت زیادہ فاصلوں کو گھیر لیتی ہے اور سارے کے سارے دوزخیوں کو اسی ایک زنجیر کے ساتھ باندھ دیں گے۔

ہم پھر کہتے ہیں کہ قیامت سے مربوط مسائل کو ہم دنیا کے رہنے والوں کی زبان میں پورے طور پر بیان نہیں کیا جا سکتا۔ جو کچھ آیات و روایات میں آیا ہے وہ صرف اس کی ایک شبح (سایہ یا ہیولے) کی تصویر کشی کرتا ہے۔

اس آیت میں ثم کی تعبیر اس بات کی نشان دہی کرتی ہے کہ وہ جہنم میں داخل ہونے کے بعد ستر ذراع کی زنجیر میں جکڑے جائیں گے اور یہ ان کے لیے ایک نئی سزا ہو گی۔ یہ احتمال بھی ہے کہ یہ تمام انفرادی اور اجتماعی زنجیریں جہنم میں وارد ہونے سے پہلے ہوں گی اور ثم اصطلاح کے مطابق ذکر میں تاخیر کے لیے ہے۔

❖ ❖ ❖

بعد کی دو آیات میں اس سخت و شدید عذاب کی اصلی علت بیان کرتے ہوئے فرماتا ہے: "کیونکہ وہ خدائے عظیم پر ایمان نہ لانے پر مصر تھا" (انه کان لا یؤمن باللّٰه العظیم)۔

انبیاء و اولیاء اور پروردگار کے رسول اسے جس قدر خدا کی طرف دعوت دیتے تھے وہ اسی قدر انکار کرتا اور قبول نہیں کرتا تھا۔ اس طرح اپنے خالق سے اس کا رشتہ کلی طور پر منقطع ہو گیا تھا۔

❖ ❖ ❖

"اور وہ لوگوں کو۔ مساکین کو کھانا کھلانے کی تشویق نہیں کرتا تھا" (ولا یحض علیٰ طعام المسکین)۔

اس طرح سے اس نے مخلوق سے بھی اپنا رشتہ توڑا ہوا تھا۔

اس بناء پر اس کی بدبختی کا سب سے بڑا عامل خالق و مخلوق سے رابطے کا منقطع ہونا تھا۔

اس تعبیر سے اچھی طرح معلوم ہو جاتا ہے کہ عمدہ الطاعتوں، عبادتوں اور شرعی احکام کو انھیں دو اعمال میں خلاصہ کیا جا سکتا ہے۔ نیز "اطعام مساکین" کا ایمان پر عطف، اس عظیم انسانی عمل کی حد سے زیادہ اہمیت کی طرف اشارہ ہے اور واقعاً ایسا ہی ہے، کیونکہ بعض کے قول کے مطابق بدترین عقیدہ کفر ہے اور رذائل اخلاقی میں سے بدترین بخل ہے۔

قابلِ توجہ بات ہے کہ یہ نہیں کہتا: "وہ کھانا نہیں کھلاتا تھا" بلکہ یہ کہتا ہے کہ دوسروں کو کھانا کھلانے

پر آمادہ نہیں کرتا تھا۔ یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے :

اولاً : صرف ایک شخص کا کھانا کھلانا فقراء و مساکین کی مشکل کو حل نہیں کر سکتا ، لہٰذا دوسروں کو بھی اس کارِ خیر کی دعوت دینا چاہیے تاکہ وہ عمومیت کا پہلو اختیار کرلے۔

ثانیاً : ممکن ہے کہ انسان شخصی طور پر کھانا کھلانے کی توانائی اور قدرت نہ رکھتا ہو لیکن ہر شخص دوسروں کو ترغیب دلانے کی قدرت تو رکھتا ہے۔

ثالثاً : بخیل افراد اس قسم کے ہوتے ہیں جو نہ صرف خود عطاء اور بخشش نہیں کرتے بلکہ دوسروں کے عطاء اور بخشش سے بھی کوئی تعلق نہیں رکھتے۔

بعض قدماء سے نقل ہوا ہے جو اپنی بیوی کو یہ حکم دیا کرتے تھے کہ وہ کھانا زیادہ پکایا کرے تاکہ وہ فقراء و مساکین کو بھی دے سکیں ، اس کے بعد یہ کہا کرتے :

" اس زنجیر کا آدھا حصہ خدا پر ایمان لانے کی وجہ سے ہم نے باہر نکال دیا ہے اور اس کا دوسرا آدھا حصہ کھانا کھلوا کر باہر نکالتے ہیں۔" [1]

❊ ❊ ❊

اس کے بعد مزید کہتا ہے : " چونکہ اس کا کوئی عقیدہ و عمل ایسا نہ تھا ، لہٰذا آج یہاں اس کا کوئی مہربان اور مددگار نہیں ہے۔" (فلیس له الیوم ھٰھنا حمیم)۔

اور نہ ہی پیپ اور خون کے علاوہ اس کے لیے یہاں کوئی اور کھانا ہے۔" (ولا طعام الّا من غسلین)۔

قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ ان کی جزا اور عمل کامل طور پر ایک دوسرے کے ساتھ مناسبت رکھتے ہیں۔ خالق سے رشتہ توڑنے کی وجہ سے وہاں ان کا کوئی گرم جوش اور گہرا دوست نہیں ہوگا ، نیز فقراء اور مساکین کو کھانا نہ کھلوانے کی وجہ سے ، پیپ اور خون کے سوا اور کوئی کھانے کی چیز ان کے حلق سے نیچے نہیں اترے گی ، کیونکہ وہ سالہا سال تک لذیذ ترین کھانے کھاتے رہے تھے جبکہ بے نوا اور بے کس لوگوں کے پاس خونِ دل کے سوا اور کوئی کھانا نہیں تھا۔

" راغب" مفردات میں کہتا ہے کہ 'غسلین' اس پانی کے معنی میں ہے جو کفار کے بدن کو دھونے سے جہنم میں گرے گا۔ لیکن مشہور یہ ہے کہ اس سے مراد وہ پیپ اور خون ہے جو دوزخیوں کے بدن سے گرے گی ، شاید راغب کی مراد بھی یہی ہو اور طعام کی تعبیر بھی اسی معنی کے ساتھ مناسبت رکھتی ہے۔

یہاں ایک سوال سامنے آتا ہے کہ سورہ غاشیہ کی آیت ۶ میں آیا ہے : لیس لھم طعام الّا

---

[1] روح المعانی جلد ۲۹ ص ۵۱

من ضریع : ان کا کھانا "ضریع کے علاوہ اور کچھ نہیں ہوگا" اور ضریع کی تفسیر ایک قسم کے کانٹے سے کی ہے۔ سورہ دخان کی آیت ۴۳، ۴۴ میں آیا ہے : ان شجرت الزقوم طعام الاثیم : "درخت زقوم گنہگاروں کا کھانا ہے۔ اور "زقوم" کی ایک کڑوے بدبودار اور بدذائقہ نبات کے ساتھ تفسیر کی گئی ہے، جس کا نمونہ سرزمین 'تہامہ' میں اگا کرتا تھا جو تلخ اور جلانے والا شیرہ رکھتا تھا۔ پس ان آیات اور زیر بحث آیت کو کیسے جمع کیا جاسکتا ہے ؟

اس سوال کے جواب میں بعض نے تو یہ کہا ہے : یہ تینوں الفاظ 'ضریع'، 'زقوم'، 'غسلین' ایک ہی چیز کی طرف اشارہ ہیں۔ (اور وہ ایک سخت اور ناگوار نبات ہے جو اہل دوزخ کی غذا ہے۔)

بعض دوسروں نے یہ کہا ہے : دوزخیوں کے مختلف طبقات ہیں، ان تینوں چیزوں میں سے ایک ایک چیز ایک گروہ کی غذا ہے۔

بعض نے یہ کہا ہے کہ ان کی غذا تو 'زقوم وضریع' ہے، پینے کے لیے غسلین ہے اور مشروب کے بارے میں 'طعام' کی تعبیر نئی نہیں ہے۔

❖ ❖ ❖

آخری زیر بحث آیت میں تاکید کے لیے مزید کہتا ہے : "اس غذا کو خطاکاروں کے سوا اور کوئی نہیں کھائے گا" (لا یاکلہ الا الخاطئون)۔

بعض مفسرین نے کہا ہے کہ خاطی اس شخص کو کہا جاتا ہے جو جان بوجھ کر غلط کام کرے۔ لیکن "مخطی" عمداً خطا کرنے والے اور سہواً خطا کرنے والے کو بھی کہا جاتا ہے ——— اس بناء پر دوزخ کی یہ غذا ان لوگوں کے لیے مخصوص ہے جو جانتے بوجھتے عمداً طغیان وسرکشی کے عنوان سے شرک وکفر اور بخل کی راہ پر چلتے ہیں۔

❖ ❖ ❖

ایک نکتہ

حروفِ قرآن پر اعراب لگانے کی ابتداء

ایک حدیث میں آیا ہے کہ "صعصعہ بن صوحان جو امام علیؑ کے اصحاب میں سے تھے کہتے ہیں : "ایک عرب امام علیؑ کی خدمت میں آیا اور آیت " لا یاکلہ الا الخاطئون" کے بارے میں سوال کیا اور اس نے خاطئون یعنی خطاکاروں کی بجائے "خاطون" (جو قدم اٹھانے والوں کے معنی میں ہے) پڑھا اور پوچھا کہ قدم تو سب ہی لوگ اٹھاتے ہیں، تو کیا خدا ان سب ہی کو یہ غذا دے گا ؟

امام نے تبسم فرمایا : کہا : اے مرد عرب ! اس آیت کے صحیح الفاظ لا یأکلہ الّا الخاطئون ہیں۔اس نے عرض کیا : اے امیر المومنینؑ ! آپ نے سچ فرمایا ہے۔ خدا کسی بے خطا بندے کو عذاب کے سپرد نہیں کرے گا۔ اس کے بعد امامؑ نے 'ابوالاسود' کی طرف جو ایک ادیب شخص تھا رُخ کیا اور فرمایا : اس وقت عربی زبان سے بیگانہ لوگ بھی مسلمان ہو گئے ہیں۔ ایسا کام کرو کہ وہ اپنی زبان کی اصلاح کر سکیں ۔اس حکم کے بعد ابوالاسود نے الفاظِ قرآن پر نصب اور کسر (زبر، زیر، پیش) کی علامت لگائی۔

❖ ❖ ❖

(۳۸) فَلَآ اُقْسِمُ بِمَا تُبْصِرُوْنَ ۙ
(۳۹) وَمَا لَا تُبْصِرُوْنَ ۙ
(۴۰) اِنَّهٗ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ كَرِيْمٍ ۙ
(۴۱) وَّمَا هُوَ بِقَوْلِ شَاعِرٍ ؕ قَلِيْلًا مَّا تُؤْمِنُوْنَ ۙ
(۴۲) وَلَا بِقَوْلِ كَاهِنٍ ؕ قَلِيْلًا مَّا تَذَكَّرُوْنَ ؕ
(۴۳) تَنْزِيْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝

❖ ❖ ❖

ترجمہ

(۳۸) قسم کھاتا ہوں میں اس کی جسے تم دیکھ رہے ہو۔
(۳۹) اور اس کی جسے تم نہیں دیکھتے۔
(۴۰) کہ یہ قرآن، ایک بزرگوار رسُول کی زبان سے نکلا ہوا کلام ہے۔
(۴۱) اور یہ کسی شاعر کا قول نہیں ہے، لیکن تم بہت کم ایمان لاتے ہو۔
(۴۲) اور نہ ہی یہ کسی کاہن کا قول ہے۔ لیکن تم بہت ہی کم متذکر ہوتے ہو۔
(۴۳) (بلکہ یہ وہ کلام ہے جو) عالمین کے پروردگار کی طرف سے نازل ہُوا ہے۔

❖ ❖ ❖

تفسیر

یہ قرآن یقیناً خدا کا کلام ہے۔

ان مباحث کے بعد جو گذشتہ آیات میں قیامت اور مومنین و کفار کی سرنوشت کے بارے میں بیان ہوئے تھے، ان آیات میں قرآن مجید اور نبوت کے بارے میں ایک فصیح و بلیغ بحث کرتا ہے تاکہ "نبوۃ" اور "معاد" کی بحث ایک دوسرے کی تکمیل کریں۔

پہلے فرماتا ہے: "قسم کھاتا ہوں میں اس کی جسے تم دیکھتے ہو" (فلا اقسم بما تبصرون)۔

❖ ❖ ❖

"اور اس کی جسے تم نہیں دیکھتے" (وما لا تبصرون)۔

مشہور یہ ہے کہ لفظ لا اس قسم کے موارد میں زائدہ اور تاکید کے لیے ہوتا ہے۔ لیکن بعض نے کہا ہے کہ لا یہاں بھی نفی کے معنی دیتا ہے۔ یعنی میں ان امور کی قسم نہیں کھاتا، کیونکہ اولاً تو اس قسم کی ضرورت نہیں اور ثانیاً، قسم خدا کے نام کی ہونا چاہیے۔ لیکن یہ قول ضعیف ہے اور مناسب وہی پہلا معنی ہے کیونکہ قرآن مجید میں خدا کے نام اور غیر خدا کے نام کی قسمیں بہت زیادہ ہیں۔

ما تبصرون وما لا تبصرون کا جملہ ایک وسیع مفہوم رکھتا ہے جو ان تمام چیزوں کو جنھیں انسان دیکھتے ہیں اور نہیں دیکھتے، گھیر لیتا ہے، دوسرے لفظوں میں یہ سارے عالم "شہود" اور "غیب" کو شامل ہے۔

ان دو آیات کی تفسیر میں دیگر احتمال بھی دیئے گئے ہیں۔ منجملہ ان کے یہ ہے: "ما تبصرون" سے مراد عالم خلقت ہے اور "ما لا تبصرون" سے مراد خالق ہے، یا یہ کہ اس سے مراد ظاہری اور باطنی نعمتیں، یا انسان اور فرشتے، یا اجسام و ارواح، یا دنیا و آخرت ہے۔

لیکن جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا ہے ان دونوں تعبیروں کے مفہوم کی وسعت اس کے معنی کو محدود کرنے سے مانع ہے۔ اس بناء پر افقِ نگاہ میں جو کچھ آتا ہے اور جو نہیں آتا وہ سب اس سوگند و قسم میں داخل ہے لیکن اس کا شمول خدا کی نسبت بعید نظر آتا ہے، کیونکہ خالق کو مخلوق کے ساتھ قرار دینا مناسب نہیں ہے، خصوصاً "ما" کی تعبیر کے ساتھ کہ جو عام طور پر غیر ذوی العقول کے لیے آتی ہے۔

ضمنی طور پر اس تعبیر سے اچھی طرح معلوم ہو جاتا ہے کہ جو کچھ انسان آنکھ سے نہیں دیکھتا وہ بہت کچھ ہے۔ موجودہ علم و دانش نے اس حقیقت کو ثابت کر دیا ہے کہ محسوسات، موجودات کے ایک محدود دائرے کو ہی شامل ہوتے ہیں اور جو کچھ افقِ حس میں نہیں آتا، چاہے وہ رنگ ہوں یا آوازیں، ذائقے ہوں یا امواج وغیرہ، وہ کئی درجے زیادہ ہیں۔

وہ ستارے جو کرۂ ارض کے دونوں آدھے حصّوں کے مجموعہ میں آنکھ سے دکھائی دیتے ہیں، ماہرین کے حساب کے مطابق تقریباً پانچ ہزار ستارے ہیں جبکہ وہ ستارے جو آنکھ سے دیکھے نہیں جاتے وہ اربوں کھربوں سے بھی زیادہ ہیں۔

وہ صوتی امواج (آواز کی لہریں) جن کا ادراک کرنے پر انسان کے کان قُدرت رکھتے ہیں بہت ہی محدود لہریں ہیں جبکہ ہزارہا دوسری ایسی صوتی لہریں موجُود ہیں کہ جن کے سننے کی انسانی کان قدرت نہیں رکھتے۔

وہ رنگ جنھیں ہم دیکھ سکتے ہیں سات مشہور رنگ ہیں لیکن آج یہ ثابت ہوچکا ہے کہ بنفشی اور قرمزی رنگوں کے علاوہ بے شمار دُوسرے ایسے رنگ ہیں کہ جن کے مشاہدے کی ہماری آنکھ میں بالکل ہی قدرت نہیں ہے۔

ان چھوٹے چھوٹے جانداروں کی تعداد جو آنکھ سے دیکھے نہیں جا سکتے اس قدر زیادہ ہے کہ اس نے تمام دُنیا کو پُر کر رکھا ہے، بعض اوقات وہ پانی کے ایک قطرے میں لاکھوں کی تعداد میں موجود ہوتے ہیں۔ اِس حال میں یہ بات کتنی دردناک ہے کہ ہم اپنے آپ کو محسوسات کے زندان میں قید کریں اور محسوسات کی دنیا کے باہر سے بے خبر ہو جائیں یا اس کا انکار کر دیں؟

عالمِ ارواح ایک ایسا عالم ہے جو دلائل عقلی بلکہ تجرباتی دلائل سے بھی ثابت ہوچکا ہے۔ وہ عالم ہمارے عالمِ جسم سے کہیں زیادہ وسعت رکھتا ہے۔ ایسی حالت میں محسوسات کی چار دیواری میں کس طرح قید رہا جا سکتا ہے؟

❖ ❖ ❖

اِس کے بعد والی آیہ میں اس عظیم و بے نظیر سوگند و قسم کے نتیجہ اور جواب کو ذکر کرتے ہُوئے فرماتا ہے: "یہ قرآن ایک بزرگوار رسُول کی گفت گُو ہے" (انہ لقول رسول کریم)۔

"رسُول" سے مُراد یہاں بلاشک و شبہ اسلام کے پیغمبرِ گرامیؐ ہیں نہ کہ جبریل، کیونکہ بعد والی آیات وضاحت کے ساتھ اس معنی کی گواہی دیتی ہیں۔

اور یہ جو کہتا ہے کہ یہ ایک بزرگوار رسُول کی گفتگو ہے حالانکہ ہم جانتے ہیں کہ قرآن اللہ کا کلام ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ پیغمبرؐ اس کی تبلیغ کرنے والے ہیں، خصوصاً جبکہ ان کی 'رسالت' کے وصف کا ذکر ہوا ہے جیسا کہ ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ رسُول جو کچھ لاتا ہے وہ بھیجنے والے کی بات ہوتی ہے، اگرچہ وہ رسُول کی زبان سے جاری اور اس کے لب ہائے مُبارک سے سُنا جاتا ہے۔

❖ ❖ ❖

اِس کے بعد مزید کہتا ہے: "یہ کسی شاعر کا قول نہیں ہے۔ لیکن تم بہت کم ایمان لاتے ہو" (وما ھو بقول شاعر قلیلاً ما تؤمنون)[1]

(حاشیہ [1] اگلے صفحہ پر)

اور یہ کسی کاہن کا قول بھی نہیں ہے ، اگرچہ تم بہت ہی کم متذکر ہوتے ہو" (ولا بقول کاھن قلیلاً ما تذکرون)۔

حقیقت میں یہ دونوں آیات ان ناروا نسبتوں کی نفی ہیں ، جو مشرکین اور مخالفین ذاتِ پیغمبرؐ کی طرف دیتے تھے۔ کبھی کہتے تھے کہ وہ شاعر ہے اور یہ آیات اس کے اشعار ہیں ، کبھی کہتے کہ وہ کاہن ہے اور یہ آیات اس کی کہانت ہیں کیونکہ کاہن ایسے لوگ ہوتے تھے جو بعض اوقات جن یا شیاطین سے ارتباط کی بناء پر غیب کے بعض اسرار بیان کیا کرتے۔ اور خصوصیت کے ساتھ اپنے الفاظ کو مسجع اور موزوں جملہ بندی کے ساتھ پیش کرتے تھے ، چونکہ قرآن میں غیب کے اخبار بھی ہیں اور مخصوص نظم و ترتیب بھی ہے ، لہٰذا وہ پیغمبرؐ پر یہ تہمت لگاتے تھے ، حالانکہ کہانت اور قرآن کے درمیان زمین و آسمان کا فرق ہے۔

بعض نے ان آیات کے شانِ نزول میں نقل کیا ہے کہ جس شخص نے پیغمبرؐ کی طرف شعر و شاعری کی نسبت دی وہ ابوجہل تھا اور کہانت کی نسبت دینے والا "عقبہ" یا "عتبہ" تھا اور دوسرے لوگ ان کی پیروی کرتے ہوئے ان تہمتوں کی تکرار کرتے تھے۔

یہ ٹھیک ہے کہ قرآن کے الفاظ میں ہم آہنگی اور ایسی خوبصورت موزونیت ہے ، جو کانوں کو بھلی لگتی ہے اور روح کو سکون بخشتی ہے۔ لیکن یہ چیز نہ تو شاعروں کے شعر سے کوئی ربط رکھتی ہے اور نہ ہی کاہنوں کے سجع و قوافی سے اس کا واسطہ ہے۔

"شعر" عام طور پر تخیلات کی پیداوار اور بر افروختہ احساسات و عاطفی ہیجانات کو بیان کرنے والے ہوتے ہیں۔ اسی وجہ سے ان میں نشیب و فراز اور اُٹھنے اور گرنے کا عمل زیادہ ہوتا ہے ، جبکہ قرآن زیبائی اور جاذبیت کے باوجود ، کامل طور پر استدلالی ، منطقی اور عضلاتی مضامین کا حامل ہے۔ اگر بعض اوقات یہ آئندہ کی پیش گوئیاں کرتا ہے تو یہ پیش گوئیاں قرآن کی اصلیت نہیں ہیں ، نیز یہ کاہنوں کی خبروں کے برخلاف سب کی سب سچی ہوتی ہیں۔

"قلیلاً ما تؤمنون" اور "قلیلاً ما تذکرون" کے جملے ایسے افراد کی توبیخ و سرزنش کے لیے ہیں جو اس آسمانی وحی کو واضح نشانیوں کے ساتھ دیکھتے ہیں ، لیکن کبھی اسے شعر قرار دیتے ہیں اور کبھی کہانت اور بہت کم ایمان لاتے ہیں۔

* * *

آخری زیرِ بحث آیت میں تاکید کے عنوان سے صراحت کے ساتھ کہتا ہے : "یہ قرآن عالمین کے پروردگار

(حاشیہ صفحہ سابقہ)

لہ قلیلاً اس آیت اور اس کے بعد والی آیت میں ایک محذوف "مفعول مطلق" کی صفت ہے اور "ما" زائد ہے۔ تقدیر میں اس طرح ہے : (تؤمنون ایماناً قلیلاً)

کی طرف سے نازل ہُوا ہے": (تنزیل من رب العالمین)۔[1]

اِس بناء پر قرآن نہ شعر ہے نہ کہانت، نہ پیغمبر اسلامؐ کے ذہن کی پیداوار اور نہ ہی جبریل کا کلام ہے، بلکہ وہ خدا کا کلام ہے جو بیشک وحی کے ذریعہ پیغمبرؐ کے پاک دل پر نازل ہُوا ہے، یہی تعبیر تھوڑے سے فرق کے ساتھ قرآن مجید میں گیارہ مقامات پر آئی ہے۔

❖ ❖ ❖

---

[1] تنزیل مصدر ہے، اسم مفعول کے معنی میں اور ایک محذوف مبتداء کی خبر ہے، تقدیر میں اس طرح ہے "ھو منزل من رب العالمین"۔

۴۸ یہ یقیناً پرہیزگاروں کے لیے ایک تذکرہ ہے۔

۴۹ اور ہم جانتے ہیں کہ تم میں سے بعض اس کی تکذیب کرتے ہیں۔

۵۰ اور یہ کافروں کے لیے مایۂ حسرت ہے۔

۵۱ اور وہ خالص یقین ہے۔

۵۲ (اب جبکہ ایسا ہے تو) تم اپنے عظیم پروردگار کے نام کی تسبیح کرو۔

❖ ❖ ❖

تفسیر

اگر وہ ہم پر جھوٹ باندھتا تو ہم اسے مہلت نہ دیتے۔

قرآن سے مربوط مباحث کو جاری رکھتے ہوئے ان آیات میں اس کی اصالت پر ایک واضح دلیل پیش کرتے ہوئے فرماتا ہے: "اگر وہ ہم پر جھوٹ باندھتا ہے" (ولو تقوّل علینا بعض الاقاویل)۔

❖ ❖ ❖

"تو ہم پوری قدرت کے ساتھ اس کو پکڑ لیتے" (لاخذنا منہ بالیمین)۔

❖ ❖ ❖

"پھر ہم اس کے دل کی رگ کو کاٹ دیتے۔" (ثم لقطعنا منہ الوتین)۔

❖ ❖ ❖

"اور تم میں سے کوئی بھی اس کام میں مانع نہ ہوتا اور نہ ہی اس کی حمایت کرتا۔" (فما منکم من احد عنہ حاجزین)۔[1]

اقاویل جمع ہے اقوال کی اور اقوال اپنی نوبت میں جمع ہے قول کی، تو اس بناء پر اقاویل جمع ہے اور یہاں اس سے مراد جھوٹی باتیں ہیں۔

"تقوّل" تَقَوُّل (بروزن تکلّف) کے مادہ سے ان باتوں کے معنی میں ہے جنھیں انسان خود اپنی طرف سے گھڑے اور ان کی کوئی حقیقت نہ ہو۔

لاخذنا منہ بالیمین (ہم اسے دائیں ہاتھ سے پکڑ لیتے اور سزا دیتے۔ کیونکہ انسان بہت سے کاموں

---

[1] "من احد" میں "من" زائدہ اور تاکید کے لیے ہے۔

۴۴ وَلَوْ تَقَوَّلَ عَلَيْنَا بَعْضَ الْاَقَاوِيْلِ ۙ
۴۵ لَاَخَذْنَا مِنْهُ بِالْيَمِيْنِ ۙ
۴۶ ثُمَّ لَقَطَعْنَا مِنْهُ الْوَتِيْنَ ۚ
۴۷ فَمَا مِنْكُمْ مِّنْ اَحَدٍ عَنْهُ حٰجِزِيْنَ ۝
۴۸ وَ اِنَّهٗ لَتَذْكِرَةٌ لِّلْمُتَّقِيْنَ ۝
۴۹ وَ اِنَّا لَنَعْلَمُ اَنَّ مِنْكُمْ مُّكَذِّبِيْنَ ۝
۵۰ وَ اِنَّهٗ لَحَسْرَةٌ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ ۝
۵۱ وَ اِنَّهٗ لَحَقُّ الْيَقِيْنِ ۝
۵۲ فَسَبِّحْ بِاسْمِ رَبِّكَ الْعَظِيْمِ ۧ

❖ ❖ ❖

ترجمہ

۴۴ اگر وہ ہم پر جھوٹ باندھتا
۴۵ تو ہم اسے پوری قدرت کے ساتھ پکڑ لیتے۔
۴۶ اس کے بعد ہم اس کے دل کی رگ کو کاٹ دیتے۔
۴۷ اور تم میں سے نہ کوئی روک سکتا نہ اس کی حمایت کرتا۔

کو دائیں ہاتھ سے انجام دیتا ہے۔ اس لیے کہ اس میں زیادہ قدرت ہوتی ہے۔ اس طرح "یمین" قدرت سے کنایہ ہے۔ [1]

بعض مفسرین نے اس آیت کی تفسیر میں اور احتمالات بھی دیئے ہیں۔ چونکہ وہ غیر مانوس اور غیر موزوں تھے لہٰذا ہم نے ان سے صرفِ نظر کیا ہے۔

"وتین" "دل کی رگ" کے معنی میں ہے۔ یعنی شہ رگ جو تمام اعضاء میں خون پہنچاتی ہے۔ اگر وہ کٹ جائے تو انسان کو فوراً اور ایک لمحہ کی تاخیر کے بغیر موت آجاتی ہے۔ یہ وہ سریع ترین سزا ہے جو کسی شخص کے بارے میں انجام پا سکتی ہے۔

بعض نے اس کی تفسیر اس رگ سے کی جس کے ساتھ دل آویزاں ہوتا ہے یا اس رگ سے جو جگر کو خون پہنچاتی ہے، یا رگِ شجاع جو مہروں کے ستون کے وسط میں ہوتی ہے۔ لیکن پہلی تفسیر سب سے صحیح نظر آتی ہے۔

"حاجزین" حاجز کی جمع ہے جو مانع اور رکاوٹ کے معنی میں ہے۔

یہاں ایک سوال سامنے آتا ہے کہ اگر کوئی شخص خدا پر جھوٹ بولے اور خدا فوراً اس کو سزا دے اور اسے ہلاک کر دے تو پھر نبوت کا جھوٹا دعویٰ کرنے والوں کو تیزی کے ساتھ نابود ہو جانا چاہیے۔ حالانکہ ایسا ہرگز نہیں ہے۔ اور ان میں بہت سے سالہا سال زندہ رہے ہیں۔ یہاں تک کہ ان کا باطل مذہب ان کے بعد بھی باقی رہا ہے۔

اس سوال کا جواب ایک نکتہ کی طرف توجہ کرنے سے واضح ہو جاتا ہے۔ وہ یہ ہے کہ قرآن یہ نہیں کہتا کہ "ہر مدعی" بلکہ یہ کہتا ہے کہ اگر پیغمبر اسلامؐ اس طرح کا کام کرے۔ یعنی وہ پیغمبرؐ جسے خدا نے معجزہ دیا۔ اور حقانیت کے دلائل نے اس کی تائید کی ہے۔ اگر وہ طریقِ حق سے منحرف ہو جائے تو ایک لمحہ کے لیے بھی اُسے مہلت نہیں دی جائے گی۔ کیونکہ یہ چیز لوگوں کی گمراہی اور ضلالت کا سبب بنے گی۔ [2]

لیکن جو شخص باطل دعویٰ کرتا ہے اور کوئی معجزہ یا واضح دلیل اپنی حقانیت پر نہیں رکھتا تو کوئی ضرورت نہیں ہے کہ خدا اُسے فوراً ہلاک کرے۔ کیونکہ اس کی باتوں کا بطلان ہر اس شخص کے لیے جو حق کا طالب ہے واضح اور روشن ہے۔ مشکل وہاں آپڑتی ہے جہاں نبوت کا مدعی دلائل و معجزات کے ہمراہ ہو اور وہ حق کی راہ سے منحرف ہو جائے۔

اِس سے واضح ہو جاتا ہے کہ یہ جو بعض گمراہ فرقے اپنے پیشواؤں کے دعوے کے اثبات کے لیے اس

---

[1] اوپر والے جملہ میں "من" زائدہ اور تاکید کے لیے ہے اور تقدیر میں اس طرح ہے۔ "لاخذناہ بالیمین"

[2] یہ وہی چیز ہے جو علم کلام کی کتب میں جھوٹے کے ہاتھ میں معجزہ قرار دینے کے عنوان سے پیش ہوتی ہے اور اس کو قبیح قرار دیا جاتا ہے۔

آیت سے تمسک کرتے ہیں وہ بالکل غلط ہے ، ورنہ مسیلمہ کذاب جیسے افراد اور دوسرے جھوٹے مدعی بھی اس آیت سے اپنی حقانیت پر استدلال کر سکتے ہیں۔

❊ ❊ ❊

بعد والی آیت میں تاکید اور یاد آوری کے لیے فرماتا ہے : "یہ قرآن یقینی طور پر پرہیز گاروں کے لیے ایک نصیحت ہے۔" (و انہ لتذکرۃ للمتقین)۔

ان کے لیے جو اپنے آپ کو گناہ سے پاک کرنے کے لیے تیار ہوں ، راہِ حق کو طے کرنے پر آمادہ ہوں ان کے لیے جو جستجو میں لگے رہتے ہیں ، حقیقت کے طالب ہیں ، قرآن ان کے لیے ذکر اور نصیحت ہے۔ لیکن جو لوگ تقویٰ کی یہ حد نہیں رکھتے وہ یقیناً قرآنی تعلیمات سے فائدہ نہیں اُٹھا سکتے۔

اِس لحاظ سے قرآن جو گہری ، عمیق اور حد سے زیادہ تاثیر رکھتا ہے وہ اس کی حقانیت کی ایک اور دلیل ہے۔

❊ ❊ ❊

اس کے بعد کہتا ہے : "اور ہم جانتے ہیں کہ تم میں سے ایک گروہ اس کی تکذیب کرتا ہے۔" (و انا لنعلم انّ منکم مکذبین)۔

لیکن ہٹ دھرم جھٹلانے والوں کا وجود ان کے حق پر نہ ہونے کی دلیل میں رُکاوٹ نہیں بن سکتا ہے ، کیونکہ پرہیز گار اور حقیقت کے طالب ہی اس سے متذکر ہوتے ہیں ، وہ اس میں حق کی نشانیاں دیکھتے ہیں اور راہِ خدا میں قدم رکھ دیتے ہیں۔

اِس بناء پر جس طرح ایک روشن چراغ سے فائدہ اٹھانے کے لیے کم از کم یہ ضروری ہے کہ انسان اپنی آنکھ کو کھلا رکھے اسی طرح نورِ قرآن سے فائدہ اٹھانے کے لیے بھی دل کی آنکھ اس کے اوپر کھلی رکھنی چاہیے۔

❊ ❊ ❊

بعد والی آیت میں مزید کہتا ہے : "اور یہ قرآن کافروں کے لیے حسرت کا باعث ہے۔" (و انہ لحسرۃ علی الکافرین)۔

آج یہ اس کی تکذیب کر رہے ہیں لیکن کل جو "یوم الظہور" اور "یوم البروز" ہونے کے ساتھ ساتھ "یوم الحسرت" بھی ہے وہ سمجھ لیں گے کہ انھوں نے ہٹ دھرمی اور عناد کی وجہ سے کتنی عظیم نعمت کو ہاتھ سے دے دیا ہے اور کیسے کیسے دردناک عذاب اپنے لیے خرید لیے ہیں ، وہ دن جس میں وہ مومنین کی بلندیاں اور پستیاں دیکھیں گے اور ان کا آپس میں موازنہ کریں گے تو حسرت کے ساتھ انگلی منہ میں داب لیں گے اور غصہ اور غصہ کی شدت سے اپنے ہاتھ دانتوں سے کاٹیں گے۔ "ویوم یعض الظالم علیٰ یدیہ یقول یالیتنی اتخذت مع الرسول سبیلاً۔" اس دن کو یاد کرو جب ظالم اپنے دونوں ہاتھوں کو شدتِ حسرت سے کاٹے گا اور کہے گا کہ اے کاش ! میں رسُول کے راستے پر چلتا۔" (فرقان ۔ ۲۷)

اِس بناء پر کہ کوئی شخص یہ خیال نہ کرے کہ منکرین کا شک و تردید یا تکذیب ، قرآن کے مفاہیم کے ابہام کی وجہ سے ہے ، لہٰذا بعد والی آیت میں مزید کہتا ہے : "یہ قرآن یقینِ خالص اور حق یقین ہے۔" (و انہ لحق الیقین)۔

بعض مفسرین کے قول کے مطابق حق الیقین کی تعبیر کسی چیز کی اپنی ذات کی طرف نسبت کی قبیل سے ہے کیونکہ 'حق' عین یقین ہے اور یقین عین حق ہے ، جیسا کہ ہم کہتے ہیں 'مسجد الجامع' اور 'یوم الخمیس' اور یہ اضافت اصطلاح کے مطابق اضافتِ بیانیہ ہے۔

لیکن بہتر ہے یہ کہا جائے کہ یہ موصوف کی صفت کی طرف اضافت کے قبیل سے ہے۔ یعنی قرآن ایک خالص یقین ہے ، یا دوسرے لفظوں میں یقین کے کئی مراحل ہوتے ہیں۔

کبھی وہ دلیلِ عقلی سے حاصل ہوتا ہے جیسا کہ ہم دھوئیں کو دور سے دیکھتے ہیں تو اس سے آگ کے وجود کا یقین حاصل ہو جاتا ہے حالانکہ ہم نے آگ کو نہیں دیکھا ، اس کو "علم الیقین" کہتے ہیں۔

بعض اوقات ہم اور نزدیک جا کر آگ کے شعلوں کو اپنی آنکھ سے دیکھ لیتے ہیں۔ اِس سے یقین اور زیادہ محکم ہو جاتا ہے اور اس کو عین الیقین کا نام دیتے ہیں۔

بعض اوقات ہم اس سے بھی زیادہ نزدیک چلے جاتے ہیں ، آگ کے پاس یا آگ کے اندر داخل ہو جاتے ہیں اور اس کی سوزش کو اپنے ہاتھ سے لمس کرتے ہیں۔ یقیناً یہ یقین کا بالاتر مرحلہ ہے اور اس کو حق الیقین کہتے ہیں۔

اوپر والی آیت کہتی ہے کہ قرآن یقین کے اس قسم کے مرحلہ میں ہے۔ لیکن اس کے باوجود دل کے اندھے اس کا انکار کرتے ہیں۔

* * *

پھر آخری زیرِ بحث آیت جو سورۂ حاقہ کی آخری آیت ہے ، اس میں فرماتا ہے : "اب جبکہ ایسا ہے ، تو اپنے عظیم پروردگار کی تسبیح کر اور اس کو ہر قسم کے عیب و نقص سے منزّہ شمار کر (فسبح باسم ربك العظیم)۔

قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ اس آیت اور اس سے پہلے والی آیت کا مضمون تھوڑے سے اختلاف کے ساتھ سورۂ واقعہ کے آخر میں بھی آیا ہے ، فرق صرف یہ ہے کہ یہاں گفتگو قرآن مجید کے بارے میں ہے اور اس کی توصیف "حق الیقین" کے ساتھ ہوئی ہے ، لیکن سورۂ واقعہ کے آخر میں قیامت میں نیکوکاروں کے مختلف گروہوں کے بارے میں گفتگو ہے۔

* * *

ایک نکتہ

قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ ان آیات میں قرآن کی توصیف چار صفات کے ساتھ کی گئی ہے۔
پہلے کہتا ہے: یہ رب العٰلمین کی طرف سے نازل کیا گیا ہے۔
اس کے بعد کہتا ہے: یہ متقین کے لیے یاد آوری اور تذکر ہے۔
پھر کہتا ہے: کافروں کے لیے حسرت و ندامت کا باعث ہے۔
اور آخری مرحلہ میں مزید کہتا ہے: یہ "حق الیقین" ہے۔
ان میں سے پہلی صفت تمام لوگوں کے لیے ہے۔
دوسری صفت پرہیزگاروں کے لیے ہے۔
تیسری صفت کذّا کے ساتھ مربوط ہے۔
اور چوتھی صفت خاصانِ خدا اور مقربین سے مربوط ہے۔

❊ ❊ ❊

خداوندا! تو خود جانتا ہے کہ کوئی چیز سرمایۂ یقین سے برتر نہیں ہے۔ ہمیں ایسا ایمان اور یقین مرحمت فرما جو "حق الیقین" کا مصداق ہو۔

پروردگارا! قیامت کا دن یوم الحسرت ہے، ہمیں کم از کم ان لوگوں میں سے قرار دے کہ جنھیں طاعتوں کی کمی پر حسرت ہو، نہ کہ کثرتِ گناہ اور ترکِ طاعت پر حسرت و ندامت ہو۔

بارِ الٰہا! ہمارا نامۂ اعمال ہمارے دائیں ہاتھ میں دینا اور ہمیں اپنی جنتِ عالیہ اور عیشۂ راضیہ (پسندیدہ زندگی) میں داخل فرمانا۔ آمین یا ربّ العالمین۔

❊ ❊ ❊

سورہ حاقہ کا اختتام ۵ ذی القعدہ ۱۴۰۶ھ
تفسیر نمونہ جلد ۲۴ کا اختتام

اختتام ترجمہ
بروز اتوار بوقت ساڑھے پانچ بجے دوپہر
بتاریخ ۲۰ ذی الحجہ ۱۴۰۷ھ مطابق ۱۶ اگست ۱۹۸۷ء
بدست حقیر پُرتقصیر سید صفدر حسین نجفی فرزند سید غلام سرور نقوی مرحوم
بر مکان سیٹھ نوازش علی ۸۱، ای ماڈل ٹاؤن، لاہور
الحمد للہ اولاً و آخراً وصلی اللہ علی محمد و آلہ سرمداً ابداً

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اشاریہ

تفسیرِ نمونہ

اُردو ترجمہ

جلد ۲۴

ترتیب و تدوین

سیّد شکیل حُسین مُوسوی

موضوعات :

اصول و عقائد	۴۱۸	کتبِ آسمانی	۴۳۳
احکام	۴۲۱	کتب تاریخ، تفسیر و سیرۃ	۴۳۵
اخلاقیات	۴۲۲	لغاتِ قرآن	۴۳۷
اقوامِ گذشتہ	۴۲۲	متفرق موضوعات	۴۴۱
شخصیات	۴۲۳	مقامات	۴۴۹
علماء و دانشور	۴۳۲		

اُصول و عقائد

اسمائے باری تعالیٰ

الٰہ ۱۷۹
اللہ ۲۹ ، ۳۵ ، ۴۴ ، ۴۸ ، ۵۵ ، ۶۷ ، ۷۵ ، ۸۴ ، ۸۸ ، ۱۰۳ ، ۱۱۹ ، ۱۳۷ ، ۱۴۵ ، ۱۵۷ ، ۱۶۷ ، ۱۷۹ ، ۱۸۳ ، ۱۹۷ ، ۲۰۷ ، ۲۱۵ ، ۲۲۵ ، ۲۳۱ ، ۲۳۹ ، ۲۷۲ ، ۳۰۷ ، ۳۱۷ ، ۳۷۳
بصیر ۱۶۷
حکیم ۳۵ ، ۴۸ ، ۶۷ ، ۱۰۳ ، ۱۸۳ ، ۲۳۹
حلیم ۱۸۳
حمید ۳۵ ، ۱۶۷
خبیر ۲۳۹ ، ۲۸۸
رب ۲۹ ، ۳۵ ، ۱۷۳ ، ۲۲۵ ، ۲۶۱ ، ۲۸۸ ، ۳۱۷ ، ۳۳۸ ، ۳۴۳ ، ۳۵۰ ، ۳۵۹
رحمٰن ۲۵ ، ۶۷ ، ۱۰۳ ، ۱۳۷ ، ۱۶۷ ، ۱۹۷ ، ۲۳۹ ، ۲۷۲ ، ۲۹۶ ، ۳۰۷ ، ۳۱۷ ، ۳۷۳
رحیم ۲۹ ، ۴۴ ، ۵۵ ، ۶۷ ، ۱۰۳ ، ۱۳۷ ، ۱۸۳ ، ۱۹۷ ، ۲۳۹ ، ۲۷۲ ، ۳۱۷ ، ۳۷۳
سبحٰن ۳۴۳
شکور ۱۸۳
عزیز ۳۵ ، ۶۷ ، ۱۰۳ ، ۱۸۳ ، ۲۳۹
علیم ۴۸ ، ۱۶۷ ، ۱۷۹ ، ۲۳۹ ، ۲۸۸
غفور ۴۴ ، ۵۵ ، ۱۸۳ ، ۲۳۹ ، ۲۷۲
غنی ۳۵ ، ۱۶۷
قدوس ۱۰۳
قدیر ۴۴ ، ۱۶۷ ، ۲۳۱ ، ۲۷۲
لطیف ۲۲۸

* * *

توحید

جو بھی آسمانوں اور زمین میں ہیں وہ سب خدا کی تسبیح کرتے ہیں ۶۷
آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے وہ ہمیشہ خدا کی تسبیح کرتے ہیں۔ ۱۰۳
زمین و آسمان کی ہر شے اس کی تسبیح پڑھتی ہے۔ ملکیت و حکومت، حمد و ستائش اسی کے لیے ہے اور وہ ہر شے پر قادر ہے۔ ۱۶۸
خدا اس کے رسول اور اس نور پر ایمان لے آؤ جسے ہم نے نازل کیا۔ ۱۷۴
خدا وہ ہے جس نے ساتوں آسمان اور اتنی ہی زمینیں پیدا کی ہیں اور ان میں اس کا فرمان نازل ہوتا ہے تاکہ تم جان لو کہ خدا ہر چیز پر قادر ہے۔ ۲۳۱
بابرکت ہے ذاتِ خدا۔ صاحبِ حکومت و قدرت ہے۔ تمھارا عمل آزمانے کو پیدا کیا موت و حیات کو۔ سات آسمان پیدا کیے

نچلے آسمانوں کو ستاروں سے سجایا۔ شیاطین کے لیے دوزخ کا عذاب ہے۔ ۲۷۴
.. وہی تو ہے جس نے زمین کو تمھارے لیے مسخر کیا جو آسمانوں پر حاکم ہے۔ ۲۹۱
.. پرندوں کو خدائے رحمٰن کے سوا کوئی فضا میں روکے ہوئے نہیں ہے۔ وہ روزی روک لے تو تمھاری ضروریات کون پوری کرے گا۔ ۲۹۶
.. وہی تو ہے جس نے تمھیں پیدا کیا۔ کان، آنکھیں اور دل بنایا۔ لیکن تم بہت کم شکر کرتے ہو ۳۰۲
.. اگر پانی زمین کی گہرائی میں اتر جائے تو کون ہے جو تمھیں پانی مہیا کرے؟ ۳۰۷
.. متقین کے لیے ان کے رب کے پاس پُرنعمت باغات ہیں۔ ۳۵۰

❊ ❊ ❊

عدل

.. دشمنوں سے بھی عدالت، مسلمان اور کافر عورتوں کے مہر و مصارف کا تبادلہ۔ ۵۴
.. فضلِ خدا بھی از روئے حساب ہے۔ احادیثِ رسولؐ کی روشنی میں خدا کے فضل کی عطاء ۱۰۹
.. تمام مصائب اسی کے فرمان سے ہیں۔ کوئی مصیبت رونما نہیں ہوتی مگر اذنِ خدا سے (بربنائے عمل) خدا ہر چیز کا جاننے والا ہے۔ ۱۷۹
.. گناہ و سزا میں تناسب، قومِ عاد و ثمود و نوح و لوط وغیرہم کے عذاب ان کے افعال و گناہ کے باعث تھے۔ ۳۸۱ ، ۳۸۲۰

❊ ❊ ❊

نبوّت

.. وہ اللہ وہ ہے جس نے امیین میں رسول بھیجا، جو ان پر آیات کی تلاوت اور تزکیۂ نفس کرتا ہے۔ کتاب اور حکمت کی تعلیم دیتا ہے ۱۰۳
.. یہ بعثتِ نبوی خدا کا فضل ہے۔ جسے چاہے دے۔ خدا صاحبِ فضلِ عظیم ہے۔ ۱۰۴
.. یہ منافق تمھارے پاس آکر کہتے ہیں کہ تم خدا کے رسول ہو۔ یہ اپنے دعویٰ میں جھوٹے ہیں۔ ۱۳۸ تا ۱۴۴
.. خدا، اس کے رسولؐ اور اس نور پر ایمان لے آؤ جسے ہم نے نازل کیا۔ ۱۷۴

❊ ❊ ❊

امامت

.. امامِ جماعت کی طرح امامِ جمعہ کا عادل ہونا بھی شرط ہے۔ لیکن بعض علماء کے نزدیک نمازِ جمعہ امامِ معصوم

کے زمانہ حضور سے مربوط ہے۔ ۱۳۱

❊ ❊ ❊

قیامت

.. تم ہرگز موت (حیات بعد الموت) کی تمنا نہ کرو گے۔ موت جس سے تم بھاگتے ہو وہ تمہیں آپکڑے گی اور تم خدا کی طرف پلٹائے جاؤ گے۔ جہاں تمہارے افعال سے تمہیں خبر دی جائے گی۔ ۱۱۴، ۱۱۵

.. پروردگار کی قسم تم سب کے سب قیامت میں زندہ کر کے اٹھائے جاؤ گے۔ ۱۷۳

.. یہ اس وقت ہوگا جب وہ تمہیں اجتماع (تغابن) کے دن جمع کرے گا۔ ۱۷۴

.. یقیناً مرنے کے بعد ایک دن اٹھائے جائیں گے۔ غبنون آشکار ہوگا۔ ۱۷۴ تا ۱۷۸

.. تم سب کی بازگشت اسی کی طرف ہے۔ ۲۹۱

.. زمین اس کے حکم سے پھٹ جائے تمہیں نگل لے اور کانپتی رہے۔ ۲۹۲

.. وہی تو ہے جس نے تمہیں پیدا کیا۔ پھر اسی کی طرف لوٹ جاؤ گے۔ قیامت کا وعدہ کب پورا ہوگا، اس کا علم تو اللہ ہی پاس ہے۔ اس وعدۂ الٰہی کو دیکھ کر چہرے سیاہ ہو جائیں گے۔ ۳۰۲

.. کیا ایسا کوئی عہد و پیمان تم نے ہم سے لے لیا ہے جو قیامت میں برقرار رہے گا؟ ۳۵۲، ۳۵۳

.. سجدے کی دعوت دی جائے گی۔ مومن تو کر سکیں گے مگر مجرموں میں اتنی طاقت ہی نہ ہوگی آنکھیں جھک جائیں گی۔ ۳۵۴

.. وہ دن جو واقع ہوگا وہ کیا ہے تو کیا جانے وہ کیا ہے۔ ۳۷۴

.. وہ دن جس میں یہ عظیم واقعہ ہوگا۔ صور پھونکا جائے گا۔ آسمان پھٹ جائیں گے۔ عرش الٰہی کو آٹھ فرشتے اٹھالیں گے۔ ۳۸۲ تا ۳۸۷

.. تم سب بارگاہِ خدا میں پیش ہوگے۔ عمل میں سے کوئی چیز پوشیدہ نہ نہ رہے گی۔ جس کا نامۂ عمل دائیں ہاتھ میں ہوگا وہ کہے گا لو میرا نامہ عمل پڑھو۔ ۳۸۸ تا ۳۹۱

❊ ❊ ❊

جنت

.. تمہارے گناہ بخش دے گا، جنت میں داخل کرے گا۔ یہ بڑی کامیابی ہے۔ ۱۷۴ تا ۱۷۷

.. ایمان والو توبہ کرو اللہ تمہارے

گناہ بخش دے گا اور جنّت میں داخل کرے گا۔ ۲۵۱
.. متقین کے لیے ان کے ربّ کے پاس جنّت کے شاداب باغات ہیں۔ ۳۵۱ ، ۳۵۲
.. ایک عالی جنّت جس کے پھل اہلِ جنت کھائیں گے۔ ۳۸۸ تا ۳۹۱

❖ ❖ ❖

دوزخ

.. جو لوگ کافر ہو گئے، ہماری آیات کی تکذیب کی وہ دوزخ والے ہیں۔ ۱۷۴
.. جنھوں نے اپنے پروردگار کا کفر کیا ان کے لیے جہنم کا عذاب ہے، اور بُرا ٹھکانا ہے۔ دوزخی خدا کی رحمت سے دُور ہیں۔ ۲۸۲

احکام

جہاد

.. سورہ صحف اولاً اسلام کی برتری دوم اسلام کی حفاظت اور ترقی کے لیے لزومِ جہاد کو بیان کرتی ہے۔ ۶۵
.. اے ایمان والو! کیا میں تمھیں ایسی تجارت (جہاد) کی طرف رہبری نہ کروں جو تمھیں عذاب سے نجات دے۔ ۸۹
.. حواریوں کی طرح ہو جاؤ۔ اپنے رسول کی نصرت میں جہاد کرو، تم غالب ہو جاؤ گے۔ ۹۴ ، ۹۵

طلاق

شرائط طلاق

.. عدت (طہر، جب وہ پاک ہو جائے اور مباشرت بھی نہ کی ہو) میں طلاق دو، گھر سے نہ نکالو، نہ وہ خود نکلے۔ لیکن فحش سرزد ہو جائے۔ یہ اللہ کی حدود ہیں، پابندی کرو۔ ۱۹۷ تا ۲۰۰

طلاق ارذل جواز

.. اس موضوع پر رسول پاکؐ اور آئمہ کی احادیث، نیز اسبابِ طلاق ۲۰۱ تا ۲۰۵

فلسفۂ عدّت

.. حفاظت نسل۔ علیٰحدگی کے عوامل کو ختم اور رجوع کرنے کا وسیلہ۔ ۲۰۵ ، ۲۰۶
.. صلح یا حکمِ خدا کے مطابق علیٰحدگی۔ بعنوانِ شائستہ رخصت کرو۔ ۲۰۸ ، ۲۱۰

مُطلّقہ کے احکام وحقوق

.. نابالغہ، یائسہ اور حاملہ کی عدّت اور کفالت ۲۱۵ ، ۲۲۴

طلاق رجعی کے احکام

.. مسکن ونفقہ کی رعایتیں صرف طلاق رجعی میں ہیں بائن میں نہیں۔ ۲۲۲

امر بالمعروف ونہی عن المنکر

.. اپنے اہلِ خانہ کو امر بالمعروف ونہی عن المنکر کرو، اگر انھوں نے قبول کر لیا تو جہنم کی آگ سے بچ گئے، ورنہ تمھاری ذمہ داری ختم ہو گئی۔ (حدیثِ رسول) ۲۵۸

اخلاقیات

اخلاقِ حسنہ

.. تیرے اخلاق کتنے عمدہ ہیں۔ قسم ہے قلم کی اور نوشتۂ قلم کی تو مجنون نہیں ہے۔ محبت علیؑ کے سبب ایک قریش آپؐ کو مجنون کہتا تھا۔ ۳۱۸، ۳۲۱
.. عزت خدا اس کے رسول اور مومنین کے لیے ہے۔ رسول مومنین اور خدا کے دوست۔ خدا ہی کے پرتو کے حامل ہیں۔ ۱۵۵
.. علامہ سوشتری کا واقعہ ۱۶۰، ۱۶۱
.. اسلام، ایمان، تواضع، توبہ، پابندی صوم صلوٰۃ اچھی بیوی کے اوصاف ہیں۔ ۲۴۶، ۲۴۷

اخلاقِ رذیلہ

.. منضوب علیہ قوم سے دوستی نہ کرو۔ جن پر اللہ کا غضب نازل ہوا، ان میں کفار و مشرکین کے علاوہ منافق بھی شامل ہیں۔ ۶۰ تا ۶۲
.. منافق بے اخلاص اور ٹوٹنے والا ہے۔ اکڑ کر کھڑا ہو جاتا ہے۔ یہاں تک کہ ٹوٹ کر بے بس ہو جاتا ہے۔ ۱۵۵
.. تکذیب کرنے، جھوٹی قسمیں کھانے والوں، عیب جو، چغلخور، ایسے بدصفات لوگوں کی پیروی نہ کرو۔ ۳۳۱، ۳۳۵
.. ارتکابِ گناہ سے روزی منقطع ہو جاتی ہے۔ (امام محمد باقرؑ) ۳۴۹

اقوامِ گذشتہ

قومِ ثمود

.. قومِ عاد و ثمود نے خدا کے عذاب کا انکار کیا۔ قومِ ثمود سرکش عذاب سے ہلاک ہوئی۔ ۳۷۵، ۳۷۶

قومِ عاد

.. قومِ عاد ایک زناٹے دار ٹھنڈی تیز آواز آندھی سے ہلاک ہو گئی، جو سات

راتیں اور آٹھ دن مسلسل چلتی رہی۔ ۳۷۴ ، ۳۷۶

قوم لُوطؑ

.. قوم لوط ایک شدید زلزلے اور پھر پتھروں کی بارش سے ہلاک ہوئی۔ ۳۷۹

قوم فرعون

.. قوم فرعون نیل کی موجوں میں غرق ہوئی ۳۷۹

قوم نمرُود

.. من قبلہ سے مراد وہ قومیں جو فرعون سے پہلے تھیں، قوم نمرود و قوم شعیب ہلاک ہوئیں۔ ۳۷۹

قوم نوحؑ

.. کشتی اور طوفان کا ذکر ۳۷۹ ، ۳۸۰

شخصیات

آسیہ بنتِ مزاحم (زوجہ فرعون)

.. آسیہ نے فرعون سے نجات اور اپنے لیے مقامِ جنت کی دعا کی۔ ۲۶۵

ابراہیمؑ

تمھارے لیے ابراہیمؑ اور ان کے ساتھیوں کی زندگی میں اچھا نمونہ ہے ۳۵

.. بیشک ابراہیمؑ مہربان اور بردبار تھا۔ ۳۸

ابوجہل

.. ابوجہل رسولِ پاکؐ کو شاعر کے عنوان سے متعارف کراتا تھا۔ ۴۰۸

ابوذر غفاری

.. خدا پرہیز گاروں کو شبہات، قیامت اور موت کی سختی سے نجات دے گا۔ (حدیثِ رسولؐ) ۲۱۱

ابوطالبؑ

.. آپ نے اپنے اشعار میں رسولِ پاکؐ کا اسمِ گرامی احمد نظم کیا ہے۔ ۸۱

ابوالاسود

.. جناب امیر کے زمانہ کا ایک ادیب جس نے جناب امیر کے حکم سے قرآنی الفاظ پر اعراب لگائے۔ ۴۰۴

اسعد بن زرارہ

.. ہجرت سے قبل مدینہ میں نماز جمعہ کی بحکمِ رسولؐ اقتداء کی۔ ۱۲۴

اسید انصاری

.. عبداللہ بن ابی سے مکالمہ میں زید بن ارقم کی مدد کیا کرتے تھے۔ ۱۴۷ ، ۱۴۸

امّ حبیبہؓ

.. مسلمان ہو کر اپنے شوہر عبیداللہ کے ساتھ حبشہ کی طرف ہجرت کی۔ عبیداللہ کے عیسائی ہو جانے پر رسول پاکؐ سے عقد ہوا۔ ۴۵

براء بن عازب

.. میں نے حسنؑ بن علیؑ کو پیغمبرؐ کے دوش پر دیکھا جبکہ آپ فرما رہے تھے خدایا میں اسے دوست رکھتا ہوں تو بھی اسے دوست رکھ۔ ۱۸۸

جعفر بن ابی طالب

.. مہاجرین حبشہ کے قائد حضرت علیؑ کے بھائی۔ ۴۵

جعفرؑ بن محمدؑ (صادق)

.. لوگوں کو اپنے عمل کے ذریعہ دعوت دو نہ کہ زبان کے ذریعہ۔ ۴۲

.. جو شخص خدا کیلئے دوستی، دشمنی اور عطاء و بخشش کرتا ہے اس کا ایمان کامل ہے۔ ۴۳

مومن کا اپنے بھائی سے وعدہ کرنا ایک نذر ہے۔ جو وعدہ کر کے خلاف ورزی کرے گا اُس نے خدا کی مخالفت کی۔ ۷۰

.. عالم وہ ہے جس کا عمل اس کے قول کی تصدیق کرے۔ ۷۳

.. ہر مومن شب جمعہ میں سورۂ جمعہ و اعلیٰ اور بروز جمعہ ظہر میں سورۂ جمعہ و منافقون پڑھے۔ یہ عمل رسولؐ ہے۔ ۱۳۶

.. مناسب نہیں کہ مومن اپنے آپ کو ذلیل کرے۔ ۱۵۶

.. جو شخص سورہ تغابن پڑھے گا تو یہ سورہ قیامت میں اس کی شفیع ہو گی۔ ۱۶۶

.. جس نے زکوٰۃ ادا کر دی اس نے بخل و حرص سے نجات پالی۔ ۱۸۹

.. خداوندا! مجھے میرے حرص و بخل سے بچا۔ ۱۹۰

.. حلال امور میں کوئی چیز طلاق سے زیادہ خدا کے یہاں مبغوض نہیں۔ ۲۰۲

.. عورت کے لیے مناسب نہیں ہے کہ وہ اپنے شوہر کے لیے زینت و آرائش کے بغیر رہے۔ بہت سی عورتیں اپنے شوہر کی عدم توجہی کے سبب جادۂ عفت سے بھٹک گئیں۔ ۲۰۵

.. جو شخص سعی و کوشش اور روزی طلب کرنے کو چھوڑ کر عبادت کرے اس کی دعا قبول نہیں ہوتی۔ ۲۱۲

.. جو شخص سورۂ طلاق و تحریم کو واجب نماز میں تلاوت کرے گا، خدا اُسے قیامت میں خوف و ہراس سے پناہ دے گا، اور جہنم کی آگ سے رہائی دے گا۔ ۲۳۷ ، ۲۳۸
.. رسول پاکؐ نے ہرگز کسی منافق سے جنگ نہیں کی۔ ہمیشہ ان کی تالیفِ قلوب میں لگے رہے۔ ۲۶۳
.. تم میں کون زیادہ صحیح عمل انجام دیتا ہے، جس میں خدا پرستی اور پاک نیت شامل ہو۔ ۲۷۶
.. مہمل کام کبھی درست نتیجہ نہیں دیتے، اور تضاد کسی نظام کا مبتدا نہیں ہوسکتا۔ ۲۷۹
.. اول ماخلق اللہ قلم، اوّل ماخلق اللہ جوہرۃ اول ماخلق اللہ عقل۔ ۳۲۳
.. اگر یہ سب کچھ (عطاء نعمات) حمد و شکر الٰہی کے ساتھ ہو تو عذاب استدراج نہیں ہے، نعمت ہے۔ ۳۵۸
.. عرش سے علم خدا مراد ہے۔ آٹھ حاملینِ عرش میں سے چار ہم ہیں۔ ۳۹۱

* * *

حاطب بن ابی بلتعہ

.. جس نے سارہ مغنیہ کے بدست خط روانہ کر کے مشرکین مکہ کو مسلمانوں کے راز بھیجے۔ ۳۰ ، ۳۱

حسانؓ بن ثابت

.. حسان کے اشعار میں آپؐ کا اسم مبارک احمدؐ مذکور ہے۔ ۸۱ ، ۸۲

حسینؑ بن علیؑ

.. ایک شخص کے جواب میں فرمایا: "مجھ سے بابا جان نے رسولؐ پاک کے خلق عظیم پر ایک طویل حدیث بیان فرمائی۔ ۳۲۶ ، ۳۲۷

حفصہؓ بنتِ عمرؓ (زوجۂ رسول)

.. جن سے رسول پاک نے شہد نہ کھانے کا وعدہ کیا۔ ۲۴۴

ام المومنین خدیجہؑ بنت خویلد (زوجۂ رسولؐ)

.. اہل جنت میں افضل ترین و برترین چار عورتیں ہیں جن میں ایک خدیجہؑ بنت خویلد ہیں۔ (فرمانِ رسولؐ) ۲۶۶

زید بن ارقمؓ

.. زید بن ارقمؓ انصاری کا عبداللہ بن ابی سے مکالمہ ۱۴۷ ، ۱۴۸

زینبؑ بن جحش (زوجہ رسولؐ)

.. آپ کی پھوپھی زاد جو بعد میں زوجۂ رسولؐ ہوئیں۔ ان کے ہاں سے آپ شہد کھاتے تھے۔ ۲۴۳

*

سارہ (مغنیہ)

.. مکی مغنیہ رسول پاکؐ کے پاس مالی امداد طلب کرنے آئی۔ حاطب بن ابی بلتعہ کا ایک خط مشرکینِ مکہ کے نام لے گئی۔ ۳۰، ۳۱

سبیعہ

.. ایک عورت جو مسلمان ہو کر حدیبیہ ہی میں مسلمانوں سے آملی۔ اس کے شوہر نے رسول اللہؐ سے اس کی واپسی کا مطالبہ کیا۔ ۴۹

سلیمان بن صرد

.. کوفہ کے شیعوں کا سرگروہ جس کے یہاں جمع ہو کر شیعہ مشورہ کرتے تھے۔ ۱۲۷

صعصعہ بن صوحان

.. جناب امیر کے صحابی نے قرآنی الفاظ پر اعراب لگانے کی روایت بیان کی۔ ۴۰۲، ۴۰۴

عائشہ

.. حفصہ زوجۂ رسولؐ نے ان سے رسولؐ کے راز کی بات کہہ دی۔ ۲۴۳

عبداللہ بن ابی

.. منافقین کا سرغنہ نہایت وجیہہ موٹا تازہ ۱۴۳

عبداللہ بن جحش

.. اسلام لانے کے بعد جنگِ اُحد میں شہادت پائی ۴۵

عبداللہ بن عباسؓ

.. مہاجر عورتوں کا امتحان یہ تھا کہ ان سے قسم لی جائے کہ وہ اسلام کی خاطر ہی ہجرت کرتی ہیں۔ میں نے عمرؓ بن خطاب سے دریافت کیا کہ پیغمبرؐ کے خلاف کن دو بیویوں نے اتفاق کر لیا تھا۔ کہا عائشہؓ اور حفصہؓ نے۔ ۲۴۵

.. حفصہؓ اور عائشہ کے بارے میں طویل روایت۔ ۲۴۵، ۲۴۶

عبداللہ زنجانی

.. عبداللہ نے تاریخ القرآن میں ابن ندیم سے نقل کیا ہے کہ تغابن تیسواں مدنی سورہ ہے ۱۶۵

عبیداللہ بن جحش

.. ام حبیبہ بنت ابوسفیان کا شوہر جس نے مسلمان ہو کر حبشہ کی طرف ہجرت کی، مگر وہاں جا کر عیسائی دین اختیار کر لیا۔ ۴۵

عبدالرحمٰن بن کعب

.. ایک محدث نے عبدالرحمٰن بن کعب سے نقل کیا ہے کہ "میرا باپ جب اذانِ جمعہ سنتا تو اسعد بن زرارہ کے لیے دعاءِ رحمت کرتا۔ ۱۲۵

عتبہ یا عقبہ (مشرکِ مکہ)

رسولِ پاک کو کاہن کہتا تھا۔ ۴۰۸

علیؑ بن ابی طالبؑ

.. مالک اشتر کے بارے میں اہالیان مصر کے نام مکتوب کی عبارت ۶۰

.. تم لوگوں سے وعدہ کرو اور پھر وعدے سے تخلف کرو۔ اس سے پرہیز کرنا، یہ موجبِ غضبِ خدا ہے۔ ۷۰

.. تم اپنی صفوں کو آہنی دیوار کی طرح مستحکم کر لو، دانتوں کو مضبوطی کے ساتھ بھینچ کر رکھو۔ (صفین کے مجاہدوں سے) ۷۱

.. اہلِ عراق سے محفل میں ڈینگیں مارتے ہو، اور میدانِ جنگ میں ہائے وائے کرتے ہو۔ ۷۳

.. میں تو خدا کے لیے احمد کی نصرت میں کوشش کرتا ہوں۔ ۸۲

.. جو لوگ بیدار و آگاہ ہیں، دنیا ان کے لیے بہت بڑا سرمایہ ہے۔ دنیا دوستان خدا کی تجارت گاہ ہے۔ ۹۳

.. وہ اللہ کی نعمتوں میں غرق ہیں، اور خوش و خرم زندگی میں شادمان ہیں۔ ۱۰۹

.. خدا کی قسم! ابوطالب کا بیٹا موت سے اِس سے بھی زیادہ مانوس ہے جتنا کہ بچہ اپنی ماں کے پستان سے ہوتا ہے۔ ۱۱۵

.. علم، عمل کے ساتھ توام ہے۔ بے عمل سے علم چلا جاتا ہے۔ عالمِ بے عمل پر حجت بہت بھاری ہے۔ اس کے لیے دائمی حسرت ہے۔ (دو احادیث) ۱۱۶

.. جو کچھ دل میں ہے اس سے بڑھ کر خضوع و خشوع کرنا ہمارے نزدیک نفاق ہے۔ ۱۶۲

.. کوئی خدا سے نہ کہے کہ میں تجھ سے امتحان اور آزمائش سے پناہ چاہتا ہوں۔ اولاد و ازواج ذریعۂ آزمائش ہیں۔ ۱۸۷

.. شریف اور بڑے آدمی اپنے حق کے لیے آگے تک نہیں جاتے۔ ۲۴۴

.. تمام خیر و خوبی نیک افراد کی دوستی اور راز پوشیدہ رکھنے میں ہے اور تمام شر افشائے راز اور اشرار کی دوستی میں ہے۔ ۲۴۹ ، ۲۵۰

.. اپنے اہلِ خانہ کو آگ سے بچانے کا مفہوم یہ ہے کہ انھیں نیکی کی تعلیم دو، اور آداب سکھاؤ۔ ۲۵۸ ، ۲۵۹

.. آدمؑ کا جبریل سے عقل، حیا، دین میں عقل کو اختیار کرنا۔ ۲۸۶ ، ۲۸۷

.. نظرِ بد بھی حق اور اس کے لیے تعویذ سے متوسل ہونا بھی حق ہے۔ ۳۶۷
.. حاملینِ عرش وہ علماء و دانش ور ہیں جنھیں خدا نے اپنے علم کی تعلیم دی۔ ۳۹۲

* * *

علیؑ بن الحسینؑ

.. جو بھی سورہ ممتحنہ کو واجب اور مستحب نمازوں میں پڑھے گا، خدا اس کے دل کو ایمان کے لیے خالص اور آمادہ کرے گا۔ نورِ بصیرت عطا ہو گا فقر و فاقہ دور ہو گا وہ اور اسکی اولاد جنون میں گرفتار نہ ہو گی۔ ۲۸
.. خداوندا! یہ مقام (نمازِ جمعہ اور عید قربان) تیرے خلفاء اور برگزیدہ ہستیوں کے لیے مخصوص تھا۔ بنی امیہ نے زبردستی اولیاء حق سے لے لیا۔ ۱۲۸
.. منافق نہی عن المنکر اور امر بالمعروف کرتا ہے مگر دونوں کے خلاف عمل کرتا ہے۔ ۱۶۲
.. تو ہی تو ہے جس نے اپنی عفو و بخشش کی طرف اپنے بندوں کے لیے توبہ کا دروازہ کھولا ہے۔ ۲۵۹

علیؑ بن موسیٰؑ

.. مسلمانوں کے امیر کو جمعہ کا خطبہ یہ موقع فراہم کرتا ہے کہ وہ لوگوں کو وعظ و نصیحت کرے۔ ۱۳۱

عرشِ خدا اس (خدا) کے علم و قدرت کا نام ہے۔ ۳۹

عمر بن مسلم (صحابی امام صادقؑ)

.. آپؑ نے عمر کو تنبیہ کی جبکہ اس نے تجارت چھوڑ کر عبادت شروع کر دی۔ فرمایا، وائے ہو اس پر۔ ۲۱۲

عوف بن مالک (صحابی)

.. عوف کو رسول پاکؐ نے تقویٰ کی ہدایت کی۔ اس کا گرفتار بیٹا دشمن کی غفلت سے فرار کر آیا اور دشمنوں کا ایک اونٹ بھی لے آیا۔ ۲۱۲

عیسیٰؑ بن مریمؑ

.. میں تمھاری طرف خدا کا بھیجا ہوا ہوں، توراۃ کی تصدیق کرتا ہوں اور اپنے بعد آنے والے رسول احمدؐ کی بشارت دیتا ہوں۔ ۷۵

فاطمہؑ بنت محمدؐ

.. افضل النساء اہل الجنۃ چار ہیں جن میں سے ایک سیدۃ النساء فاطمہؑ بنت محمدؐ ہیں۔ (رسول پاکؐ) ۲۶۶

فرعون

جناب موسیٰؑ کے زمانہ کا بادشاہِ مصر ۳۷۸

محمدؐ بن عباس

.. محدث بحرانی نے البرہان میں محمدؐ بن عباس سے نقل کیا ہے کہ اس سلسلہ (فضیلتِ علیؑ) میں تیس احادیث عامہ و خاصہ کے طرق سے نقل ہوئی ہیں۔ ۳۸۱

محمدؐ بن عبداللہؐ (نبی آخر)

.. جو سورہ ممتحنہ کی تلاوت کرے قیامت کے دن تمام مومنین و مومنات اس کے شفیع ہوں گے۔ ۲۷

.. خدا کی خاطر دشمنی و دوستی اور بخل و بخشش ایمان کو محکم کرتی ہے۔ ۴۳

.. جو شخص سورۂ صف کو پڑھے حضرت عیسیٰؑ اس کے لیے استغفار و دعائے رحمت کریں گے۔ ۶۵

.. 'احمدؐ' نام کے ثبوت میں ابوطالب اور علی ابن ابی طالب کے اشعار۔ ۸۱ ، ۸۳

.. واقعہ معراج میں آپؐ کو احمدؐ نام سے خطاب کیا گیا۔ ۸۲

.. جو لوگ نمازِ جمعہ میں شریک ہوں انہیں شرکاء نماز و عدم شرکاء کی تعداد سے دس گنا ثواب ملے گا۔ ۱۰۱

.. جس کا علم زیادہ ہو لیکن اس کی ہدایت میں اضافہ نہ ہو تو یہ علم اسے خدا سے دوری کے سوا کچھ نہیں دیتا۔ ۱۱۵

.. عالمِ بے عمل، عالم کی تمام ذمہ داریاں اٹھانے کے باوجود علم سے بہرہ مند نہیں ہوتا۔ ۱۱۶

.. جو شخص نمازِ جمعہ بطور استخفاف ترک کرے، اس کا ہر ایک عمل نماز، زکوٰۃ ناقبول، خدا اُسے پریشان حال کرے گا اور ہر شے سے برکت اٹھ جائے گی۔ ۱۲۵

.. جو شخص از روئے ایمان خدا کے لیے نمازِ جمعہ میں شرکت کرے، اس کے گناہ بخش دیئے جائیں گے۔ ۱۲۶

.. تو نمازِ جمعہ پڑھ یہی تیرا حج ہے۔ (ایک شخص کو ہدایت) ۱۲۶

.. جو شخص سورۃ منافقون کی تلاوت کرے گا ہر قسم کے نفاق سے پاک ہو جائیگا۔ ۱۳۵

میں تم میں سے اس منافق سے ڈرتا ہوں جس کی زبان سے علم ٹپکتا ہے۔ ۱۵۴

.. مومن زراعت کی طرح ہیں جنھیں ہوائیں گرا دیتی ہیں مگر وہ پھر بھی کھڑی ہو جاتی ہیں۔ ۱۵۵

.. خدا نے مومن کے تمام کام خود اس کے سپرد کر دیئے ہیں۔ پس لازم ہے کہ وہ ہمیشہ عزیز رہے، ذلیل و خوار نہ ہو۔ ۱۵۶

.. منافق امانت میں خیانت، جھوٹی بات اور وعدہ خلافی کرتا ہے۔ ۱۶۱

.. سورہ تغابن پڑھنے والا ناگہانی موت

سے محفوظ رہے گا۔ ۱۶۶
.. کوئی مولود پیدا نہیں ہوتا مگر اس کے سر کے مشکوں (جالیوں) پر سورہ تغابن کی پانچ آیتیں لکھی ہوتی ہیں۔ ۱۹۹
.. کوئی عمل خدا کے نزدیک طلاق سے زیادہ قابلِ نفرت نہیں ہے۔ ۲۰۲
.. نکاح کرو، طلاق نہ دو، طلاق سے عرشِ الٰہی کانپتا ہے۔ ۲۰۲
.. تمام انسان اس (من یتق اللہ سورۂ طلاق) کے دامن کو تھام لیں تو حلِ مشکلات کے لیے کافی ہے۔ ۲۱۱
.. جو روزی کے لیے سعی و کوشش کو چھوڑ کر عبادت کرے گا اس کی دعا قبول نہ ہو گی۔ ۲۱۲، ۲۱۳
.. توبۂ نصوح یہ ہے کہ توبہ کرنے والا گناہ کی طرف نہ لوٹے، جیسے دودھ کبھی پستان کی طرف نہیں لوٹتا۔ ۲۵۶
.. اپنے اہلِ خانہ کو امر بالمعروف و نہی عن المنکر کر لیا، تو نارِ جہنم سے بچ گئے ورنہ تیری ذمہ داری ختم ہو گئی۔
تم سب نگہبان اور جوابدہ ہو جن کی نگہبانی پر مامور ہو۔ بیوی اپنے شوہر کے گھرانے کی نگہبان ہے۔ ۲۶۰
.. کسی بھی پیغمبر کی بیوی ہرگز منافی عفت عمل سے آلودہ نہیں ہوئی۔ ۲۶۴
برگزیدہ مستورات چار ہیں۔ خدیجہؑ بنتِ خویلد، فاطمہؑ بنت محمدؐ، آسیہ بنت مزاحم اور مریم بنت عمران ۲۶۶
.. سورۂ ملک کی فضیلت کی دو حدیثیں۔ ۲۷۱
.. تم میں کس کی عقل و خرد کامل اور خدا ترسی زیادہ ہے۔ خدائی امر و نہی سے کون زیادہ واقف ہے۔ ۲۷۵، ۲۷۶
.. احمق کی حماقت سے جو مصیبت آتی ہے وہ فاجر و بدکار کے گناہ سے بدتر ہوتی ہے۔ ۲۸۵
.. علماء کے قلم کی آواز، مجاہدین کے قدموں کی چاپ، پاک دامن عورتوں کے چرخوں کی آواز، تمام حجابوں کو توڑ کر بارگاہِ الٰہی میں پہنچتی ہیں۔ ۳۲۵
.. میں اس لیے مبعوث ہوا ہوں کہ اخلاقی فضائل کی تکمیل کروں۔ ۳۲۷
.. مومن اپنے حسنِ خلق کے باعث راتوں کو عبادت اور دنوں کو روزے رکھنے والے کے درجے تک پہنچ جاتا ہے اور دیگر احادیث۔ ۳۲۷
.. شریر ترین افراد چغلخور ہیں۔ دیگر دو احادیث۔ ۳۳۶
.. اگر کوئی چیز قضا و قدر پر سبقت لے سکتی ہے تو وہ نظرِ بد ہے۔ ۳۶۷
.. حسنؑ و حسینؑ کے لیے تعویذ بنایا اور فرمایا ابراہیمؑ نے اسمٰعیلؑ و اسحٰقؑ کے لیے اسی طرح تعویذ بنایا تھا۔ ۳۶۷

محمد بن علیؑ (باقرؑ)

.. جو سورۂ صف کو واجب اور مستحب نمازوں میں تلاوت کرے گا خدا اُسے انبیاء و مرسلین کی صف میں قرار دے گا۔ ۶۶

.. پیغمبر اسلام کے دس نام تھے۔ پانچ قرآن میں موجود ہیں۔ محمد، احمد، عبداللہ، یٰسٓ ۔ ۸۲

.. نمازِ جمعہ ایک فریضہ ہے۔ امام (معصوم) کے ساتھ اجتماع واجب ہے۔ جب کوئی تین جمعہ ترک کر دے تو اس نے تین فریضے ترک کر دیئے۔ تین فرائض بغیر کسی علت کے ترک نہیں کرتا، مگر منافق۔ ۱۲۵

.. آگے پیچھے دو بھیڑیے گلّہ کو اتنا نقصان نہیں پہنچاتے، جتنا مال و اولاد کی محبت مومن کے دین کو نقصان پہنچاتی ہے۔ ۱۵۸

.. اور وہ (آئمہ) وہی ہیں جو مومنین کے دلوں کو نور اور روشنی بخشتے ہیں۔ ۱۷۶

.. مطلقہ عورت عدت کے دوران شوہر کے گھر رہتے ہوئے ہر طرح کی آرائش کرے۔ ۲۰۱

.. رسول پاکؐ نے امیرالمومنینؑ کا تعارف کرایا اے لوگو! یہ صالح المومنین ہے۔ ۲۴۸

.. خداوند کریم اپنے بندوں کی توبہ سے ایسے خوش ہوتا ہے جیسے کوئی گم شدہ شے پاکر خوش ہوتا ہے ۲۵۹

.. توبہ کرنے والا شخص ایسا ہے جیسے اس نے کوئی گناہ کیا ہی نہ ہو۔ ۲۶۰

.. سورہ ملک کی تلاوت عذابِ قبر سے بچاتی ہے۔ ۲۷۱

.. اگر تمہارا امام غائب ہو جائے تو کون تمہارے لیے امام بھیجے گا۔ ۳۱۰

.. مومنین میں سے اس کا ایمان سب سے بہتر ہے، جس کے اخلاق زیادہ کامل ہیں۔ ۳۲۸ ، ۳۲۹

.. ارتکابِ گناہ سے بعض اوقات روزی منقطع ہو جاتی ہے۔ ۳۴۹

مریمؑ بنت عمران (والدۂ جناب عیسیٰؑ)

.. جنت میں چار عورتیں برگزیدہ ہیں جن میں سے ایک مریم بنت عمرانؑ ہیں (رسول پاکؐ) ۲۶۶

معاذؓ بن جبل (صحابی)

.. معاذ نے رسول پاکؐ سے توبۃ نصوح کی تشریح معلوم کی۔ ۲۵۶

موسیٰؑ بن عمران

.. مجھے کیوں اذیت دیتے ہو حالانکہ میں تو تمہاری طرف بھیجا ہوا رسول ہوں۔ ۷۵

نعمان بن بشیر

سنہ ۶۰ھ میں کوفہ کا گورنر تھا۔ ۱۲۷

والعہ (زوجہ لوطؑ)

.. جناب لوطؑ کے راز قوم لوط کو بتاتی تھی، واصل جہنم ہوگی۔ نبی کی بیوی ہونا اُسے کوئی فائدہ نہ دے گا۔ ۲۶۲

والعہ (زوجہ نوحؑ)

.. جناب نوح کی مخالف رہی، خیانت کی، داخل جہنم ہوگی۔ نبی کی بیوی ہونا اُسے کوئی فائدہ نہ پہنچائے گا۔ ۲۶۲

ولید بن مغیرہ

.. مشرکین مکہ کا سرغنہ جس نے رسول پاکؐ کو مال و دولت کا لالچ دیا۔ ۳۳۲

ہارون الرشید

.. عباسی خلیفہ کی بیماری، طبیب کی آمد، تشخیص مرض، وصیت اور حسرت ناک موت ۲۹۶ تا ۲۹۸

ہندہ بنت عتبہ بن ربیعہ

.. رسول پاکؐ کا شرائط بیعت بیان فرمانا اور ہندہ کے جوابات۔ ۵۹

عُلماء و دانشور

آلوسی (مفسّر) ۲۴۸
ابن منظور (لسان العرب) ۳۸۰
ابوحیان اندلسی ۲۴۸
ابوالفتوح رازی (مفسّر) ۵۹
بحرانی محدث (البرہان) ۲۴۸ ، ۳۸۱
ثعلبی (مفسّر) ۲۴۸
جلال الدین سیوطی (مؤرخ و مفسر) ۵۹ ، ۱۰۸ ، ۲۴۸
حکیم ابوالقاسم حسکانی ۳۰۶
راغب (مفردات) ۸۶ ، ۹۲ ، ۱۷۷ ، ۲۴۳ ، ۲۶۴ ، ۳۳۳ ، ۳۸۰ ، ۳۸۵ ، ۳۹۰ ، ۴۰۲
زمخشری ۱۰۸
سبط ابن جوزی ۲۴۸
طباطبائی (المیزان) ۷۰ ، ۱۰۸
طبرسی (مجمع البیان) ۱۰۸
عبداللہ زنجانی (تاریخ القرآن) ۱۶۵
فخر رازی (کبیر) ۲۸۹
قرطبی (مفسّر) ۱۰۸ ، ۲۴۸
قطب (سیّد) ۱۰۸
گنجی (علّامہ) ۲۴۸
محمد بن عباس (ابوعبداللہ جوابن الحجام مشہور ہے۔) ۲۴۸
محمد بن عباس (قمی) ۳۸۱
مراغی ۱۰۸

کُتبِ آسمانی

توریت و انجیل

.. وہ لوگ خدا کے بھیجے ہوئے پیغمبر کی پیروی کرتے ہیں، وہی پیغمبر کہ جس کی صفات توریت میں پاتے ہیں۔ ۷۸

.. جو لوگ تورات کے مکلّف قرار دیے گئے ہیں مگر اس کا حق ادا نہ کیا وہ گدھے پر کتابیں لادنے کی مثال ہیں :۔ ۱۱۰

.. عہدین (توریت و انجیل) میں ایسی بہت سی تعبیریں نظر آتی ہیں جو ایک عظیم ظہور کی بشارت دیتی ہیں وہ نشانیاں پیغمبر اسلام پر ہی پوری ہوتی ہیں۔ ۷۹

انجیل یوحنا

.. وہ تمھیں دوسرا تسلّی دینے والا دے گا جو ابد تک تمھارے ساتھ رہے گا۔ ۷۹

.. سچائی کی رُوح جو میرے باپ کی طرف سے آئے گی وہ میرے بارے میں شہادت دے گی۔ ۷۹

.. میں چلا جاؤں تو اُسے تمھارے پاس بھیج دوں گا۔ ۸۰

.. سریانی اناجیل میں فارقلیطا آیا ہے۔ یونانی اناجیل میں پیرکلوتوس آیا ہے جو محمد و احمد کا معادل ہے۔ ۸۰

قرآن کریم

.. قرآن کی نشر و اشاعت، عظمت اور تحریف کے بارے میں مفسّر کی کچھ گذارشات ۱۵ تا ۱۸

سورہ ممتحنہ کے مضامین

.. حب فی اللہ اور بغض فی اللہ کا مسئلہ اور مشرکین سے دوستی کی ممانعت ۲۷

سورہ ممتحنہ کی تلاوت کے فضائل

.. قاری سورہ کے قیامت میں تمام مومنین اور مومنات شفیع ہوں گے۔ (رسولؐ) ۲۷ ، ۲۸

سُورہ صف کے مضامین

.. اسلام کی دیگر آسمانی ادیان پر برتری ۶۵

سورہ صف کی تلاوت کے فضائل

.. قاری سورہ کے لیے حضرت عیسیٰؑ دعاء رحمت کریں گے۔ ۶۵

سورہ صف کی شان نزول

.. جنگ اُحد سے بھاگنے والے ۶۸

سورہ جمعہ کے مضامین

.. توحید، صفاتِ خدا، ہدفِ بعثت، معاد

نماز جمعہ کا اصلاحی نقشہ اور کاروبار کی تعطیل ۱۰۱

سورہ جمعہ کی تلاوت کے فضائل

.. سورۂ جمعہ پر ارشاداتِ رسول ۱۰۲
.. نماز جمعہ اور خطبہ کے لیے دوڑتے ہوئے آنا، ختم نماز کے بعد ذکرِ خدا، تلاشِ فضل، بھاگنے والوں کی مذمت۔ ۱۲۱ تا ۱۲۳

سورہ منافقون کے مضامین

.. منافقین کی نشانیاں، ہوشیار رہنا۔ قبل از موت راہِ خدا میں خرچ کرنا۔ ۱۳۵

سورہ منافقون کی تلاوت کے فضائل

.. ہر قسم کے نفاق سے پاک ہو جائے۔ (فرمانِ رسولؐ) ۱۳۵

سورہ منافقون کی شانِ نزول

.. عبداللہ بن ابی کا ایک انصاری کی مدد کو آنا، مہاجرین کو بُرا بھلا کہنا۔ زید بن ارقم و اسید انصاری کی گفتگو۔ ۱۴۶ تا ۱۴۸

سورہ تغابن کے مضامین

.. توحید، خدا کی صفات و افعال پر بحث، تیسرا حصہ معاد پر گفتگو ۱۶۵

سورہ تغابن کی تلاوت کے فضائل

قاری ناگہانی موت سے محفوظ رہے گا۔ ۱۶۶
.. خدا، اس کے رسولؐ اور اس نور پر ایمان لے آؤ (قرآن) جسے ہم نے نازل کیا۔ ۱۷۴
سورہ تغابن کی آخری آیات کی شانِ نزول پر امام محمد باقرؑ کی حدیث ۱۸۴

سورہ طلاق کے مضامین

.. طلاق کے احکام خصوصیات اور نتائج مبداء و معاد، نبوت و بشارت و نذارت۔ ۱۹۵

سورۂ طلاق کی تلاوت کے فضائل

.. قاری سورہ اور اس پر کاربند دنیا سے سُنّتِ پیغمبرؐ پر جائے گا۔ ۱۹۵
.. ذکر سے مراد قرآن ہے۔ ۲۲۸، ۲۲۹

سورہ تحریم کے مضامین

.. پیغمبرؐ کی بعض ازواج کا ذکر، مومنین سے خطاب، مریم و آسیہ کا ذکر ۲۳۷

سورہ تحریم کی تلاوت کے فضائل

.. خدا قاری سورہ کو توبۃ النصوح کی توفیق بخشے گا۔ ۲۳۷

سورہ تحریم کی شانِ نزول

.. رسول پاک کی بیویوں نے آپؐ سے سازش کی، عقدہ کھل گیا۔ ۲۴۱

سورۂ ملک کے مضامین

.. مبداء و معاد، ظالم اور کافروں کو انذار ۲۷۱

سورہ ملک کی تلاوت کے فضائل

.. اس کی تلاوت شب قدر میں رات بھر بیدار رہ کر عبادت کرنے کے برابر ہے
سورہ تبارک مومنوں کے دلوں میں ثبت ہو جائے یہ مجھے پسند ہے۔ ۲۷۲

سورۂ القلم کے مضامین

.. رسولِ خدا کی صفات و اخلاق۔ آپ کے دشمنوں کی صفات، جنت، قیامت صبر و استقامت ۳۱۵

تلاوت سورہ کے فضائل

.. قاری سورہ کو حسنِ اخلاق پر فائز لوگوں کا سا ثواب ملے گا۔ (رسولؐ پاک) قسم کھاتا ہوں اس سورۃ کے قاری کو فقر و فاقہ اور فشارِ قبر سے حفاظت ہوگی۔ (امام جعفر صادقؑ) ۳۱۶

سورہ حاقہ کے مضامین

.. قیامت، قوم عاد و ثمود وغیرہ کا بیان، قرآن اور پیغمبر کی عظمت۔ ۳۷۱

سورہ حاقہ کی تلاوت کے فضائل

.. قاری سورہ کا قیامت میں خدا حساب آسان کرے گا۔ (رسولؐ پاک) ۳۷۱
.. قسم کھاتا ہوں اس کی جو تم پر ظاہر ہے، پوشیدہ ہے۔ یہ قرآن بزرگ رسولؐ کی زبان سے نکلا ہوا ہے۔ یہ شاعر کا کلام ہے نہ کاہن کا، رب العالمین کی طرف سے نازل ہوا ہے۔ ۴۰۵ تا ۴۰۹
.. یہ قرآن متقیوں کے لیے تذکر ہے بعض اس کی تکذیب کرتے ہیں۔ یہ کافروں کے لیے حسرت ہے۔ یہ خالص یقین ہے۔ ۴۱۱ تا ۴۱۵

❖ ❖ ❖

کتبِ تاریخ، تفسیر، سیرت

احقاق الحق ۲۴۸
اصول کافی ۳۸، ۴۳، ۷۰، ۷۳
۱۱۶، ۱۵۶، ۱۵۸، ۲۶۰
۲۸۷، ۳۳۶، ۳۵۸
الشہاب فی الحکم والآداب ۳۲۵
الغدیر ۸۲
بخاری ۳۲، ۴۷، ۱۰۸
۲۴۱، ۲۴۵، ۲۶۸
بحار الانوار ۱۲۷، ۱۸۸، ۲۱۴
۲۵۹، ۲۷۹
تاریخ ابن عساکر ۸۱
تاریخ القرآن ۱۶۵
تفسیر المیزان (طباطبائی) ۷۰، ۷۸، ۱۰۸

۱۸۷، ۲۴۴، ۳۲۹
۳۸۱، ۳۹۲،
تفسیر برہان (طبرسی) ۲۳۳، ۲۴۸، ۳۶۷
" درالمنثور (سیوطی) ۵۹، ۸۲، ۹۶
۱۰۸، ۱۲۴، ۱۸۴
۲۴۵، ۲۵۹، ۲۶۴
۲۶۶
" روح البیان ۳۲، ۴۳، ۴۷
۱۴۰، ۱۹۱، ۲۱۲
۲۸۹، ۳۲۵، ۳۲۹
۳۸۱
" روح الجنان (ابوالفتوح رازی) ۵۲، ۵۹۰، ۳۱۰
۳۸۱
" روح المعانی ۳۲، ۴۰، ۱۲۱
۱۲۴، ۱۲۵، ۱۸۷
۲۴۸، ۲۶۴، ۳۸۱
۴۰۲
" صافی ۲۷۶
" علی بن ابراہیم ۱۸۴، ۳۷۵، ۳۸۶
" فی ظلال (قطب) ۸۲، ۹۲، ۱۰۸
۱۸۷، ۲۷۱، ۳۹۳
" قرطبی ۳۲، ۱۰۸، ۱۲۴
۱۸۷، ۲۴۸، ۲۵۵
۲۶۴، ۳۳۲، ۳۸۱
" کبیر (فخررازی) ۳۲، ۴۰، ۲۱۲
۲۸۹، ۳۲۳
" کشاف (زمخشری) ۱۰۸، ۱۴۳
مجمع البیان (طبرسی) ۲۷، ۳۲، ۴۱
۴۹، ۵۰، ۵۹
۶۸، ۱۰۱، ۱۰۲
۱۰۸، ۱۱۰، ۱۲۰
۱۲۲، ۱۲۴، ۱۳۵
۱۶۶، ۱۸۷، ۱۸۹
۱۹۵، ۲۱۱، ۲۱۲
۲۱۸، ۲۳۷، ۲۴۸
۲۵۶، ۲۷۲، ۲۷۶
۲۸۵، ۳۰۶، ۳۱۶
۳۲۲، ۳۲۴، ۳۲۷
۳۲۸، ۳۵۷، ۳۶۷
۳۷۱، ۳۸۱، ۳۸۶
تفسیر مراغی ۳۲، ۲۳۲
نورالثقلین ۳۸، ۷۱، ۸۲
۱۰۱، ۱۰۲، ۱۵۶
۱۷۶، ۱۸۴، ۱۹۰
۲۱۱، ۲۱۲، ۲۳۸
۲۵۸، ۲۸۷، ۳۰۶
۳۱۰، ۳۱۱، ۳۲۲
۳۳۶، ۳۴۹، ۳۵۶
۳۵۸، ۳۹۱، ۳۹۲
" ثواب الاعمال ۲۳۸
" جامع الرواۃ (محمد بن عباس) ۲۴۸
" جواہرالکلام ۵۲، ۲۱۹
" حجۃ البیضاء ۱۱۶
دیوان ابوطالب ۸۱

دیوان حسان بن ثابت ۸۱ ، ۸۲
سفینۃ البحار ۱۱۷ ، ۱۵۴ ، ۱۶۱
۳۲۸ ، ۳۹۷ ، ۳۹۸
سنن ابوداؤد ۳۳۶
سنن بیہقی ۳۴۸
صحیفہ سجادیہ ۱۲۸
غائت المرام ۳۸۱
کامل ابن اثیر ۳۷
کنز العرفان ۲۱۸
لسان العرب (ابن منظور) ۳۸۰
مسلم ۱۵۵ ، ۱۸۸ ، ۱۹۸
مفردات ۸۶ ، ۹۲ ، ۱۷۷ ، ۲۴۳
" ۲۶۴
" ۳۳۳ ، ۳۸۰ ، ۳۸۵
" ۴۰۲
مجمع البحرین ۱۷۴
مکارم اخلاق ۲۰۵
مجموعہ ورام ۲۵۸
معانی الاخبار ۳۲۷
مناقب (ابن مناذلی شافعی) ۳۸۱
نہج البلاغۃ ۵۰ ، ۷۰ ، ۷۱
۷۳ ، ۹۳ ، ۱۰۹
۱۱۵ ، ۱۱۶ ، ۱۱۸
۱۵۲ ، ۱۵۳ ، ۱۸۷
۳۶۷
وسائل الشیعہ ۱۲۵ ، ۱۲۶ ، ۱۳۱
۲۰۲ ، ۲۱۸ ، ۳۲۴
۳۲۹ ، ۳۴۸

لُغاتِ قرآن

الف

احصوا : مادہ 'احصاء' شمار کرنا ۱۹۹

ارجاء : 'رجاء' کی جمع اطراف، کنارے ۳۸۵

اغدوا : مادہ 'غدوہ' دن کا اوّل حصہ صبح کا کھانا۔ ۳۴۱

اقاویل : جمع اقوال کی جمع قول کی مُراد جھوٹی باتیں۔ ۴۱۱

ب

براء : بری کی جمع ۳۷

بضاعت : مادہ ضِعف بروزن شعر کئی گنا کرنا ۱۹۰

ت

تبارک : مادہ 'برکت' پائیدار و دائم نعمت۔ ۲۷۴

تدعون : مادہ 'دُعا' تقاضا کرنا۔ دعا مانگنا۔ انکار۔ ۳۰۵

ترهقهم : مادہ 'رہق' (بروزن شفق) چھپانا۔ گھیرنا۔ ۳۵۶

تعرضون : مادہ 'عرض' کسی چیز کو دکھانا' پیش کرنا۔ ظاہر کرنا ۳۸۹

تعیھا : مادہ 'وعی' (بروزن سعی) کسی چیز کو دل میں محفوظ رکھنا۔ ۳۸۰

تفاوت : دو جانب ۱۷۷

تقوّل : مادہ تقوّل (بروزن تکلف) انسان کی خود گھڑی ہوئی باتیں۔ ۴۱۱

تموس : لرزنا، بے سکون ہونا۔ ۲۹۳

تمیّز : متلاشی و پراگندہ ۲۸۴

تنادوا : مادہ 'ندا' 'ندی' (بروزن غنا) رطوبت۔ ۳۴۱

ج

جُنّة : مادہ 'جن' (بروزن فن) کسی چیز کو جس سے پنہاں کرنا۔ ۱۴۱

ح

حاجزین : حاجز کی جمع۔ مانع، رکاوٹ ۴۱۲

حرد : (بروزن سرد) شدت سے منع کرنا، روکنا۔ ۳۴۲

حساباً شدیداً : سخت گیری کے ساتھ حساب لینا۔ ۲۲۷

حسوماً : مادہ 'حسم' (بروزن اسم) کسی چیز کے آثار ختم کرنا۔ سخت آندھی ۳۷۷

حسیر : مادہ 'حسر' (بروزن قصر) برہنہ کرنا ۲۷۸

حلّاف : بہت زیادہ قسمیں کھانے والا جھوٹا۔ ۳۳۲

حواری : مادہ 'حور' دھونے اور صاف کرنے کے معنی میں۔ صاف باطن۔ ۹۹

خ

خاسی : مادہ 'خساد و خسوع' (بروزن مرد و خشوع) ناتوان، ناکام ۲۷۸

خاویہ : مادہ 'خوا' (بروزن ہوا) بھوکے شکم خالی۔ ۳۷۷

خلق : مادہ 'خلقت'۔ ایسی صفات جو انسان سے جدا نہ ہوں۔ ۳۲۱

د

دکّة : صاف اور نرم زمین، شدت سے کوٹنا۔ ۳۸۵

ذ

ذراع : کہنی سے لے کر انگلی کے سرے تک فاصلہ ½ میٹر، ایک ہاتھ ۴۰۱

ذلول : رام، مسخر ۲۹۲

ر

رابیہ : آزمائش، اضافہ ۳۷۹

راغبون : مادہ 'رغبت' الی یا فی کے ساتھ بمعنی تمائل، اور عن کے ساتھ انصراف و بے اعتنائی کے معنی دیتا ہے۔ ۳۴۷

رجوم : 'تیز' آسمانی شہابوں کی طرف اشارہ۔ ۲۸۰

❖ ❖ ❖

ز

زاغوا : مادہ 'زیغ' صراط مستقیم سے انحراف۔ ۷۷

زعم : مادہ 'زعم' (بروزن طعم) وہ بات جس کے جھوٹ ہونے کا احتمال یا یقین ہو۔ ۱۷۴

زنیم : وہ شخص جس کا حسب نسب واضح نہ ہو۔ ۳۲۳

س

سحق : (بروزن قفل) پیسنا، نرم کرنا۔ ۲۸۶

ش

شبابیک : شباک (بروزن خفاش) شبک (جالی) کی جمع ہے۔ ۱۹۲

شح : بخل، جس میں حرص شامل ہو۔ ۱۸۹

شهیق : قبیح اور ناگوار آواز مادہ 'شہق' طولانی آواز ۲۸۳، ۲۸۴

ص

صرصر : (بروزن دفتر) سرد زناٹے دار آواز۔ ۳۷۶

صریم : مادہ 'صرم' قطع کرنا، پھل توڑنا تاریک رات۔ ۳۴۰

صغت : مادہ 'صغو' (بروزن عفو) کسی چیز کی طرف مائل ہونا۔ جھکنا۔ ۲۴۴

صف : کسی چیز کو سیدھے خط میں قرار دینا (یہاں بطور اسم فاعل آیا ہے) ۷۱

ط

طیبه : طیب کے معنی ایسی چیز جس سے ظاہری و باطنی حواس لذت حاصل کریں۔ ۹۲

ظ

ظن : یہاں بمعنی یقین استعمال ہوا ہے۔ ۳۹۰

ع

عاتیه : مادہ 'عتو' (بروزن غلو) سرکش ہوائیں۔ ۳۷۶

عاقبتم : مادہ معاقبہ (بروزن کدر) پاؤں کی ایڑی ۵۴

عتت : مادہ 'عتو' (بروزن غلو) زوگردانی کرنا ۲۲۷

عتل : بدخو کینہ پرور ۳۳۳

عسیٰ : کسی چیز کے پورا ہونے کی امید۔ ۶۴

عصم : عصمت کی جمع۔ منع کرنا۔ ۵۲

غ

غابن : سبقت کرنے والا ۱۷۶

غلوه : مادہ 'غل' ایسی زنجیر جس میں قیدی کے ہاتھ پاؤں گردن سے باندھتے ہیں۔ (تکلیف دہ) ۴۰۰

❖ ❖ ❖

ف

فاسق : ہر گنہگار فاسق نہیں۔ گناہوں پر اصرار کرنا فسق ہے۔ ۱۵

فطور : مادہ فطر (بروزن سطر) طول میں شگاف کرنا۔ ۲۷۷

ق

قریہ : اجتماع کی جگہ، شہر یا گاؤں۔ ۲۲۷

قطوف : قطف (بروزن حزب) کی جمع چنے ہوئے پھل۔ ۳۹۱

ک

کأین : اسم مرکب۔ کم ۲۲۷

کرتین : مادہ 'کر' (بروزن شر) توجہ بازگشت۔ تکرار۔ ۲۷۸

کوافر : کافرہ کی جمع ۵۳

ل

لطیف : صاحبِ لطف و کرم ۲۹۰

لووا : مادہ 'لی'۔ رسّی کو بل دینا، منہ پھیرنا، سر ہلانا۔ ۱۴۹

لیزلقونک : مادہ 'زلق'۔ پھسلنا۔ زمین پر گرنا۔ نابود ہونا۔ ۳۶۴

م

مثقل : مادہ ثقل : بھاری، بہانا جو سے بہانا چھین لینا۔ ۳۶۰

مرصوص : مادہ 'رصاص' سیسہ، سیسہ پلائی ہوئی پختہ عمارت ۷۱

مشاء بنمیم : تعلقات خراب کرنے والا۔ ۳۲۳

معین : مادہ 'معن' (بروزن طعن) پانی جاری ہونا۔ ۳۰۹

مغبون : ہار جانے والا۔ ۱۷۶

مغرم : مادہ 'غرامت' وہ نقصان جو بغیر کسی جرم یا خیانت کے پہنچتا ہے۔ ۳۶۰

مفتون : فتنہ سے اسم مفعول ہے۔ معنی ابتلاء۔ یہاں جنوں میں مبتلا ہونا مراد ہے۔ ۳۲۱

مقت : اس شخص کے لیے بغض شدید کے معنی میں ہے جس نے کوئی قبیح کام کیا ہو۔ ۶۹

مکظوم : مادہ کظم (بروزن ہضم) حلق، حبس، کظم۔ سقا۔ مشک کا دہانہ بند کرنا۔ ۳۶۲

ممنون : مادہ 'من' منقطع نہ ہونا۔ ۳۲۰

منافق : مادہ 'نفق' (بروزن نفع) پیشروی، نفوذ، نفق (بروزن شفق) کھال، نقب زیرِ زمین، نافقا، پوشیدہ سوراخ ۱۴۰

مناکب : منکب (بروزن مغرب) کی جمع، کندھا۔ ۲۹۳

مؤتفکات : مادہ ائتفاک۔ مؤتفکہ کی جمع، الٹ پلٹ ہونا۔ تہ و بالا ہونا۔ ۳۷۹

مہین : مہانت، پستی، حقارت، کم عقل جھوٹے۔ ۳۳۲

ن

نصوح : مادہ 'نصح' (بروزن صلح) خالص خیر خواہی۔ ۲۵۵

نکر : (بروزن شکر) بے مثال مشکل ۲۲۷

نودی : مادہ 'ندا' پکارنا۔ اذان ۱۲۱

و

وأتمروا : مادہ 'ایتمار' کسی دستور کو قبول کرنا۔ مشاورت کرنا۔ ۲۲۱

وبال : مادہ 'وابل' سخت بارش جس کے نقصان سے انسان خائف ہو، وبال۔ ۱۷۱

وتین : دل کی رگ۔ شریان ۴۱۲

وجد : (بروزن حکم) توانائی اور تمکن کے معنی میں ہے۔ ۲۲۰

وقود : (بروزن کبود) آتش گیر مادہ ۲۵۳

ھ

ھاؤم : لے لو۔ مذکر و مونث واحد جمع تثنیہ کی گردان۔ ۳۹

ھماز : مادہ 'ہمز' (بروزن طنز) عیب جوئی کرنا ۳۳۲

ی

یثقفوکم : مادہ 'ثقف' کسی چیز پر ماہرانہ تسلط۔ ۳۳۳

یدھنون : مادہ 'مداہنہ' دہن، روغن نرمی، جھکاؤ، منافقانہ جھکاؤ ۳۳۲

یصدون : منع کرنا۔ اعراض کرنا۔ ۱۴۹

یوم تغابن : غبنوں کے ظہور کا دن۔ قیامت کا ایک نام ۱۷۷

* * *

متفرق موضوعات

ابدی نمونے

عمل موثر ترین نمونہ ہے جو بات دل سے نکلتی ہے، دلوں پر لازمی اثر کرتی ہے۔ ۴۱

ابراہیمؑ تم سب کے لیے نمونہ تھے۔

ابراہیمؑ نے اپنی مشرک قوم سے کہا کہ میں تم سے اور تمھارے خداؤں سے بیزار ہوں۔ ہمیشہ کی جدائی، یہاں تک کہ تم ایمان نہ لے آؤ۔ ۳۶، ۳۷۰

اپنے اہل و عیال کو جہنم کی آگ سے بچاؤ۔

یہ تمھاری ذمہ داری ہے کہ اپنے بیوی بچوں کی تربیت کرو، تاکہ وہ راہِ مستقیم اختیار کریں۔ ۵۲

اچھی بیوی کے اوصاف

اِسلام، ایمان، تواضع، تائب، عبادت گذار، روزہ دار۔ ۲۴۶، ۲۴۷

اخلاقی رذائل

چغلخوری، عیب جُوئی، بہت قسمیں کھانا، شکم پروری ۳۳۳

اُڑتے پرندوں کو دیکھو

انھیں کس نے اڑنا سکھایا۔ خدا کے مقابلے میں تمھارے لشکر تمھاری کچھ مدد نہیں کر سکتے۔ ۲۹۷ تا ۲۹۹

اسے پکڑ کر زنجیروں میں جکڑ دو۔

دوزخیوں کی گرفتاری، جہنم میں دخول اذیت، جہنم میں ان کا کھانا پینا۔ ۳۹۹ تا ۴۰۳

افشاءِ راز

افشاء راز سے خیر و خوبی ختم ہو جاتی ہے۔ (امیرالمومنینؑ) ۲۴۹ ۲۵۰

اگر وہ ہم پر جھوٹ باندھتا تو ہم اسے مہلت نہ دیتے

اگر رسول ہم پر جھوٹ باندھتا تو پکڑ لیتے۔ رگِ دل کاٹ دیتے، کوئی حمایت نہ کرتا۔ قرآن پرہیزگاروں کے لیے تذکرہ ہے۔ بعض تکذیب کرتے ہیں۔ کافروں کے لیے حسرت ہے۔ یہ خالص یقین ہے۔ اپنے رب کی تسبیح کر۔ ۴۱۱ تا ۴۱۵

* * *

انحصار طلبی

ثروت مندوں کی بہت بڑی مصیبت مالِ دنیا کی طرف لگاؤ کا افراط اور انحراف کی شکل میں ظاہر ہونا۔ ۳۴۸

انسان کی ناکامی کے چار عوامل

دھوکہ، ہٹ دھرمی، سرکشی، حق سے دوری انسان کی بدبختی اور گمراہی کا سبب ہیں۔ ۳۰۰

انسانی زندگی میں قلم کا نقش و اثر

قلم کی کارکردگی پھر اس کی تعریف اور اِستفادہ پر دلائل۔ قلم اور اس کے حاصل کی قسم نے اہمیت واضح کر دی۔ ۳۲۲

اہلِ خانہ کی تعلیم و تربیت

اپنے اہلِ خانہ کو امر بالمعروف و نہی عن المنکر کرو۔ اگر قبول کر لیا تو جہنم کی آگ سے بچ گئے ورنہ تیری ذمہ داری ختم ہو گئی۔ (حدیثِ رسولؐ) ۲۵۸

اے اہلِ محشر میرا نامۂ اعمال پڑھو۔

جس کا نامۂ اعمال دائیں ہاتھ میں ہو گا، وہ فخر سے کہے گا۔ لو میرا نامہ اعمال پڑھو۔ ۳۸۸

ایسا جانور جس پر کتابیں لدی ہوئی ہوں

جو لوگ کتاب پڑھ کر اس پر عمل نہ کریں ان کی زندگی گدھے پر کتابیں لادنے کی مثال ہے۔ ۱۱۱

اے کاش مجھے موت آجاتی

جس کا نامۂ اعمال بائیں ہاتھ میں ہوگا، وہ کہے گا۔ مجھے نامۂ عمل نہ دیا جاتا، موت آجاتی۔ ۳۹۵، ۳۹۶

باغ والوں کی عبرت انگیز کہانی

شاداب باغوں کے مالک جو حاجتمندوں کو روک کر پھل چنتے تھے۔ عذابِ خدا سے باغوں کا تباہ ہونا۔ ۳۳۹ تا ۳۴۲

باغ کے مالکوں کا عبرتناک انجام

باغ کی خستہ حالی پر اظہارِ تاسف۔ ایک دوسرے پر الزام تراشی، رجوع الی اللہ! ۳۴۴ تا ۳۴۷

بدصفات لوگوں کی پیروی نہ کرو۔

تکذیب کرنے اور قسمیں کھانے والوں، عیب جو اور چغلخوروں کی پیروی نہ کرو۔ ۳۳۱ تا ۳۳۵

بشارت اور تکمیلِ دین کا ربط

سورۂ اعراف کی آیت ۵۶ سے حضرت عیسٰی کی بشارت واضح ہے۔ ۷۸

بعثتِ پیغمبر اسلام کا مقصد

تلاوتِ آیات، تہذیب و تزکیۂ نفس اور کتاب و حکمت کی تعلیم ۱۰۴ تا ۱۰۹

بعض ازواجِ پیغمبر کی سرزنش

عائشہؓ اور حفصہؓ ازواجِ رسول پاکؐ سے سازش کی تفصیل ۲۴۲ تا ۲۴۶

بنیادی اصل

حب فی اللہ اور بغض فی اللہ ۴۳

بیدار فکر و سماعت رکھتے تو جہنم میں نہ جاتے

کافروں کے لیے جہنم برا ٹھکانا ہے، رسول تو آئے ہم نے جھٹلا دیا۔ اعترافِ گناہ کے باوجود دوزخی رحمتِ خدا سے دور ہیں۔ ۲۸۳ تا ۲۸۶

بیعت مستورات کا ان کی اسلامی شخصیت کے ساتھ ربط

شرائط بیعت نے عورت کی انسانی حیثیت کو بیدار کر دیا۔ ۵۵

بیعتِ مستورات کی شرائط

شرک، چوری، زنا، قتلِ اولاد، بہتان و افتراء اور رسولؐ کی مخالفت نہ کرنا۔ ۵۷، ۵۸

پریشانیوں پر غلبہ کی راہ

صبر، تذکر، علامہ شوستری کا واقعہ ۱۶۰، ۱۶۱

❊ ❊ ❊

تغابن ، غبنوں کا آشکار ہونا۔

قیامت میں دوبارہ اُٹھنا، جنت و دوزخ کے مناظر، فیصلہ کا دن ۱۷۴ تا ۱۷۸

تمام عالمِ ہستی میں کوئی نقص نہ پاؤ گے۔

بابرکت خدا نے ہر چیز پیدا کی۔ آزمائش کے لیے موت وحیات کو خلق کیا۔ اس کی مخلوق میں کوئی نقص نہیں ہے۔ ۲۷۴

تمام مصائب اسی کے فرمان سے ہیں۔

کوئی مصیبت رونما نہیں ہوتی مگر خدا کے اذن سے۔ خدا ہر چیز کا جاننے والا ہے۔ ۱۷۹

تمھارے مال و اولاد ذریعہ آزمائش ہیں۔

تمھاری اولاد و ازواج میں بعض تمھارے دشمن ہیں، جو ہجرت سے روکتے ہیں۔ یہ تمھاری آزمائش کا ذریعہ ہیں۔ ۱۸۵

تمھارے مال و اولاد تمھیں یادِ خدا سے غافل نہ کردیں

ہم نے جو روزی تمھیں دی ہے اس میں سے راہِ خدا میں خرچ کرو۔ ۱۵۷ تا ۱۶۰

توبہ رحمت کا ایک دروازہ ہے۔

تمام گنہگاروں کو اپنی اصلاح احوال کی دعوت کا توبہ ایک دروازہ ہے۔ ۲۵۹

تیرے اخلاق کتنے اچھے ہیں۔

قسم ہے قلم کی اور نوشتہ قلم کی تو مجنون نہیں ہے (محبت علیؑ کے باعث ایک قریشی کا آپ کو مفتون کہنا)۔ ۳۱۸ تا ۳۲۱

جاری پانی تمھارے اختیار میں کون دیتا ہے؟

کفار کو دردناک عذاب سے کون نجات دے گا۔ پانی زمین کی گہرائی میں اتر جائے تو کون کرے گا۔ ۳۰۸ تا ۳۱۱

چند عبرت انگیز داستانیں

ہارون الرشید کی بیماری، طبیب کی آمد، تشخیص مرض، وصیت اور موت کی تفصیل۔ ۳۹۶ تا ۳۹۸

حواریوں کی طرح ہو جاؤ۔

رسول کی نصرت میں جہاد کرو، کامیاب اور غالب ہو جاؤ گے۔ جیسے عیسےٰ کے حواری تھے۔ ۹۲ تا ۹۴

حواریین کون ہیں؟

حضرت عیسیٰؑ کے بارہ جاں نثار ساتھی۔ ۹۶

خدا سب سے بے نیاز ہے۔

علیم و خبیر اور غنی حمید ہے۔ ۴۲

❊ ❊ ❊

خلقت عالم کا مقصد معرفت ہے۔
خدا نے سات آسمان اور اتنی ہی زمینیں پیدا کیں، ان میں اس کا امر نازل ہوتا ہے تاکہ تم جان لو کہ وہ قادر ہے۔ ۲۳۱ تا ۲۳۵

دشمنوں کے لیے بھی عدالت
مسلمان اور کافر عورتوں کے مہر کا تبادلہ ۵۴

راہِ توحید پر چلنے والے افراد
کیا وہ شخص جو منہ کے بل گرا ہوا چل رہا ہو، ہدایت کے زیادہ نزدیک ہے یا صراطِ مستقیم پر چلنے والا۔ ۳۰۲ تا ۳۰۶

رُوحِ توکل
سعی و کوشش کے ساتھ خدا پر بھروسہ کرنا۔
چند احادیث۔ ۲۱۳ ، ۲۱۴

سرکشوں کا دردناک انجام
شہر اور آبادیاں، مکینوں نے نافرمانی کی، مبتلاءِ عذاب ہوئے۔ اللہ کا ذکر کرو، رسول بھیجا جو ہدایت کرتا ہے۔ ۲۲۶ تا ۲۳۰

سننے والے کان کہاں ہیں؟
قوم فرعون اور قوم نوح و لوط کا ذکر ۳۷۸ تا ۳۸۰

صالح المومنین
صالح، متقی، کامل الایمان مراد ہیں۔
جناب علیؑ مراد ہیں۔ ۲۴۷ ، ۲۴۸

صفوں میں وحدت کی ضرورت
صفوں کی درستگی کے لیے نہایت موزوں تعبیر۔ 'بنیانِ مرصوص'۔ ۷۲

طلاق
طلاق ارذلِ جواز ہے۔ (احادیث رسولؐ و آئمہ) شرطیں اور طریقِ کار۔ عدت، رجوع، بائن۔ ۱۹۷ تا ۲۲۲

عالم آفرینش کی عظمت
زمین سے سورج بارہ لاکھ گنا بڑا ہے اور کہکشاں میں ایک اوسط درجہ کا وجود ہے۔ ۲۸۰ ، ۲۸۱

عالم بے عمل
حصولِ علم میں مشقت اٹھانا، برکاتِ علم کے مقابلہ میں ہیچ ہے۔ جس عالم نے علم سے فائدہ نہ اٹھایا، گدھے پر کتابیں لادنے کی مثال ہے۔ ۱۱۵

عذاب کا تقاضا نہ کرو۔
قوم کے لیے بددعا نہ کرو۔ یونسؑ کا مچھلی کے پیٹ میں جانا۔ پھر رہائی و نجات پانا۔ ۳۵۹ ، ۳۶۳

عزّت خدا اور اس کے دوستوں کے لیے ہے۔

عزّت خدا کے لیے ہے۔ رسولؐ اور مومنین اس کے دوست اور اس کے پرتو کے حامل ہیں۔ ۱۵۵

عقل و خرد کی قدر

قرآن میں بار بار اولی الابصار، اولی الالباب کی فضیلت بیان ہوئی ہے۔ ۲۸۶

علیؑ اور ان کے شیعوں کا مقام

علیؑ اور ان کے شیعہ اہلِ جنّت ہیں۔ ۳۹۲

علیؑ کی ایک اور فضیلت

وتعیھا اذن واعیۃ کا نزول، رسولِ پاکؐ کی دعا۔ جناب امیر کا بیان، رسولِ پاکؐ سے جو سنا ہمیشہ یاد رہا۔ ۳۸۱

عہدین کی بشارتیں

موجودہ کتب (تورات و انجیل) میں ایسی بہت سی تعبیریں نظر آتی ہیں جو ایک عظیم ظہور کی بشارت دیتی ہیں۔ ۷۹ تا ۸۳

فتح قریب کون سی ہے؟

ہر زمانے میں ہے اگرچہ مراد فتح مکہ ہے ۹۲

فضل خدا از روئے حساب ہے۔

احادیثِ رسول کی روشنی میں خدا کے فضل کی (از روئے عدل) عطاء ۱۰۹

فولادی دیوار کی طرح جم کر لڑنے والے

وہ بات کہنا جس پر عمل نہ کرو، موجبِ غضبِ خدا ہے۔ سچے مومنوں کی گفتار و عمل میں کبھی فرق نہیں ہوتا۔ ۶۸، ۶۹

قرآن پر اعراب لگانے کی ابتدا

صعصعہ بن صوحان کی روایت۔ جناب امیرؑ کے حکم سے ابوالاسود کا قرآن پر اعراب لگانا۔ ۴۰۳، ۴۰۴

قرآن یقیناً کلامِ خدا ہے۔

قسم ہے ظاہر اور پوشیدہ کی، یہ قرآن ایک بزرگ رسول کی زبان سے نکلا۔ عالمین کے رب کی طرف سے، شاعر کا کلام ہے نہ کاہن کا۔ ۴۰۵ تا ۴۰۹

قیامت، سجدہ، مجرم و کافر

پنڈلیاں خوف سے کھل جائیں گی، سجدہ کرو، مومن کریں گے۔ مجرموں میں سجدہ کرنے کی طاقت ہی نہ ہوگی۔ ۳۵۴ تا ۳۵۸

کافر دوست جو تم سے برسرِ پیکار نہیں ہیں

جن لوگوں (کافروں) نے تمہیں نقصان نہیں پہنچایا، اُن سے نیکی کرو کوئی حرج نہیں۔ ۴۵

کوئی مجرم اس کے عذاب سے امان میں نہیں ہے

اگر خدا چاہے تو زمین پھٹ جائے تمہیں نگل جائے، لرزتی رہے، آندھی یا طوفان بھیج دے۔ ۲۹۲ تا ۲۹۵

کیا جہانوں کا خالق جہان کے اسرار سے واقف نہیں؟

جس نے پیدا کیا ہے وہ ظاہر و پوشیدہ سب کچھ جانتا ہے۔ ۲۸۸، ۲۹۰

گفتارِ بلا عمل

زبان دل کی ترجمان ہے۔ اگر دونوں میں وحدت نہ ہو تو یہ نفاق ہے۔ ۷۲

گناہ اور سزا میں تناسب

قومِ ثمود و عاد، قومِ نوح و لوط وغیرہم پر عذاب ان کے افعال و گناہ کے باعث تھے۔ ۳۸۱، ۳۸۲

گناہ اور قطع رزق کے درمیان رابطہ

ارتکابِ گناہ سے روزی منقطع ہو سکتی ہے۔ (امام محمد باقرؑ) ۳۴۹

مداہنہ اور سازگاری

لے دے کر (سودے بازی سے) دوسروں کو اپنے گروہ میں کھینچنا۔ ۳۳۶، ۳۳۷

مساکنِ طیبہ کیا ہیں؟

قرآن میں تین چیزیں رات، مکان محبت کرنے والی بیویاں وجہِ سکون بیان ہوئی ہیں۔ جنت میں یہ تینوں ہیں۔ ۹۲، ۹۳

مسلمانوں اور کفار کے نقصان کی تلافی

جو عورت مسلمان ہو کر آئے یا مسلمان کی کافر بیوی چلی جائے تو مہر اور مصارف واپس لے لو، دے دو۔ ۵۰

مشکلات سے نجات اور تقویٰ

تقویٰ کی برکات سے کئی مشکلات کے حل پر احادیث، عمر بن مسلم اور عوف بن مالک کے واقعات ۲۱۱، ۲۱۲

مغضوب علیہ قوم سے دوستی نہ کرو۔

جن پر اللہ کا غضب نازل ہوا ان میں کفار اور مشرکین کے علاوہ منافقین بھی شامل ہیں۔ ۶۰ تا ۶۲

مکمل بازپرس

کیا مومنین کو مشرکین و مجرمین کے برابر درجہ دیں۔ کیا مجرم مومن کے ہم پلہ ہو جائیں گے۔ ۳۵۰ تا ۳۵۳

منافقِ بے اخلاص

ہٹ دھرمی کرتے ہوئے اکڑ کر کھڑا ہو جاتا ہے۔ یہاں تک کہ ٹوٹ کر بے بس

ہو جاتا ہے۔ ۱۵۵

منافق کی دس نشانیاں

جھوٹ، قسمیں کھانا، باطن خالی، بے ہودگی حق کا مذاق اڑانا۔ فسق و گناہ وغیرہ ۱۵۲

منافق سے خطرہ

معاشرہ میں شامل ہو کر ہر طرح کا نقصان پہنچا سکتا ہے۔ ۱۵۴

موت کا خوف

فنا کے بعد کی زندگی پر یقین نہ ہونا یا اعمالِ قبیحہ کی بناء پر خوف ہوتا ہے۔ اگر یہ نہ ہو تو موت رحمت ہی رحمت ہے۔ ۱۱۷ ، ۱۱۸

مومن اور کافر عورتوں کے نمونے

نوح و لوطؑ کی نافرمان بیویوں اور فرعون کی صاحبِ ایمان بی بی آسیہ اور جناب مریمؑ کا ذکر۔ ۲۶۲ تا ۲۶۸

میرے اور اپنے دشمنوں کو دوست نہ بناؤ۔

جو شخص بھی ایسا کام کرے گا وہ سیدھے راستے سے ہٹ گیا۔ ۳۲ ، ۳۳

بشارتِ عیسیٰؑ

میں تورات کی تصدیق کرتا ہوں اور ایک آنے والے نبی کے ظہور کی بشارت دیتا ہوں۔ ۷۶ ، ۷۷

نظرِ بد کی حقیقت

نظرِ بد حقیقت ہے اس کا دفاع بذریعہ رقیہ (تعویذ) کیا جائے۔ (ارشادِ رسولؐ)

جناب اسماء کا بیان۔ ۳۶۶ تا ۳۶۸

نفاق اعتقادی و عملی

منافق کی تین نشانیاں۔ جھوٹا، خائن اور وعدہ خلاف۔ (ارشادِ رسولؐ) ۱۶۱

نفاق کا سرچشمہ اور علامات

جھوٹی قسمیں کھانا۔ چکنی چپڑی باتیں بنانا، اپنے سایہ تک سے خائف رہنا۔ کبر و نخوت۔ ۱۲۸ ، ۱۲۹

نفع بخش و بے مثال تجارت

ایمان والو جہاد عذاب سے نجات دینے والا ہے۔ اللہ و رسولؐ پر ایمان لے آؤ راہِ خدا میں جان و مال سے جہاد کرو، اللہ گناہ بخش دے گا۔ جنت میں داخل کرے گا۔ پسندیدہ نعمت فتح مبین عطا کرے گا۔ ۸۸ تا ۹۱

نمازِ جمعہ، اسلام میں پہلی مرتبہ

ہجرت سے پہلے اسعد بن زرارہ کی اقتدا میں نماز یوم عروبہ ہوئی۔ رسول پاک ؐ کا مدینہ میں آنا، مسجد قباء کی بنیاد، نماز جمعہ بنی سالم میں ادا فرمائی، نماز کے بعد خطبہ دیا۔ نمازِ جمعہ کی اہمیت۔ ۱۲۴ ، ۱۲۵

نمازِ جمعہ کا فلسفہ

ایک عظیم اجتماعی عبادت، دو خطبے، مواعظ پند و نصائح اور پرہیزگاری کا حکم، ایک سیاسی کانفرنس۔ ۱۲۶

نماز جمعہ کے آداب اور خطبوں کے مضامین و مطالب

نماز کی شرائط، طریق کار، خطبہ میں خدا کی حمد و ثنا، درود، خوفِ خدا اور تقوٰے کی وصیت۔ ۱۲۹ ، ۱۳۰

نماز جمعہ کی شرائطِ وجوب

امام جماعت کی طرح امامِ جمعہ کا عادل ہونا۔ بعض کے نزدیک نمازِ جمعہ امامِ معصوم کے زمانہ حضور کے ساتھ مربوط ہے۔ ۱۳۱

وہ تجھے نابود کرنا چاہتے ہیں۔

قرآنی آیتیں سن کر تجھے گھورتے ہیں۔ نابود کرنا چاہتے ہیں لیکن یہ ان کے اختیار میں نہیں۔ ۳۶۴ تا ۳۶۶

واقفِ اسرار القلوب

اس نے تمھاری بہترین صورت بنائی۔ زمین و آسمان کی ہر شے سے واقف۔ تمھارے پنہاں و آشکار سے باخبر۔ ۱۷۰

واقعۂ عظیم

قیامت کے حالات آسمانوں کا شق ہونا ۳۸۳ تا ۳۸۷

وہ ، اور نورِ خدا

خدا پر جھوٹ باندھنا بڑا ظلم ہے۔ اسلام کی دعوت دی جارہی ہے۔ نورِ خدا پھونکوں سے نہ بجھے گا۔ اللہ کا دین غالب ہوگا۔ ۱۴ تا ۸۷

ہندہ کی بیعت

رسول اللہ ؐ کا شرائطِ بیعت بیان فرمانا اور ہندہ کے اعتراضات و جوابات ۵۹

مقامات

احقاف : عاد کا مسکن ۳۷۶
حبشہ : بند ٹوٹنے کے باعث تباہ ہونے والا باغ حبشہ میں تھا ۳۳۹
حجاز ۳۷۶
شام ۳۷۶
صنعا : سرزمین یمن میں ۳۳۹
طائف ۳۳۹
قدید : سرزمین قدید میں جنگ بنی مصطلق واقع ہوئی۔ ۱۴۶

الحمدللہ! توفیقِ الٰہی کے ساتھ اشاریہ اختتام پذیر ہوا۔ سید شکیل حسین موسوی۔ ۴۶۔ بی جعفریہ کالونی بند روڈ۔ لاہور۔ ۲۸ مئی ۱۹۹۱ء